شب دیدہ
محمد یحییٰ خان
افسانے ۔ سفرانے

● کتاب کے حصول کے لئے

پیا رنگ کالا پبلی کیشنز

412۔نرگس بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔

فون :7844838 موبائل : 0300-9417829

ماہنامہ "آداب عرض" 29۔ایف شمع پلازہ۔فیروزپور روڈ لاہور۔

فون : 7550964

شب دیدہ

●

محمد یحییٰ خان

●

پیا رنگ پبلی کیشنز، لاہور

آموختہ
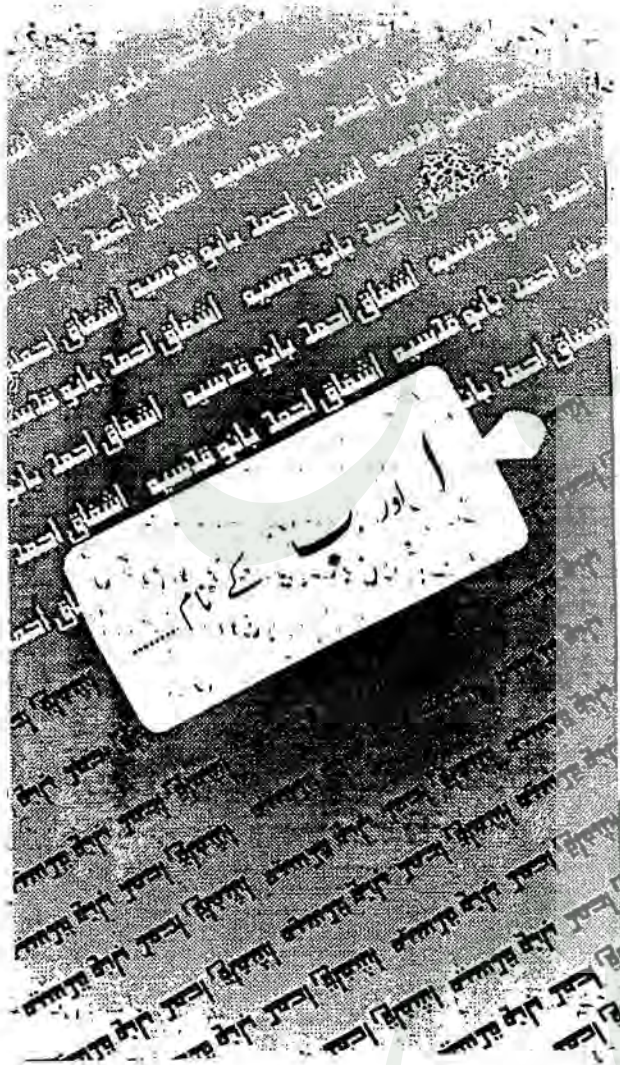
786-99-72 MUHAMMAD YAHYA KHAN
SHAB DEEDA / MUHAMMAD YAHYA KHAN
LAHORE: PIYA RANG PUBLICATIONS
SEP. 2001. P. 417
1. AFSANEY
1. TITLE FB

مصنف : محمد یحییٰ خان
کتاب : شب دیدہ
طبع اوّل : ستمبر 2001ء
گرد و پیش : لالہ جی
کمپوزنگ : مُحمد مصوّر امین
باہتمام : محسن
مطبع : میٹرو پرنٹرز
گرافکس : ڈاکٹر محمد طارق
پروڈیکشن ایڈوائزر : سیّد ثمین شاہ
پبلشر : محمد یحییٰ خان (پیارنگ پبلی کیشنز، لاہور)
تعداد : 500
قیمت : 250 روپے

Piya Rang Pubications
412, Nargis Block, Allama iqbal Town, Lahore. 54570
Tel: 7844838 Mobile: 0300-9417829

اِک آئینہ رُوبرُو ہے

آج ہر انسان، ہزارہا انسانوں کے سنگ رہنے کے باوجود تنہائی کا شکار ہے اور سوچئے تو یہ تنہائی اس کی خودساختہ ہے۔ مان لیجئے کہ ہر انسان اپنی ذات میں مکمل ہے، زندہ رہنے کے لئے اسے پہاڑ کاٹنے پڑتے ہیں، اپنی راہیں اسے خود بنانا پڑتی ہیں۔ وہ اپنی ذات پر اختیار رکھتا ہے، اپنے مفاد کی خاطر انوکھے اور جان جوکھم میں ڈالنے والے فیصلے کرتا ہے۔ اپنے لئے سوچتا ہے، مستقبل سنوارنے کے لئے پینترے بدلتا ہے۔ کبھی اپنے ہی جیسے کئی انسانوں کو رَوند ڈالتا ہے اور کچھ کو اپنا مقصد پانے کی خاطر سر پر بٹھا لیتا ہے۔ احساس کو ذرا سا تیکھا رنگ دیجئے تو یہی بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ آج ہر انسان دوسروں کو مار کر خود جینا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا کی ساری آسائشیں اس کی دسترس میں ہوں۔ بس یہی خرابی ہے، یہی سارے فساد کی بنیاد ہے۔ ہمارے، آپ کے یہی رویئے ہیں جو ہمیں ایک دوسرے سے دُور کئے جا رہے ہیں، ایک چھت کے نیچے رہنے والے چار افراد بھی ایک دوسرے سے یہ سوچ کر ڈرے سہمے رہتے ہیں کہ نہ جانے کس وقت دوسرے کا داؤ چل جائے اور چھت سے بھی محروم ہونا پڑے۔ یہ بات بڑی واضح ہے کہ یہ تنہائی بے جا لالچ اور ہماری ہوس کا رَدِ عمل ہے اور ہم دن بدن اپنی زندگیاں، اپنے راستے تنگ کرتے جا رہے ہیں--- "شَب دیدہ" میں یوں تو مختلف کرداروں سے وابستہ منتخب سچائیاں شامل ہیں لیکن اگر آپ انہیں اپنے احساس کے کسی اُجلے وَرق پر رقم کرلیں تو گویا بحیثیت انسان اور مسلمان آپ زندگی کو زندگی کرنے کا ایک نصاب حاصل کرلیں گے۔ یہ انتخاب ایک درس ہے ان کے لئے جو انسانیت کے اُٹھ جانے کا رونا روتے ہیں، اپنی تنہائی پر گریاں ہیں لیکن کاش! وہ ایک لمحہ کے لئے ہی سہی، اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لیں--- بابا جی، محمد یحییٰ خان نے وقت کی ضرورت کو محسوس کیا ہے، ایک آئینہ آپ کے رُوبرُو کر دیا ہے۔ اس کی جزا اللہ انہیں دے اور قارئین! آپ اپنے آپ کو ضرور اس آئینے میں دیکھئے گا۔

خالد بن حامد

مدیرِ اعلیٰ

ماہنامہ "آداب عرض" لاہور

سُخن ہائے گُفتنی

● "شَب دِیدہ" میرے ان چند ایک پسندیدہ افسانوں، کہانیوں اور مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف جرائد میں شائع ہو کر سنجیدہ قارئین کی توجّہ کا مرکز بن چکے ہیں۔ جب کہ اس مجموعہ میں شامل دو کہانیاں "زہرباد" اور "کالا شا کالا" بنگالی، ہندی اور ازبک زبان میں منتقل ہو کر بین الاقوامی شہرت بھی حاصل کرچکی ہیں۔

بے شک حسَبِ سابق کی طرح اس کتاب کی اشاعت میں بھی میرے مدّاحوں، مجھ سے رُوحانی، قلبی تعلق رکھنے والے بچوّں اور احباب کا پُرخلوص تعاون اور محبت اور محنت کا گرانقدر سرمایہ بھی شامل ہے۔ اِک طرح سے دیکھا جائے تو "شَب دِیدہ" بھی حال ہی میں شائع ہونے والی میری کتاب "پیا رنگ کالا" کی جڑواں بہن ہے۔ یعنی ان دونوں نومَولود کتابوں کا درمیانی وقفۂ پیدائش محض چند روز سے زیادہ کا نہیں ہے۔

اس مجموعہ کے مضامین کے بارے میں مجھے یہ کہنے میں شمّہ بھر بھی ہچکچاہٹ نہیں ہے کہ یہ رُودادیں جہاں زندگی اور اس کی تمام تر تلخ حقیقتوں، اس کی رنگا رنگ دلچسپیوں، بُوقلمونیوں اور حیرت انگیز بوالعجبیوں کی جمع تفریق--- اس کے شاخسانوں، مکافاتِ عمل کے پیش منظر اور پَس مناظر کو اُجالتی ہیں وہیں ان کی بَین الاِستعاراتی بُنْت، سادگی، بیساختگی، روزمرّہ کی رَمزیّت کے فِطری اور نفسیاتی رَوئیوں کے والہانہ پَن کی بھی مَظہر ہیں جبکہ زبان کا لٹکا اور چٹخا بھی خاصے کی چیزیں ہیں۔

اس رُوئے اَرض پہ جہاں کہیں بھی حضرتِ انسان موجود ہے اس کے انسانی، حیوانی، جبلّی، نفسیاتی، جنسیاتی اور رَوحانی رَوئیے قریب قریب ایک ہی قبلہ رُخ سجدہ ریز ہیں--- کوئی بھی انسان اپنا مُدعا مقصد بیان کرنے کے لئے محض نطُق کا ہی محتاج نہیں بلکہ اس کے لئے اپنا عندیہ بیان کرنے کی خاطر آنکھیں، ہاتھ، لَب و اَبرو کی جنبشیں، اِلفاظ کی عِلّت کے بغیر غوَغائے صوَت کے لہریئے یا حَزن و انبساط کے رَوئیے اشاریئے ہی کافی ہوتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب میں اسی "انسان و حیوان" کی فطرت و جبلت اور اس کے مختلف نفسیاتی رَویّوں کی کتھائیں لکھی ہیں جو آپ کو ہنسا اور رُلا رُلا بھی دیں گی اور پھر کبھی گُپت چُپ کے کسی ٹھہرے ہوئے پانی والے گہرے کنوئیں میں بھی اُتار لے جائیں گی اور پھر آپ شاید محسوس کریں گے کہ یہ گہری چُپ اور گھمبیر گھُپ والا کنواں رَوزِ ازل سے آپ کو کہیں نیچے درمیان میں گاڑ کر خِشت خِشت، بالِشت بالِشت اوپر اٹھایا گیا ہے۔ جہاں زمانوں سے بیٹھے آپ اپنے پاؤں تلے کی نمی، گرد پھیلی ہوئی باس، تنہائی و تاریکی اور محض اوپر، بہت اوپر رَوشن ستارے کی طرح آسمان کی ٹکی دیکھ سکتے ہیں۔

اب آخر میں وہی "سدا کی سانجھ کا اندھیرا" --- کہ مَیں کوئی پڑھا لکھا، پیشہ وَر مستند ادیب نہیں ہوں۔ میں تو محض جاہلِ مطلق، "جمعہ جنج نال" یا از قسم "شامل واجا" لکھنے والا ہوں۔ اس رعائت سے زبان و بیان اور ادب و سخن کے سلسلہ، علم و ہنر کے حوالہ سے میری کسی کوتاہی، لغزش یا فنی سقم و سکتہ پہ گرفت واجب نہیں ہونی چاہیے۔

وما علینا الا البلاغ

محمد یحییٰ خان

ترتیب

مائی مٹھی اب عمر ناتواں کے جس عالم استغراق میں تھی' شاید ایسی ہی کسی کیفیت سے سرشار ہو کر شاعر نے کہا تھا ۔

ہم کو اپنی خبر نہیں یارو' تم زمانے کی بات کرتے ہو

بے چاری مائی مٹھی کبھی منہ میں کوزہ مصری کی ڈلی ہو گی۔ ڈلکاں مارتی ہوئی ڈل سی ڈونگی آنکھیں' لہجے میں لاجونتی لجیا' چہرے پہ چیت کی چاندنی--- بس! اب ہاتھ پاؤں سے ہار بیٹھی تھی۔ کار کرتوت کیا کرتی' اب تو یہ تھا کہ کوئی ہو جو اس کے کام کاج کی کھوج کرے۔ کھڑی ہو تو بٹھا دے' بیٹھی ہو تو اٹھا دے۔ دیدے پھپھوندی پھولے ہو گئے تھے۔ ماش کی دال کیا دکھتی' کالے چنے بھی کابلی دکھائی پڑتے۔ پوپلے منہ میں دانت' داڑھ کا شاید ہی کوئی جلا بھنا دانہ باقی بچا ہو۔ ٹیڑھے میڑھے ہاتھوں کی انگلیاں اورک کے پنجے' آزار بند باندھنا آزار۔ مکھی' مچھر سے بیزار۔ سماعت سات سمندر گہری' یادداشت کی گرہ ڈھیلی۔ باورچی خانے' باتھ روم کا فرق ندارد۔ کموڈ پہ پتیلی تو کھانے کی میز پہ لوٹا رکھ آتی تھی--- ایک صبح جب آئی تو پوٹلی بڑھاتے ہوئے بولی۔

"حاجی جی! بڑے میٹھے بیر ہیں' اللہ بچایا بازار سے لایا تھا' میں اپنے حصہ کے بیر آپ کے لئے لائی ہوں---"

ایک گول سا پتھر نکال کر مجھے کھلانے کا جتن کرنے لگی تو رعشہ جھولے ہاتھ کی بے سکت انگلیوں سے پھسل کر پتھر قالین پہ گر پڑا۔ اٹھانے کو جھکی تو تھپ سے چکی پاٹ ہو گئی--- یہ اٹھانے بٹھانے کا چکر تو چلتا ہی رہتا تھا' تھوڑی دیر بعد لوتم پوتم خود ہی سیدھ ہو

جاتی تھی اور موڈ ہوتا تو دو چار گھنٹے وہیں خراٹوں کے اخروٹ توڑتی رہتی۔ بڑبڑاتی' کوسنے گالیاں بکتی۔ ٹپّے' ڈھولے الاپتی اور میں اس دوران اس کے کرنے کے کام کرتا رہتا۔ جھاڑ پونچھ' پوچا صفائی' بستر چادر تہہ داری۔۔۔ آج بھی میں اسے چھریلے بیروں کے پاس لاؤنج کے قالین پہ یہ سوچ کر پڑا چھوڑ آیا تھا کہ چلو' دو گھڑی سکون لے لے' خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ لے کہ وہ بیدار رہ کر بھی کون سا پہاڑ کھود لیتی۔۔۔ یوں بھی اس کا یہیں سو رہنا ہی بہتر تھا' یہی تو اس کی جائے اماں یا جائے پناہ تھی۔ گھر یعنی جھونپڑے میں اسے کون سونے یا آرام کرنے دیتا تھا۔ شام کو گرتی پڑتی جھونپڑی بستی پہنچتی تو سب سے پہلے ننگے دھڑنگے ندیدے بچے' بھوکی بلیوں کی طرح اس پہ جھپٹتے۔ لوٹ کھسوٹ' چھینا جھپٹی ہوتی اور جو کسی کے ہاتھ منہ لگتا' لے بھاگتے۔ وہ لُٹی سوکھی' بے دم' روہانسی سی وہیں ڈھیر ہو جاتی۔ ساری برادری کی مائی رحمی! چھوٹے بڑے' سب کی دادی لوٹ پوٹ کر خود ہی کھسیانی سی ہنسی ہنستے اُٹھ بیٹھتی۔ اُکھڑی سانس درست کر کے گھسٹتی بڑھتی اپنے جھونپڑے تک پہنچ جاتی۔ اس کا بوڑھا بیمار' اپنے پرائے سے بیزار خود بھنگ پئے سویا مرا ہوتا یا پھر نشے کی ترنگ سے ترا تھوڑا کسی ہمسائے سے گالی گلوچ کر رہا ہوتا۔ ایسے میں وہ اسے دیکھتے' سونگھتے ہی کسی پاگل بھینسے کی طرح پھنکارتا۔

"آ گئی' حرامزادی! اپنے بڈھے عاشق کی بغل سینڈ کر کے۔۔۔" دو چار گیلی گیلی گالیوں سے اس کا سواگت کر کے اندر گھسیٹ لیتا۔ چادر کا پلّو' شلوار کا نیفہ' نیچے اوپر بڑی بے دردی سے ٹٹولتا۔۔۔ "ہمیشہ خالی ہاتھ ہی آؤ۔ دولو اور' نوٹ روپیہ پیسہ تجھے تیرا عاشق نہ دیوے ہے؟۔۔۔ ارے بھیڑو' ٹیچرو! اس کی کوئی سُندری گھڑی ہی لے آتی مرتی۔۔۔"

اگر تو اس کی بہو' پوتیاں موقع پہ موجود ہوتیں تو قدرے بچت ہو جاتی ورنہ وہ دو ہتھڑ دھرنے سے بھی باز نہ آتا' ماں بہن برابر کر کے وہ برابر کے کسی جھونپڑے میں ٹیلی ویژن دیکھنے گھس جاتا اور اس جنم جلی کے بس میں مدافعت یا فریاد کرنا تو کجا' رونا یا کراہنا بھی نہیں تھا۔ سوکھی ساڑ' ندی کی طرح مجھوانہ کھیا' ملاح نہ ملاد' بیلا نہ پتن۔ بھیڑیا بھٹ کھودے یا بجر بھونجا بھٹ پوتے' چار چوٹ یا چار حرف' اسے کیا خبر کہ کیا ہو گئیں۔ چاروں شانے چت' چہار عالم سے نچنت چپ' بے حس بے آہ و کراہ جھلنگ کھاٹ پہ خود کو ڈال دیتی۔ دیر بدیر' گور اندھیر رات کے کسی ناآسودہ حصے میں سُدھ بُدھ سونگھتی تو

کروٹ لے لیتی۔ پھر' پہتو' کھتّل کی کھتوٹ تو کھال کھلے والے کو پڑتی ہے۔ کھال خدا کھال پہ کھجلی کیا کرتی؟ معدہ بول اٹھتا تو پڑے پڑے چنگاڑا گھال کر دیتی۔ موت سے شلوار کا سوت بھیگا رہتا اور اِدھر اُدھر سے پالتو کبوترے' بلیاں' بندر رات بھر منہ مارا کرتے رہتے۔۔۔ اُجڑی رلت گئے شاہ جمال' لاہور ہوٹل' ٹبّی یا مُون لائٹ سے پرواز کرتا ہوا اس کا جہاز پُتّر' اللہ بچایا آ دھمکتا۔ باپ مستا اگر جاگ رہا ہوتا تو ہلکا پھلکا گالیوں کا تبادلہ ہوتا۔ تھوڑی سی چخ چخ کے بعد چرس کی پڑیا یا دس بیس روپوں سے معاملہ ٹھنڈا کر کے وہ بھی مائی رحمی کی کھٹیا کی بغل میں نیند کی پوٹ کھول دیتا۔ لالٹین کی ہلکی پیلی روشنی میں اپنی سوتیلی مائی رحمی اسے کوئی جہنم کی مخلوق دکھائی دیتی' اس کا بے دانت کھلا ہوا منہ دہانہ کسی نامراد کی کھلی ہوئی قبر کی مانند دکھائی دیتا۔ بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کی منہ ناک میں آزادانہ آمدورفت۔۔۔ وہ کراہت اور بے زاری سے منہ موڑ لیتا۔ اس کا منہ کڑواہٹ اور غلیظ تھوک سے بوجھل ہو جاتا۔ شدید بدبو کے بھبکے' پوپلے منہ پہ پڑے گڑھے' سیاہ باسی کلیجی جیسے لٹکے ہوئے ہونٹ' بانسے سے پھسکی ہوئی ناک' دھواں رنگ' مٹی سے اٹے ہوئے چھدرے بال' ویرانہ سالی' بدحالی کی خشک باؤلی میں کنکر آنکھیں' جھریوں کے تہہ در تہہ ریگ تھل' ببول کانٹے دار جھاڑیاں۔۔۔ منہ پھیرنے اور بند آنکھوں کے باوجود بھی وہ مائی رحمی کے بھوت سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔ کیا ہوا جو وہ اس کی سوتیلی ماں تھی' ماں تو پھر ماں ہوتی ہے مگر اس خیال اور لاکھ کوشش کے باوجود وہ اس کے لئے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ تلاش نہ کر سکا تھا۔ پھر بُرا ہو نشہ کا' اس حالت میں تو اس کے اندر نفرت کی آندھیاں چلنا شروع ہو جاتی تھیں۔ گھبرا کر وہ آنکھیں کھول دیتا۔ سامنے کاٹھ کباڑ کے پاس اس کی مستانی بیوی پھولاں' پھول سے گال کو ہتھیلی کے پیالے میں دھرے کوئی حسین سا خواب دیکھ رہی ہوتی۔ اس حالت میں پھولاں کے ملیح چہرے پہ کئی رنگ ابھرتے ڈوبتے' مختلف تاثرات کے تماشے ہوتے رہتے' فلم بنانے والوں کے ہاں جو کام کرتی تھی۔ اسی لئے وہ جاگتے سوتے فلمی دنیا کے رنگ ڈھنگ میں ہی رہتی۔۔۔ اللہ بچایا کی نظریں اس کے سراپے سے پھسلتی ہوئی پاؤں کی جانب اپنی نوعمر کاکیوں بھیرو اور ٹیچرو پہ رُک جاتیں جو ایک دوجے میں گتھم گتھا بے خبری کی نیند سوئی ہوتیں۔ انھیں دیکھ کر اس کی طبیعت میں اک عجیب سا ہیجان پیدا ہو جاتا' شدت سے چرس کے سگریٹ کی ضرورت محسوس ہوتی اور

تڑا مڑا سگریٹ سلگاتے ہی اس کے چودہ طبق روشن ہو جاتے۔ زرد ملگجی روشنی، چرس کی دھوئیں کے نیلگوں مرغولے، گول گول تیرتے لہراتے دائرے، دو چار بھرپور کشوں سے جھونپڑے کی قبر نما فضا میں دھوئیں کی گھنگھور گھٹائیں اُمڈ آتیں اور ماحول میں ناگوار سی تلخی اور گھٹن گھل جاتی۔ بھیرو اور خیرو، ننگی پنڈلیاں اور بازو کھجلاتی ہوئی کروٹیں بدلنا شروع ہو جاتیں، ان کا تنفس دھونکنی کی مانند چلنا شروع ہو جاتا۔ ننھنے بے جل، جل پریوں کے سنہری گلیمرڑوں کی طرح کانپنے لگتے۔ چرسیلے دھوئیں کی سُرمہ سلائی سے نیم وا نین کٹوروں میں مدھ کی مُدھرتا جھلکنے لگتی زُلفوں کے آوارہ سنپولئے بے بین لہرانے لگتے۔ دن بھر کی کڑی مشقت ٹوٹے ہوئے الہڑ جسم، نوعمری، نوخیزی، نوچندری چاندنی میں چم چماتا ہوا چندن جام، ہونٹوں پہ پکی ہوئی بیر بہوٹیاں۔۔۔ نشہ بھی انسان کو کیسا بے غیرت اور بے حس بنا دیتا ہے۔ کش پہ کش، چھلیتی سکڑتی آنکھیں، جوش نظارگی۔ وہ بھول جاتا کہ یہ تو اس کی اپنی کالیاں ہیں۔۔۔ نیند کی غنودگی اور نشہ کی ترنگ۔ کہیں دور جل ترنگ سے بجنے لگتے۔ اُودھے، پیلے، بنفشی، کاسنی رنگوں کی لہروں پہ لہراتا ہوا وہ نیند کی گود میں سر رکھ دیتا۔

آج بھی وہ آدھی رات بیتے واپس پلٹا تھا، ریڑھا ریس میں اکٹھے ڈیڑھ سو ہارنے پہ اس کا موڈ بڑا خراب تھا۔ سردی سے دانت کنکنا رہا تھا، سر میں شدید درد تھا۔ داخل ہوتے ہی آواز دی۔

"اے پھولاں! اُٹھ، ایک پیالہ چائے بنا دے۔ سر بڑا دُکھے ہے، ری۔۔۔!"

پھولاں تو خواب میں وحید مراد کے ساتھ گانا پکچرائز کروا رہی تھی۔ اس بھبھوتڑے کی آواز کیا سنتی؟۔۔۔ کپڑے بدلتے ہوئے اس نے ایک آدھا بار پھر چائے کے لئے کہا اور جواب نہ پا کر پھر اس نے ایک لات دھر دی۔ درد کی شدت سے ہڑبڑا کر پھولاں چیختی ہوئی اُٹھی اور پھر جو مغلظات کا طوفان اٹھا تو ساری جھونپڑ بستی اُٹھ بیٹھی۔ یہ تماشہ تو اِدھر روز ہی ہوتا تھا۔ آج یہاں تو کل کسی دوسرے جھونپڑے میں، کسی کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ آنکھیں ملتے جھپکتے لوگ، دو چار سُن سنا کر پھر نیند ٹیکی لے گئے۔ کاکیوں بھیرو، خیرو نے پل کی پل، آنکھیں کھولیں اور کروٹ بدل کر پھر سو گئیں۔ البتہ مائی رحمی سر کھجلاتی ہوئی باقاعدہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔۔۔ بچ بچ ساری چائے سے شروع ہوئی تھی۔ پھولوں کسی زخمی سپنی کی طرح پھنکار رہی تھی۔

"بے غیرتا! میں سارا دن محنت مشقت کروں اور تو ہڈ حرام، ریس جُوا تماشے کرے۔ رات بھی مجھے دو گھڑی آرام نہ کرنے دے۔۔۔ جا، اپنی میا سے چائے بنوا جس کا تو حرامی پلا ہے۔۔۔"

اس سے پیشتر کہ اللہ بچلیا اسے ایک اور دھرتا، مائی رحمی درمیان میں سرک آئی۔

"بس بس، زیادہ نہ بول پھولاں!۔۔۔ جا، تو سو جا۔۔۔" وہ پوپلے منہ سے اسے پچکارتے ہوئے بولی۔ "میں تم دونوں کے لئے چائے بناتی ہوں۔"

معاملہ رفع دفع ہو گیا اور اچھا ہوا کہ بابا مستا، لمبی لگا کر سویا ہوا تھا ورنہ صبح یہیں ہو جاتی۔۔۔ مائی رحمی، المونیم کی دیگچی میں پانی بھر کر جھونپڑے سے باہر آ گئی ور رات کے کسی پہر بجھے ہوئے الاؤ کو چھڑی سے چھیڑنے لگی۔ شاید کسی چنگاری کو تلاش کر رہی تھی۔ بوڑھوں اور سٹھیائے ہوؤں میں یہ علت ہوتی ہے کہ چیز پاس بھی پڑی ہو مگر وہ جان بوجھ کر اسے تلاش کرتے ہیں۔ سردیوں کی یہ ٹھٹھرتی ہوئی نیم شب، شعلوں کو بھی بھڑکنے سے شرم آئے تو تبھوں دبی کسی نحیف خفیف سی چنگاری کی کیا بساط، کیا تلاش؟۔۔۔ وہ دیر تک بھوبھل اُڑاتی رہی۔ آخر اللہ بچلیا نے اندر ہی سے ماچس اچھالی اور وہیں سے بولا۔

"مائی، سردی سے جُثّے میں خون جم رہا ہے اور تو ٹھنڈی راکھ میں کوئی گرم چنگاری ڈھونڈ رہی ہے۔۔۔"

مائی کی سردی اور بے بسی نے مت مار دی ہوئی تھی لیکن اس کے اندر کسی نے جواب دیا۔۔۔ "ہاں، اب میرے پاس راکھ کریدنے کے علاوہ اور رہ بھی کیا گیا ہے، ناآسودہ بوڑھوں کے ہاں یہی تو ایک مشغلہ باقی بچتا ہے۔ وہ ماضی کے ٹھنڈے بجھے الاؤ میں خوشگوار موسموں اور اچھے دنوں کی کوئی چنگاری تلاش کرتے رہتے ہیں۔۔۔" گھاس پھوس ڈال کر اس نے آگ دہکائی۔ دیگچی ٹکا کر دودھ لینے اندر آئی، جھلنگے سے دودھ اٹھایا۔ نیچے پھونس کے بستر پہ پھولاں، پسلی پہ ہاتھ جمائے سسک رہی تھی۔ مائی وہیں بیٹھ گئی اور بے جان ہاتھوں سے سہلانے لگی۔

"چُپ کر، مت رو۔ ابھی تیرے لئے گرم گرم چائے لاتی ہوں۔ صبر کر۔۔۔"

وہ دودھ لے کر باہر آ گئی۔۔۔ عورت، عورت کو نہ سمجھے گی تو اور کون سمجھے گا؟ پھولاں، بہو کے علاوہ ایک عورت بھی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اللہ بچلیا اس سانڈل

گائے کے سامنے ابھی ایک بچھڑا ہے۔ یہ بھرپور عورت اور وہ بچہ' کاٹھ کا ضرور مرد تھا مگر اوقات کا ابھی کچا تھا' پکی گندل اور یہ کچا گوگل--- وہ بھی تو کچھ ایسی ہی صورت سے گزری تھی' وہ بچی تھی اور بھگو ایک بھرپور مَرد!

☆☆☆

اپنے گاؤں کا نام اسے یاد تھا۔ منڈل تھر' تھرپارکر کا ایک دُور افتادہ چھوٹا سا گاؤں۔ بے وسائل' بے آب و گیاہ' بے کراں اور بے رحم۔ خشک جھاڑ جھنکاڑ' بدمزاج جگہ بدلتے ہوئے ٹیلے' جھکڑ اٹھاتے ہوئے موٹی گرم ریت کے آتشیں بھگولے' شوریدہ موسموں کی چیرہ دستیاں--- اس کا بوڑھا بیمار باپو دولتا گھاس پھوس' کپڑے کاغذ کے کھلونے اور سرُکیوں' سَرکنڈوں سے چھاج بناتا تھا۔ پھٹا پرانا گھاگرا' شیشوں والی چولی کہنیوں تک دونوں بازوؤں میں کچے کانچ کا بھٹل چُوڑا' ناک میں چاندی کا بُلاق' ہونٹ گردن پہ نیلو سرُمے سے کھدے ہوئے ٹلرُٹے' جوُٹ بان سی کسی بندھی مینڈھیاں--- وہ سارا دن ننھے ننھے ہاتھوں سے ہاتھی گھوڑوں کے کھلونوں میں بھُس بھرا کرتی تھی۔ کچے نیلے' پیلے' ہرے رنگوں سے نقش و نگار بنا کر اپنی بن بیٹے کے باپ کی مدد کیا کرتی تھی۔ اس کے دونوں کانوں میں بہت سے سوراخ تھے جو لونگوں کے پھولوں سے بندھے رہتے تھے۔ مسلسل کیچ بھری آنکھوں میں کچے تیل والا کاجل بھرا رہتا۔ ناک کی سیدھ اُوپر' مانگ کی لکیریاں چُن کر کشادہ کی ہوئی تھی۔ میّا روز صبح سویرے اس میں تلسی کے بُنٹھل پہ پسی ہلدی کا ٹیکہ لگایا کرتی تھی۔ ایک دن ہلدی کی جگہ سیندور بھینچا گیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا بیاہ ہو رہا ہے۔ بوڑھے معذور اور مجبور باپو نے مہاجن کے قرضے اور اپنی تنگدستی کا اُپائے کر لیا تھا۔ اس کا مردِ بھگو لگ بھگ بیس برس بڑا تھا۔ وہ بازی گر نَٹ تھا۔ گز بھر کی چھٹانکی سی چھوکری' پیلی گوٹ لگی چُنریا کا گھونگٹ کاڑھے' انگلی پکڑ اس کے سنگ ہولی۔ بے شعور بچی شادی بیاہ کا مطلب بھی نہیں سمجھتی تھی۔ بڑی خوش تھی' اپنی سکھیوں سہیلیوں کو اپنا چولی لہنگا دِکھا دِکھا کر خوش ہو رہی تھی۔ اس ناداں نے جاتے سمے پلٹ کر اپنی میّا اور باپو کی جانب دیکھنا بھی گوارہ نہ کیا جن کی آنکھوں میں یہاں کے صحرا کی طرح پانی یا آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ تھا--- قطرے پہ گوہر ہونے تک کیا گزرتی ہے' اس کا اندازہ ساحل پہ مست خرام کوئی تماشائی نہیں کر سکتا۔ بھگو بازی گر نے اسے اپنی ضرورت اور خاص مقصد کے تحت خریدا

تھا۔ بیاہ تو ایک بہانہ تھا جو اس کو مستقل باندھنے کے لئے تھا۔ دو چار مریل سے اونٹوں کا کارواں تھا۔ قریہ قریہ' گاؤں گاؤں پڑاؤ پڑتا۔ دو چار دن تماشا ہوتا پھر تام جھام لادا تو اگلے گاؤں--- مٹھی' مُٹھی بھر اُبلا ہوا باجرا کھائی لوٹ' بھگو کے ساتھ اس کی چھولداری میں پڑ جاتی۔ بچی تھی' اس لئے ابھی تک بچی ہوئی تھی۔ بھگو بھی اس کا خاص خیال رکھتا تھا۔ بازی گری کا فن اور کھیل بڑی مہارت اور ریاضت کا متقاضی ہوتا ہے' اس کام کے لئے بازی گر کی کچی عمر سے ہی تربیت شروع کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ کچی ہڈیاں لچک قبول کر لیتی ہیں۔ مخصوص خوراک' انتھک محنت' لگاتار مشق اور استاد کی کڑی نگہداشت کے بعد ہی کہیں جا کر کوئی کام کا بازی گر بنتا ہے۔ بھگو' آہستہ آہستہ اسے اپنے ڈھب پہ لا رہا تھا۔ دن رات سفر' نئی نئی جگہیں' بھانت بھانت کے لوگ' بولیاں ٹھولیاں' بھانڈ مسخرے' بھالو' بندر' کتے' کبوتر' سانپ' سانڈے' ان دلچسپیوں میں مٹھی کی بہت مزے سے گزر رہی تھی۔ وہ بہت جلد باپو میّا' اپنا گاؤں' سہیلیاں اور بھوک بھی بھول گئی۔ تنی تار پہ ایک پہیئے کی سائیکل چلاتے ہوئے وہ یکدم رُکتی اور پھر ممبھیری کی لوُٹ لگا کر گھومتی تو بچوں بوڑھوں عورتوں کی آنکھیں تارا بن جاتیں۔ لچکیلے بیس ہاتھ' بانس کی پھُنک پہ ڈوری میں پاؤں پھنسا کر الُٹ بازی لگاتی تو دیکھنے والوں کی سانسیں بھی جیسے الُٹ جاتیں۔ ریچھ سے لڑائی' کتوں' کبوتروں کے کرتب' ایک سے چار تک جلتی ہوئی مشعلوں کو اچھالنا--- بھگو' اب اسے ایک نئے خطرناک کھیل کے لئے تیار کر رہا تھا۔ اس نے یہ دلچسپ اور پُراسرار کھیل بہت عرصہ پہلے ایک راجستھانی بوڑھے سپیرے سے سیکھا تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق ایک ایسی نڈر بالک بچی کی ضرورت تھی جو چترنی چتوّن ہو۔ سَرپ' ماتھے' کہیں پہ بھی چندر گہن کا بندھ ہو۔ بھویں جڑی' نین کونے چڑے' رنگت مُشکی' بال کُنڈلے۔ بڑی کھوج کھجل کے بعد مٹھی ملی تھی۔ جس میں یہ ساری دُر گھٹنائیں موجود تھیں۔ اس کا مخصوص لباس' بستر جوتے' موزے' ان سب کا خفیہ بندوبست اس نے بہت پہلے سے ہی کر لیا ہوا تھا۔ سیاہ کڑونڈیئے کا بھسم اس کے پاس موجود تھا جس کی ایک مخصوص قلیل مقدار' خاص طریقے سے اس کے استعمال کی اشیاء پہ چھڑکی جاتی۔ گڑگڑُی کے پانی میں اُبلے ہوئے لوبیے اور پینے نہانے کی پانی میں ملائی جاتی۔ مخصوص مدت کے بعد' اس نے اسے ایک کم زہریلے سانپ سے ڈسوایا' ڈستے ہی وہ خود لوٹ پوٹ ہو کر مر گیا۔ وہ خود کو بھی سانپ ڈسواتا تھا'

گاجر مولی کی مانند کچ کچ چبا جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے مٹھی بھی اس قابل ہو گئی کہ زہریلے سے زہریلا سانپ اس کی باس سونگھتے ہی راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتا۔ اب وہ مکمل طور پر ایک بس کنیا کا روپ اختیار کر چکی تھی۔ جس کا اسے خود بھی اِدراک نہیں تھا' وہ تو اسے محض کھیل کرتب سمجھے ہوئے تھے۔ اس کھیل تماشے کی خوب کھلی مچی' ایک نوعمر سانولی سی لڑکی بیسیوں زہریلے خطرناک سانپ جسم گردن بازوؤں پہ لپیٹے جب پنڈال میں آتی تو تماشائی دَم سادھ لیتے۔ زبان پہ ڈسوانا' دانتوں سے کاٹ کر گردن پرے پھینک دینا' انہیں طیش دلا کر تھپڑ مارنا اور بھی کئی کھیل جو وہ دکھا کر' دیکھنے والوں ششدر کر دیا کرتی تھی--- زہر کا اثر' کوئی اور وجہ یا پھر ریگستانی آب وہوا کی تاثیر تھی۔ اس نے ایسی اُٹھان لی' ایسی چھب نکالی کہ دیکھنے والی نگاہ الٹ کر رہ جائے۔ سانولی سلونی رنگت میں جادوئی سی ملاحت اور جاذبیت تھی۔ اسے حسین' خوبصورت یا دلکش سر سراپے کی مالک تو نہیں کہا جا سکتا تھا جبکہ وہ کوتاہ قامت بھی تھی لیکن اس کے باوجود' اس کی شخصیت و شبیہہ میں کوئی ایسی مقناطیسی قوت یا کوئی پُراسرار اثر ضرور موجود تھا جو چشم زدن میں چشم تماشائی کو اپنے سحر میں جکڑ لیا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کشش تھی اور ننھے ننھے ابھرے ہوئے ہونٹوں پہ ہمہ وقت خفیف سے جنبش' تھرتھراہٹ رہتی جیسے اندر ہی اندر کوئی زہریلا لاوا کُلبلا رہا ہو۔ اس کے سراپے سے ایک عجیب سی غیرمانوس خوشبو پھوٹا کرتی جو مشام جاں کے لئے لطافت وکراہت کا مِلا جُلا احساس بیدار کرتی۔ اس کی سانسوں کے زیروبم میں چاندی کی پازیبوں کا مدہم سا آہنگ ہوتا جس کا نازک سا احساس صرف اسی سے ہوتا تھا جب وہ محوِاستراحت ہو۔ گھنٹیاں' پایُلیں' کانسی کے ننھے ننھے گھنگرو' سِسکیاں' شُشکاریاں' سرسراہٹیں سِیٹیاں۔ ان سب کا مِلا جُلا صوتی آہنگ--- ریگ زاروں' تھلوں اور صحراؤں کی صبحیں' شامیں اور موسم ہجراں کی مانند طویل کٹھن راتیں ویسے ہی پُراسرار اور پُرآزار ہوتی ہیں۔ اپنی چھولداری میں مٹھی کے سنگ ہونا اب بھگو کے لئے بڑا مشکل ہو رہا تھا' نگاہ پڑتی تھی تو سلگ اٹھتی تھی' ہاتھ انگ لگ جائے تو جلن شروع ہو جائے۔ پٹاریوں اور کلڑوں میں بند سینکڑوں سانپ سنپولیئے اندر پڑے رہتے۔ پھر بھی اسے شدت سے احساس ہوتا جیسے علاقے بھر کے سارے کیڑے چھولداری کے باہر گھیرا ڈالے پڑے ہیں۔ اس کے اپنے اندر کہیں گھنٹیاں بج رہی تھیں کہ کچھ ہونے والا ہے' کوئی تبدیلی ظہور پذیر ہونے

والی ہے۔ مٹھی اس کی بیوی تھی یعنی بیاہ کی آڑ میں اسے خریدا تھا۔ وہ شاگرد تھی اور روزی کا وسیلہ بھی--- نٹوں' بازیگروں میں کام کرنے والی لڑکیوں عورتوں کا پیر بھاری نہیں ہونے دیا جاتا' حتی الامکان انہیں عیال داری اور دُنیاداری سے دُور رکھا جاتا ہے تاکہ ان کے لچکیلے انگ سے اندرونی بیرونی توڑ پھوڑ اور جذباتی مدوجزر سے محفوظ رہیں اور اک طویل عرصہ تک وہ لائق کار رہیں۔

وہ اِک طویل حبس اور ہیجان زدہ رات تھی' نیند کوسوں دور تھی اور مٹھی اِک ہاتھ کی مسافت پہ تھی۔ وہی کیفیت' ناگن کی مانند کنڈلی لپیٹے' لرزتے نم آلود ہونٹ' چہرے پہ جادو گری' حسنِ خوابیدہ' وہ نظر جمائے اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک کہیں کوئی صحرائی جانور چلانے لگا تو کروٹ لے کر مٹھی اس سے لپٹ گئی--- چند لمحوں بعد وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ میلہ سائیں سکندر سرکار کما کر سیدھا اپنے بھائی مَتا کے پاس بہاولپور جائے گا اور مٹھی کو باقاعدہ بیوی بنا کر گھرداری شروع کرے گا مگر یہ سُلگتی رات' مٹھی کے پُرسوز شباب کے کالے گلاب کا کالا جادو' غیرارادی طور پر سر پہ چڑھ کر بول گیا۔

بہاولپور کے نواح میں مَلونی ملوکھا' چند کچے گھروں اور کھپریل سرکنڈوں کے جھونپڑوں پہ مشتمل ایک مزدور بستی تھی۔ مرد وزن' بچے بالے' بوڑھے بوڑھیاں' سب ہی گاڑے مٹی' اینٹ بھٹے کا کام کرتے تھے' صدیوں سے ان کا یہی ذریعہ معاش تھا۔ افلاس' جہالت' مجبوریوں اور استحصال واستبداد کی نادیدہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے یہ بڑے مفلوک الحال لوگ تھے۔ متا بھی بھٹے پہ آگ آنچ دکھانے والا مستری تھا۔ بارشوں کے دو چار مہینے وہ کراچی یا ملتان چلا جاتا۔ محنت مزدوری' سیر سپاٹے کے بعد بہت سے تحفوں سے لَدا پھَدا واپس آتا تو اس کی خونخواہ بدمزاج عورت بلاقی اسے آڑے ہاتھوں لیتی' اس پہ غلط سلط الزام دھرتی۔ بلاقی سے اس کا ایک سات سالہ بیٹا اللہ بچایا بھی تھا' اس شرارتی شُدنے کو صرف اللہ نے ہی بچایا ہوا تھا ورنہ اس کی خطرناک حرکتیں اور الٹے سیدھے کام ایسے تھے کہ کبھی کا برابر ہو چکا ہوتا۔ چوری چکاری' ہیرا پھیری' گالی گلوچ میں بڑے بڑوں کو کھلا دکھاتا جبکہ بدزبانی میں وہ بلاقی سے بھی دو چار جوتے آگے تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مَتا دو چار ماہ ان عذابوں سے وقتی طور پہ فرار حاصل کرنے کے لئے کھِسک لیتا۔

بھگو اور مٹھی مَلونی ملوکھا پہنچے۔ پہلی رات تھی اور دوسرا پہر۔ اچانک بھگو کی طبیعت

مالش کرنے لگی' ذرا سی دیر بعد منہ بھر کرتے ہوئی۔ ہاتھ پاؤں سُکڑ کر ٹیڑھے سے ہو گئے' ماتھے پہ تُرپلی کی تُریا چمکی تو جسم برف میں جم گیا۔ لوٹنیاں لیتے لیتے مُنہ سے جھاگ بتاشے جھڑنے لگے۔ واویلا ہوا' لوگ باگ اکٹھے ہوئے مگر مرض سمجھ میں آیا' نہ کوئی دوا دارو کا چارہ تھا' جتنے منہ اتنی باتیں۔ کوئی کیڑا کاٹا بتائے تو کوئی دل کا دَورہ۔ کوئی سر سہلائے' کوئی پیر پکڑے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کیا جائے--- رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی۔ لَو بڑھے ہوئے چراغوں کا تپا ہوا تیل بھی دُھواں چھوڑنے لگا تب یکبارگی اس کا اینٹھا ہوا جسم سکون پکڑ گیا۔ پاس کی بستی' سیانے کو لانے کے لئے آدمی دوڑا دیئے ہوئے تھے اور ایک بوڑھے نے کسی جڑی بوٹی کا جوشاندہ بھی پلا دیا تھا۔ ہلکی ہلکی صبح کی سپیدی پھیل چکی تھی' شب بھر جلنے والے دِیئے بھی دَم سادھ بیٹھے جب تیز گام اونٹنی پہ سے سیانا اُترا اور ادھر بھگو پابہ رکاب ہو لیا۔ اس کی لاش کچے نیل کی مانند نیلگوں ہو چکی تھی' جسم کے ہر سوراخ سے نیلو رِس رہا تھا۔ پاس سِسکتی' سِسکاریاں لیتی ہوئی مِٹھی بھی بے دَم سی بیٹھی بھگو کے تڑخے ہوئے جسم سے رِستا ہوا لہو دیکھ رہی تھی--- کاش! وہ اپنے ٹوٹ ہوئے جسم سے ابھی تک رِستا ہوا سرخ خون کسی کو دِکھا سکتی۔ جنگلی سانڈ اور صحرائی ہرنی!

بھگو کی دہشت ناک' بلکہ عبرت ناک مَوت کئی روز تک بستی والوں کے لئے سوہان روح بنی رہی۔ جس جگہ زمین بوس کیا' تیسرے روز وہاں گڑھا بن گیا۔ مٹی کا رنگ سیاہ پڑ گیا۔ پانی کا چھڑکاؤ بھی دُھواں دُھند بن کر اُڑ جاتا۔ لوگوں نے اِدھر جانا ہی چھوڑ دیا۔ خیال تھا کہ اس کے پالتو سانپوں میں کسی انتہائی زہریلے کیڑے نے اس کا کلیان کر دیا ہے--- مِٹھی بیوہ اور بیمار تھی' بھگو کے بعد اب بیکار تھی۔ نَٹ منڈلی کے دیگر لوگ بھی کِھسک لئے۔ مَنڈلی کا کاٹھ کباڑ بھی اَونے پَونے بیچ باچ کر مَستا مرنے والے بھائی کا چالیسواں کر کے فارغ ہو گیا--- مِٹھی نے صحت پکڑی تو مستا کی عورت بلاقی کی طبیعت بگڑ گئی۔ وہ ایک بھرپور عورت تھی بلکہ بَلا کی عورت تھی۔ ایسی عورت جن کا مَرد اگر مرغی کی طرف بھی رغبت سے دیکھے تو مرد کو ادھیڑ کر رکھ دیں اور آپ چاہے کھاٹ کھاٹ کھاتی پھریں۔ وہ شروع دن سے ہی اس کی آنکھ میں سُور کا بال دیکھ رہی تھی۔ چُپ سادھنے والی نہیں تھی لیکن چپ تھی کہ شاید مِٹھی کی دلجوئی کی خاطر لگاوٹ لگا رہا ہے مگر اب اس کا بھیتر بول رہا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے--- ایک دن اس نے مَستا کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"اس کلموہی کو کہیں دفع کر--- سارا دن کھٹیا اور نوالہ توڑتی رہتی ہے اور تو بھی اسے بٹر بٹر تاکے ہے۔ میرا صبر نہ آزما' ایسا نہ ہو کہ کسی دن تیرے دِیدے تیری ہتھیلی پہ اور اس کو خصم کی قبر میں گاڑ آؤں---"

وہ اپنی چوری پکڑے جانے پہ اندر سے کانپ سا گیا۔ بلاقی کی عادت فطرت سے خوب واقف تھا کہ ہٹیلی بے وقوف جو کہتی ہے' کر گزرتی ہے۔ وہ تو بچے' اللہ بچایا اور بلاقی کی زور آوری کی وجہ سے پھنسا ہوا تھا ورنہ کب کا پَلا پاک کر چکا ہوتا--- وہ بڑی رسائی سے کھکھیایا۔

"یہ اپنی عزت ہے' بلاقی! مرے بھائی کی بیوہ ہے۔ ہم آسرا سہارا نہ دیں تو اور کون پوچھے گا؟--- دن بیت لیں تو کہیں اس کا آسرا تلاش کریں گے۔ ذرا سوچ! ابھی بچی ہے' کام دھندے لگے گی تو ہمیں ہی فائدہ ہو گا---"

بلاقی تو بلا نظر تھی۔ اس کے دِیدے تاڑ رہی تھی' اس کی دلیلوں سے متاثر نہ ہوئی۔

"مجھے چکر نہ دے' مستے! میں تیری بدمعاشیاں خوب سمجھتی ہوں۔ یہ کیڑے چبا چبا کر خود بھی کیڑا بن گئی ہے' اس نے تیرے بھائی کو کاٹا ہے۔ ذرا اس کی آنکھیں غور سے دیکھ! یہ تجھے' مجھے اور میرے اللہ بچایا کو بھی کھا جائے گی--- میری سُن! اس کو کہیں دفع کر' ٹھکانے لگا دے۔ یہ یہاں نہیں رہے گی' یہ میرا آخری فیصلہ ہے---"

مستا بولا۔ "سانپ تو بھگو بھی کھاتا تھا۔ دُم سری کاٹو' باقی مچھلی--- وہم نہ کر' چند دنوں تک گزارہ کر۔ مَیں کوئی اسامی دیکھتا ہوں' موٹی رقم مل جائے گی تو کراچی' کوئٹہ کوئی کاروبار کر لیں گے---"

بلاقی کی فکر اور اس کے اندر اُبھرنے والے خدشات کچھ زیادہ غلط نہیں تھے' ایسا سوچنا اور اس کا اپائے کرنا اس کا بنیادی حق بھی تھا۔ لیکن مَستا بھی اپنی جگہ پہ صحیح تھا۔ یہ مُنہ زور سانڈل گائے اس کے پَلے پڑی ہوئی تھی۔ نہ ناک نہ نقشہ' نخرہ نہ عشوہ' مگر محنتی اور ہمت زور والی ضرور تھی۔ کئی برسوں میں اس کتیا نے ایک پِلاّ جنا مگر اب پٹھے پہ ہاتھ نہ دھرنے دے۔ لبھانا پرچانا ایک طرف کبھی لگاوٹ سے نظر ماری بھی نہ کرے--- کراچی' کوئٹہ' ملتان میں کیسی کیسی عورتیں دیکھی تھیں مگر مِٹھی دیکھی تو دیکھتا رہ گیا تھا۔ بھائی کی تھی تو کیا ہوا؟ طبیعت کہیں پہ بھی ٹھک جائے' دل کسی پہ بھی آ جائے' یہاں تو خود ہی رستہ

صاف ہو گیا تھا۔ مٹھی کے لئے تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا' بھائی سے بھی چھین لیتا۔ انسان جب کسی عورت کو چاہنے لگے یا حاصل کرنا چاہے تو رشتے ناتے' جائز ناجائز' اخلاق قانون' سب کچھ ٹھوکروں پہ رکھ لیتا ہے۔ شیطان اس کے دماغ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنا لیتا ہے' مقصد تک پہنچنے کے ایک سو ایک طریقے اور راستے سامنے آ جاتے ہیں۔ رشتوں کی پامالی' انسانی قدروں اور اخلاقی تقاضوں سے روگردانی معمولی چیزیں ہیں' قتل و غارت تک رَوا ہو جاتا ہے--- کئی روز غور فکر کرنے کے بعد صرف ایک ہی محفوظ اور آسان طریقہ اس کی سمجھ میں آیا۔ اس نے اپنے لوگوں میں بات پھیلا دی کہ اس سیزن کا آخری بھٹہ چڑھانے کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے کوئٹہ جا رہا ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ بھائی کی بے وقت المناک موت سے وہ ٹوٹ پھوٹ سا گیا ہے' اب اس جگہ وہ بالکل نہیں رہ سکتا۔ ادھر بلاقی کو بہت سے تحفے اور روپے دے کر تیار کیا کہ تو ایک آدھ دن اپنے ماں باپ کو مل ملا آ اور واپسی پہ اپنے بھائی کو ساتھ لے آنا۔ اگر اسے مٹھی پسند آئے تو شادی کر لے۔ پھوکٹ میں اسے عورت مل جائے گی۔ کم عمر ہے' خوب کمائے گی اور نہ پسند ہو تو ساتھ لے جائے' کہیں اور دے دے--- فائدے کی یہ باتِ اس احمق کو اچھی لگی۔ سیانا کوّا ہمیشہ گندگی پہ گرتا ہے' مکار نے مکار کو مکاری کے جال میں اتارا تھا۔ جس صبح اس کے جانے کی تیاری کی' اس سے پہلی رات' بھٹے کے آخری پُور کی آخری آگ تھی۔ آخری بار اس نے مشعل جلائی' آگ دکھائی' کون جانے کچی اینٹوں کے نیچے بوری میں بلاقی مری ہوئی پڑی ہے۔ اس کے ناک کا بھاری چاندی کا بلاق' اللہ بچلیا کے باپ کے شلوکے میں سلوک عشق کے سلسلے دراز کر رہا ہے۔

کوئٹہ کا بُنا کر' وہ جھنگ آ گیا تھا۔ مائی ہیر کے قبرستان کے قریب اینٹوں کے ایک پرانے بھٹے پہ اس کے چند واقف کار ٹھیکے دار تھے' یہیں ٹھیکے پہ ٹھپائی کروانے لگا۔ یہیں ایک روز' مائی ہیر کے مزار پہ بٹھا کر مٹھی کا ہاتھ تھاما اور بولا۔

"آج سے تو میری عورت' مَیں تیرا مرد---" اللہ بچلیا کو گھسیٹ کر اس کی گود میں ڈالا۔ "دیکھ! تیری خاطر مَیں نے بلاقی سے جان چھڑائی ہے۔ تیرا مرد' میرا بھائی مر گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ تو اس کی قاتل ہے مگر مَیں کہتا تھا کہ اس کی زندگی ہی اتنی تھی--- مَیں جانتا ہوں تو بے قصور ہے' مَیں یہ بھی جانتا ہوں کہ اسی نے تیرے ساتھ زیادتی کی تھی تو اس

وقت کچی تھی' اس نے تیرے سنگ ظلم کیا۔ تیری جان ماری' اس کی سزا اسے مل گئی۔ اب تو پچھلی زندگی بھول جا--- مَیں تیرا بہت خیال رکھوں گا تو اس بالک کا خیال رکھنا' اسے اپنا پیٹ جُنا جاننا--- اور ہاں' مَیں تجھے تیری مرضی کے بغیر ہاتھ نہیں لگاؤں گا---"

آنکھیں پھاڑے وہ اس کی باتیں سُن رہی تھی' ہونٹوں پہ وہی سدا کی لرزش تھی--- لرزتے ہاتھ سے مستا نے ایک بھاری سا بلاق اسے دیتے ہوئے کہا۔

"--- لے' یہ بلاق--- یہ بلاقی کا ہے۔ مَیں نے اس سے چھین لیا تھا' وہ اس کے قابل نہ تھی۔ پہلا اتار دے' اسے پہن لے تو اپنا بلاق اللہ بچلیا کی عورت کو پہنانا---"

مٹھی نے اپنا ہاتھ اللہ بچلیا کے سر پہ رکھ دیا۔

"دیکھ رے' اللہ بچلیا! یہ تری ماں ہے رے۔ بلاقی چاچی کو بھول جا' وہ بڑی ظالم تھی۔ تجھے پیٹ بھر کھانے کو نہیں دیتی تھی' مجھے گالیاں بکتی تھی' مارتی تھی اس لئے مَیں نے اسے بہت دُور بھیج دیا ہے--- یہ تیری ماں ہے' مٹھی۔ تجھے کبھی نہیں مارے گی اچھے اچھے کھانے' انگریزی بسکٹ کھلائے گی۔ نئے نئے کپڑے پہنائے گی تو بھی اس کا خیال رکھیو' بات مانیو---"

اللہ بچلیا کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کیسی قسمتِ لے کر آئی ہے؟--- پالنے میں پاؤں پسارنے کے دن تھے تو مشقت کی چکّی میں پسی۔ سکھیوں سنگ گڑیوں کے بیاہ کرنے کے دن تھے تو ایک کھَل نائیک سے بیاہ دی گئی۔ کچی زمین پہ ابھی چلنا نہ سیکھی تھی کہ تنی تار پہ چڑھا دی گئی' وہاں سے اُتری تو بھڑکتی آگ کے آوے پہ لادی گئی اور وہاں سے اتار کر مائی ہیر کے قبرستان میں بٹھا دی گئی۔ مُردوں کی گواہی ڈال کر پھر بیاہی گئی۔ سہاگ منڈل نہ ملن ملاپ' مَتلانہ اُبکا' پیڑا نہ پیٹ مگر ایک جیتے جاگتے کان کانٹے بچے کی ماں بھی بن گئی۔ اب دیکھیے آگے کیا ہوئے؟--- وہ ہلکے سے مسکرا دی۔

قبروں' مُردوں کے درمیان سرکتے سرکتے وقت بھی جیسے مُردہ ہو کر رہ گیا تھا۔ صبح و شام' ماہ و سال گزرنے کا احساس ہی ختم ہو گیا۔ زندگی میں اگر کوئی امنگ نہ ہو تو وہ قبرستان ہی بن جاتی ہے۔ جہاں حسرتوں اور ناآسودہ خواہشوں کے لاوارث مُردے دفن ہوتے رہتے ہیں--- قبرستانوں میں تین طرح کے لوگ رہ سکتے ہیں۔ وہ جو مر گیا ہو یا وہ جو کسی کے مرنے کا منتظر ہو یا پھر جس نے اپنے اندر کو ختم کر دیا ہو۔ ان تینوں میں کسی نہ کسی طور

پہ یہ تینوں چیزیں موجود تھیں--- کہتے ہیں کہ وقت کسی بھی نقش کو قائم و دائم نہیں رکھتا' وقت کا رَگڑا ہر چیز کو رَگڑ کر رکھ دیتا ہے۔ صُورتیں' سیرتیں بدل جاتی ہیں۔ رشتے ناتے تبدیل ہو جاتے ہیں۔ جذبے' جلوے' وفائیں' احترام' قدریں' روائتیں' معیار' اُصول اُسلوب' سب کچھ وقت کے ہاتھوں ریخت ہوتا رہتا ہے۔ وقت اگر کسی کو برقرار رکھتا یا بڑھاتا بھی ہے تو یک جنبش ختم کرنے کے لئے جیسے بُجھتے دیئے کی بھڑکتی ہوئی تیز لَو یا دَمِ آخر' توانائی سے بھرپور جھٹکا--- کسی نے کہا ہے کہ مَرد اور عورت محض دو متضاد مگر ہم سواد جنسیں ہیں۔ ان کے مابین سارے تعلق رشتے صرف مصلحتیں' وقت کے تقاضے' مجبوریاں اور منافقتیں ہیں' اُصول شرافت کی مشقیں' علم الاخلاق کی تاویلیں' سماجی حدود بندیاں' صرف معاشرتی توازن برقرار رکھنے کے لئے ہیں۔ مرد صرف مَرد اور عورت صرف عورت ہے--- یہاں قبرستان میں بھی صرف ایک مَرد اور ایک عورت تھی۔ مرد بچہ' اللہ بچایا ابھی ان بکھیڑوں سے بچا ہوا تھا۔ زہر ہو یا تریاق' وقت ان کے اثرات پہ بھی اثر انداز ہوتا ہے' مُٹھی بھی سَم سے قند بن گئی تھی لیکن کلی سے پھول بنتے ہی اسے کیڑا لگ گیا۔ پہلے میٹھے میٹھے ہی پیٹ میں تھوہر سا پھرنے لگا' کلیجے کو جیسے جونکیں چاٹ رہی ہوں۔ ہَول اُٹھنے لگے' کھایا پیا اُلٹنے لگا' دوسرے مہینے چام چِنا بن گئی۔ اُدھر مستا بھی لُڑھکا پڑا تھا۔ ہاتھ پاؤں' پنڈلیوں پہ برص جیسے چٹے چھوڑے پڑ گئے۔ کھاج کھاج کھال اُدھیڑ دی۔ کسی کل چین نہیں پڑتا تھا۔ گرمیاں اور حبس کے دن۔ مکھیاں' مچھر' گندگی۔ پیپ پڑی اور جدھر لگی نیا زخم دے گئی۔ کہیں زہر باد پھوٹا تو کہیں خناق ابھرا۔ دونوں بیمار' اِک دوجے سے بیزار۔ مرہم پٹیاں' پیپ لہو' بدبو سڑاند--- آدھی رات پیچھے آدھی آگے' پیٹ میں زلزلہ سا لہرایا' اِک دَم مروڑ سا اٹھا۔ وہ اُٹھی تو ایک دھنسی ہوئی قبر کے دہانے پہ پڑ گئی اور دن چڑھے تک بے سکت وہیں پڑی رہی ۔ اللہ بچایا' کہیں ادھر آ نکلا تو نیم جاں مٹھی کو گھسیٹ کر کُٹیا میں لایا۔ مستا اپنی بستا میں پڑا' کراہ رہا تھا' زیرِلب کچھ بڑبڑا کرتا وہ زخم کو کھجلانے لگا--- غریبوں' ناداروں اور خاص کر ان خانہ بدوشوں کا تو اللہ ہی ڈاکٹر ہوتا ہے۔ جڑی بوٹیاں' مٹی پتے' الم غلم' پوٹ پاٹ کھا' پی' لوٹ پوٹ خود ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ مٹھی بھی مٹھی بھر جان کے باوجود جانبر ہو گئی تھی۔ مستا کے زخم کوڑھ کی بھیانک شکل اختیار کر چکے تھے۔ تہبند چپک کر مُردار چمڑے کی صورت بن جاتا' اتارنے پہ تازہ کھرنڈ بھی اتر

آتے۔ پھر پیپ اور گندلا خون--- وہ چڑچڑا تو وہ ہو ہی گیا۔ چہرے پہ بھی نحوست' بدمزگی اور وحشت کی سیاہی پت آئی تھی۔ بات بات پہ بدکلامی اور چیخ دھاڑ اس کا معمول بن چکی تھی۔ دن جیسے تیسے گھسٹتے جا رہے تھے۔ جیسے انہیں بھی کوڑھ ہو گیا ہو۔ بھٹے اینٹوں کا کام چھوٹ چکا تھا' ہاتھ پاؤں کسی قابل ہی نہیں رہے تھے۔ دیا جیسے بھی جلے' جلنے کے لئے تیل مانگتا ہے۔ پیڑ پودے' پرندے اور پیٹ بھی کھانا پینا مانگتے ہیں۔ جیسے تیسے وہ اس غلاظت کی پوٹ کو گھسیٹ گھسیٹ کر قبرستان اور عیدگاہ کے راستے پہ لے آئی اور پیڑ تلے گدڑی پہ اوندھے سوندھے ڈال کر خود بھی پیٹ پاپ کی ٹکی نکالے پاس بیٹھ گئی۔ آتے جاتے گور مرگ فاتحہ والے خیر خیرات ڈال جاتے۔

وقت گزرتا گیا۔ ناسور سڑتے رہے' بڑھتے رہے۔ روزی حیلہ' بہانے موت--- مرہم پٹی' دوا دارو چھوڑ دیا تھا۔ رِستے بہتے' کریہہ صورت' کلبُل کلبُل چٹ مُنے کیڑے اب روزی کا وسیلہ تھے۔ چھوٹا بچہ اللہ بچایا کئی روز سے غائب تھا۔ اسے کون ڈھونڈے اور کہاں تلاش کرے' شاید وہ ان کی بیماری داری' باپ کی سڑی طبیعت سے بیزار ہو کر کہیں راستہ کر گیا ہو۔ انہوں نے بھی یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ شاید کسی روز واپس پلٹ آئے۔

ایک دن صبح صبح قبرستان کا پرانا گورکن بوڑھا جو موروثی کام کو اپنے بیٹوں کے حوالے کرنے بعد زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ ان کے پاس آ بیٹھا اور دونوں کو گہری نظروں سے گھورتے ہوئے مٹھی سے پوچھنے لگا۔

"یہ تیرا کیا لگے ہے' پتری؟"

"میرا مرد ہے---"

بوڑھا جواب سن کر چونک سا پڑا--- "اوہو--- میں سمجھا تھا' تیرا باپ یا بڑا بھائی ہے--- خیر' کوئی بات نہیں---" اب وہ بوڑھا مستا کو گہری نظروں سے گھورتے ہوئے کہنے لگا۔ "اسے کسی دشمن نے مُہرا چنا دیا ہے یا کسی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا ہے' اس کی صورت اور زخموں کی حالت یہی بتاوے ہے---"

"کیا' کہیں' بابا! ہماری سمجھ میں تو کچھ نہ آوے ہے۔ پہلے دَدر نکلی تھی' پھر چنبل آ پڑی۔ ڈھنگ سے دوا دارو نہ ملا تو یہی حالت ہو گئی---"

"تو بھی مجھے بہت بیمار لگے ہے' تیری حالت بھی بڑی خراب ہے---"

"غریب لوگ ہیں، بابا! اپنے بیگانے سب منہ موڑ گئے ہیں، بُرے وقت کون کسی کا ساتھ دیوے ہے۔۔۔"

وہ کمر پکڑے ہوئے اُٹھتے ہوئے بولا۔ "سچ کہت ہو، پُترا۔۔۔ مَیں شام سے آؤں گا، میرا انتجار کرنا۔۔۔"

شام تک وہ آ پہنچا۔

"لے، بیٹا! رُوکھی سُوکھی جو مِلی، لے آیا ہوں۔ خود بھی کھا، اسے بھی کھلا۔۔۔ اور ہاں، یہ جڑی بوٹیوں کا جوشاندہ ہے۔ گھونٹ گھونٹ تین وقت اسے پلاتی رہیو اور ہر روج کی حالت نظر میں رکھیو۔۔۔ تین روز بعد پھر آؤں گا۔" قریب ایک پودے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سمجھانے لگا۔ "یہ دوا پینے کے بعد اسے اُلٹیاں آویں گی، یہ اُلٹیاں اس پودے کی جڑ میں ڈالتی جانا۔۔۔"

تین روز بعد وہ بوڑھا حسب وعدہ آ پہنچا اور سیدھا پودے کے پاس چلا گیا، جھک کر پودے کی جڑ کو دیکھنے لگا۔ پودا یوں جھلسا ہوا تھا جیسے کسی نے اسے آگ لگا دی ہو۔ پودے کی جڑ میں جیسے جلی ہوئی کلیجی کی بوٹیاں سڑ رہی تھیں۔۔۔ وہ بڑا سنجیدہ سا چہرہ لے کر مَستا کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور چند لمحے اسے گھُورنے کے بعد اس کی آنکھ کی پتلیاں غور سے دیکھنے لگا، ناخنوں کی جڑیں دیکھیں۔ پھر وہ پاس بیٹھی مِٹھی سے مخاطب ہوا۔

"مَیں پھر کہتا ہوں کہ اسے کسی زہریلے کیڑے نے کاٹا ہے یا پھر۔۔۔" بات ادھوری چھوڑ کر وہ مٹھی کی آنکھیں دیکھنے لگا، ناخنوں کی جڑیں دیکھیں۔ "پُترا! سچ بتاؤ، تمہیں کبھی کسی کیڑے نے کاٹا؟"

"نہیں، بابا! مجھے کبھی کسی کیڑے نے نہیں کاٹا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مَیں نے سینکڑوں سانپوں کو خود کاٹا ہے۔۔۔"

بابا یہ سُن کر یوں پیچھے کی جانب کھِسکا جیسے اس کے سامنے کوئی زہریلی ناگن اچانک نکل آئی ہو۔۔۔ وہ بولی۔

"باباجی! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ ہم بازی گر لوگ ہیں۔ مَیں سانپوں کے کرتب دکھایا کرتی تھی۔ تماشے میں سانپوں کی مُنڈیاں، دانتوں سے کاٹ کر علیحدہ کیا کرتی تھی۔ بچپن سے ہی مجھے سانپوں سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ مَیں ان سے کھلونوں کی طرح

کھیلتی رہتی تھی، جاگتے سوتے دو چار تو میرے ساتھ ہی لپٹے رہتے تھے۔۔۔"

بابا آنکھیں پھاڑ پھاڑ اسے دیکھ رہا تھا، کہنے لگا۔

"میرا تجربہ غلط نہیں ہو سکتا، مجھے پہلے ہی پکا شک تھا۔۔۔ ایک بات اور بتا، ایسی بیماری پہلے بھی تیرے ہاں کسی کو لگی۔۔۔؟"

اب مَستا کراہتے ہوئے بتانے لگا۔ "بابا! مَیں بتاتا ہوں۔۔۔ میرا بھائی، اس کا پہلا مَرد بھی اسی بیماری سے یک دم مر گیا تھا۔" تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ پھر بولا۔ "مِٹھی کا اس میں کوئی قصور نہیں، قصور تو ہم دونوں بھائیوں کا ہے جنہوں نے اس زہریلی عورت کو اپنی عورت بنایا۔۔۔" وہ بچوں کی مانند دھاڑیں مارنے لگا۔ "بابا! مجھ سے غلطی ہو گئی، مَیں بڑا ظالم ہوں۔ مَیں نے بلاتی کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے، وہ چڑیل مرنے کے بعد بھی مجھے جلا رہی ہے۔ مجھے یوں لگے ہے جیسے پورا جلتا ہوا بھَٹہ میرے اُوپر جل رہا ہے۔ اس حرامزادی نے مجھے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لیا ہے۔۔۔"

"زیادہ نہ بول، مَستے۔۔۔!" مِٹھی اسے ڈھارس دیتے ہوئے پچکارنے لگی۔ "جو بخت میں لکھا ہوتا ہے، وہ بھگتنا پڑتا ہے۔ کاہے تو فکر کرے ہے، مَیں جو ہوں تیرے سنگ۔۔۔"

بوڑھا گورکن بہت دیر تک ان دونوں کی رام کتھا سنتا رہا۔

٭٭٭

مِٹھی نے مُردہ بچہ جنا تھا۔ بچہ بھی کیا۔۔۔ دونوں کان ندارد، مَلی مچھلی کی مانند انتہائی چکنا ملائم، منہ میں سامنے اوپر دو دانت۔۔۔ مستے نے خاموشی سے اسے رات کی تاریکی میں ایک پرانی قبر میں دبا دیا۔ بچی ہوتی تو شاید مستا کو افسوس ہوتا۔ یہ تو لڑکا تھا، اچھا ہوا کہ مر گیا۔ طوائفوں، خانہ بدوشوں، چنگڑوں، پکھی واس، تیزواس گگڑے، سانسی، سنڈیلے اور بازی گروں میں لڑکیوں کی پیدائش ہی مبارک سمجھی جاتی ہے۔ پھر لطف یہ کہ ان لوگوں میں لڑکیاں ہی زیادہ پیدا ہوتی ہیں، شاید ہی کہیں کوئی اکا بگا لڑکا غلطی سے پیدا ہونے کا جرم کر بیٹھتا ہو۔ ان کا کاروبارِ حیات ہی لڑکیوں، عورتوں سے چلتا ہے۔ یہی ان کی کمائی آشنائی کا ذریعہ وسیلہ ہوتی ہیں۔ ان کے اکثر مَردوں کا کام ہی ڈیروں پہ بیٹھنا، پہرہ دینا، نشہ پانی، جوا شطرنج، تاش گنجفہ یا پھر گھوڑیاں بیچ کر سونا ہوتا ہے۔ یہ لوگ چھوٹے موٹے جرائم بھی

کمرتے ہیں۔ بَردہ فروشی، جسم فروشی، رَسہ گیری، جیب تراشی بھی چلتی ہے۔ بچوں کے اغوا کے کیس بھی کر لیتے ہیں۔ یہ مرد کھانے کھابے اور نشہ پانی کے بڑے شوقین ہوتے ہیں، منشیات فروش بھی ہوتے ہیں۔ منہ پہ مُونچھیں، لمبے سنورے ہوئے بال، سُرمیلی بے حیا آنکھیں، گلے میں تعویذ، قیمتی کپڑے، مُنہ میں برابر کا پان، انگلیوں میں سگریٹ۔ ان کا حلیہ، تیور اور لہجہ ہی بتا دیتا ہے کہ اس نے اپنی رسیلی بیوی کی گود میں بچہ ڈال کر کسی چوراہے پہ کھڑی کی ہوئی ہے یا کسی کوٹھی میں دَھندے پہ لگا رکھی ہے۔ سڑکوں، بازاروں، دوکانوں پہ بھیک مانگتی ہوئی قبول صورت، تیکھے بنے سنورے نین نقش، گداز نیلے کئے ہوئے جسم، سانولی سلونی نمکین، ناز نخرے سے لہراتی بل کھاتی ہوئی لڑکیاں اور چھوٹے موٹے زیور پہنے عورتیں کسی طور بھی بھوکی ننگی دکھائی نہیں دیتیں وہ اسی قماش قبیلوں سے اسی قبیل تعلق رکھتی ہیں۔ گھروں، کوٹھیوں میں کام کرنے والی اکثر ادھیڑ عمر یا گئی گزری ہوتی ہیں جو اپنی عُمرِ لطیف کے اچھے دن گزار چکی ہوتی ہیں، اب ان کے پاس کھونے یا گنوانے کو کچھ بھی باقی نہیں ہوتا۔ قبول صورت نو عمر اگر کہیں کام کرتی نظر پڑے تو سمجھ لیں کہ وہ کام کی آڑ میں کوئی دوسرا کام ضرور کرتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے تو وہ لڑکی یا عورت نہیں ہے، تیسری جنس ہے جن کی ضمانت تو بالکل ہی نہیں دی جا سکتی یا پھر اس گھر میں کوئی جوان مرد نہیں ہے۔ فارغ الاعمال بوڑھے ہیں یا فرشتے--- سینکڑوں میں اگر ایک آدھ دانہ بچل بھی نکل آئے تو اس کی کیا حیثیت ہے۔

ہفتہ عشرہ اسی بَھد بَھدی میں گزر گیا۔ مِٹھی سخت جان نے اس سخت موقع پہ بھی سنبھالا لے لیا تھا۔ گور کن بابا نے چند دن اور علاج کیا، کچھ احتیاطیں اور پرہیز بھی بتائے۔ یہ بھی صاف صاف کلن سے نکال دیا کہ زندگی میں کبھی بھی ایک دُوجے کے قریب مت جانا، مِٹھی ایک بِس کنیا ہے، زہر اس کے انگ انگ میں رچ بس گیا ہے۔ یہ اشارہ بھی کر دیا کہ یہ عورت ذات کی ایسی نسل سے تعلق رکھتی ہے جو مرد کو بادشاہ بنا سکتی ہے۔ مرد کی وفادار ہوتی ہے، خدمت گزار اور راز کو سنبھالنے والی ہوتی ہے--- واقعی، اس نے جن حوصلہ شکن حالات میں صبر اور ثابت قدمی سے مُتے کا ساتھ نبھایا تھا، وہ گور کن بابا کی بات کا سچا ثبوت تھا۔ مَتا بھی جس کے پاس اب صرف رونا دھونا کراہنا یا پھر گالیاں بکنا رہ گیا تھا، مِٹھی کی وفاداری اور خدمت گزاری کا معترف تھا۔

ایک دن وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا کرنے لگا۔

"دیکھ، مِٹھی! میں تجھے کسی بات پہ دَوش نہیں دیتا۔ مَیں تو ایک مُردار جناور کی طرح ہوں۔ عمر بھی ایسی کہ مَروں، جیوں برابر--- تو اپنا رَستہ کھوٹا نہ کر، مَیں خوشی سے تجھے آزاد کر دیتا ہوں۔ تیری زندگی پڑی ہے۔ کہیں چلی جا، کہیں اپنا گھر بسا لے۔ میں تو بس---"

مِٹھی نے اس کے موٹے موٹے سلگتے ہونٹوں پہ جیسے کافوری انگلیوں کی سلائیاں رکھ دیں۔ "نہ رے، ایسا نہ بول---" وہ روہانسو سی ہو گئی۔ "خدا تجھے زندگی دے، میری بھی تجھے لگے---" وہ اس کے گدلے سے آنسو، اپنے پھٹے پلّو سے پونچھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "تو نے میرا ہاتھ مائی ہیر کے سامنے تھاما تھا۔ اب تو جو بھی ہو، ساتھ جئیں مریں گے۔"

پھر پھنگری دونوں نَم آلود ہو گئے۔

"تخم جَنے نے ساتھ توڑ دیا، تو کب تک ساتھ چلے گی؟--- میری مان، اپنی زندگی میرے ساتھ برباد نہ کر---"

"مَتے! اچھا ہوا، وہ خود ہی کہیں چلا گیا۔ ہمارے سنگ زندگی برباد کرتا، تو بالکل فکر نہ کر۔ بابا نے دوا دی ہے، تو بھلا چنگا ہو جائے گا۔ مَیں تیری سیوا کروں گی--- رَبّ کرے گا تو اللہ بچایا بھی آ جائے گا۔ کچا بالک ہے، کسی الکل میں کہیں نِکل گیا ہو گا---"

رِستے ناسوروں پہ گندے غلیظ چیتھڑے۔ کھیاں بِھن بِھن کرتی رہتیں۔ تعفن سڑی بَدبو، دماغ پھٹ جاتا--- رَبّ روزی رَساں ہے۔ کسی کی خوبی خوبصورتی ہُن برسانے کا سبب ہوتی ہے اور کسی کی کراہت، کمی کجی رزق روزی کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ دھوپ، گرمی، سردی، بارش، اسی جگہ پاؤں پسارے، زخم کھولے، درد ناک آواز میں وہ آنے جانے والوں سے التجائیں کرتا رہتا۔ چہرے پہ وحشت کرب۔ سر، مونچھ، داڑھی کے اجڑے خاک آلود بال، پیلے گندے دانت، آنکھ میں چِنا--- لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ اس کے آگے ضرور پھینک جاتے۔ مِٹھی، پاس بیٹھی اس کے زخموں کے جامنوں پہ سے کھیاں جھلتی رہتی--- موسم اور وقت بھی کھیوں کی طرح ہوتے ہیں، بھنبھناتے اور تنگ کرتے ہیں۔ آتے ہیں، جاتے ہیں اور اُڑ جاتے ہیں۔ سخت کوش انسان جینے کے لئے

انہیں جان پہ جھیلتا رہتا ہے اور آخرش یہ خود بھی ایک مکھی بن جاتا ہے۔ پھر قضا کا کوئی جھونکا اسے ہر دَرد دکھ' آزمائش سے دُور کر دیتا ہے۔ یہ ناآسودہ خواہشیں' اُدھورے خواب' بانجھ تمنائیں' بے ثمر کاوشیں' بے فیض وبے مہر تعلق ناتے' جبر' صبر' قہر' سوچوں کا زہر جبری زندگی کے مُردار پہ بِھنبھناتی ہوئی مکھیاں ہی تو ہیں--- وہ مکھیاں اڑاتی ہوئی شاید یہی کچھ سوچا کرتی۔ بے علمی' بے حسی' بے توفیقی اور بھول بھلکڑی اگر نہ ہوتی تو یہ دنیا کبھی کی خاصے انسانوں سے خالی ہوئی ہوتی' دو چار اگر ہوتے بھی تو باون گزے ہوتے' سنہری پروں والے' سونے کے سینگوں والے۔ دَھڑ گھوڑے کا' سر دیوتا کا ہوتا۔ مَروارید کھاتے' مُونگے لیدتے--- اور پھر شاید مکھیاں نہ ہوتیں' کوہ قامت مگرمچھ ہوتے جو اپنی پشت پہ جنت نظیر جزیرے اٹھائے دریا دریا' دلدل دلدل دَندناتے--- مٹھی' مٹھی بھر شعور کی لاانداز وسعتوں میں جانے کہاں کہاں ٹکریں مارتی رہتی۔ سمجھ اور بے سمجھی کے اندھیروں اُجالوں کی بھول بھلیّوں میں خود کو کھوتی کھوجتی رہتی۔ کئی اندھیرے اُجالے' ماہ و سال کی لَوح پہ نقشِ پارینہ بن گئے تھے۔ وقت' حالات' خیالات کی تختی کئی بار لکھی' مٹی اور صاف ہوئی۔ کسی کچی پکی جماعت کی طالبہ کی طرح مٹھی بھی کچا پکا آموختہ لکھتے دھراتے' عمرِ تجربے کی کئی جماعتیں اُوپر جا چکی تھی۔ اب وہ ایک بھرپور عورت تھی' جہاندیدہ--- نفع نقصان اونچ نیچ کو سمجھنے پرکھنے والی اور مَستا! اب اپنی تمام بیماریوں' آوازاریوں کے ساتھ ساتھ ایک سڑیل بوڑھے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ دُکھ' دَرد اور آزار اگر دائمی صورت اختیار کر لیں تو تکلیف کا احساس ختم ہو جاتا ہے بلکہ ایک طرح سے راحت کا سبب بن جاتے ہیں۔ بھولے بھٹکے اگر کوئی زخم بھرنے لگتا تو یہ کھُجل کھُجل کر پھر کھول دیتا۔ بڑھاپے کے سائے جیسے جیسے گہرے ہوتے جا رہے تھے' وہ چڑچڑا اور بدمغزا ہوتا جا رہا تھا اور ایسے ایسے مٹھی اور بھی مٹھی مٹھار ہوتی جا رہی تھی۔

عیدیں' دن دیہاڑے تو بھک منگوں کی چاندی ہوتی ہے۔ اصل میں یہ تہوار ہوتے ہی ان لوگوں کے ہیں۔ سفید پوش تو محض اجلے کپڑے پہننے اور مقدور بھر خرچ کرنے کے مجرم ہوتے ہیں اور بعد میں کئی مہینوں تک اپنے ہلے کھسکے بجٹ کی چُولیں بٹھاتے رہتے ہیں۔ ادھر یہ بھک منگے کئی دنوں تک اپنی کمائی کی ریزگاری اور چھوٹے موٹے نوٹ گنتے گناتے رہتے ہیں--- بڑی عید کے جانوروں کی اوجھریوں' انتڑیوں کی سڑاند ابھی تک فضا

میں موجود تھی۔ پیٹ معدے قربانی کے گوشت کے بوجھ سے ابھی ہلکے نہیں ہوئے تھے کہ بہاولپور سے آئے ہوئے ایک بازی گرنے بتایا کہ بلاقی کے بھائی اسے تلاش کر رہے ہیں' وہ لوگ کراچی' کوئٹہ بھی چکر لگا آئے ہیں۔ اندیشوں کے کینچوے اس کے اندر کُلبلانے لگے۔ ایسے میں مٹھی نے اپنا خواب سنایا کہ وہ دونوں داتا دربار حاضر ہیں۔ ایک مجذوب سی عورت اچانک نمودار ہوئی اور مٹھی کی گود میں ایک کچا پکا انار پھینک گئی--- باہم مشورہ ہوا تو یہی فیصلہ ہوا کہ یہاں سے فوراً کوچ کرو۔ دانہ پانی اٹھتا ہے تو سارے انتظام بھی ہو جاتے ہیں۔ بنجاروں کے پاس ہوتا بھی کیا ہے؟ تام جھام اکھاڑا' ٹرالی پہ لادا اور دوسرے دن منہ سویرے لاہور نگری میں وارد ہو گئے۔ جمیل ٹاؤن کے باہر پانی کی بڑی ٹنکی کے پاس' چنگڑوں کی جھونپڑ بستی تھی۔ خانہ بدوشوں کے بہت سے گوت قبیلے یہاں برسوں سے پڑے ہوئے تھے۔ ریڑھی بان' گشتی جھولوں والے' مداری سپیرے' رنگ روغن والے' مزدور دیہاڑی دار' اٹھائی گیرے' گرہ مار' چھوٹے موٹے جرائم پیشہ لوگ۔ ان کی عورتیں آس پاس کی کوٹھیوں میں کام کرتی تھیں اور جو باہر کام نہیں کرتی تھیں وہ بستی کے اندر ہی گھگھو گھوڑے' مٹی سرکنڈوں کچیوں کے کھلونے' چھاج' کھجور کے دَستی پنکھے اور بانس کی دنبلیاں مُرلیاں بناتی رہتی تھیں۔ بیشتر مرد اپنی ازلی ہڈ حرامی اور روائتی بے غیرتی کے سبب جھونپڑوں میں پڑے رہتے' سارا سارا دن نشہ پانی' تاش اور گانا بجانا کرتے' شام ڈھلے جب ان کی دُود ھیل بکریاں' گائیاں' اُونٹنیاں تھکی ہاری' جُوٹھ جَاٹھے سے لَدی پھَدی اپنے اپنے تھانوں پہ واپس آتیں تو کسٹم والوں کی طرح ان کے جسم و لباس کی تلاشی لیتے' ان کی ٹھکائی دُھنائی کے بہانے تلاش کرتے' یہی ان کا طریقہ اُصول تھا کہ اپنے مال کو دبا ڈرا کر رکھو۔ ان کی کمائی کھاؤ' ان کے مال پہ مُوج اڑاؤ جس طرح گوالے کمائی کے لئے گائیں بھینسیں پالتے ہیں۔ اسی طرح یہ لوگ بیٹیاں' بیویاں' بہنیں اور مائیں پالتے ہیں۔ صدیوں سے ان کی زندگی اسی ڈھب سے گزرتی چلی آ رہی ہے۔ تعلیم علم حاصل کرنا ان کے ہاں مہلاپ اور دین مذہب محض دِکھاوے کی حد تک ہوتا ہے۔ اخلاق' شرافت' پاکیزگی' طہارت' حلال' دیانت کا ان کے ہاں کوئی تصوّر نہیں۔ ان کے ہاں جنگل کا قانون چلتا ہے۔ بلیّاں' بندر' ریچھ' لومڑ' کتے کتوروں پہ بھی دانت تیز رکھتے ہیں۔ عورت کو صرف عورت سمجھتے ہیں۔ رشتے ناتوں کا فرق' تقدس یا احترام محسوس کرنے کا تکلّف نہیں کرتے۔ یہی

ان کی رِیت' رواج اور رَوایت ہے--- رواج رَوایت کے مطابق' بستی والوں نے مَستا اور مِٹھی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کِھلایا' پلایا' بٹھایا--- جھَٹ گھڑی آرام کے بعد سب مِل جُل کر ان کا جھونپڑا جمانے میں مصروف ہو گئے' مَستا تو سفر کی تھکان سے ہلکان' گھاس پھونس پہ حسب معمول زخموں کو کریُد رہا تھا' مٹھی اپنے سامان یعنی کاٹھ کباڑ کو ترتیب دے رہی تھی۔ تپّڑ ڈالنے کے لئے بانسوں کی کمانیں زمین میں دبائی جا رہی تھیں۔ بستی کا ایک نوجوان بڑی تندہی سے زمین میں گڑھا کھوُد رہا تھا۔ موٹے ڈولوں کی تڑپتی ہوئی مچھلیوں پہ کَس کر تعویذ بندھے ہوئے تھے' کشادہ پیشانی پسینے سے تَر تھی اور سینے پہ سیاہ بالوں کا جنگل بھی بھیگا ہوا تھا' تہبند کے پلّو سے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے اچانک اس کی نظر چیتھڑے سمیٹے ہوئی مِٹھی پہ پڑی۔ اس کی ناک سے لٹکے ہوئے بلاق کے نگینے سے ایک شعاع منعکس ہو کر' تیر کی اَنی کی طرح اس کے دماغ میں ترازو ہو گئی تھی اور یادوں کے خون کا ایک فوارہ سا پھوٹا۔ پہلی نظر میں وہ اسے پہچان نہ پایا تھا اور ایسے معاملے میں جہاں نظریں کام نہ کریں' وہاں خون کام کرتا ہے۔ کیمرے سے کھنچی تصویریں جس طرح وقت' تاثرات' کیفیات کو قید کرلیتی ہیں۔ اسی طرح انسان ذہن کے اندر بھی کہیں ایک نظام قائم ہے جو ایسی کیفیات' جزئیات کی واضح تصویر کشی کرلیتا ہے۔ جن سے اس کی کسی طرح کی بھی والہانہ وابستگی ہوتی ہے۔ برس' دو برس یا دو صدیوں بعد جب بھی کبھی حالات' واقعات یا اتفاقات کے دندانوں سے قلبی' جذباتی' نفسیاتی یا روحانی دَندانے مِلتے ہیں تو پرانی البم کی تصویریں کھناک کھناک سامنے اُبھر آتی ہیں--- دُھندلی ایک پرانی تصویر واضح ہوتی چلی گئی۔

٭٭٭

"لے بے' اٹھنی---" مستا اسے چمکارتے ہوئے کہنے لگا۔ "دو کلن سے کوئی اچھی سی چیز کھالے اور جلدی لَوٹنا' آج ہم سب نے کوئٹے جانا ہے--- مَیں بھٹے پہ جا رہا ہوں' وہیں پلٹ کر مجھے ملیو---"

خوش خوش' اُچھلتا کوُدتا رِیوڑیاں بتاشے پھانکتا جب وہ بھَٹے پہ پہنچا تو وہ ویسر ہو چکا تھا۔ مُستا بھٹے کو آگ دِکھا کر' اس کی کوکھ جُلا کر مختصر سا سامان لادے مٹھی کے سنگ تیاری پکڑے کھڑا تھا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے معصوم اللہ بچایا نے پوچھا۔

"ماں کہاں ہے---؟"

"وہ اپنے گاؤں گئی ہے--- چھوڑ اسے' وہ آجائے گی---"

مُٹھی سے رِیوڑیاں اور چُندی چُندی آنکھوں سے گرم گرم آنسو سرکنے لگے--- کھناک سے اِک دوسری تصویر' ذہن کی سکرین پہ اُبھری۔ مٹھی اس کی ماں کی جگہ پہ آگئی تھی۔ اس کی کپڑے چپل' نوم چُھلا' اس کی کھاٹ--- ایک رات اس نے باپ کے ساتھ اسے ایسی حالت میں دیکھ لیا جسے پوری طرح نہ سمجھتے ہوئے بھی وہ بہت کچھ سمجھ گیا اور شاید اسی ناسمجھی نے ہی اسے اپنی ماں بلاقی کے انجام کے بارے میں بھی بہت کچھ سمجھا دیا تھا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ایک ایسی راہ پہ لگ گیا جو اسے باپ اور مٹھی سے بہت دُور لے گئی۔ پاؤں چھوٹے' راستہ لمبا--- وہ کسی انجانی منزل کی جانب نِکل پڑا۔ بہت جلد وہ تھک ہار کر سڑک کنارے ایک گھنے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھ گیا۔ بھوکا پیاسا' تھکاوٹ سے اونگھ لگی تو لمبا پڑ گیا۔ پھر ہوش آیا تو ایک بندریا اسے جگا رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ پاس ہی ایک بوڑھا مداری گُڑگُڑی پی رہا تھا۔ مداری نے بالک بچہ بھوک پیاس' تھکاوٹ سے نڈھال دیکھا تو گدڑی سے کچھ نکال کھلایا' پلایا۔ دَم تسلی دی' پچکارا۔ بچہ تو پیار دُلار اور روٹی کا بھوکا ہوتا ہے' دونوں چیزیں ملیں تو مداری کا بچہ جمورا بن گیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہر انسان کبھی نہ کبھی' کسی نہ کسی کا بچہ جموڑا ضرور بنتا ہے۔ یہ مجبوری بھی ہو سکتی ہے' ضرورت اور حالات کا تقاضا بھی اور کبھی تو انسان کی اپنی شدید خواہش اور کوشش بھی ہوتی ہے کہ کسی مخصوص انسان کا بچہ جمورا بنے۔ بچہ جمورا بنے بغیر کوئی مداری' مداری نہیں بن سکتا۔ خود کو معمول اور دوسرے کو عامل کہے بن کوئی عامل وکامل نہیں ہو سکتا۔ سیپ بِن سَمندر' موہن بِن مندر' سپہ بن سکندر' قناعت بن قلندر اور مداری بِن بندر کسی کام کے نہیں ہوتے۔ مداری بابا کو اللہ نے اللہ بچایا دے دیا تھا۔ وقت نے وقتی طور پہ بھوک اور سرپرستی کا آسرا کر دیا تھا۔ بندر اور بچہ جمورا دونوں کی ڈور مداری بابا کے کمزور لیکن ہنرمند ہاتھوں میں تھی۔ بندر ناچتا رہا' سوانگ بھرتا رہا۔ قریہ قریہ' شہر شہر' گلی گلی گھومتے گھومتے' ڈگڈگی بجاتے بجاتے بابا اور بندر بوڑھے ہو چکے تھے جبکہ اللہ بچایا بچپن سے نکل جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکا تھا۔ آخر ایک بند گلی میں مداری بابا کی زندگی کی شام ہو گئی۔ سرِپڑی رات بابا قبر میں پاؤں پسارے لمبا لمبا لیٹ گیا۔ اگلے چند دنوں بوڑھا بیمار بندر بھی داغ

مفارقت دے گیا' سارا کھیل تماشا تو مداری کے ساتھ تھا۔ تماشا ختم' پیسہ ہضم۔ بندریا بے چاری سخت جان' بھد بھد بین کرتی رہتی تھی۔ طبیعت سخت متنفر ہوئی' کھڑے کھڑے بندریا' ڈفلی' بنسری' تماشاگری کا سارا سامان ایک مداری کے ہاتھ فروخت کردیا۔ اس پیشے پہ چار حرف بھیجے اور سرزمینِ الاولیاء ملتان شریف سے داتا نگری آگیا۔ ہڈگوڈے اب مضبوط ہو گئے تھے' ٹاہلی کے پُھنگ کی طرح سر نکال لیا تھا۔ ہلکا سانولا رنگ' دراز کنڈلائی تیل پلائی زلفیں' تیکھے تیکھے نین نقش' چال ڈھال میں مستی کا رنگ' ریشمی رنگین لاچے پہ دھاری دار ڈوریئے کا لمبا سا کھُلا کرتہ اور ملتانی کُھسّہ۔ وہ کسی طور مداری نظر نہیں آتا تھا۔ پہلی مرتبہ لاہور آیا تھا اور لاہور تو لاہور ہے' پہلی بار آنے والوں کی تو ایک مرتبہ مَت مار دیتا ہے۔ دِیدے پھاڑ پھاڑ گرد و پیش کا نظارہ کر رہا تھا' اپنے تئیں پچھتا بھی رہا کہ وہ اِدھر پہلے کیوں نہیں آیا۔ اتفاق سے انہی دنوں شالامار کا میلہ بھی اپنے عروج پہ تھا۔ پاؤں میں دَم' جیب میں دام' دِیدوں میں دِیدم اور وقت کشادہ ہو تو میلہ' میلہ ہوتا ہے۔ اللہ بچایا کے ہاں یہ سب کچھ موجود تھا۔ دو چار دن خوف مزے سے گزرے۔ لاہور نے اسے خوب مضبوطی سے اپنے کشادہ بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ جیب قدرے ہلکی ہوئی تو بسر اوقات اور کسی رِیپٹے ٹِھکانے کی ضرورت محسوس ہوئی' گھومتے کھوجتے سڑک کنارے ایک مجمع کے پاس کھڑا ہو گیا۔ نورانی صورت بزرگ عربی عبا' سیاہ چادر اوڑھے' گلے میں موٹی موٹی مالائیں' کلائیوں میں قلندری کڑے' انگلیوں میں عقیق فیروزے' بڑے دَبنگ انداز میں دوکانداری جمائے داستان سکندر ذوالقرنین سنا رہے تھے۔ پرانے داستان گو سا انداز' لہجہ میں گھمبیرتا' زیر و بم' اشارے' کنایئے' کردار نگاری۔ پورے مجمعے کو اپنے سحرِ خطابت میں جکڑ رکھا تھا' عقلے' بے عقلے' پڑھے اور اَن پڑھے... دم سادھے' پاؤں کی مٹی پکڑے ہوئے دَم بخود کھڑے تھے تو اللہ بچایا بھی جگہ بنا کر الف لیلوی تماشا دیکھنے لگا۔ پَون گھنٹے بعد تعویذ نکل آئے اور مجھے دینا' اسے دینا' ابھی دیتا ہوں' ترکیب استعمال سنتے جانا۔ قسمت والا لے گا' بد قسمت خالی جائے گا' ہونے لگی۔ اس کے بعد مردانہ طاقت کی دوا نکل آئی اور پندرہ بیس منٹ میں سب کچھ قسمت والے لے گئے۔ دو چار علیحدگی میں پرائیویٹ بات کرنے کے لئے رک گئے۔ دوکانداری سے فارغ ہو کر سیّد صفدر علی شاہ اپنا خالی بریف کیس اور نوٹوں سے ٹُھسی ہوئی جیب لے کر پاس ہی ایک ہوٹل میں آ بیٹھے' ابھی بھی تین چار آدمی ان

کے ساتھ تھے۔ اللہ بچایا بھی تعاقب میں تھا' اصل میں یہ انہیں علیحدگی میں ملنا چاہتا تھا۔ چائے آئی' شاہ صاحب ان لوگوں سے کھُلی ڈھلی بات چیت میں مصروف تھے۔ وہ بھی پاس کی میز پہ بیٹھا چائے سرکتے ہوئے شاہ صاحب سے بات کرنے کے لئے بے چین تھا۔ شاہ صاحب پرانے گھاگ تھے' تاڑ گئے کہ یہ نوجوان ملنا چاہتا ہے۔ انہوں نے خود ہی اسے بلایا تو اس نے اپنا مدعا پیش کیا اور شاگرد بننے کی خواہش کا اظہار کیا۔ بات بن گئی اور اب وہ اپنے نئے استاد کا بچہ جمورا بن کر اس کے ڈیرے پہ کڑاہی گوشت' روغنی نان اڑا رہا تھا۔ یہ ڈیرا یا کمرا' انار کلی کی نکڑ پہ واقع ایک چار منزلہ ہوٹل کی بالائی چھت پر تھا۔ ٹین کی چھت' لکڑی کی دیواریں' فرش پہ کھپریل کی صفیں' دو کرسیاں' ایک لوہے کی چارپائی' ہاون دستے' دوائیں' کتابیں' کیلوں کی کھونٹیوں پہ لٹکے ہوئے کپڑے۔ لکڑی کی میز پہ گندی کاغذ پہ چھپے ہوئے تعویذ اور نقش--- آیت الکرسی' نقش سلیمانی' یک ورقی قرآن پاک' پنج تنی پنجہ' دم داؤدی' درود نولکھا' اسم اعظم قرآنی' نقش ماہی یونس "نقش پائے مبارک" مہر مبارک' بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ یہ دو نمبر سید صفدر علی شاہ رحیم یار خان کا رہنے والا تھا' وہیں اپنے گاؤں کی خستہ حال مسجد میں گزارے لائق امام تھا--- ظاہر ہے' تعویذ گنڈے بھی کرتا تھا۔ اپنے علاقے کے ایک آسودہ حال زمیندار کا کوئی پھنسا ہوا کام اتفاقاً" اس کے تعویذ عمل سے پورا ہو گیا تو زمیندار نے انعام میں اسے عمرے پہ بھجوا دیا۔ وہیں اس کے ساتھ ایک حادثہ پیش آگیا۔ جبلِ نور سے اترتے ہوئے پاؤں رپٹا اور پنڈلی کی پٹی دو پاٹ ہو گئی۔ بِلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ کئی ہفتے شفاخانے میں پڑا سڑتا رہا۔ فارغ ہوا تو تیمور لنگ بن چکا تھا۔ گاؤں کی جمعراتی روٹیوں سے پہلے ہی تنگ آیا ہوا تھا۔ ٹانگ کا عذر لنگ لے کر وہیں ٹک گیا۔ ایک فیصل آبادی ہوٹل میں باورچی لگ گیا' عربی سے واجبی سی شدبد تو پہلے سے ہی تھی۔ زبان رواں ہوئی تو عربیوں کے بھی کان کترنے لگی۔ چرب زبانی' خوشامد' محنت اور میٹھی زبان کے صدقے کئی سال لکے چھپے گزار دیئے۔ عمرے بھی ہوتے گئے' ہوتے ہوتے یہ ایک معلم کے آگے ایک معلم کی حیثیت سے کام کرنے لگا' پیچھے صرف ایک صابر سی دیہاتن بیوی تھی' بچہ کوئی تھا نہیں' تین لفظ اسے بھیج کر' کراچی کی ایک بیوہ کھوجن سے نکاح کر لیا۔ وہ بھلی مانس بھی وہاں غیر قانونی ٹکی ہوئی تھی۔ یہ عورت اسے راس نہ آئی' کچھ ہی عرصے بعد یہ دونوں غیر قانونی قیام کے سلسلے میں پکڑے گئے اور چند

دنوں بعد کراچی پارسل کر دیئے گئے۔ کراچی چند مہینے قیام رہا' جمع پونجی ٹھکانے لگنے لگی تو آئندہ کے پیٹ پاپڑ کی پڑی۔ بڈھی کھوجن نے آنکھیں پھیرلی تھیں' وہ پھر واپس سعودیہ جانے کے چکر میں تھی۔ اس نے طلاق طلب کرلی اس نے بھی فوراً فارغ خطی تھما کر پنجاب نکل لیا۔ سیدھ وہ لاہور پہنچ کر بنا تھا۔ مُلّا' ملاح' مراثی' ملنگ' مزارعے اور منشی اپنے پیشوں سے بڑی مشکل سے دستبردار ہوتے ہیں۔ عربی وہ عربیوں کے لہجے میں بولتا تھا اور چرب زبانی' دوسروں کو شیشے میں اتارنا اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ شخصیت بھی بڑی پُراثر تھی۔ جامی' رومی' سعدی کے بے شمار شعر اور حکاتیں ازبر تھیں۔ موقع محل کے مطابق بڑی خوبصورتی سے استعمال بھی کرلیتا تھا۔ یعنی بس یہی ایک میدان تھا جو اس کے لئے بڑا سرسبز تھا۔ یہاں اسے ایسا ماحول بھی مل گیا۔ اب خوب اللہ کی مخلوق کو لوٹ رہا تھا۔ اللہ بچایا' جو اس کا بچہ جمورا بنا تو اس کی وجہ یہی روپے پیسے کی ریل پیل اور عیش و عشرت تھی۔

شاہ صاحب نے اسے بھی اپنا کارندہ بنالیا تھا۔ ایسے کارندے اس کے پاس دیہاڑی یا کمیشن پہ کام کرتے تھے۔ کام یہی تھا کہ مجمع میں تماشائیوں کے درمیان تماشائی بن کر کھڑے ہو جاتے۔ شاہ صاحب کی بزرگی اور تعویذات کی برکت' دواؤں کے پُراثر ہونے کا پراپگنڈہ کرتے اور خریدنے میں بڑے جوش و خروش سے پہل کرتے۔ مجھے دینا' مجھے دینا کی پہلی آوازیں انہی کی ہوتیں۔ ساتھ کھڑے لوگوں کو بھی خریدنے پر اکساتے۔ کمیشن کے علاوہ کھانا پینا بھی ملتا۔ کھانے کو اچھے اچھے کھابے' رہنے کو ٹھکانا اور اخراجات کے لئے پیسے تھے تو اور اسے کیا چاہئے تھا؟ دن بڑے مزے اور مصروفیت میں گزرنے لگے۔ دن بھر میں صرف تین چار مجمعے لگتے۔ باقی وقت وہ ڈیرے پہ بیٹھا تعویذ بناتا' طاقت کی گولیاں ڈبیوں میں پیک کرتا رہتا یا پھر سگریٹ بھرتا رہتا۔ بھنگ پہ تو مرنے والے مداری نے لگایا تھا اور چرس ان شاہ صاحب کی دین تھی۔ تولہ بھر چرس وہ پانچ چھ ڈبیوں کے سگریٹوں میں بھر کر تیار رکھتا تھا جو دن بھر شاہ صاحب' دیگر کارندوں' پولیس ملازم' علاقے کے جگا ٹیکس وصول کرنے والوں اور کمیٹی کے کارندوں کے کام آتے۔ ہر مجمع کی آمدنی پہ ان لوگوں کا بھتہ طے ہوتا تھا' شام کو ان کا حصہ ان تک پہنچ جاتا۔ دو چار مہینوں میں اس نتیجے پہ پہنچا کہ وہ غلط لوگوں میں پھنس گیا ہے۔ یہ آئی چلائی کا دھندا تھا۔ شاہ صاحب جیسا وہ بن نہیں سکتا تھا کیونکہ بے علم اور اوبڑ تھا۔ وہ تو بندر بندریا کا تماشا دکھانے والا مداری تھا جو گلی محلوں'

بچوں بالوں کا تماشا ہے۔ لاہور تو بڑے اونچے درجے کا تماش بینوں اور مَن موجیوں کا شہر ہے۔ چینڈو قسم کے تماشے ان کے لئے چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ اس نے اپنے تئیں طے کرلیا کہ کوئی اور راستہ نکالے گا۔

شاہ صاحب نے اچانک سہون شریف جانے کا پروگرام بنالیا۔ سہون شریف میں اس نے پھولاں کو دیکھا تھا۔ دریا کنارے وہ کپڑے دھو رہی تھیں اس کی تو چھب ہی نرالی تھی۔ وہ کوئی ایسی بھی خوبصورت نہیں تھی کہ انسان اسے دیکھتا ہی رہ جائے' پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے بے حد پرکشش بناتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ہر کوئی' کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی پہ عاشق ضرور ہوتا ہے۔ چاہے وہ عشق کا مطلب سمجھے یا نہ سمجھے۔ وقتی طور پہ سہی' کوئی ضرور اچھا لگتا ہے۔ اسے جم کر دیکھتے رہنے کو جی چاہتا ہے یا اسے حاصل کرنے کی تمنا جاگ اٹھتی ہے۔ اس کی قربت' جلوت سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ ایسے ہی وہ بھی اسے کھڑا گھورتا رہا۔ پھولاں عجب بے نیاز' لاپرواہ سی خانہ بدوش لڑکی تھی۔ اسے مطلق احساس نہ تھا کہ کوئی اس چاہ بھری نگاہوں سے دیکھ رہا ہے حالانکہ وہ بالکل اس کی دائیں جانب قریب ہی پاؤں دھو رہا تھا۔ شاید اِک اڑتی چڑیا سی نظر نے ادھر دیکھا بھی یا نہ دیکھا یا شاید وہ بن رہی تھی۔ کسی سے سُنا تھا کہ مرد کی دو آنکھیں ہوتی ہیں اور جوان عورت کے جسم کا ہر مسام اس کی آنکھ ہوتا ہے۔ اسے کسی زاویئے' کسی الگ رنگ سے دیکھو' اسے فوراً محسوس ہو جاتا ہے کہ کوئی مَرد اسے دیکھ رہا ہے بلکہ وہ اس کی اچھی بُری نیت تک سونگھ لیتی ہے۔ اس کی یہ حِس بڑی تیکھی اور اُتھری ہوتی ہے' چشم زدن میں اسے چشم چور کی چاند ماری کی چکا چوند چوکنا کردیتی ہے۔ یقیناً اس نے بھی محسوس کرلیا ہو گا کہ کوئی اسے چاہت بھری نظروں سے تک رہا ہے۔

"اے' یہاں رہتی ہو---؟"

اچانک اس سوال پہ وہ اسے پریشان ہی دیکھنے لگی' دیکھتی ہی چلی گئی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ جواب نہ پاکر اللہ بچایا نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پھر پوچھا۔

"گونگی ہو کیا---؟"

وہ ہونق سی ہونکی۔ "تم کیوں پوچھتے ہو---؟"

"بس یونہی--- تم سے بات کرنے کو جی چاہا---"

"چلو چلو' اپنا راستہ پکڑو---"

دھوئے' اَن دھوئے کپڑے اٹھائے وہ خود چل دی۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوئی' وہ تکتا رہا۔ موڑ مڑتے ہوئے جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو یہ ہلکے سے مسکرا دیا۔ اگلے چند دنوں میں وہ لاہور واپس آ گئے--- عملاً وہ شاہ جی کا ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ اب تو محض وقت گزاری اور آئندہ کے لائحہ عمل پہ مزید سوچ بچار کے لئے اس کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔ شاہ صاحب کے ساتھ باہر جانا چھوڑ دیا تھا۔ ڈیرے پہ بیٹھا تعویذ' ڈبیاں باندھتا رہتا یا پھر سگریٹ بھرتا' پھونکتا رہتا۔ طبیعت اوبتی تو باہر نکل آتا' ٹبی شاہی محلے میں دل پشوری کرنے چلا جاتا یا موڈ ہوتا تو بھاٹی کے کسی سینما میں گھس جاتا۔ ایک روز بھاٹی چوک گزرتے ہوئے چن کھناں کا بڑا سا بینر دیکھا' فلمسٹار رانی بڑے دل فریب انداز میں مسکرا رہی تھی۔ بینر پہ نظریں جمائے وہ دیر تک تکتا رہا۔ وہی سون شریف والی لڑکی!--- خدا جانے کس طرح سے اس نے رانی اور اس خانہ بدوش لڑکی کو آپس میں گڈمڈ کر لیا تھا۔ کہاں وہ' کہاں یہ--- ہرحال' رانی کا یہ انداز دیکھ کر اسے وہ لڑکی یاد آ گئی اور چن کھناں دیکھنے کا موڈ بن گیا۔ شو ابھی ٹوٹا نہیں تھا' کچھ دیر تھی۔ ادھر اُردو بازار کی جانب جوتوں والی دکان پہ وہ جوتے دیکھنے لگا۔ جب اس کے کانوں میں جھانجھر سی چھنکی۔

"ارے' یہیں رہتے ہو یا لاہور دیکھنے آئے ہو---؟"

پاس ہی فٹ پاتھ پہ' چار پانچ نیم مردہ سانڈے پیٹ چاک اُلٹے پڑے ہوئے تھے' دہکتے کوئلوں کی آنچ پہ المونیم کے چھنّے میں سیاہی مائل سیال بلبلے چھوڑ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی شیشیاں' لوہے کی پتری جو شاید چھری کا کام دیتی تھی۔ چھوٹا سا چمٹا تھا۔ وہ میلے کچیلے کپڑوں کی گٹھڑی پہ پھسکڑا مارے بیٹھی' میٹھی سی مسکراہٹ سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر وہ پوچھنے لگی۔

"کیا باولوں کی طرح دیکھ رہے ہو--- گونگے ہو کیا' مجھے پہچانا نہیں؟"

وہ اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ ابھی ابھی تو اسے یاد کیا تھا' اسی کی خاطر تو وہ چن کھناں دیکھنے والا تھا۔ اسی نے تو اسے مرد ہونے کا احساس دلایا تھا--- وہ چپ چاپ اسے گھورتا ہوا پاس بیٹھ گیا اور وہ دوبارہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

"گونگے ہو--- دیدوں سے نہیں' منہ سے پھوٹو---؟"

اچھلتے فوارے کی مانند اس کی ہنسی چھوٹی جیسے کئی ننھے منے گھنگھرو اچانک پھوٹ پڑے ہوں۔ حیرانی' خوشی اور اس اچانک ڈرامائی ملاقات نے اسے حواس باختہ کر دیا تھا۔ اس کے ماتھے پہ پسینے کے ننھے منے سچے موتی چمکنے لگے' بڑی دقت سے خشک حلق تر کیا' آنکھیں پٹپٹائیں اور اٹکتے ہوئے پوچھا۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو---؟"

"اندھے ہو' دکھائی نہیں دیتا--- سانڈے کا تیل بیچ رہی ہوں۔"

وہ حیرانی سے سانڈوں کو دیکھنے لگا۔

"تم--- تم سانڈوں کا تیل بیچتی ہو؟"

"ہم سانسی ہیں' سانڈوں کا تیل نہیں نکالیں گے تو کیا سرسوں کا کولہو چلیں گے۔" سانڈے کو دُم سے پکڑ' سامنے لہراتے ہوئے وہ آنکھ دبا کر بتانے لگی۔ "اس کا تیل بڑے کام کی چیز ہے--- شادی کر لی ہے یا یونہی الڑ بلڑ سے ہو---؟" سانڈہ پھینک کر وہ شیشی میں گرم گرم تیل بھرنے لگی۔ "ایک شیشی لے جاؤ۔ شرم آتی زبان کھولتے ہوئے۔ اشارہ سمجھ لو--- بڑے کام کی چیز ہے' یاد کرو گے---"

"میں یاد تو تمہیں اس کے بغیر بھی کرتا ہی رہتا ہوں۔ تیل کی شیشی کی ضرورت نہیں' ضرورت تو مجھے---"

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہ گھبرا سی گئی۔ بڑی مشکل سے اس کی نگاہوں سے نگاہیں چراتی ہوئی بے اختیار پوچھ بیٹھی۔

"تجھے کس چیز کی ضرورت ہے---؟"

"تیری---"

تیر کمان سے نکل چکا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے--- اُلٹے پڑے ہوئے پیٹ چاک سانڈے' چربی دار سرخ کلیجی بوٹی باہر نکلی ہوئی۔ وہ نظریں جھکائے انہیں پاؤں ہلاتے' زبان اندر باہر نکالتے یوں دیکھ رہی تھی جیسے تھرپار کر کے تھلوں میں وہ ان سانڈوں کی طرح الٹی پیٹ چاک پڑی ہو اور ایک سانڈنی سوار' اس کے سر پہ کھڑا ہو۔ اتنے میں دو چار تماش بین آ سر پہ کھڑے ہوئے اور وہ بڑی مشکل سے ہکلائی۔

"کل اسی وقت آئیو---"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تو انہیں نبٹا لے' میں چوک سے سگریٹ لے آؤں---"

"سگریٹ میرے لئے بھی لیتے آئیو اور ڈبل چونا پان بھی---"

جان بوجھ کر وہ دیر سے آیا تھا' وہ سانڈے وانڈے گٹھری میں باندھ کر انتظار میں بیٹھی تھی۔

"لا' مجھے سگریٹ سلگا کر دے---"

"تم سگریٹ کیوں پیتی ہو---؟" وہ حیرانی سے پوچھنے لگا۔

"بس' پیتی ہوں--- اور بھی بہت کچھ پیتی ہوں۔" وہ سگریٹ مُٹھی میں دبا کر گہرا کش کھینچتے ہوئے اس کے گھبرائے ہوئے چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔

"تم سگریٹ کیوں پیتے ہو---؟" وہ مزہ لیتے ہوئے کریدنے لگی۔

"بس' عادت ہے---"

"مجھے اس کی عادت نہیں' ضرورت ہے۔ میں ادھر فٹ پاتھ پہ لاہور شہر میں بیٹھی ہوں۔ عورت ذات ہوں۔ جو چیز بیچتی ہوں' تم جانتے ہو کہ کس کام آتی ہے۔ میں اِدھر ہاتھ میں تسبیح لے کر بیٹھوں گی تو مجھے تسبیح یا داڑھی والا کوئی مولوی ساتھ لے جائے گا--- دیکھ رہے ہو' مَیں سینما کے سامنے بیٹھی ہوں۔ میرا سارا دن تماش بینوں' آوارہ بدکاروں سے واسطہ رہتا ہے۔ مجھے ان سے دو ہاتھ اوپر بدمعاش بن کر دوکانداری کرنا پڑتی ہے۔ تب جا کر رات کو دو ٹکے اور جان کی سلامتی لے کر ڈیرے پہنچتی ہوں۔" وہ اس کے چہرے پہ غلیظ دھواں پھینکتے ہوئے مزید بولی۔ "سمجھے کہ نہ سمجھے---؟"

وہ دِیدے پھاڑے' منہ بھاڑ کھولے اس کا فلسفہ کاروبار سُن رہا تھا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں میں راکھ ہو چکا تھا۔ تبھی ایک بوڑھا' جوگیوں جیسے لباس میں سر پہ آ کھڑا ہوا۔ موٹی موٹی سرخ آنکھیں' سفید داڑھی' کھڑی مونچھیں' اسے دیکھتے ہی وہ بولی۔

"بابا! چل ذرا گلی میں چائے پی' میں ابھی آتی ہوں---"

"وہ چلا گیا تو اس نے پوچھا۔

"یہ تیرا کون ہے---؟"

"میرا بابا ہے' دربار میں بھیک مانگتا ہے--- میری ماں بھی ہے' وہ بھی ابھی آنے والی ہے---" وہ اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولی۔ "اب تو بتاؤ' تم کیا چاہتے ہو--- صاف صاف بولو' ٹائم بہت کم ہے۔"

"مَیں--- مَیں تو بس---"

تھوک نگلتے ہوئے وہ بولا۔ "رہتا تو مَیں لاہور میں ہی ہوں' ادھر استاد کے ساتھ گیا تھا---"

"اچھا' یہ بتاؤ کہ میں تمہیں اچھی لگتی ہوں یا تو صرف میرے ساتھ عیاشی کرنا چاہتا ہے---؟" اِک دَم اس نے پوچھ لیا تھا۔

"نہیں' مَیں ایسا نہیں ہوں۔ مجھے تو بس اچھی لگتی ہے۔ اس دن سے آج تک مَیں تجھے کبھی نہیں بھولا' ہر روز یاد کرتا ہوں---"

"یہ بتا' تیری شادی ہو چکی ہے---؟"

"نہیں--- نہ ہی سر پہ ماں باپ ہیں جو میری شادی کی فکر کرتے۔" اس نے مختصراً اپنی رام کہانی سنائی۔

وہ بتانے لگی۔ "ہم سانسی ہیں۔ میں اپنے بابا کی اکلوتی بیٹی ہوں' میرا کوئی بھائی نہیں۔ شہر شہر' نگر نگر گھوم پھر کر روزی کماتے ہیں' یہی ہماری زندگی ہے۔ مَیں نے سہون شریف ایک دُعا مانگی تھی مجھے یقین تھا کہ میری دُعا ضرور قبول ہو گی اور سہون والا سائیں میری مراد ضرور پوری کرے گا---" وہ سر جھکا کر بولی۔ "مجھے تو بہت اچھا لگا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ تو مجھے اِک دن ضرور ملے گا---" پھر کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولی۔ "مَیں ڈیرے پہ آج بابا سے بات کروں گی۔ تو کل اسی ٹائم میرے پاس آئیو---"

"تیرا بابا تیری بات مان لے گا---؟"

"---کیوں نہ مانے گا؟--- میرا بابا بہت اچھا ہے' میری کسی بات کو نہیں ٹالتا۔ بس اِک شرط رکھے گا کہ تو شادی کے بعد ہمارے سنگ ہی رہے گا---"

"مجھے منظور ہے---"

"---اور ایک شرط میری بھی ہو گی۔

"بول' جو مرضی کہہ--- مَیں تیری ہر شرط قبول کروں گا۔"

"مَیں گھر پہ بیٹھوں گی' باہر کام نہیں کروں گی تو کمائے گا' مَیں بیٹھی کھاؤں گی۔"

وہ لنگوٹ اور محبت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "تو بولے بھی تو مجھے

تجھے باہر نہیں نکلنے دوں گا۔۔۔ مَرد ہوں' خود کماؤں گا' تجھے خوش رکھوں گا۔"

چھ سات روز بعد بڑی سادگی سے دونوں جیون ساتھی بن گئے۔ دُلہن پھولاں کے ساتھ اس کے بوڑھے ماں باپ بھی اس کے پاس اٹھ آئے تھے۔ اس سے پہلے وہ شاہدرے' راوی کنارے سانسیوں کی بستی میں رہتے تھے۔ جمیل ٹاؤن آئے تو بڑی مشکل پڑی۔ روزانہ بوڑھی بوڑھے کو داتا دربار جانا پڑتا تھا' پھولاں بھی بھاٹی چوک اور موری دروازے کے درمیان اڈے لگاتی تھی۔ کچھ روز تو نئی نئی شادی کے ہنگاموں میں گزرے' بعد میں وہ خود سسر کو لے کر دربار جانے لگا۔ حسب وعدہ پھولاں کو گھر میں بٹھایا اور خود پھولاں والے اڈے پہ سانڈے اور تیل لے کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی تیل بیچنے لگا تھا۔۔۔ تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو۔ وقت اپنے دھارے پہ لگ گیا۔

سردی ابھی اپنے عروج پہ نہیں لگی تھی کہ پھولاں کی مَیا' نمونیے کی ایک معمولی سے جھٹکے میں ڈھے گئی۔ میّت ابھی درمیان میں ہی پڑی تھی کہ پھولاں کی فلک شگاف چیخ نے سب کو دہلا دیا۔ پھولاں نے ایک ننھی سی کلی کو جنم دیا تھا' اللہ بچایا ایک بچی کا باپ بن گیا۔ شروعات بڑی اچھی ہوئی تھی۔ پہلے پور میں ہی مادی پیدا ہوئی تھی۔ بچی کی خوشی میں بوڑھی کی غمی بھی غڑغوں ہو گئی۔ پڑے سے پر آئے ہوئے مبارکبادیاں دینے لگے۔ بوڑھا سسر' بیوی کا غم اور جوڑوں کا پرانا درد لے کر کھاٹ پہ پڑ گیا۔ مہینہ بھر ساس کے مرنے پُرسے اور نومولودی بچی کی آمد جلد میں گزر گئے' سردیاں اور روزی دَھندے کی فکر جب عروج پہ آئی تو وہ سانڈے' شیشیاں لے کر پھولاں کے پرانے اڈے پہ آ بیٹھا۔۔۔ عورت پیتل بھی بیچے تو خریدار بہت' مرد سونا بیچے تو کوئی نہ خریدے' اسے اس دھندے کا تجربہ بھی نہیں تھا۔ سارا دن پہلو بدل بدل وہ سگریٹ پھونکتا رہتا۔ آتے جاتے لوگ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے اور سانڈوں کو گھورتے ہوئے گزر جاتے۔ تیل کی ناگوار بُو سے اس کا دماغ چیخ جاتا۔ کمائی تو ایک طرف' پانچ دس پلے سے جھاڑ کر' بے نیل و مرام واپس آ جاتا ادھر پہنچتے ہی بچی اور پھولاں کی ضرورتیں' بیمار سسر کی دواؤں کے تقاضے منہ کھولے ہوتے۔ وہ ذہنی دباؤ کو کم کرنے کے لئے دو چار سگریٹ ڈکوس لیتا کہ چرس کا دھواں وقتی طور پر پریشانیوں سے دُور لے جاتا۔ پھر اس نے صاف صاف پھولاں سے کہہ دیا کہ یہ سانڈوں کا دھندا اس سے نہیں ہوتا اور ویسے بھی یہ کام اسے پسند نہیں تھا۔ سانڈوں پہ

لعنت بھیج کر وہ گھر بیٹھ گیا۔ دن بھر سونا' رات بھر تاش' نشہ' گانا بجانا یا سیر سپاٹا۔ بوڑھا سسر عدم توجہ' دوا دارو اور خوراک کی تھوڑ سے ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ پھولاں اور ننھی بچی بھی فاقوں کی زد میں آ گئیں۔ ایسی صورت حال میں مزاج میں بھی تلخی آ جاتی۔ آہستہ آہستہ نوبت گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑوں پہ آ گئی۔ ایک صبح جب اللہ بچایا مستی کی نیند سویا ہوا تھا پھولاں اٹھی' باپ کو ریڑھی پہ لادا اور داتا دربار چھوڑ آئی اور خود بچی کو سینے سے چمٹائے' سانڈے لے کر اپنے اڈے پہ جا بیٹھی۔ وہ پرانی ڈگر پہ آ گئی تھی۔ کھلے گریبان سے چھاتی نکال کر بچی کو چُساتی رہتی اور شام ڈھلے باپ کو ساتھ لے کر واپس آتی تو ہانڈی روٹی میں جُت جاتی۔ جب پھولاں کی کمائی پہ گھر بار چلنے لگا تو اللہ بچایا کی زبان اور ہاتھ لات بھی چلنے لگی۔ وہ اپنے نشے عیش کے لئے اس سے پیسے طلب کرتا' انکار پہ دُھنائی کر دیتا۔ چار چوٹ کی مار کھا کر بھی وہ اس کی خدمت کرتی' گرم گرم کھانا کھلاتی۔ پاؤں دابتی' صبح سویرے بچی چمٹائے دَھندے پہ بھی نکلتی۔ ایک صبح سردیوں کا یہ عالم کہ سردی سے دانت بھی کٹکٹانے لگے۔ باپ کو جگانے کے لئے ہاتھ لگایا تو وہ سل وٹہ بن چکا تھا۔ لمبی رات کے کسی پہر اس کی آتما' تیز کے کسی سوراخ سے خارج ہو گئی تھی۔ اکڑی ہوئی اکڑوں لاش کو قابل قبول حالات میں لانے کے لئے کنستر پانی گرم کرنا پڑا۔۔۔ اب ان کے جھونپڑے میں سوا دو جی رہ گئے تھے۔ اللہ بچایا اس لحاظ سے خوش قسمت نکلا کہ جلد ہی ساس سسر کے جھمیلوں سے آزاد ہو گیا تھا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد جیسے پھولاں کو بھی صبر آ گیا ہو۔ بوڑھی ہڈیاں تھیں' کب تک سینت سینت رکھتی' خاوند بھی ہوائی گولا ملا۔ خاوند کے حقوق میں اسے صرف ایک کام ہی آتا تھا جس کے نتیجے میں وہ بچی کی ماں بنی تھی۔ باقی سارے کام' ذمہ داریوں سے اس نے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ تنگ پڑ کر پھولاں نے اسے وعدہ یاد دلایا کہ شادی کے بعد وہ باہر کام دھندا نہیں کرے گی۔

"ہاں' ہاں۔ مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔ مَیں نے بتیری کوشش کر لی ہے' دَھندے پہ بھی بیٹھا ہوں۔۔۔ میرے پاس کوئی گاہک ہی نہیں آتا۔ سارا دن نیستی سستی۔۔۔ پتھر پہ بیٹھے بیٹھے چولیں ہل جاتی ہیں۔ تو جاتی ہے تو چار پیسے کما لاتی ہے' مَیں کسی اور کام دھندے کی فکر میں ہوں۔"

پھولاں سمجھ گئی تھی کہ یہ اب کچھ کرنے کا نہیں۔ جو مَرد ایک بار اپنی یا پرائی عورت

کی کمائی کا ایک لقمہ بھی حلق سے نیچے اتار لے وہ مرد پھر ٹھنڈا بے غیرت بن جاتا ہے۔ وہ پھر محنت کرنے کے قابل نہیں رہتا' خون پسینہ ایک کر کے کما نہیں سکتا۔ وہ ہمیشہ کے لئے ٹھن ٹٹ' ہڈ حرام بن جاتا ہے۔ تاش پتوں' شطرنجوں کی چوپالوں میں' دین و دنیا و مافیہا سے بے نیاز' تھڑوں پارکوں بارہ دریوں' مزاروں درباروں' بلیرڈ کلبوں' پان سگریٹ کی دوکانوں پہ وقت پاس کرتے اکثر لوگ اسی قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بیویاں' بہنیں' بیٹیاں' مائیں' کوٹھیوں' سکولوں' دفتروں' گھروں میں کام کر رہی ہوتی ہیں اور یہ صرف خرچہ پانی لینے اور کھانے پینے کے لئے گھر جاتے ہیں۔ ان بے غیرتوں کی نہ تو گھر میں عزت توقیر ہوتی ہے' نہ معاشرے میں کوئی مقام۔ حرام کھا کھا کر یہ اتنے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں کہ ان کے کانوں تلے جوں تک نہیں رینگتی بلکہ محظوظ ہوتے ہیں۔ اللہ بچایا کے منہ بھی حرام لہو جم چکا تھا۔ پہلی بچی ابھی پالنے میں ہمک رہی تھی کہ دوسری ڈال سے ٹپک پڑی۔ یہ بچی بھی بڑی خوبصورت تھی' ملیح رنگت' نگینوں کی مانند تاب دار نین نقش تھے۔

"اب تو بھی کچھ کہہ لے' میں دو بچیوں کو لے کر وہاں نہیں بیٹھ سکتی---" وہ تنگ آ کر کہنے لگی۔

"میں کیا کروں' میرے مطلب کا کوئی کام ہی نہیں ملتا--- میں بچیوں کو سنبھال لوں گا' تو دھندا نہ چھوڑو---"

"دودھ تو وہ میرا ہی پییں گی' ننھی بچیاں ماں بن کیسے رہ سکتی ہیں۔ بگ موت' پھر بازار--- میں کل سے دھندے پہ نہیں جاؤں گی۔" اس نے آخری فیصلہ سنا دیا۔

کسی نے رنگ سازی کا مشورہ دیا تو آس پاس کوٹھیوں میں ٹھیکے پہ کام لے لیا۔ محنت مشقت کا وہ عادی نہیں تھا' کچھ پرانے رنگ کرنے والے ساتھ رکھ لئے' خود اوپر نگرانی اور حساب کتاب پہ بیٹھ گیا۔ پہلا ٹھیکہ مکمل ہونے سے قبل ہی اس کی چیں بول گئی۔ کاریگروں نے رنگ پالش اور دیسازیوں میں ایسا رگڑا دیا کہ اس کا دماغ ٹن ہو گیا۔ مالکوں نے ادھورے اور غیر معیاری کام کی وجہ سے بقایا ادائیگی روک لی اور اس کے حوالے ہو گئے۔ بڑی مشکل اور خاصے نقصان کے بعد یہ پھر اڈوں پہ بیٹھ گیا۔ پھولاں بے چاری گھر پڑی ہوئی بھی کچھ نہ کچھ دال دلیا کر لیا کرتی تھی' بچیوں اور کھانے پکانے سے جو بھی وقت ملتا وہ چھاج' دستی پنکھے وغیرہ بنا لیتی۔ خاوند کی نظر سے اوجھل کچھ بچت بھی سنبھال رکھی

تھی۔ ادھر اللہ بچایا نے ایک خاصی رقم ٹھیکے داری میں نقصان کی مد میں سر پہ چڑھا رکھی تھی' سود خور پٹھانوں نے اس کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ یہاں بھی پھولاں کام آئی۔ مری ماں کا کچھ اندوختہ زیور کی شکل میں تھا' کچھ اپنا' کچھ جمع پونجی' بڑی مشکل سے پٹھانوں سے نجات حاصل کی۔ پھولاں یہ نہ کرتی تو پٹھانوں کے پاس ہوتی--- اللہ بچایا کو اب بھی ہوش نہ آئی۔ بھنگ' چرس' مدک' جو بھی میسر آتی بڑک جاتا۔ چوبیس گھنٹے نشے میں پڑا سڑتا رہتا۔ پھولاں بھوکی پیاسی نڈھال محنت کرتی رہتی۔ بچیاں ادھر ادھر گندگی میں منہ مارتی رہتیں--- اچھی بُری زندگی کسی نہ کسی طور کٹ رہی تھی مگر جب ایک شام چولہا نہ جلا تو وہ جل بھن کر پھولاں کے حوالے ہو گیا۔

"بچیوں اور خصم کو بھوکا پیاسا مارے گی؟--- صبح سویرے کہیں کام دھندے پہ نکلو' کسی کوٹھی بنگلے میں کام پکڑ' شام کو پکا پکایا تو لے کر آئے گی---"

"چھوٹی بچیاں' ان کو یہاں پھینک کر کہاں جاؤں--- تجھے نشے پانی سے فرصت ملے تو تیرے سپرد کر کے کہیں مروں' جاؤں---"

"زیادہ زبان نہ چلا' میں انہیں سنبھال لوں گا۔ صبح تو مجھے یہاں نہ دِکھے--- مائی تبو کو دیکھے ہے' بڈھی ہے مگر کوٹھی میں کام کرتی ہے۔ شام کو اچھے اچھے کھانے' کپڑے' خالی ڈبے' بوتلیں اور ردی اخبار لاتی ہے۔ کیسی اچھی گزران کرے ہے تو تو ابھی مائی نہیں ہے۔ جوان ہے' خوبصورت کسی کسائی ہے۔ محنت اور ذرا میٹھی زبان دکھائے گی تو سب دلدر دُور ہو جائیں گے---"

پھولاں کو کون سمجھاتا' وہ تو سب سمجھتی تھی کہ وہ اسے کیا سمجھا رہا ہے۔ وہ تو بھاٹی چوک کی فارغ التحصیل تھی۔ اس نے تو فقط چاہا تھا کہ کوئی ایسا چاہنے والا ملے جو اسے گھر بٹھائے۔ پیار اور آسرا دے' اس کے اندر کوئی بول اٹھا کہ تو ایسا چاہ تو سکتی ہے' سوچ سکتی ہے مگر ایسا ہو جائے' یہ تیرے بس میں نہیں۔ صدیوں کی پرانی ریت' طور طریقے' اصول اور ذہنیت کبھی نہیں بدلے گی۔ بیمار کو شفاخانے نہیں لے جایا جاتا بلکہ اس کی معذوری' لاچاری کیش کرائی جاتی ہے۔ بوڑھی بوڑھے کو تخت پہ نہیں' کسی درخت کے نیچے لٹا کر بھیک منگوائی جاتی ہے۔ حاملہ کو آرام کا موقع فراہم نہیں کیا جاتا بلکہ ایک اور بچہ اس کے سینے پہ چڑھا کر کسی چوراہے میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ یہاں کسی کے ناسور پھوٹ پڑے تو

اس کی لاٹری لگ جاتی ہے' ہاتھ پاؤں ٹوٹ جائیں تو چاندی ہو جاتی ہے' اور تو اور ان کے مُردے بھی قبروں میں اترنے سے پہلے سینکڑوں ہزاروں' لواحقین کی گود میں ڈال جاتے ہیں ـــ رات بھر وہ سوچوں اندیشوں کے شمشان گھاٹ پہ اَدھ جلی لاش کی مانند سلگتی رہی۔ صبح سویرے وہ انگارہ سی سرخ آنکھوں پہ برف کے ٹھنڈے پانی کے چھپکے ڈال کر دُھواں دُھواں سی دوسری عورتوں کے ساتھ کسی کام دھندے کی دُھن میں نکل آئی۔ پھر وہ دن' یہ دن' وہ مشقت کی چکّی میں دَھڑا دَھڑ پستی رہی۔ کہیں کام کا جھگڑا' کہیں تنخواہ کی تلخی' کہیں کام چوری اور چوری کا الزام' کہیں بَدزبانی تو کہیں بَدنگاہی۔ یہ کوٹھی' وہ کوٹھی' وہ ٹھوکروں میں پتھر کی طرح لُڑھکتی رہی۔ مسلسل ٹھوکریں کھاتے کھاتے تو پتھر بھی فاختہ کا انڈا بن جاتا ہے۔ اس نے بھی اپنے آپ کو حالات کے دھارے پہ رکھ دیا تھا۔ اسی دھارے نے اسے ایک فلمی گھرانے میں لا پھینکا۔ اس فلمی گھرانے نے کئی ایک ہٹ فلمیں بنائی تھیں۔ پڑھے لکھے لوگ تھے' جیبیں بھاری اور دسترخوان وسیع تھا۔ دن رات فلمی لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا ـــ کبھی ریہرسل تو کبھی میوزک بن رہا ہے۔ بنی سنوری ایکٹریسیں' خوبرو ایکٹر' ہیرو۔ ہر وقت گہما گہمی اور دعوتیں ہوتی رہتیں۔ شروع شروع تو یہ صفائی پہ لگی' بعد میں کچن میں آ گئی۔ صابر اور محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ قدرے سلیقہ شعار اور ہوش مند بھی تھی۔ گھر والوں کی نظر میں ایسی جچی کہ گھر کا فرد ہی بن گئی' مجلسی طور طریقے سیکھے۔ زبان سیدھی ہوئی تو خوش گفتاری میں گلفشانیاں کرنے لگی۔ خوراک' آسودگی میسر آئی تو چہرے پہ نکھار بھی آ گیا۔ اعتماد کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے وہ اب اعتبار کے ایسے مقام پہ پہنچ گئی کہ گھر کے اکثر معاملات میں دخیل ہو گئی۔ اندر باہر کی چابیاں اس کے پلّو سے بَندھی ہوتیں۔ ظاہر باطن کا ہر راز اس کے پاس تھا۔ فلمساز' ہدایت کار کی بیگم صاحبہ اس پہ خاص طور پر مہربان تھی۔ اپنے پرانے کپڑے' جوتے' میک اپ کا بچا کھچا آؤٹ آف ڈیٹ سامان اسے دے دیا کرتی تھی۔ بچا بچایا کھانا' ناشتہ تو خیر اس کا حق تھا جسے وہ جاتے ہوئے ساتھ لے جاتی تھی۔ گھر کا ماحول سٹوڈیو جیسا تھا۔ ایکٹر' ایکٹرسوں کے نت نئے فیشن' لباس کے ڈیزائن' میک اپ دیکھ دیکھ کر اس نے بھی شُدبُد لے لی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اپنے نقشے بدلنے لگی۔ سگریٹ تو وہ پہلے ہی پیتی تھی' فرق یہ پڑا کہ اب وہ بڑھیا سگریٹ پینے لگی۔ عورت سگریٹ پیتی ہوئی بڑی گھٹیا لگتی ہے لیکن ایک آدھ عورت

ایسی بھی ہوتی ہے جو سگریٹ پیتی ہوئی بڑی ہی اچھی لگتی ہے۔ سگریٹ نکال کر سلگانا' ہولڈ کرنا' ہونٹوں سے لگانا اور پھر بوسے دے دے کر اس کا جی جلانا۔ گو اس میں ایسی چیزیں نہیں تھیں لیکن کوئی نہ کوئی ادا ایسی ضرور تھی کہ یہ سگریٹ نوشی کے وقت مکروہ نہیں لگتی تھی۔ بھنگ اور چرس بھی اس نے چکھ رکھی تھی لیکن برانڈی' وسکی اور بیئر کی چسکیاں اسے یہیں نصیب ہوئی تھیں۔ اسے ہر بات کی خبر تھی کہ میوزک بناتے وقت میوزک ڈائریکٹر کے لئے انڈین مالٹے وسکی کا پَوا آتا ہے۔ فلاں ہیرو سکاچ طلب کرتا ہے' فلانی ہیروئن فرنچ شیری لیتی ہے۔ خود ہدایت کار صاحب واڈکا سے گزارا کرتے ہیں جبکہ چھوٹا بھائی چھُپ چھُپ کر جو ہتّے چڑھے' چکھ لیتا ہے۔ وہ تلچھٹ لبڑی خالی بوتلیں اور ڈبے جمع کر لیتی۔ ایک بوتل میں سوڈا یا پانی ڈال کر کھنگالا کرتی اور اسی طرح ساری بوتلیں ڈبے کھنگال کر ایک بوتل کاک ٹیل بنا لیتی جو اصل سے زیادہ زُود اثر اور مزیدار ہوتی ـــ اس کے اصرار پہ ایک دن بیگم صاحبہ نے اس کی پِکنک کر دی' ایک پرانا سیٹ' بال سیٹ کرنے والے کلپوں کا عطا کر دیا۔ پھولاں تو وہ پھولاں ہی نہ رہی جس میں بنجاروں کی فطری بے باکی اور الہڑپن تھا۔ اب اس کی چال ڈھال' انداز' لباس و تراش اور ہلکے سے میک اپ کو دیکھ کر کسی فلمی ایکسٹرا لڑکی کا احساس ابھرتا تھا۔

"اے' اللہ بچایا! کس کھائی میں اترا پڑا تو۔ دس منٹ کا کام' کہاں گم ہے؟ ـــ بڈھا بڑی تکلیف میں ہے' جلدی گڑھا کھود۔"

اس کا ہمسایا بھولا اسے گم صم کھڑا دیکھ کر کہہ رہا تھا۔ ماضی کی سکرین پہ چلتی ہوئی فلم جیسے ایک دم ٹوٹ گئی۔ آنکھیں میچے' سر کو جھٹکا سا دے کر جیسے اس نے خود کو بیدار کیا اور اپنے آپ میں واپس آیا۔ نقوش کیسے ہی بوسیدہ اور مدہم ہوں' اپنی بنیادی ہیئت و حیثیت کبھی ضائع نہیں کرتے۔ وہ اپنی نشاندہی خود ہی کرتے ہیں۔ چمکتے دمکتے بلاق کے پیچھے مٹی کو جو اس کی ماں بلاقی کی جگہ آئی تھی' وہ پہچان چکا تھا۔ پھر اچانک اس کی نظر' گھاس پھوس پہ گندگی کی طرح ڈھیر اپنے باپ پہ پڑی۔ سفیدی چڑھی ہوئی داڑھی' جھریوں کا جال' خستہ حال' کھرنڈوں سے گھبرایا ہوا لاغر جسم۔ اسے بھی پہچاننے میں مطلق دیر نہ لگی۔ اس کی مدھم سی یادداشت بڑی مضبوطی سے اس کی گرفت میں آ چکی تھی۔ اس کی مری ہوئی ماں بلاقی کی روح جیسے اس کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔ کتنے برس بیت گئے تھے۔ اتنے برسوں

شاید ہی یہ لوگ اسے یاد آئے ہوں اور یاد بھی کیا کرتا' کیسے کرتا؟ اس ظالم باپ کو جو اس کی ماں کا قاتل تھا' مِٹھی کو جو اس کی ماں کے قتل کا رن تھی۔ ان لوگوں نے اس سے اس کا بچپنا چھینا۔ گھر سے بے گھر اور دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے پہ مجبور کر دیا۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ ہونٹ تھر تھرانے لگے۔ ماتھا پسینے سے بھیگ گیا۔ اسی اثنا' جانے مَستا کو کیا سوجھی کہ لٹھیا کے سہارے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ دو قدم پرے سائے میں ہٹنے کی کوشش میں لٹھیا زمین پر ٹکائی' ٹیک لیتے ہی دھڑم سے نیچے آ رہا۔ لٹھیا گوبر کے گوتڑے میں دھنس گئی تھی۔ دوسرے لوگ مصروف تھے۔ یہ اسے دیکھ رہا تھا۔ بجلی سی سرعت سے آگے بڑھا اور باپ کو گود میں بھر لیا۔ کچے پکے کھنڈ چھل گئے۔ لہو' پیپ' بدبو' بھبکے' سڑن سے اس کا دماغ جل گیا۔ مِٹھی بھی دہاڑ لگاتی لپکی۔ پانی پَر وسا۔ باپ کو اٹھائے وہ اپنے جھونپڑے میں لے آیا۔ کھٹیا پہ لٹا کے زخم صاف کرنے لگا۔ ہانک لگا کر اللہ بچایا نے ان کے جھونپڑے کا کام رکوا دیا اور سارا سامان سرکوا کر پاس ڈال لیا۔

"بابا' میّا میرے جھونپڑے میں رہیں گے۔ یہ میرے اپنے مائی باپ ہیں۔" باپ کے سڑے سینے پہ سر ٹکا کر پِھس پِھس رونے لگا۔ "بابا! دیکھ' مَیں تیرا اللہ بچایا ہوں--- دیکھ' مجھے پہچان۔ مَیں تیرا بچہ ہوں---"

مِٹھی نے آگے بڑھ کر اسے گہری نظروں سے تولا۔

"ہائے' میرا بچہ---!"

دہاڑ لگا کر سینے سے چمٹا لیا۔ آس پاس بستی والے یہ انوکھا ملاپ دیکھ رہے تھے۔ اللہ بچایا کی دونوں لڑکیاں بھی کونے میں سہمی کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ڈرتے ڈرتے آگے بڑھ کر بابا کی کھٹیا کے پاس کھڑی ہو گئیں۔

"یہ تیری پُتریاں ہیں' بابا! میری اپنی بیٹیاں۔ ان کو دیکھ' یہ بڑی سیوا کریں گی۔ ان کے سر پہ ہاتھ رکھ---"

پوتیوں کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے مَستا پوچھنے لگا۔ "تیری عورت کدھر ہے' اللہ بچایا---؟"

"وہ کام دھندے پہ گئی ہے' شام کو آوے گی۔" تیرے لئے اچھا سا کھانا لاوے گی' پیٹ بھر کے کھائیو---

شام کے بعد رات' صبح کے بعد پھر شام' رُتیں بدلتی گئیں۔ موسموں پہ موسم آتے گئے۔ میمنے' بکرے بن کر بڑی عید پہ بکتے گئے۔ سُرمیلے نینوں والے گدھیوں کے بچے' گدھا ریڑھیوں کے ساتھ بھاگتے بھاگتے پورے گدھے بن گئے۔ بستی میں کئی بچے پیدا ہوئے۔ دو چار بوڑھے بوڑھیاں لُڑھک بھی گئے۔ ایک دو حرام زایاں کہیں نکل گئیں۔ کئی مرتبہ پولیس کی ریڈ پڑی' کارپوریشن والوں سے پھَڈے پڑے اور دو تین حکومتیں بدل گئیں مگر نہ بدلے تو ان کے اطوار نہ بدلے۔ اللہ بچایا' اب خاصا خوشحال اور بَداطوار ہو گیا تھا۔ بستی والے اس کی قسمت پہ رشک کرتے تھے۔ پھولاں نے جھونپڑے کو کسی خوبصورت کاٹیج میں تبدیل کر دیا تھا۔ بیٹری والا ٹرانزسٹر ریڈیو' ٹیپ۔ نئے نئے فیشنوں والے لباس۔ دو پرانے صوفے جن پر پھولدار ریشمی کپڑا منڈھا ہوا تھا۔ کپڑوں کی الماری' کھانے والی ٹرالی' فرش پر پرانا قالین' ٹوٹے لیکن الفی جڑے ہوئے ملتانی مٹی کے گلدان' برتن' گلاس' کونے سے ٹوٹا ہوا بڑا سا آئینہ۔ اپنے فلمی مالک کی فلموں کی تصویریں' پوسٹر۔ ایک فریم کی ہوئی تصویر جس میں فلمی ایکٹروں کے پیچھے وہ کھڑی مسکرا رہی تھی--- پھولاں صبح سویرے' منہ اندھیرے نکل جاتی اور شام گئے یا رات کے کسی پہر واپس لوٹتی۔ کبھی تو رات بھی واپس نہ پلٹتی۔ مِٹھی سارا دن کٹیا میں سڑتی رہتی یا پھر پوتیوں کے سر سے لیکھیں' جوئیں کھوجتی رہتی۔ بابا مَستا' بھنگ پیئے اونگھتا رہتا۔ مسلسل آرام اور ڈھنگ کے کھانے پینے سے ہاتھ پاؤں میں بھی دَم آ گیا تھا۔

پھر اللہ بچایا کے رویئے میں اِک دم تبدیلی سی آ گئی تھی' وجہ نہ جانے کیا تھی۔ ایک سہ پہر باہر سے آیا تو ریڑھے پہ ایک چھوٹی سی چار پہیوں والی ریڑھی دھر لایا۔ اس کے پہیوں کے ساتھ سائیکل کی چین اور پیڈل لگے ہوئے تھے۔

"بابا! یہ تیرے لئے بنوائی ہے۔ اس پہ ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ جایا کر--- پاس ہی بکر منڈی ہے۔ بڑی کاروباری جگہ ہے' بوچڑ خانہ بھی ہے۔ ایک تو تیرا دل لگا رہے گا اور چار پیسے بھی کمائے گا۔" مِٹھی سے کہنے لگا۔ "صبح پھولاں کے ساتھ ہی نکل جائیو' کسی کوٹھی میں کام دلوا دے گی۔ اس کی بڑی واقفیت اور عزت ہے---"

اچھا ہوا کہ بھیرو اور خیرو اس کی لڑکیاں پہلے ہی ایک اچھے گھر میں صفائی پہ لگی ہوئی تھیں ورنہ آج وہ انہیں بھی دیس نکالا دے دیتا۔ اس ساری کارروائی کی وجہ یہ تھی کہ دو

روز پہلے گڈھا ریڑھی ریس میں اچھی خاصی رقم ہار گیا بلکہ مقروض ہو گیا تھا۔ پہلے پٹھانوں کے ہتھے چڑھا تھا' اب اعوانوں کی گرفت میں آگیا تھا۔ جنہوں نے قرضے کی واپسی کے لئے بڑی قلیل مدت دی تھی۔۔۔ باپ بے چارا اب سارا دن بکرمنڈی میں ریڑھی میں پڑا' نرخرے کٹے بکرے کی طرح ڈکرا ڈکرا کر بھیک مانگتا رہتا اور شام سے ذرا پہلے غلیظ پٹیوں سے جکڑے ہوئے ہاتھوں سے اپنی سڑی لاش کو دھکیلتا دھکیلتا واپس آ جاتا۔ یہ نہلا دھو' کپڑے پہن' انتظار میں ہوتا۔ کسی سخت گیر منشی کی مانند دھیلے دھیلے کا حساب پورا کرتا۔ کپڑوں' ریڑھی کی تلاشی لیتا۔ روپے ریزگاری اڑوس کر باہر نکل جاتا۔ شاہ جمال پہنچتا' قبرستان کے تکئے میں دَم سوٹا لگاتا۔ ریڑھیوں پہ ہار جیت کر کے کسی پہر رات واپس پلٹتا۔ کسی وقت تو کرائے کے لئے پلّے دَھیلا نہ ہوتا۔ نشے اور ہار کی ترنگ میں براستہ میانی صاحب' چوبرجی پیدل مارچ کرتا ہوا آتا۔ پھولاں پہنچی ہوتی تو آتے ہی اس سے روپوں پیسوں کا تقاضا ہوتا۔ کامیابی یا ناکامی' ہر دو صورت میں صبح تک چیخ چیخ کا بازار گرم رہتا۔

پھولاں نے اپنی ساس مِٹھی کے لئے کئی گھر دیکھے مگر مٹھی کو کسی نے نہ قبولا اور نہ ہی اسے کسی بھرے پُرے گھر میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ عمر اور جسمانی حالت بھی ایسی تھی کہ اس پر ترس کرتے ہوئے کھانا کھلا کر کسی جگہ بٹھا دیا جائے۔ اس کے مالکوں کے ہاں بھی اس کے لئے قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اللہ بچایا کے خوف سے وہ ہر صبح اسے اپنے ساتھ نکال لاتی اور اپنے مالکوں کی کوٹھی سے پانچ چھ کوٹھیاں آگے ایک درخت کی چھاؤں میں بٹھا دیتی۔ ساتھ ہی ایک خالی پلاٹ تھا جو کوڑا کرکٹ سے بھرا ہوتا تھا۔ یہیں بیٹھی بیٹھی وہ اُونگھ بھی لگا لیتی' ضرورت کے وقت پلاٹ میں کاٹھ کباڑ کی اَوٹ میں فارغ بھی ہو لیتی۔ پھولاں دوپہر' سہ پہر جب بھی موقع ملتا' بچا کھچا کھانا اس کے آگے رکھ جاتی۔ شام یا رات اگر وہ وہاں موجود ہوتی تو ساتھ ہنکالے جاتی یا اکثر مِٹھی خود ہی وقت بے وقت کٹی پھٹی کنَی مارتی ہوئی پتنگ کی طرح جھونپڑ بستی جا گرتی۔

غزالِ وقت نے ایک اور ہلکی سی زقند لگائی۔۔۔ مِٹھی کے ہاتھ' پاؤں' چہرے کی جھریوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ قوا کمزور' اعصاب مزید ڈھیلے' یادداشت نحیف اور دماغ مختل ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بچاری زندگی میں اتنی قلابازیاں کھا چکی تھی کہ اب اسے اُلٹا سیدھا' بُرا بھلا' دکھ سکھ کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے لئے ریت' شکر برابر تھی۔

ٹک ٹک دیدم' جہاں نگاہ جمتی' قلفی ہو جاتی۔ اس کی بیماری نے بیکاری کی شکل اختیار کر لی تھی' ادھر پھولاں بھی اب بیزار سی ہو گئی تھی۔ بھول بھلکڑی کی حد تھی کہ ایک صبح صرف شلوار میں ہی نکل کھڑی ہوئی۔ بچے چھل پیری سمجھ کر ڈر گئے۔ روٹی سر پہ رکھے' دوپٹہ چابنے لگی۔ کھینچ کھانچ کر نکالا تو اوپر کے باقی دو دانت بغیر کسی خون خرابے تکلیف باہر گر پڑے۔ اللہ بچایا نے اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ وہ کون سی اس کی سگی ماں تھی اور اگر سگی بھی ہوتی تو کیا سنوار لیتا۔ کب آتی ہے' کہاں جاتی ہے' کیا کھاتی ہے؟ وہ ان تمام جھنجھٹوں سے جان چھڑا بیٹھا۔ اب وہ ایک بوڑھی گائے کی مانند تھی۔ جو سارا دن اپنی مرضی سے جہاں چاہے گھومتی رہتی ہے بول بَراز پہ منہ مارتی رہتی ہے اور شام کو اپنے ٹھکانے پہ خود ہی واپس پہنچ جاتی ہے۔ جہاں گوالا اس کا دودھ دوہنے کا منتظر ہوتا ہے۔

کویت والے بوڑھے حاجی صاحب کے ٹھنڈے دودھ میں جانے کیا تاثیر تھی کہ مِٹھی اسی تھان پہ خود بخود بندھ گئی۔۔۔ کئی برس پہلے وہ اس ارادے سے پاکستان آئے تھے کہ یہیں جئیں مریں گے۔ چالیس برس پردیس کی خاک پھانکی' جوانی میں وہیں ایک کویتی دولتمند بیوہ سے شادی کر لی تھی۔ اولاد پیدا ہوئی' جوان ہوئی۔ کاروبار میں بے انداز دولت کمائی مگر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے بوڑھے باپ سے منہ موڑ لیا۔ بیوی بچوں نے خارجی پاکستانی ہونے کا طعنہ دیا۔ کویتی بیوی نے بھی بچوں کا ساتھ دیتے ہوئے خاوند سے علیحدگی کر لی۔ بھلے وقتوں میں لاہور کچھ جائیداد بنالی تھی۔ تن کے تین کپڑے اٹھائے اور ہمیشہ کے لئے کویت چھوڑ دیا۔ وہ دن' یہ دن۔ بیوی بچوں نے بھولے سے بھی خبر نہ لی۔ دلبرداشتہ سے دل پہ بیوی کی بے وفائی' اولاد کی ناخلفی کا داغ لئے راضی برضا ہو کر زندگی کے دن پورے کرنے لگے۔ کیا کھویا' کیا پایا۔ سب کچھ فراموش کر دیا۔ مرنجاں مرنج طبیعت' صابر' قانع' وضع دار۔ لوٹا رکھے' مُصلا بچھائے اللہ اللہ کرتے تھے۔ کوئی دَم خم ہوتا تو شاید مناکحت کا سوچتے۔ سر پہ بڑھاپے کی اَوس پڑی ہوئی تھی' اب کیا اَولے کھاتے۔۔۔ ویسے بھی عورت ذات سے لرزیدہ تھے۔ دس مرلے کی ہر آسائش و ضرورت سے آراستہ کوٹھی' کار تھی۔ خاموش' متین' خوددار' جمعرات کو داتا دربار چلے جاتے۔ گھر پہ پودے پال اور کتابیں سنبھال رکھی تھیں۔ زیادہ تر کتابوں میں وہ ڈوبے رہتے۔

ایک شکر دوپہر بالکونی میں پڑے برتن میں چڑیوں کے لئے ڈبل روٹی کے بھُورے بھگو

رہے تھے کہ سامنے سڑک کے کنارے نیم کے درخت کے نیچے ایک بڑھیا کو بے دم سا ہانپتے ہوئے دیکھا' تنے سے ٹیک لگائے بے سُدھ سی پڑی تھی۔ جانے کیا سوجھی کہ ٹھنڈے میٹھے دودھ کا گلاس لئے اس کے سر پہ جا پہنچے۔

"بہن! یہ لو' دودھ پی لو---"

خشک ہونٹ' بے جان مُندھی مُندھی آنکھیں۔ اس نے کوئی جواب دیئے بغیر دودھ کا گلاس کانپتے ہاتھوں' ہونٹوں سے لگایا۔ گندے پھٹے پلّو سے مُنہ پونچھا اور بغیر کچھ بولے اُٹھ کر ایک طرف کو چل دی۔ جو کام اللہ کی رضا یا انسانی خدمت کی نیت سے کیا جاتا ہے۔ اس کے لئے کسی صِلے' تحسین و تعریف کی تمنا بھی نہیں ہوتی۔ وہ کوئی بھی بات مثلاً بھلا ہو' خیر ہو یا شکریہ! کچھ بھی تو نہیں بولی۔ شاید گونگی تھی۔ نہیں' وہ گونگی نہیں ہو سکتی۔ وہ کوئی انتہائی دکھیا' ٹوٹی پھوٹی' غریب بوڑھی عورت تھی۔ جس کے پاس شاید الفاظ کا آسرا بھی نہیں تھا۔ جس کا چہرہ بولتا ہو' آنکھیں بولتی ہوں اسے بھلا لبوں کو اِذنِ تکلم دینے کی کیا حاجت؟--- حاجی صاحب اسے مرے مرے قدموں سے جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس کا سایہ' اس کے قدموں میں پیچھے سرک رہا تھا۔ وہ اسے دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرا دیئے۔ جب کوئی کچھ دے کر ہاتھ یا دامن خالی کر لیتا ہے تو اس کا دل خوشگوار سی خوشیوں سے بھر جاتا ہے لیکن نہ جانے کیوں ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ ٹھنڈا ٹھنڈا نم آلود خالی گلاس ان کے ہاتھ میں تھا۔

دوسرے یا تیسرے روز صبح ہی صبح' گھنٹی کی آواز پہ انہوں نے نیچے جھانکا تو دیکھا کہ وہی پیاسی بوڑھی مائی ایک جواں سال بنی ٹھنی عورت کے ساتھ کھڑی تھی۔

پھولاں' اپنی ساس مائی مِٹھی کو لائی تھی۔ حاجی صاحب نیچے پہنچے تو اس خاتون نے آگے بڑھ کر بڑی شائستگی سے سلام کیا اور بڑے ادب سے کہنے لگی۔

"حاجی صاحب! یہ میری مائی ہے' بہت اچھی اور ایماندار ہے۔ بس ذرا بوڑھی اور بیمار ہے مگر کام کی محنتی ہے۔ مَیں جانتی ہوں کہ آپ گھر میں نوکر دوکر نہیں رکھتے لیکن مَیں بڑی آس امید لے کر آئی ہوں۔ آپ بھی بزرگ ہیں اور یہ بھی بوڑھی' چھوٹے موٹے کام کر دیا کرے گی اور آپ جو بھی دیں گے' لے لے گی بس آپ اسے رکھ لیں---" وہ بولے جا رہی تھی اور مائی مِٹھی بے نیاز بے زار سی خالی نظروں سے' کیچڑ چاٹتے ہوئی اس

کُتیا کو تک رہی تھی جس کے کتورے چند روز پہلے کمیٹی والوں کو کُچلا آلود کلیجی چاٹ کر مر گئے تھے۔ بکرے اور بکروال کی مَیا کب تک خیر منائے گی' ایک نہ ایک دن قصائی اور کمائی کی چھُری تلے آئے گی۔ "میرا نام پھُولاں ہے' مَیں شاہ صاحب فلم والوں کے گھر عرصہ سے کام کر رہی ہوں۔ انہیں تو آپ جانتے ہوں گے' میرے بارے میں آپ ان سے تصدیق کر لیں۔ مَیں اپنی مائی کی ضمانت دیتی ہوں۔"

وہ اپنی ہانک رہی تھی۔ حاجی صاحب نہ جانے کہاں گم تھے اور مائی مِٹھی رَبّ جانے کہاں کھوئی ہوئی تھی۔ ہر کوئی اپنی اپنی کہہ' سُن اور سوچ رہا تھا--- پھولاں اپنی سی کہہ سن کر خاموش ہو گئی اور حاجی صاحب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

"میں آپ کے لئے کچھ پینے کے لئے لاؤں---"

پہلی بار مائی مٹھی نے خشک ہونٹوں پہ زبان پھیرتے ہوئے' حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ مائی مٹھی اور پھولاں شربت ملے ٹھنڈے دودھ سے اپنی اپنی پیاس بجُھا چکیں تو حاجی صاحب نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"میرے لائق کوئی خدمت---؟" جیسے انہیں علم ہی نہیں کہ وہ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں۔

پھولاں پھر شروع ہو گئی تو حاجی صاحب بولے۔

"بیٹا! مجھے کسی ملازم کی ضرورت نہیں' مَیں اپنے چھوٹے موٹے کام خود ہی کرنے کا عادی ہوں اور پھر مَیں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔" حاجی صاحب نے سو روپے کا نوٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو' یہ کچھ پیسے رکھ لو۔ میرا خیال ہے' تمہاری ماں کو دوا اور خوراک کی ضرورت ہے--- ضرورت پڑے تو اور لے جانا۔"

مائی مِٹھی نے پہلی مرتبہ زبان ہلائی۔ "حاجی صاحب! بِن مانگے آپ نے میری پیاس بجھائی تھی۔ دودھ تو بہت پیا' پر اس دن یوں لگا جیسے دودھ تو آج پیا ہے' اندر کی سڑن اور آگ پہ جیسے ٹھنڈک سی پڑ گئی تھی۔ آج بھی آپ نے بن مانگے دودھ شربت پلایا۔ حاجی صاحب! آپ سیٹھ صاحب ہیں۔ جب چاہیں' ثواب خرید سکتے ہیں۔ کیا ہم غریب لوگوں کو ثواب بھیک میں بھی مانگنے کا حق نہیں؟--- مَیں آپ سے آپ کی خدمت کرنے کی بھیک مانگتی ہوں' ثواب کے لئے---" وہ کانپتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر مِنّت کرنے لگی۔

پھر لمبا عرصہ گزر گیا۔ مائی مٹھی، حاجی صاحب کے ہاں کام کرتی تھی۔ کام کیا کرتی تھی، بس صبح سویرے آتے ہی رات کا بکھرا ہوا اَلم غَلم اٹھاتی۔ اخبار، رسالے، کتابیں، برتن، لگے بندھے انداز میں وہ سب سمیٹ سنبھالا کرتی رہتی۔ کپڑے، تکئے، چادریں اپنی اپنی جگہ جماتی اور اپنے آپ سے باتیں بھی کرتی جاتی۔

"کھانا جیسے چکھا تک نہیں، ویسے کا ویسا دھرا ہے۔ شام کو کہیں گے کہ مائی، گھر لے جاؤ۔۔۔"

اپنے مردِ مَستا کی باتیں، اللہ بچایا کے قِصّے، پوتیوں کی شرارتیں، بستی والوں کے حالات۔ حاجی صاحب سُنی، اَن سُنی کرتے رہتے۔ دوپہر تک صفائی ستھرائی، کھانا پکانے سے فارغ ہو کر جمائیاں توڑنے لگتی۔ یہ الارم ہوتا کہ میں اَب تھک گئی ہوں، اب ذرا کمر سیدھی کر لوں۔ کمر پہ ہاتھ رکھے، اُوپر کی منزل پہ چلی جاتی۔ ہاتھ روم میں معلوم نہیں کیا کرتی رہتی۔ پھر ورانڈے میں چلمن کے پیچھے چارپائی پہ چِت پڑ جاتی۔ حاجی صاحب کے لئے اس کا وجود ہونے، نہ ہونے کے برابر تھا۔ دُوبدَوبات کرنے کا موقع بھی بہت کم میسّر آتا۔ دونوں ایک دوجے کے قریب ہونے کے باوجود بھی بہت دُور دُور تھے۔ شاید دونوں کے لئے ہی انسانی یا خونی رشتے بیکار تھے۔ دونوں ہی انہی رشتوں ناتوں کے ڈَسے ہوئے تھے اور اب شاید دونوں نے بڑی دردماری کے بعد ایک ایک انسان تلاش کر لیا تھا۔ جس پہ دونوں اندھا دھند اعتماد کرتے تھے۔ دونوں کی فرسا روحوں کو شانتی اور طمانیت کا ایک عالمِ برزخ مل گیا تھا جہاں نطق وسماع، حرص وہوا، طمع وتردّد، تانیث و تذکیر کا کیا تذکرہ۔۔۔ ہر چیز کھلی پڑی ہے، روپے پیسے یوں ہی میز درازوں پہ دَھرے پڑے ہیں۔ قیمتی گھڑیاں، قلم، ریڈیو، عینکیں، قیمتی نگوں والی انگوٹھیاں۔ وہ ایک ایک چیز اِدھر اُدھر، میزوں صوفوں، غسل خانوں سے اٹھاتی اور مناسب جگہ پہ رکھتی۔ خود کلامی بھی جاری رہتی جس میں غصّے، احسان، احتجاج اور شفقت و شکایت کا ایک عجیب سا امتزاج ہوتا۔۔۔ چھپکلیاں انڈے دیتی پھرتی ہیں، کچھ خبر ہی نہیں۔ دیواروں پہ رنگ پھروانے والا ہے، دروازوں کی پالش اڑ گئی ہے، پنکھوں پہ گرد اٹی پڑی ہے، پردے میلے ہو رہے ہیں، چپلوں کی ایڑیاں گھس گئی ہیں۔۔۔ جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہتی۔ کبھی کبھی عجیب سا دورہ پڑتا تو پنجے جھاڑ کر حاجی صاحب کے دوالے ہو جاتی۔

"حاجی صاحب، جی! مَیں نہ ہوتی تو اس گھر کا کباڑا ہو جاتا۔ مجھے دُعائیں دیں جو ہر چیز کا خیال رکھتی ہوں۔۔۔"

حاجی صاحب سرہلا کر ہاں میں ہاں ملاتے رہتے۔ انہیں محسوس ہوتا جیسے وہ اس گھر پہ قبضہ کرنے والی ہے۔ وہ پے انگ گیسٹ ہیں اور وہ لینڈ لیڈی۔۔۔ کبھی جھنجھلا کر کہہ بھی دیتے کہ مائی، تم خواہ مخواہ چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اپنا جی نہ جلایا کرو۔ سب کچھ ٹھیک ہے اور جو ٹھیک نہیں ہے وہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔ وہ تُنک کر جواب دیتی۔

"واہ، حاجی صاحب! واہ۔۔۔ کیا ہوا جو آپ کے بی بی بچے اِدھر نہیں ہیں۔ مَیں جو ہوں خیال کرنے والی۔۔۔" پھر جیسے وہ اِک دَم بُجھ سی جاتی، شانت سی ہو جاتی۔ "آپ کی ٹہل سیوا کر کے مجھے بڑا سُکھ ملتا ہے، بڑا ثواب ملتا ہے۔ شاید آپ کی خدمت سے میرا اخیر ٹھیک ہو جائے۔ آپ نے مجھے جو مان دیا ہے، وہ تو مجھے اپنوں نے نہیں دیا۔ آپ نے مجھے انسان سمجھا ہے۔ آپ نے مجھے یاد دلایا ہے کہ مَیں اپنے سوہنے رَبّ کی مخلوق ہوں۔ میری بھی کوئی عزت ہے، میں بھی کسی گنتی میں ہوں۔۔۔"

پھسک جاتی، آنکھیں بھیگ جاتیں۔ حاجی صاحب کے لئے یہ لمحے بڑے اذیّت ناک ہوتے۔ وہ اسے دَم تسلی دیتے روہانسو ہو جاتے۔

"مائی جی! آپ تو بہت اچھی ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتی ہیں۔"

پھر وہ کِھل جاتی جیسے ٹپکا ٹپکی کرتے ہوئے بادل کُھل کر برسنے لگتے ہیں۔ "حاجی صاحب! ہم بڑے بَدنصب، بے کل بندے ہیں۔ کسی کی خدمت، وفاداری اور احسان کا کوئی پاس لحاظ نہیں کرتے۔ بھیک میں ملنے والا سونے کا پہاڑ لے لیں گے مگر کسی کو ایک سچا بول بھی دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔ ہمارے مَرد بڑے بے غیرت اور بے دِیدے ہوتے ہیں۔ وہ کسی پہ کیا، خود اپنے پہ بھی اعتبار نہیں کرتے۔ سات جنم جی لو، ان کے سات بچے جَن لو مگر وہ سات روپوں کی خاطر، عورت کی سات پُشتیں تُوم کر رکھ دیں گے۔۔۔ حاجی صاحب! آپ موٹی موٹی کتابیں پڑھتے ہیں، لِکھتے ہیں۔ لِکھو کبھی مِٹھی جنم جلی کی کہانی۔۔۔ کیسے کیسے کشٹ اس نے بھوگے ہیں، زندگی کی تنی تار پہ کیسے کیسے تگنی کے ناچ ناچی ہے۔ یہ مِٹھی جس نے نہ بچپنا چکھا، نہ جوانی سونگھی اور اب۔۔۔ نہ یہ بڑھاپا اَبھایا۔۔۔"

بادل کُھل کر برَسنے لگتے۔ وہ دونوں بھیگ جاتے۔ ایسے میں اس کے دَرد کی سُوندھی

سُوندھی خوشبو پھیل جاتی۔

"آپ میرے مرد ہیں نہ مائی باپ' بھائی ہیں نہ بیٹے--- اسی لئے تو مَیں آپ کی عزت خدمت کرتی ہوں کہ آپ ایک انسان ہیں۔ صرف انسان! جو دوسروں کو بھی اپنے سے اچھا انسان سمجھتے ہیں---"

حاجی صاحب ایک طالب علم کی طرح اس کی باتیں سنتے رہتے۔ انسان کا جب اندر بولتا ہے تو پورا تولتا ہے' رتی ماشے کا ہیر پھیر نہیں کرتا۔ اس کا جب باطن کھُل جائے تو ظاہر کہیں مُنہ دے لیتا ہے۔ کبھی وہ انہیں کوئی بہت اونچی فلاسفر دکھائی دیتی' کبھی دانشور اور کبھی صاحبِ تصرّف--- زندگی کی تگ و تاز اور انسانی جبرو قدر کی کیسی کیسی باریکیوں پہ اس کی نظر تھی۔ سکول دیکھا' نہ کتاب پڑھی۔ حرف شناس نہ لفظ پَرور' پَر طاقتِ پرواز تگر رکھتی تھی۔ ولدل کے کنول کی مانند' اس کا باطن کیسا اُجلا تھا۔ سفید سفید بھولے کبوتروں کی طرح اس کی سوچ' فکر کتنی سجل تھی۔ وفا کا لفظ لکھ پڑھ نہیں سکتی تھی لیکن اس کے معنی مفاہیم کا ادراک رکھتی تھی۔ وہ سوچنے لگتے کہ زندگی کا جوان لہو جن بیوی بچوں کو پلا کر پروان چڑھایا' کسی قابل بنایا۔ زندگی کے اہم اور نازک حصے میں انہوں نے اپنے راستے الگ کر لئے' ناتے توڑ لئے۔ کویتی کندن نے پاکستان تانبا الگ کر دیا۔ یہ نہ سوچا کہ خالص سونا گھس جاتا ہے' ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ تانبا ٹانکا ہی اسے مضبوطی' خوشنمائی اور چمک دمک عطا کرتا ہے۔ مِٹھی کو تو انہوں نے لہو نہیں' دودھ پلایا تھا۔ اس بیاسی' بے بس' بے عِلم اور بے زَور و بے رِیا عورت نے انہیں وہ کچھ عطا کیا جو انہیں کہیں نہ ملا۔ مِٹھی نے حاجی صاحب کا عورت پہ اعتماد پھر سے واجب کر دیا تھا۔ پھر وہ مِٹھی سے ڈرنے لگے تھے۔ بڑھاپے کے بُوجھ تلے وہ دَب سی گئی تھی۔ اب تو وہ لمبی غنودگی کا نشہ بھی کرنے لگی تھی۔ جب ہاتھ سے کہیں زیادہ اس کی زبان چلنے لگی تو انہوں نے سارے کام اپنے ہاتھ لے لئے بلکہ اکثر اس کے آنے سے پہلے ہی تمام کام بنٹا دیا کرتے تھے۔ ایک وقت آیا کہ آتے ہی ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتی' الٹا سیدھا ہانکتی بانکتی' پھر کہیں پڑ جاتی یا اوپر خراٹے بھرنے کے لئے چلی جاتی۔ دوپہر کا کھانا پانی' حاجی صاحب خاموشی سے اس کے قریب رکھ آتے اور شام پوٹلی بنا کر اس کے حوالے کر دیتے۔ مہینے بعد اس کی تنخواہ' پلّو سے باندھ دیتے۔ کور بشی کا عارضہ بھی عَود آیا۔ اب یہ تھا کہ سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی اس

کی رہی سہی بینائی بھی ڈوب جاتی۔ اب حاجی صاحب کی ڈیوٹی میں یہ بھی شامل ہو گیا کہ اس کا ہاتھ تھامے جھونپڑ بستی کے قریب تک چھوڑ آئیں۔ کئی بار ارادہ کیا' پھولاں کو بُلا کر کہیں کہ مَیں کچھ عرصہ کے لئے ملک سے باہر جا رہا ہوں' واپس آؤں گا تو مِٹھی کو بلا لوں گا لیکن نہ جانے کیوں وہ ایسا نہ کر سکے۔ انہیں دکھائی دے رہا تھا کہ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو کسی دن مِٹھی کی میّت اسی گھر سے نکلے گی۔

ایک صبح مِٹھی نہیں آئی۔ ایسا اس سے قبل تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ حاجی بڑی بے دلی سے اخبار دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے کہ کہیں راستے میں دَم لینے کی خاطر بیٹھ گئی ہو گی یا بیٹھے بیٹھے سو گئی ہو گی--- جب کافی دن چڑھ آیا تو وہ باہر نکل آئے اور واپڈا کے گرڈ اسٹیشن کی جانب دیکھنے لگے کہ شاید کہیں مِٹھی آتی ہوئی دکھائی دے۔ سورج کافی اٹھ آیا تھا۔ مایوسی' بے دلی سے وہ بھی اوپر اُٹھ آئے اور بے دَم سے صوفے پہ ڈھے گئے۔ چائے میں لُطف' نہ اخبار میں دلچسپی' عجیب سی بے چینی اور اداسی دَر آئی تھی۔ کچھ دیر بعد پھر اٹھے اور بالکونی سے آگے جھک کر دُور تک نظر دوڑائی مگر مائی مِٹھی نظر نہ آئی۔ کہاں یہ ارادہ کہ اب اس کو فارغ کر دیا جائے اور کہاں یہ کیفیت کہ اس کے انتظار میں کسی پل چین نہیں۔ دل میں بُرے بُرے خدشات اُبھرنے لگے۔ یا اللہ خیر!--- وہ کچھ سوچ کر اٹھے ہی تھے کہ باہر گھنٹی پہ کسی نے دباؤ ڈالا--- باہر پھولاں کھڑی اُوپر دیکھ رہی تھی۔

"خیریت ہے--- مِٹھی نہیں آئی؟"

"حاجی صاحب! مَیں یہی بتانے آئی تھی۔ رات جاڑا کھا گئی ہے' تین تین لحاف لپیٹے ہیں مگر کانپا نہیں ٹوٹا۔ سُدھ لیتے ہی آ جائے گی---"

سنتے ہی جیسے حاجی صاحب کو بھی کلنپا لگ گیا۔ پہلے تو اس خاتون کو دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شاہ صاحب کے گھر کام کرنے والی پھولاں ہے۔ سلیقے کا لباس' نفیس نازک سی چپل' ہنرمندی سے بندھا ہوا ڈھیلا سا جوڑا' نامعلوم سا میک اپ۔ وہ کوئی فلمی ایکسٹرا لڑکی لگ رہی تھی۔ دوسری بات بھی تسلیم کرنے میں ہچکچاہٹ تھی کہ مِٹھی بھی کبھی بیمار پڑ سکتی ہے۔ اسے جاڑا لگ سکتا ہے' وہ بیماری کی بناء پر بستر پہ پڑ سکتی ہے۔ وہ خود زندگی کے پیچھے جھاڑو لے کر پڑی ہوئی تھی' بیماری نے اس بیچاری سے کیا لینا دینا؟ وہ حسبِ عادت اندر بڑبڑا رہے تھے--- وہ شاید عجلت میں تھی۔

"حاجی جی! مَیں چلتی ہوں--- فکر نہ کریں' وہ سنبھلتے ہی خود ہی آ جائے گی۔" دو قدم چل کر رکی۔ "اگر حکم ہو تو میں وقت نکال کر صفائی کے لئے آ جایا کروں یا کسی اور کا بندوبست---؟"

"نہیں' نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔ مِٹھی ٹھیک ٹھاک ہو جائے تو پھر دیکھیں گے--- سنو' لڑکی! اسے کسی ڈاکٹر کو دکھایا ہے؟"

وہ مسکرائی اور بولی۔ "صاحب جی! غریب لوگ خود ہی لَوٹ پَوٹ ٹھیک ہو جاتے ہیں--- دو گولیاں اسپرو کی کھلا دی تھیں۔"

حاجی صاحب' بڑے بوجھل قدموں سے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے جیسے کئی روز سے سخت بخار میں مبتلا رہے ہوں اور پھر--- پھر وہ واقعی بخار چڑھا کر پلنگ پہ پڑ گئے۔

پلنگ پہ پڑے پڑے کئی روز گزر گئے۔ نقاہت' کمزوری اور بے خوراکی نے انہیں بے حد لاغر کر دیا تھا۔ گھر کباڑ خانہ بن چکا تھا۔ اخبار بے پڑھے ہی دھرے ہوئے تھے۔ چولہا تو کب سے ٹھنڈا تھا' صرف سادہ پانی ہی رہ گیا تھا جو حاجی صاحب کی خوراک اور دوا بھی تھا۔ نیچے کرائے داروں کو دوسرے تیسرے دن ان کی علالت کی بھنک پڑی تو زبردستی اٹھا کر ہسپتال لے گئے۔ ذرا سنبھلے تو زبردستی گھر واپس آ گئے۔ نیچے والوں نے اپنی نوکرانی سے صفائی کروائی۔ دوا خوراک' آرام کا خیال رکھا۔ اگلے پانچ چھ روز احتیاط آرام میں گزارے۔ پاؤں پہ کھڑے ہونے کے قابل ہوئے تو داتا صاحب سلام کے لئے چل پڑے کہ دو جمعراتیں خالی گئی تھیں۔ عصر کی نماز پڑھ کر واپسی کا قصد کیا۔ حسب عادت چھوٹے نوٹ فقیروں میں تقسیم کرتے ہوئے بازار کے وسط میں پہنچے تو جیسے سکتہ ہو گیا--- مِٹھی ہتھ ریڑھی پہ پڑی تھی۔ فالج سے مفلوج' کوَردیدے' نظر بند۔ خستہ حال ہڈیوں کی پنجر۔ ایک مدقوق سا بوڑھا ہتھے پہ ہاتھ رکھے پاس کھڑا تھا۔ نم آلود آنکھوں سے بہت دیر تک اسے تکتے رہے۔ بوڑھا' اس طرح انہیں دیکھتا روتے' دیکھ کر بولا۔

"حاجی صاحب! بڑی غریب' لاچار بڑھیا ہے کچھ خیر خیرات دیتے جاؤ---"

حاجی صاحب نے اپنے سفید رومال سے مِٹھی کے منہ سے بہتی ہوئی رال صاف کی۔ پاس کی دکان سے شربت ملا کر دودھ لائے اور پاس بیٹھ کر اس کے فالج سے لٹکے ہوئے ہونٹوں سے لگا دیا۔ ہونٹوں کے کونوں سے دودھ بہہ کر اس کے رگیدے ہوئے سینے میں

جذب ہو رہا تھا۔ جس کے نیچے قدرت نے دودھ کے چشمے پیدا کئے تو تھے لیکن جن سے کوئی سیراب نہ ہو سکا' جو پڑے پڑے سُوکھ گئے تھے۔ ایک آدھ بوند' جو حلق سے نیچے اتری اس میں جانے کیسی مسیحائی تھی کہ چہرے پہ کئی چاند ابُھر آئے' آنکھوں کے بجھے ہوئے دِیئے روشن ہو گئے۔ بے حِس مُردہ جسم میں جیسے بجلی کا کوندا لپک گیا ہو' ہاتھ پاؤں میں توانائی لہرا گئی۔ ہونٹوں پہ تھرتھراہٹ سی پیدا ہوئی اور نہایت نحیف سے آواز آئی۔

"حاجی صاحب! بس دو قطرے ہی کافی ہیں۔ آپ سے آخری التجا ہے' بھیرو اور خیرو کو اپنے پاس رکھ لیجئے گا۔ جوان ہو رہی ہیں۔ ان کی ماں پھولاں فلموں میں کام کرنے لگی ہے' میرے مردستے اور پتر اللہ بچایا نے میرے مُردے کا سودا' اس بندے کے ہاتھ کر دیا ہے جو میری ریڑھی پکڑے---"

جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس کی نقاہت بھری آواز کہیں موَت کی وادیوں میں دَم بخت ہو گئی--- بڑی ردّوکد کے بعد پندرہ سو کے عوض' مِٹھی کے لاش حاجی صاحب نے حاصل کر لی تھی۔ بیچنے والے نے کلمہ پڑھ کر کہا تھا کہ دو چار روز کمایا سو کمایا' آپ کو مول کے مول ہی دے دی ہے--- ناہموار راستہ' تنگ بازار' ہجوم۔ حاجی صاحب ناتواں ہاتھوں سے پورا زور لگا کر ریڑھی کو دھکا لگا رہے تھے۔ بھک منگوں کا گروہ ساتھ ساتھ کلمہ شہادت کے آوازے لگا رہا تھا۔ آتے جاتے لوگ' مِٹھی کے مُردہ جسم پہ نوٹ پھینک رہے تھے۔

✿✿✿

جب سے وہ ڈیڑھ کلو بھر کی لوتھ کو گھر لایا تھا' گھر کی بے رونقی اور ویرانی یکسر گہماگہمی اور اِک عجیب سی ناگوار مگر دلچسپ سی مصروفیت میں بدل گئی تھی۔ گاؤں بھر سے بچے سارا دن یہاں جمع رہتے' اس کے کھانے پینے کے لئے چیزیں لاتے' اٹھا اٹھا کر پیار کرتے اور اس کے عجیب و غریب لجلجے خوبصورت جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے اجزائے ترکیبی دریافت کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔ بھاگاں گائے کے گوبر ملی مٹی سے پُتے ہوئے کچے فرش پہ وہ آدھا دھڑ گھسیٹتے ہوئے سارا دن یہاں سے وہاں 'اِدھر سے اُدھر بُھد بُھد کرتا رہتا اور چاؤں چاؤں' عف عف کی معصوم مہین چیخوں' مسلسل بہتے ہوئے مُوت کے تعفّن سے اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا۔ گھسٹتے وقت اپنے پیچھے فرش پہ گیلا نشان چھوڑتا جاتا جس سے اس کے جسم کا نچلا حصّہ گندہ اور بھیگا بھیگا سا رہتا اور کیچ بھری مُندھی مُندھی آنکھوں سے آنسوؤں کی پتلی سی لکیر جیسے جبڑے تک جم سی گئی تھی---
کسی لُومڑوچے کی نازک رُوئیں جیسی سموری کھال 'گہرے چمکدار سیاہ رنگ والی اس عجیب سی مخلوق کا نام "کلا" رکھا گیا' یہ نام شکردین شکاری کی بے اولاد بیوی' مہتابی نے اسے پہلے روز دیکھتے ہی رکھ دیا تھا۔ یہ نام رکھتے وقت اسے مطلق علم نہیں تھا کہ یہ کالی پشم کا گولا ایک دن اس گھر' بلکہ گاؤں بھر میں ایک امتیازی حیثیت حاصل کرلے گا۔ اس نے تو ایک معصوم' بے زبان اور اپاہج ہونے کے ناتے پناہ دی تھی اور اب اس کی نازبرداریوں' شرارتوں' بچوں کی یلغار اور شور شرابے سے پناہ مانگ رہی تھی۔

مہتابی کے اُدھیڑ عمر خاوند کا صحیح نام تو شکردین تھا۔ پیشہ اس کا شکار کھیلنا' دوسرے

شکاریوں کو مشورے دینا اور مدد کرنا تھا مگر جان پہچان اور گاؤں والے عموماً" اسے شِکرا کہتے' یہ الگ بات کہ کچھ لوگ ضرورت کے وقت اسے چچا شُکردین بھی کہہ کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے لیکن اس کی اصل پہچان اور مشہوری شِکرے شکاری سے ہی تھی۔۔۔ اور کلا! تو یہ دراصل اسے جھونگے میں ملا تھا۔ راول ڈیم پروجیکٹ کے سلسلے میں مقیم ایک غیر ملکی انجینئرَ کے پاس ایک اعلیٰ نایاب جرمن نسل کے کتوں کا جوڑا تھا' یہ کالے سیاہ قد آور کتے اپنی خوبصورتی' وجاہت اور اپنی نسل کی کمیابی کی بناء پہ دُور دور مشہور تھے۔ کتوں کے شوقین اور قدردان بڑی بڑی دُور سے انہیں دیکھنے آتے اور انہیں تحسین بھری نظروں سے دیکھتے' کئی ایک نے یہ کتے اور ان کی نسل حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے معاوضے بھی پیش کئے مگر ان کا مالک کسی بھی پیش کش کو قبول کرنے پہ راضی نہ تھا۔ پھر ایک دن کسی نے انہیں زہر دے دیا' کتا تو جانبر نہ ہو سکا مگر کتیا بچ گئی۔ کچھ عرصہ بعد کتیا نے تین پِلّوں کو جنم دیا جن میں ایک پِلّا نرم تھا یعنی آدھے دھڑ سے معذور۔۔۔ انجینئرَ جو خود بھی ایک اچھا شکاری اور اعلیٰ نسل کے کتوں کا شوقین تھا' اس واقعہ سے بڑا بددل اور مایوس ہوا۔ اس دوران اس کا معاہدہ بھی مکمل ہو گیا' اس نے واپس جانے کی تیاری کی تو بیمار کتیا اور نوزائیدہ پِلّوں کو ساتھ لے جانا مسئلہ بن گیا۔ آخرکار اس نے بادل نخواستہ ان سب کو فروخت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ شکار اور کتوں کی مشترکہ دلچسپی کی وجہ سے اس کی شِکرے شکاری سے بھی یاداللہ تھی' ایک دن اس کو بلایا' اپنی پریشانی اور ارادہ ظاہر کیا۔ شِکرے نے کتیا اور پِلّوں کے موجودہ حالات کے پیش نظر اس کو یہی مشورہ دیا کہ انہیں بیچ دیا جائے' کوئی اچھا سا گاہک تلاش کرنے کی ذمہ داری بھی شِکرے کے سر ڈالی گئی۔۔۔ شِکرا شکاری ایسے کئی لوگوں کو جانتا تھا جو ان کتوں اور یہ نسل حاصل کرنے کے لئے بڑی سے بڑی رقم دینے کو تیار تھے' ان ہی لوگوں میں پار گاؤں کا چوہدری کرم داد بھی تھا۔ آدھے گاؤں کی زمینوں کا مالک' اولاد نرینہ سے محروم اور جس کی واحد دلچسپی کتوں اور ان کی نسل پر پہروں بحث کرنا' لڑانا' دوڑانا اور مقابلے کے لئے تیار کرنا تھی' اس کے پاس بے شمار کتے تھے' کہیں بھی کسی اچھی نسل کے کتے کی اس کے کانوں میں بھنک پڑتی تو وہ دیوانہ وار حاصل کرنے کی کوشش کرتا لہٰذا یہ کتے بھی اس نے ایک بڑی رقم کے عوض حاصل کر لئے۔ شِکرے شکاری کو جہاں ایک معقول رقم بطور کمیشن ہاتھ لگی وہیں یہ کلا بھی گلے پڑ

گیا تھا تو وہ بھی اسی سودے میں شامل مگر چوہدری کرم داد نے کتیا اور دو پِلّے تو رکھ لئے اور یہ کلا اسے انعام کے طور پر بخش دیا۔ نیچے کا دھڑ' پچھلی دونوں ٹانگوں سے معذور' شائد زچگی کے دوران کسی بے احتیاطی یا زہر کے اثر سے یہ حالت ہو گئی تھی مگر تھا تو اعلیٰ نسل!۔۔۔ پھر بھی اسے حاصل کر کے شِکرے کو خاص خوشی حاصل نہ ہوئی تھی' تندرست ہوتا تو بڑے کام کا اور قیمتی تھا مگر یہ الٹا اس پہ بوجھ بن گیا۔۔۔ خیال تو یہی تھا کہ دو چار روز میں کہیں مر مرا جائے گا یا اگر لومڑ' گیدڑ' بلی سے بچ گیا تو بچے ہی اس کا کریا کرم کر دیں گے کہ ماں تو تھی نہیں جو خود پاس لیٹ کر دودھ پلاتی۔۔۔ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے مصیبت گلے پڑ گئی تھی' ترس بھی آتا کہ ننھی سی معصوم جان کو کہاں پھینکیں کہ آخر ہے تو اللہ کی مخلوق جو کیڑے کو بھی پتھر میں رزق پہنچاتا ہے۔ آس پاس کے بچے بالے دودھ روٹی کے ٹکڑے اس کے آگے رکھ دیتے' سارا دن اٹھائے پھرتے اور یہ ٹکر ٹکر دیکھتا رہتا۔ خود کھا پی لینے کی تو کالے کی حالت اور عمر نہ تھی' بچے زبردستی اسے دودھ روٹی وغیرہ کھلانے پلانے کی کوشش کرتے۔ اس کا چہرہ' منہ بھیگ جاتا' کھانسی اور چھینکوں سے بُرا حال ہو جاتا' لیکن بچوں کا مکھولا بن جاتا۔ مہتابی بڑی مشکلوں سے ان شیطانوں سے اس کی جان چھڑاتی' انگلی یا کپڑا بھگو بھگو کر اسے چُساتی۔ منہ صاف کرتی' بدن خشک کرتی اور پھر بڑے پیار سے کپڑے میں لپیٹ کر چکی کے نیچے لٹا دیتی۔ یہ ٹر ٹر اسے دیکھتا ہوا چیں چیں کرتا رہتا۔

ایک دن' کلا بیمار پڑ گیا' پیٹ خراب ہو گیا تھا۔ مہتابی نے سختی سے بچوں کو کھلانے پلانے اور تنگ کرنے سے منع کر دیا۔ پورے دو دن بے سُدھ پڑا رہا۔ شکرے نے مہتابی کو کہہ دیا کہ بس' اس کا کام تمام سمجھو' ذرا آنکھیں مُوندھے تو باہر روڑی پہ پھینک دینا اور فرش کو بھی پوت دینا۔ بچے بھی اداس' منہ لٹکائے اسے دیکھتے رہتے' کھانے پینے کی چیزیں دھری تھیں' مکھیاں بھنبھناتی رہتیں مگر کالو نقاہت اور کمزوری کی وجہ سے کسی چیز پہ منہ نہ دھرتا۔ عجیب سی اداسی اور مایوسی کا عالم تھا' اس کی آئی جائی حالت دیکھتے ہوئے چند بچوں نے اس کے کفنانے دفنانے کا انتظام بھی کر لیا' باہر ببول کے نیچے چھوٹی سی قبر بھی کھود لی' رنگ برنگے چیتھڑوں سے کفن بھی تیار تھا اور بس دیر تھی تو کالے کی آنکھیں بند ہونے کی۔۔۔ مگر بچانے والا بھی تو ہے جو مُردوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے' ابھی اس ننھی سی جان میں زندگی کی رَمق باقی تھی' تب ایک ہمسائی نے مشورہ دیا کہ یہ اُوپرے دودھ اور

بدپرہیزی سے بیمار پڑا ہے۔ اسے کسی کتوروں والی کتیا کے پاس چھوڑ آؤ‘ اگر اس کی زندگی ہے تو وہی اسے چُوم چاٹ کر تندرست کردے گی۔ مہتابی کو یہ مشورہ پسند آیا اور قرعہ فال کرے دُھنئے کی پالتو شکاری کتیا چچڑی کے نام نکلا‘ جس کے پانچ مرل سے بِلّے پہلے ہی موجود تھے‘ چھنا یہ بھی اس کے کنبے میں شامل کر دیا گیا۔ چچڑی بڑی شریف الطبع‘ لاغر سی کتیا تھی۔ کرے دھنئے کی طرح صابر‘ شاکر اور ہمدرد--- چچڑی نے بڑی شفقت سے اسے قبول کر لیا۔ اب ساری رونق اور گہماگہمی‘ کرے چاچا کے گھر منتقل ہو گئی۔ بچوں کا میلہ وہاں جمنے لگا‘ مہتابی کے آنگن میں پھر وہی بے رونقی اور سدا کی جمی ہوئی اداسی اُتر آئی‘ جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ کالے کی وجہ سے چند روز بڑے مصروف اور اچھے گزرے تھے‘ کالے کی وجہ سے اس کی روزمرّہ کی لگی بندھی زندگی کے ٹھہراؤ میں ایک خوشگوار روانی سی آگئی تھی‘ اس کی کہیں دبی ہوئی ماستا کی ناآسودگی کے تپتے ہوئے صحرازار میں آسودگی کی ایک نازک سی کونپل پھوٹی تھی۔ وہ چچڑی کی قسمت پہ ناز کر رہی تھی جس کی ہری بھری گود کی پھلواری میں پھول ہی پھول تھے۔ ان ہی پھولوں کے تصوّر میں‘ وہ ماضی کے خزاں رسیدہ چمن زاروں میں اتر گئی۔

☆☆

بارہ تیرہ برس پلک جھپکتے ہی بیت گئے تھے‘ بڑے علاج‘ تعویذ گنڈے کئے مگر مہتابی کی گود ہری نہ ہو سکی دو تین ماہ پیٹ ٹھہرتا‘ پھر کمر کی ہڈی سے لگ کر برابر ہو جاتا‘ شکرا جنم جنم سے شکاری‘ شکار کے علاوہ اسے کوئی اور مصروفیت یا دلچسپی تھی ہی نہیں۔ لاپرواہ‘ مہم جُو‘ تیز طرّار اور پانیوں‘ کھیتوں‘ جنگلوں اور میدانوں کے قاعدے‘ قانونوں کا جانکار۔ جانوروں کی نفسیات‘ عادات اور فطرت کا ادراک رکھنے والا اپنے چھوٹے سے گھر کی چاردیواری میں اپنی سادہ سی بیوی کے جذبات کو سمجھنے میں شائد دانستہ چشم پوشی سے کام لیتا اور اسے ملول اور اداس دیکھ کر اکثر کہا کرتا۔

"خواہ مخواہ دل نہ چھوٹا کیا کر--- اللہ کے گھر دیر ہے‘ اندھیر نہیں اور پھر ہم کون سے بوڑھے ہو گئے ہیں؟--- صبر شکر کیا کر‘ سوہنا رب جس حال میں رکھے اسی میں خوش رہ---"

اسے کئی سیانوں بلکہ مولوی صاحب نے بھی مشورہ دیا تھا کہ شکار کرنا چھوڑ دو‘ بے

زبان معصوم جانوروں کی بددعا نہ لیا کرو کہ شکاری اکثر اوَتر نکمتر ہوتے ہیں‘ ان کی جان بڑی مشکل سے نکلتی ہے--- خدا جانے یہ درست تھا یا غلط‘ لیکن یہ بات اٹل تھی کہ وہ شکار کرنا چھوڑ نہیں سکتا تھا اور چھوڑتا بھی کیسے؟ اس کا باپ بھی شکاری تھا اور شائد دادا بھی‘ یہی شوق اس کا پیشہ بھی تھا۔ پیٹ بھرنے‘ روزی پیدا کرنے کا وسیلہ تھا۔ طوطے‘ چڑے‘ کبوتر‘ شکرے‘ باز‘ بٹیرے‘ تیتر‘ سرخاب‘ مچھلیاں‘ سانپ‘ سانڈے‘ بندر‘ خرگوش‘ غرض وہ ہر اس جانور کا شکار کرتا جس کی ضرورت‘ موسم اور فرمائش ہوتی۔ وہ غیرملکیوں اور مقامی شکاریوں کو ضرورت کے مطابق پنجرے‘ پھائیاں‘ جال‘ سدھائے ہوئے کتے اور دیہاڑی دار مزدور بھی فراہم کرتا۔ غیرملکیوں کو وہ "باہروالے" کا شکار بھی کھیلاتا۔ اس کا باپ بھی ایسے ہی ایک شکار کے دوران اپنا پیٹ کھلوا بیٹھا تھا جس کے دو روز بعد لوگوں نے اسے قبر کھول کر دبا دیا تھا مگر شکرے نے پھر بھی عبرت نہ پکڑی--- کہتے ہیں کہ شکاری‘ سپیرا‘ تیراک اور بدمعاش اکثر اپنے شوق اور کسب و صف کے ہاتھوں ہی اپنے انجام کو پہنچتے ہیں۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ دنیا کے جنگلوں‘ صحراؤں‘ سمندروں‘ میدانوں اور فضاؤں میں صرف دو طرح کی مخلوق ہوتی ہے۔ ایک جو شکار کرتی ہے‘ دوسری جو شکار ہوتی ہے اور ضروری نہیں کہ تیرو تفنگ سے ہی شکار کھیلا جائے‘ شکار تو نظر سے بھی کیا جاتا ہے۔ زبان‘ علم‘ عقل اور خوبصورتی سے بھی‘ طاقت‘ حکمت‘ دولت اور سیاست سے بھی کیا جاتا ہے۔ یہ شہر‘ محلے‘ گلیاں‘ کوچے‘ کچہریاں‘ عدالتیں‘ اسمبلیاں‘ خانقاہیں‘ سب شکارگاہیں ہی تو ہیں۔ یہ وردیاں‘ عبائیں‘ قبائیں‘ کالے کوٹ‘ لمبے چوغے‘ اونچے شملے‘ پھائیاں‘ پنجرے‘ سب چارے ہی تو ہیں اور ندی نالوں کو نہریں‘ نہروں کو دریا اور دریاؤں کو سمندر نگل جاتا ہے۔ ہرن‘ تیتر‘ بٹیر اور سرخاب سب کھا تو لیتے ہیں لیکن ان کا شکار نہیں کرنے دیتے‘ کہتے ہیں کہ گناہ ہے‘ ظلم ہے حالانکہ سب سے بڑا ظلم تو ضرورت ہے‘ مجبوری ہے--- اپنے اس شکاریانہ فلسفے اور نظریئے کا پرچار وہ اکثر چوپال اور گاؤں کے سیدھے سادھے اَن پڑھ لوگوں میں کرتا رہتا جو اسے شکار نہ کرنے کی ترغیب دیا کرتے لیکن اس کے گھروالی مہتابی کبھی اس سے متفق نہ ہوتی‘ وہ بھی اکثر اسے منع کرتی رہتی لیکن جب کبھی مچھلی یا بٹیوں کی فرمائش کرتی شکرے کا جواب ہوتا کہ کھیتوں یا ڈیم کے کنارے کھڑی ہو کر آواز دو‘ شاید وہ تمہاری آواز پہ خود چل کر تمہارے پاس پہنچ جائیں

اور وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتی کہ تیرے نال پوری نئیں پیندی۔

★★

آج بھی وہ شلجم کی ترکاری پروستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کلا وہاں بڑا اداس ہو گیا ہوگا--- کہو' تو گھر لے آؤں؟"

"کیا مطلب--- وہ ابھی تک زندہ ہے؟"

"ہاں--- اللہ حیاتی دے' اب کچھ بھلا چنگا ہو گیا ہے۔ چاچا کرما کہہ رہا تھا کہ بس ذرا کمزوری ہے۔ لیکن بچ جائے گا--- چھڑی کا دودھ اب غڑپ غڑپ پیتا ہے اور کبھی کبھی پچھلی ٹانگیں بھی ہلاتا ہے۔"

وہ بے پرواہی سے بولا۔ "--- رہنے دے' رہنے دے وہیں پہ--- دوسرے پلوں کے ساتھ وہیں پہ پڑا رہے گا' خوامخواہ گھر لا کر پھر بیمار کرنا ہے--- بچوں کا چیخ چکاڑہ بھی وہیں رہنے دے۔"

وہ اسے پنکھا جھلتے ہوئے بولی۔ "تجھے تو خدا واسطے کا بیر ہے اس معصوم سے--- اور گکو بیرے تو تجھے اچھے لگتے ہیں مگر کتوں کے بچے تیرے لئے مصیبت ہیں اسی لئے تو خدا تیری مراد پوری نہیں کرتا--- شکر دین! معصوموں سے پیار کرنا بڑا ثواب ہے۔"

"میں کہتا ہوں کہ جانور' جانوروں کے ساتھ ہی خوش رہتے ہیں--- وہاں چھڑی ہے' کتوروں کے ساتھ کھیلتا ہے۔ یہاں کیا ہے؟"

وہ ہاتھ ہلا کر بولی۔ "سواہ تے مٹی--- وہ وہاں کھیلتا ہے۔ چھڑی تو بھنگ کا پیالہ پی' سوئی مری رہتی ہے۔ کتورے ادھر ادھر گندی نالیوں میں گھسے ہوتے ہیں' یہ وچارہ چاؤں چاؤں کرتا ہوا' آسے پاسے لڑھکتا رہتا ہے اور روئی کپاہ کے اڑنے سے کھانستا' چھینکتا ہے وچارہ!"

"--- اوئے بھلی لوک! یہ جانور ایسے ہی رہتے ہیں' ان پہ زیادہ نگاہ نہیں رکھتے--- زیادہ دل چاہے تو وہیں جا کر دیکھ آیا کر---"

"میں تو دو چار بار دن میں وہاں جاتی ہوں' مجھے دیکھتے ہی کوں کوں کرنے لگتا ہے جیسے ترلے منتیں کر رہا ہو کہ مجھے گھر لے چلو' میں گند نہیں کروں گا' میں تنگ نہیں کروں گا--- شکر دین! مجھے تو بہت ترس آتا ہے' میں تو کل جا کر لے آؤں گی---"

"اوئے پاگلے! اس کا لک مارا ہوا ہے' ٹھیک ہوتا ہے تو کوئی بات نہیں تھی' پال پوس لیتے--- رہنے دو اس کو وہیں اور اگر پالنے کا بڑا شوق ہے تو میں کوئی اور اچھا سا کتورا لا دیتا ہوں' شوق پورا کرتی رہنا---"

"کھے ڈال اور کتورے پہ--- بات شوق اور کتورے کی نہیں' کالے کی ہے۔ وہ تمہاری نظر میں لک مٹا ہوگا پر وہ میری نظر میں میرا کلا ہے۔ میں اس کی ٹہل سیوا کروں گی' نہلاؤں گی' مالش اور علاج کروں گی تو دیکھ لینا' وہ ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ بیزاری سے کھانا ختم کرتے ہوئے بولا۔ "جو دل چاہے کر--- مگر یاد رکھنا' اگر یہاں بچوں کی منڈلی لگی یا گوہ موت ہوا یا چاؤں چاؤں سنائی دی تو اسی وقت نہر میں پھینک آؤں گا---"

کلا واپس کیا آیا جیسے کسی ماں کا پردیسی بچہ واپس گھر لوٹ آیا ہو۔ گھر بھر میں جیسے چکاچوند اجالا ہو گیا ہو' درودیوار جیسے جاگ پڑے ہوں۔ بھاگو گائے کھونٹے پہ لڈی ڈال رہی ہو' کوؤں' چڑیوں' شارکوں نے آسمان سر پہ اٹھالیا۔ بچوں کے پرے کے پرے بداہیاں دینے آنے لگے۔ ہمسائیاں دیواروں' منڈیروں پہ چڑھی رونق دیکھنے لگیں--- خوشیوں کے دھارے تو انسان کے کہیں اندر سے پھوٹتے ہیں پسینے کی ننھی ننھی بوندوں کی طرح' جو پورا وجود بھگو دیتی ہیں۔ انسان ہو یا حیوان' معصوم ہو یا بالغ' ہر ذی حس خوشیوں کی بوندا باندی اپنے وجدان کی چھپڑ کلیا پہ محسوس کرتا ہے اور اظہار کے لئے نطق کا ہونا ضروری نہیں' خوشی کی خوشبو ہی کافی ہوتی ہے۔ آج بھی یہی کیفیت تھی۔ کلا کوں کوں کرتا ہوا پورے گھر میں رینگنے لگا جیسے گھر کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک ذرے کو خوشخبری سنانا چاہتا ہو کہ میں واپس آگیا' میں واپس آگیا--- یہاں آ تو گیا' اس کے پچھلے حصے میں حرکت تو تھی مگر طاقت نہیں تھی۔ ایک بوجھ کی طرح وہ اپنے وجود کو گھسیٹتا رہتا' کبھی گھوم کر بے جان حصے کو چاٹنے بھی لگتا' دانتوں سے کھینچا تانی کرتے ہوئے جھنجھوڑنے لگتا جیسے اپنی مردہ بے حس رگوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنا چاہتا ہو۔ آخر وہ تھک ہار کر' التجا بھری نظروں سے مہتابی کو تکنے لگتا جیسے کہہ رہا ہو کہ ماں! مجھے بچالو' کبھی اپنے سے جدا نہ کرنا۔ میں تمہاری بڑی خدمت کروں گا اور مہتابی' مامتا کی ماری ہوئی جیسے اس کی ایک ایک التجا سن اور سمجھ رہی ہو--- ممتا صرف پیٹ جنوں کے لئے ہی نہیں ہوتی' یہ تو ہر بچے کا

حق ہوتی ہے چاہے وہ انسان کا ہو یا حیوان کا۔۔۔ وہ اولاد سے خالی تھی اور یہ ممتا سے بیگانہ' جیسے دونوں نے ایک دُوجے کو تلاش کر لیا تھا۔۔۔ ادھر چچڑی بھی کئی چکر لگا چکی تھی' اس بھاگوان نے کئی روز تک اپنا لہو تھنوں کے پیالوں سے اسے پلایا' چاٹ چاٹ کر اس کی مُردہ رگوں میں زندگی کی گرمی پیدا کی تھی' اپنی ممتا کی چھپر چھاؤں میں اسے پناہ دی' اس کے لئے اپنا سکھ چین تج دیا تھا۔ وہ اسے کیسے بھول سکتی تھی؟۔۔۔ باہر دروازے کے پاس آکر خوش بختی کی طرح کھڑی ہو جاتی' اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اسے تلاش کرتی۔ زبان لٹکائے' دُم ہلا ہلا کر اس کی بلائیں لیتی اور پاس پہنچ کر چاٹتی' سُونگھتی' جبڑے میں داب کر دو چار پٹخنیاں دیتی جیسے ورزش کرا رہی ہو۔ پھر خود ہی پہلو جانب لیٹ جاتی' تھوتھنی سے دھکیل دھکیل کر تھنوں کے قریب لاتی۔۔۔ مہتابی یہ سب کچھ دیکھتی رہتی جیسے اس کی ممتا کو بھی تسکین مل رہی ہو۔ انسان اور حیوان کے فرق کو محسوس کرتی' اللہ سوہنے کے وارے صدقے جاتی جو سب کا پالن ہار اور رازق ہے' اپنی مخلوق کو اپنی اپنی جگہ پہ بہترین رزق پہنچاتا ہے۔ چچڑی کا یہ ایثار دیکھ کر وہ بھی پیالے میں دودھ ڈال کر اس کے آگے رکھ دیتی۔ چچڑی جیسے تشکر بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی۔ اس کے چہرے پہ عجیب سے رنگ کھلے ہوتے' زندگی کے سارے مفہوم' مقصد' خزانے' خوشیاں اس کے قدموں میں ڈھیر ہوتیں۔ وہ کسی اور ہی جہاں کی مخلوق دکھائی دیتی جیسے چچڑی اپنے پورے وجود سمیت غائب ہو گئی ہو اور اس کی جگہ ممتا کا جذبہ اپنی پوری صداقتوں' عظمتوں' برکتوں اور بشارتوں کے ساتھ مجسم ہو کر رہ گیا ہو۔۔۔ جانے سے پہلے وہ پھر مہتابی کی جانب محبت بھری نظروں سے دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو کہ بہن' بہت بہت شکریہ! کالو کو اللہ نظرِ بد سے بچائے' تمہارا ہی بیٹا ہے پر دو چار روز میرا دودھ بھی پیا ہے' اب اسی لئے محبت اور مامتا سے مجبور ہو کر چلی آتی ہوں' برا نہ ماننا' بیچارہ ابھی معصوم اور کمزور ہے۔ اس کا ذرا خیال رکھنا۔۔۔ جاتے جاتے وہ اسے ایک دو پٹخیاں اور دیتی' چاٹتی اور دُم ہلاتی ہوئی باہر نکل جاتی۔

چچڑی کے جانے کے بعد مہتابی دیر تک اس کے برتاؤ پہ غور کرتی رہتی۔ اس بے زبان اور حقیر سمجھے جانے والے جانور نے اس کے اندر کے کئی بند کواڑ کھول دیئے تھے۔ پٹخنیاں دینا' مفلوج حصے کو چاٹنا' لیٹ کر پچھلی ٹانگوں کو ہلانا' پچھلی ٹانگوں کو منہ میں داب کر

الٹا لٹکاتا۔۔۔ جیسے وہ مہتابی کو کہہ گئی ہو کہ تم بھی اسی طرح اس کی مالش کیا کرو' اسے ورزش کراؤ۔

اب وہ ہر روز دوپہر کو گلابی جاڑوں کی سنہری دھوپ میں اسے پیڑھی پہ لٹا کر نرم نرم ہاتھوں سے تیل کی مالش کرنے لگی۔ اس کے رگ پٹھے سہلاتی' میٹھے تیل میں ماجو جلا کر اس کی ریڑھ کی ہڈی پہ سکائی کرتی اور وہ آنکھیں مُوندے آرام سے پڑا رہتا۔ کہیں ہاتھ سخت پڑتا تو آنکھیں کھول کر چیٹوں کی آواز نکالتا۔۔۔ ماں بیٹے کا یہ لاڈ پیار پاس بیٹھے بچے بھی دیکھتے رہتے۔ پاس پڑوس والیاں بھی کروشیئے' کڑھائیاں' سویٹر سلائیاں لے کر آ بیٹھتیں۔ مشورے' چغلیاں' ہنسی ٹھٹھول چلتے رہتے۔

وقت گزرتا گیا۔

شکرا بھی سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی ٹہل سیوا' دوا دارو اور بدلتی سنبھلتی حالت دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ یہ مرنے والا نہیں۔۔۔ پچھلی ٹانگیں گو ابھی پورا وزن سہارنے کے قابل نہیں تھیں لیکن ہولے ہولے حرکت کرنے لگیں۔ وہ کھڑے ہونے کی کوشش میں بار بار گر پڑتا' چیٹوں چیٹوں کرتا ہوا پھر کھڑا ہوتا اور پھر دھپ سے گر پڑتا۔ بچے لوگ تالیاں پیٹتے' اسے بڑھاوا دیتے۔

"شلوا بھی شیرا' اٹھ جوانا!۔۔۔ ہمت کر کالے! اٹھ' ہئی شلواش۔۔۔"

یہ تماشا اس وقت تک جاری رہتا جب تک مہتابی ان شیطانوں سے اس کی جان نہ چھڑاتی۔

اس مشغولے میں سردیاں بھی سر پہ آ گئیں' لمبی لمبی راتیں اور چھوٹے ٹھٹھرتے ہوئے دن۔۔۔ پہلے تو کلا دالان میں چکّی کے نیچے پڑا رہتا تھا' اب اسے کسی اور محفوظ جگہ سلانے کی فکر ہوئی۔ شکرے نے مشورہ دیا کہ بھاگو گائے کی کوٹھڑی میں چارے کی کھرلی کے نیچے پرالی بچھا کر اس شہزادے کے سونے کا بندوبست کر دیا جائے۔ یوں ایک تو یہ گائے اور بچھیا کی موجودگی میں اکیلا پن بھی محسوس نہیں کرے گا اور سردی سے بھی بچا رہے گا' گوُ' موت کے لئے بھی آسانی رہے گی لیکن مہتابی کو یہ مشورہ کچھ جچا نہیں۔ وہ بولی۔

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ ویسے تو مرا نہیں' اسی طرح کسی وقت تمہاری بھاگو لاڈلی

کے کھروں تلے آکر چٹنی ہو جائے اور تمہارے کلیجے میں ٹھنڈ پڑے--- نہ' مَیں اس معصوم کو وہاں نہیں رکھوں گی۔"

"--- تو اور کہاں رکھو گی اپنے لاڈلے کو؟" وہ بیزار ہوتے ہوئے بولا۔ "یہاں اسی کوٹھڑی میں تو نہیں رہ سکتا' یہاں ہم سوتے ہیں--- ایسا کرو کہ سردیاں سردیاں اسے چھڑی کے پاس چھوڑ دو' چھڑی ویسے بھی روئی کپاہ کی کوٹھڑی میں ہوتی ہے۔ سردی سے بچاؤ بھی ہو گا اور یہ وہاں خوش بھی رہے گا۔"

وہ آہستہ سے بولی۔ "شکر دین! اگر کلا ہمارا بچہ ہوتا تو بھی اسے وہیں چھوڑ آتے---؟"

"بے وقوف! پاگل نہ بن---" وہ زچ ہوتے بولا۔ "کئی بار سمجھایا ہے کہ جانور اور انسان میں بڑا فرق ہے۔ انسان' انسانوں میں اور جانور' جناوروں میں خوش رہتے ہیں--- پتا نہیں' یہ بات تیری موٹی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟"

مہتابی بڑے سکون سے کہنے لگی۔ "میرا خیال ہے کہ جان دونوں میں ہوتی ہے چاہے وہ انسان ہو یا حیوان' جانور بے چارے بول نہیں سکتے' صرف رَبّ سے فریاد کر سکتے ہیں--- ویسے برا نہ مانو تو یہ بھی سنو کہ مَیں نے جانوروں میں انسانوں سے زیادہ ہمدردی اور احساس محسوس کیا ہے--- شکر دین! ہم سے تو چھڑی اچھی ہے جو دن میں دو چار بار ادھر چکر لگا جاتی ہے' دودھ پلا کر اس کو چومتی' چاٹتی اور اس کا دل بہلاتی ہے---"

وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "تم سے کون سر کھپائی کرے--- جو جی میں آئے کر' چاہے تو اپنے پاس سلا لیا کر۔ مَیں ادھر کوٹھڑی میں کھاٹ ڈال لوں گا---"

"کوئی حرج نہیں--- میرا اپنا کلا ہے' کوئی غیر تھوڑا ہی ہے--- تم یہاں سو جایا کرو۔ مَیں ادھر بھوسے' جالوں' پنجروں والی کوٹھری میں سو جایا کروں گی۔ مَیں نے اپنا پرانا کھیس کاٹ کر اس کے بستر کا انتظام بھی کر لیا ہے' پرانے باجرے والے پڑولے کو توڑ کر اس کا پنگھوڑا تیار کیا ہے' کنالی میں مٹی راکھ ڈال کر کونے میں رکھ دی ہے اور---"

وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "--- اور میرے تہبند اور کُرتے پھاڑ کر اس کے لئے تولئے اور جُلیاں بنائی ہیں--- مجھے حکم کرتی' مَیں تیرے سُورج نِکے کے لئے رانگلا پنگھوڑا بنواتا' ساٹن کی لیف تلائی لاتا' شیشے کی دُودھ والی بوتل اور چُوسنی منگواتا۔ ایک

آدھ نوکر کامے کا بندوبست کرتا---"

"بس بس' رہنے دے--- یہ لاتا' وہ لاتا--- تو اسے اس گھر میں رہنے دے تو بڑی مہربانی---" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

مہتابی نے اس کے لئے روئی کی ایک خوبصورت سی صدری بھی بنائی' پورے جسم پہ چڑھا کر ڈوریوں سے باندھ دیتی اور اس نئی ہیئت کذائی میں وہ عجیب و غریب ملوکڑا سا بڈا دکھائی دیتا اور لمبے لمبے کان لٹکائے' چمکتی ہوئی تھوتھنی نکالے سر سر کرتا رہتا' نپل بوتل سے دودھ پیتا ہوا جاپانی گڈا لگتا۔ فراغت کے لئے وہ اب مخصوص کونے میں پڑی کنالی تک جانے لگا تھا۔

سردیاں ختم ہوتے ہوتے یہ اپنے چاروں پیروں پہ کھڑا ہو چکا تھا' قد بھی خاصا نکل آیا۔ یہ پوہ ماہ کی پوری سردیاں ماں بیٹے نے اسی کوٹھری میں کاٹی تھیں اور اب جیسے وہ دونوں مشکلوں اور آزمائشوں کی کال کوٹھڑی سے باہر نکل آئے تھے۔ سردیوں میں جمی' ٹھہری اور ٹھٹھرتی ہوئی دوستیوں پہ پھر سے بہار آگئی۔ بچے بالے' یار دوست اب پھر اکٹھے ہونے لگے۔ شکاری کے گھر پروان چڑھنے والا یہ ننھا شکاری اب چڑیوں' گلہریوں' کوؤں کا تعاقب کرنے لگا اور کیا مجال جو کوئی کوا منڈیر پہ بیٹھ جائے یا بلی ادھر جھانک لے یہ شہزادوں کی سی آن بان سے اندر باہر اٹھلاتا رہتا اور مہتابی گھر کے کاج میں مصروف اسے دُلار بھری نظروں سے دیکھتی رہتی' ایسے ہی خوامخواہ آوازیں دینے لگتی۔

"وَے مسنڈیا' وَے کالے' کتھے ویں۔ ذرا سامنے آ' تجھے ٹھیک کرتی ہوں--- تیرا باپ ٹھیک کہتا ہے' تو بڑا سر پہ چڑھ گیا ہوا ہے--- دیکھتا نہیں' ماں کام کر رہی ہے تو مَیں ہی ذرا کوؤں بلیوں کا خیال رکھوں۔"

آخری دھمکی پہ وہ کہیں سے چھلاوے کی طرح برآمد ہوتا اور دیکھتے دیکھتے میدان دشمنوں سے خالی ہو جاتا۔ اندر باہر' کوٹھری' غسل خانہ' چکّی کے نیچے' کھُرلی کھلیار' ہر جگہ پھرکی کی مانند گھوم جاتا لیکن مہتابی کے قریب نہ پھٹکتا' بس دُور ہی دُور سے تکتا رہتا۔ وہ بھی غصّے میں ہاتھ دکھاتے ہوئے کہتی۔

"آ' آ ذرا میرے کول' تیرے کَن پٹاں---"

وہ عَف عَف کرتا پھر کہیں اوجھل ہو جاتا--- کوئی سننے والا سنے اور دیکھنے والا دیکھے

تو کیا کہے کہ یہ کیسا تماشہ ہے' کیسا پاگل پن ہے' کون سا جذبہ ہے--- بس! سارا دن ان ہی چونچلوں' شرارتوں اور خوش فعلیوں میں گزر جاتا اور محرومیوں اور ناآسودگیوں کے سمندر میں ڈوبنے والے بھی کیسے کیسے تنکوں کے سہارے تلاش کر لیتے ہیں' اپنا من پرچانے کے لئے کیسے کیسے ناٹک کھیلتے ہیں' وقت کو دھکا دینے کے لئے خود کو کیسے کیسے دھوکے دیتے ہیں اور شاید انسان اگر ایسا نہ کرے تو اپنی ہی گھٹن کے اندھیروں میں گھٹ گھٹ کر مر جائے۔

ایک دن شکرا شہر سے جو لوٹا تو نرم سے چمڑے کا ایک خوبصورت پٹہ بھی لیتا آیا جس میں پیتل کا بکسوا اور چھوٹے چھوٹے گھنگھرو جڑے ہوئے تھے۔

"لے' تیرے کالے کے لئے لایا ہوں۔ اسے اب پٹہ ڈال' بڑے نرم چمڑے کا بنوایا ہے تیرے لاڈلے کے لئے--- دیکھ یہ کوکے اور گھنگھرو' چھن چھن کرتا پھرے گا---"

وہ بغیر دیکھے ہی تنک کر بولی۔ "--- ہے تو اچھا مگر اپنے پاس ہی رکھ--- میرا کالا نہیں پہنے گا یہ جانوروں والا پٹہ---"

"ہائیں---" وہ چونک کر بولا۔ "یہ جانوروں کا پٹہ نہیں پہنے گا تو کیا انسانوں والا کینٹھا پہنے گا؟"

"ہاں ہاں' وہ بھی پہن لے گا جب پہننے لائق ہو گا۔ میں نے تو آج ہی اس کے کان چھدوائے ہیں اور سونے کی تاریں ڈلوائی ہیں' ابھی دکھاتی ہوں--- کالے' وے کالے!"

کالا ہف ہف کرتا ہوا مہتابی کے پاؤں پر لوٹنے لگا' پاؤں سے کان کھجانے لگا جیسے مرکیاں دکھا رہا ہو' شکرا حیرت سے کبھی اس کو اور کبھی اپنی بیوی کو تکنے لگا۔

"اوئے' پاگلے! تم نے اسے سونے کی تاریں ڈال دی ہیں--- کبھی کتوں کتوروں کو بھی کسی نے سونے کی تاریں ڈالی ہیں؟"

وہ کالے کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا حرج ہے؟ کسی نے نہیں ڈالیں تو ہم نے ڈال دی ہیں--- سونا ڈالو یا پیتل' یہ تو اپنے اپنے پیار کی بات ہے اور گھبراؤ مت' میں نے تمہارے پیسے خرچ نہیں کئے' میں نے تو پہلے دن سے ہی اس کے نام کی کمیٹی ڈال دی تھی۔ اتنا خوش قسمت ہے میرا کلا کہ آج اسی کے نام کی پرچی نکلی۔ حسو سنارے نے ایک پیسہ بنوائی کا نہیں لیا' بس چار ماشے دو رتی---"

"بس بس' رتیاں ماشے مجھے نہ بتا۔ مجھے تو صرف یہ بتا کہ میں تم دونوں پاگلوں کا کیا علاج کروں--- مجھے تو ڈر ہے کہ تم نے اگر اسے کرتہ لاچا پہنایا اور بستہ گلے میں ڈال کر سکول بھیجنا شروع کر دیا تو میں کیا کروں گا؟--- ایسا کر' اس کو حلوہ پکا کر کھلایا کر' اس کے بال سنوار کر کنگھی کیا کر' اس کے لئے جوتے اور کپڑے بنا' اس کا شناختی کارڈ بنوا اور ذرا بڑا ہو جائے تو اس نواب صاحب کے لئے رشتہ تلاش کر---"

"شکردین! تم تو خوامخواہ بات کا بتنگڑ بنا رہے ہو--- تم خود ہی لوگوں کو مشورے دیتے ہو کہ اس کتے کو یہ مربہ کھلاؤ' اس بیل یا گھوڑے کو یہ کشتہ کھلاؤ اور لوگ بھی تو اپنے جانوروں کو زیوروں سے سجاتے ہیں' جھانجریں' کینٹھے' گھنگھرو' ہار پہنچیاں پہناتے ہیں۔ اگر میں نے دو تاریں ڈال دیں تو کون سی قیامت آ گئی؟--- میں تو اگلی کمیٹی پہ کینٹھا اسے پہناؤں گی۔"

"نیک بختے! کوئی سونے کے لالچ میں اسے اٹھا کر لے جائے گا' پھر روتا بیٹھ کے--- یہ کلا کتورا ہے' کوئی پتر پوترا نہیں جو تو اسے سونے کا کینٹھا ڈالے---"

"پتر پوترے کی کمی جہاں بھی پوری ہو جائے--- لوگ تو پتھر کو خدا مان کر مرادیں لے لیتے ہیں' ہم خدا کی ایک مخلوق کو پتر کا پیار بھی نہیں دے سکتے؟"

"تیرے سے کون باؤلا مغز کھپائی کرے--- کالے کے ساتھ تیری عقل بھی کالی ہو گئی ہے' تجھے چٹا بھی کالا دکھائی دیتا ہے۔"

"شکرے! تو مرد ہے' عورت نہیں۔ ایک دن عورت کے وچار سامنے رکھ کر دیکھ' پھر تو جان جائے گا کہ عورت کی سب سے بڑی خواہش کیا ہوتی ہے' اولاد اور اس کی حب کے بغیر عورت کتنی نامکمل اور کتنی بڑی تہمت اور گالی بن جاتی ہے---" وہ روہانسو سی ہو گئی۔

شکرا ہاتھ جوڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "اچھا' بابا! تو جیتی میں ہارا--- ویسے اگر تو یہ سمجھتی ہے کہ مجھے اولاد کی خواہش نہیں تو یہ تیری محض بے وقوفی ہے۔ رب کے آگے زور تو نہیں۔ وہ بے نیاز ہے' جب چاہے کرم کر دے---" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "لے' یہ پٹہ اس کے گلے میں ڈال دے۔ میں بڑے چاؤ سے لایا ہوں' میرا دل نہ توڑ--- اور یہ یاد رکھ کہ یہ ہمارا پالتو کتا ہے' پتر نہیں۔ کتا پتر نہیں بن سکتا اور پتر کتا نہیں ہو سکتا--- میں

جانتا ہوں، جہاں میں جانوروں کی عادات سے واقف ہوں وہاں انسان کی فطرت بھی شکاری
سمجھتا ہوں۔ تو پیاسی ہے اور پیاس میں گندہ یا صاف پانی نہیں دیکھا جاتا' مَیں تیرے جذبات
جب ہوں لیکن ذرا قابو رکھ' اتنا پیار اور اُنس نہ بڑھا کہ کل کلاں تجھے دُکھ اٹھانا پڑے---
خدا نے ہی اسے کتا بنایا ہے تو تو بھی اسے کتا ہی رہنے دے' قدرت کے معاملوں میں دخل
نہ دے--- اٹھ' شاباش! یہ پٹہ اس کے گلے میں ڈال دے---"

ادھر شکرا باہر نکلا' ادھر مہتابی کی آنکھوں سے بھی آنسو نکل آئے--- کالا' اس کی گرگابی پہ تھوتھنی رکھے چپ چاپ یہ باتیں سُن رہا تھا۔ مہتابی نے اسے پیار سے پچکارا' سر پہ ہاتھ پھیرا--- وہ سوچ رہی تھی کہ شکرا ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ابھی یہ بچہ ہے' کل بڑا ہو گا اور اسی حساب سے اس کی ضرورتیں' فطری تقاضے بھی بڑھیں گے۔ جانور تو اول آخر جانور ہی ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی ایک دنیا ہے' انسانوں کے ساتھ رہتے ہوئے بھی یہ اپنی فطرت اور جبلّت کے جنگل میں سانس لیتے ہیں اور شائد یہی ان کی بقاء اور تشخص ہے--- اس نے بڑھ کر اس کے گلے میں پٹہ ڈال دیا۔

☆☆

گھر کا صحن جیسے یونانی اکھاڑہ ہو جہاں شیروں' چیتوں اور غلاموں کے درمیان بڑے خونی معرکے ہوا کرتے اور بادشاہ' امراءٔ عیش کوش عوام کے ساتھ بربریّت کے خونچکاں مظاہروں سے لطف اندوز ہوتے تھے--- شہزادہ کلا پہلوان' پٹھا چاچا شکردین بمقابلہ موتی پہلوان' پٹھا ماسی موٹی تنوروالی کے ساتھ کشتی لڑے گا' جیتنے والے کو پیالی دودھ اور تازے تازے چھچھڑے ملیں گے۔ خوب لڑائیاں اور مقابلے ہوتے' تحسین و آفرین کے نعروں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ دوسرے گاؤں کے بچے بھی کتے کتورے لاتے' ڈبے کھڑکائے جاتے' پالیاں جمتیں' چوہدری اور منصف فیصلے اور اعلان کرتے۔ مہتابی بے چاری صلواتیں سناتی رہتی مگر کلا تو جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اپنے سے بڑے بڑے کتوروں کو چشم زدن میں دُم دبا کر بھاگنے پہ مجبور کر دیتا' پسینے سے شرابور' ہف ہف کرتا ہوا ایک فاتح کی طرح اٹھلاتا پھرتا۔ ماں کی جھڑکیوں اور گالیوں کا اثر نہ اس پہ ہوتا اور نہ بچوں پہ ہوتا۔

کلا اب زبردست لڑاکا' مضبوط اور پھرتیلا ہو گیا تھا۔ انگ انگ میں جیسے بجلیاں بھر گئی تھیں' چاروں پاؤں پہ تیار--- مہتابی دیکھ دیکھ کر خوش بھی ہوتی اور غصے سے لال پیلی بھی

کہ سارا سارا دن اسی قسم کی ہلڑبازیوں میں گزر جاتا' نہ کسی کو کھانے کا ہوش' نہ پینے کی فکر' بچوں کی مائیں بہنیں بھی اپنے بچوں کو تلاش کرتی ہوئی یہاں پہنچتیں' گالیاں' صلواتیں' کوسنے' پھر اِدھر اُدھر کی باتیں' کالے کے قصّے--- تھکاہارا شکرا گھر آتا تو اسے دن بھر کی رپورٹ باہر ہی مل جاتی' گھر صحن کا نقشہ بھی دن بھر کی کارروائیوں کی چغلی کھاتا۔ پھر بھی کھانا کھاتے ہوئے وہ کالے کے بارے میں بھی پوچھ لیتا' اِدھر اُدھر اسے تلاش بھی کرتا مگر وہ اس کی خوشبو پاتے ہی کسی کونے کھدرے میں دَب جاتا۔ جیسے اسے معلوم ہو تا کہ اب میری شکائتیں لگیں گی--- مہتابی بھی تھکی تھکی' مضحل سی دکھائی دیتی اور پوچھنے پہ کبھی وہ بتا بھی دیتی کہ بڑا شرارتی ہو گیا ہے۔ سارا دن اودھم اور ہلاگلا کرتا رہتا ہے۔ یہ توڑا' وہ پھوڑا' فلاں کتورے کا کان' فلاں کی ٹانگ' بچوں کی لڑائیاں' مقابلے' سب بتاتی۔ وہ بے پروائی سے کھانا کھاتا رہتا اور "ہوں' ہوں" کہہ کر لقمے توڑتا رہتا اور پھر کہتا۔

"ٹھیک ہے--- تم جانو اور تمہارا کلا' میں تم دونوں کے بیچ آنے والا کون ہوتا ہوں؟--- میں نے تو نیکی بدی سمجھادی ہوئی ہے۔"

☆☆

جمعہ کا دن تھا۔ گاؤں کے باہر میدان میں کبڈی کے مقابلے تھے۔ پاس پڑوس کے گاؤں والے' چیدہ چیدہ کھلاڑی' شوقین بچے' سب وہاں موجود تھے اور خوب رونق اور موج میلہ تھا۔ گھر' گاؤں' گلیوں میں بوڑھے' بیمار یا عورتیں ہی رہ گئی تھیں۔ کلا بڑا بے چین تھا' بار بار باہر دیکھتا اور بھاگتا ہوا کوٹھے پہ چڑھ جاتا۔ منڈیر' دیواروں کو سونگھتا پھرتا' پتا بھی ہلتا تو کان کھڑے کر لیتا۔ اسے آج کوئی دوست نظر نہیں آرہا تھا۔ مہتابی نے بھی آج فرصت پا کر پچھلی کوٹھڑی میں لپائی شروع کر دی تھی' ایک ہمسائی بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ بار بار اندر آتا' ماں کو دیکھتا' مصروف پا کر پھر باہر نکل جاتا۔ دروازے کے باہر جھانکتا مگر بچے تو سارے کبڈی کے میدان میں موجود تھے جہاں دوسرے ایک گاؤں کی ٹیم سے مقابلہ تھا' دونوں ٹیمیں زبردست تیاریوں میں تھیں۔ ڈھول ڈھمکے' باجے تاشے' خوب ہلڑبازی کا سامان جمع تھا۔ اس گاؤں کی ٹیم کا کپتان چوہدری فیض عالم تھا' گاؤں کے چوہدری رَبّ نواز کا اکلوتا لاڈلا بیٹا! گاؤں والوں کی ناک اور آنکھ کا تارا' جوان رعنا' نظر و نیّت کا صاف اور کھیل تماشوں کا شوقین' بچوں میں بچّہ اور بڑوں میں بڑا تو پھر کیسے کوئی بچہ بڑا گاؤں میں

موجود ہوتا' سب ہی وہاں کھیل کے میدان میں اسی کی ہلاشیری کے لئے موجود تھے اور ادھر کلا سخت مضطرب تھا۔ کوؤں' چڑیوں' گلہریوں نے بھی جیسے ہڑتال کر رکھی تھی۔ بھاری بوجھل قدموں سے وہ پھر باہر دروازے کی دہلیز پہ آ کھڑا ہوا' دائیں بائیں جھانکنے لگا۔ باہر گلی میں بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک مری ہوئی شارک پہ نظر پڑی تو پاس پہنچ کر اسے .بھنبھوڑ کر جی ہلکا کرنے لگا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی' ایک عورت اس کے سر پہ کھڑی تھی اور پیشتر اس کے کہ وہ آنکھ اٹھا کر دیکھتا' ایک بھاری چادر اس پہ گری اور وہ اندھیروں میں ڈوب گیا۔۔۔ ہوش آیا اور آنکھ کھلی تو وہ تیزواسی سانسیوں کے جھونپڑی میں ایک گڑے بانس کے ساتھ بندھا پڑا تھا' پاس ہی ایک ٹوٹے ہوئے پیالے میں گندلا سا دودھ پڑا ہوا تھا' سامنے جھونپڑوں کے پاس بندر' ریچھ اور غلیظ سے چھوٹے چھوٹے بدنسلے کتے بندھے ہوئے تھے' کچھ ننگ دھڑنگ' روتے بسورتے بچے ایک دوسرے کو گھسیٹ رہے تھے اور کچھ عجیب و غریب حلیے والی عورتیں کسی جناتی زبان میں گفتگو کرتی ہوئی مٹی کے کھلونوں کو رنگ کر رہی تھیں۔ بدبو' غلاظت اور سڑے بُسے گوشت کی سی سڑاند سے اس کا دماغ پھٹنے لگا' گلے پہ کس کر بندھی ہوئی رسی سے اسے اپنا دَم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ گلے کا پٹہ اور کانوں میں سونے کی تاریں غائب تھیں۔۔۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مہتابی شدت سے یاد آنے لگی۔ یار دوست' چڑیاں' گلہریاں' کوّے' آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے اور شدت جذبات سے روتے روتے وہ کوُں کوُں کرنے لگا جیسے فریاد کر رہا ہو۔ آواز سن کر دو مریل سے خارش زدہ کتورے لپک کر ادھر آ گئے اور پھر دور ہٹ کر اسے گھوُرنے لگے' انہیں دیکھ کر اس کی طبیعت اور مکدّر ہو گئی۔ وہ انہیں نظرانداز کرتا ہوا ادھر کونے میں منہ پھیر کر بیٹھ گیا۔ میدان صاف دیکھ کر انہوں نے لپک کر چپڑ چپڑ دودھ والا پیالا صاف کر دیا اور دودھ پی کر جیسے وہ شیر ہو گئے۔ ایک پاس آ کر غرغر کرنے لگا۔ کلا پہلے ہی بیزار بیٹھا تھا' وہ ان بدنسلوں' نیچوں کے منہ لگنا نہیں چاہتا تھا' اس نے بہتری کوشش کی کہ یہ دودھ پی کر ٹل جائیں' دفعان ہو جائیں مگر وہ بدذات اسے خراب کرنے پہ تُلے ہوئے تھے۔ پھر دوسرا بھی شہ پا کر آگے بڑھ آیا اور دُم دبائے یہ دیکھی' اَن دیکھی کرتا رہا۔ ایک نے جو آگے بڑھ کر پنجہ چلانے کی کوشش کی تو اس نے اسے دبوچ لیا' پھر چھوڑا اس وقت جب وہ فارغ ہو چکا تھا' دوسرا چیاؤں چیاؤں چلاتا ہوا باہر بھاگ گیا اور چیخ چیخ کر اس نے

آسمان سر پر اٹھالیا۔ بندر' ریچھ' کتے' سب ادھر دیکھنے لگے۔ عورتیں بھی کام چھوڑ کر ادھر آ گئیں' اندر جو حالت دیکھی تو مرے ہوئے کتورے والی بھی چیخنے لگی۔ کلا پنجرے میں بند شیر کی طرح ٹہل رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ شیر' شیر ہی ہوتا ہے چاہے وہ پنجرے میں ہو یا جنگل میں۔۔۔ پھر مکھن ملائیوں سے پلا ہوا شہزادہ ان کمینوں کی صورتیں دیکھ کر اور جھلا اٹھا' رسی تڑانے لگا' بھونک بھونک کر ان کو صلواتیں سنانے لگا۔ یہ ہاہاکار سن کر ان کا چوہدری بسرا بھی لنگڑاتے لنگڑاتے اندر آ گیا اور اس نے آتے ہی گالیاں بکنا شروع کر دیں۔

"کیا شور مچاتی ہو؟۔۔۔ خاموش ہو جاؤ۔۔۔"

کتورے والی آگے بڑھی اور خون سے لت پت کتورا دکھانے لگی۔

"دیکھ بسرے! میرا کتورا مر گیا ہے۔۔۔ اس کالیئے نے اسے مار ڈالا۔ میں اس کا ہرجانہ لوں گی۔۔۔"

"چپ کر۔۔۔ مر گیا ہے تو کیا ہوا' تو تو نہیں مر گئی اور تو نے اپنے کتورے کو یہاں کیوں آنے دیا؟۔۔۔ اچھا چھوڑ اس بکھیڑے کو۔۔۔ اے مندراں! تجھے کہا تھا کہ اس کو چھپا کر رکھ' گاؤں والوں کو خبر ہو گئی تو مصیبت پڑ جائے گی۔ یہ بڑا نسلی کتورا ہے' ہزار دو ہزار میں جائے گا۔ اس کو چھپا' سیتے کو بول کہ اسے کہیں اور چھپا کر رکھے۔۔۔ اور سنو! کسی کو اس کی سُن گُن نہیں لگنی چاہئے۔۔۔ اے بگڑو! پھینک اس مردہ کتورے کو کہیں روڑی پہ' ادھر پھر مت آنا۔۔۔"

☆☆

کالے کی گمشدگی کی خبر پر لگا کر اڑ گئی تھی' اڑوس پڑوس کی عورتیں' لڑکیاں' بوڑھے سب جمع ہو گئے اور مہتابی نے رو رو کر برا حال کر لیا۔ شکرا تو گاؤں میں موجود نہیں تھا' لوگ ہمدردی دلاسے کے ساتھ ساتھ مختلف قیاس آرائیاں کر رہے تھے کہ کسی نے سونے کے لالچ میں اغوا کر لیا ہے۔ ادھر ادھر گلیاں اور کنویں بھی دیکھے گئے۔ چند ایک شریر لڑکوں پہ بھی شک کیا گیا' تیزواسیوں کے بارے میں بھی خدشات ظاہر کئے گئے۔۔۔ اڑتی اڑتی بات کبڈی کے میدان میں بھی پہنچ گئی۔۔۔ وہاں بھی کھیل اپنے اختتام تک پہنچ چکا تھا' عصر کی نماز سے پہلے پہلے آدھا کبڈی کا میدان شکرے کے گھر جمع ہو چکا تھا' شکرے کو

بھی خبر مل چکی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو یہاں اک ہاہاکار مچی ہوئی تھی۔ مہتابی بین کر رہی تھی' شکرے کو دیکھتے ہی دہاڑیں مارنے لگی۔

"ہائے میرا کالا' میرا سوہنا!۔۔ جاؤ' کہیں سے تلاش کر کے لاؤ۔۔۔"

"سنبھالا کر' مل جائے گا۔۔۔ کہیں اِدھر اُدھر ہو گا۔" وہ اسے تسلی دینے لگا۔

"نہ' نہ۔۔۔ سارا گاؤں چھان مارا ہے۔۔۔ ہائے' کوئی اسے تلاش کرے۔" وہ بین کرنے لگی۔

شکرا ذرا سختی سے بولا۔ "چپ کر پاگلے! میں پہلے ہی کہتا تھا کہ اتنا نہ چڑھا اسے سر پہ' سونے کی تاریں نہ ڈال۔۔۔ دیکھ لیا؟ اسی سونے کے لالچ میں اسے کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔۔۔"

مہتابی چپ ہو گئی' بُکل میں منہ دے کر سر سر کرنے لگی۔

"جاؤ بھئی' جاؤ اپنے گھروں میں۔۔۔ کتے بِلے تو گم ہوتے ہی رہتے ہیں مگر یہاں ایسے لوگ جمع ہیں جیسے خدانخواستہ کوئی آدمی مر گیا ہے۔۔۔"

ہمسایہ رحمت دوکاندار بولا۔ "شکرو دین! اتنا سخت نہ بول۔۔۔ بہن مہتابی اس سے بڑا پیار کرتی تھی' اولاد کی طرح خیال رکھتی تھی۔۔۔ میرا خیال ہے' ہم سب مل کر ایک بار پھر اسے تلاش کرتے ہیں۔"

"۔۔۔ کہاں تلاش کریں' شام ہو رہی ہے۔۔۔ اندھیرے میں کہاں ٹکریں ماریں گے؟" شکرا پانی کا گھونٹ لیتے ہوئے بولا۔

اتنی دیر میں چوہدری رب نواز کا بیٹا چوہدری فیض اندر داخل ہوا' کبڈی جیتنے کی خوشی میں ٹیم کے سارے کھلاڑی بھی ساتھ تھے۔ چوہدری کے ڈیرے سب کی دعوت تھی مگر کالے کا سن کر سب یہیں آ گئے۔

"چچا شکرے! سنا ہے' کالا گم ہو گیا ہے۔۔۔"

"ہاں' چوہدری جی! شاید کوئی اٹھا کر لے گیا ہے۔۔۔ آج کل پیتل کوئی نہیں چھوڑتا اور تیری چاچی نے تو اس کے کانوں میں سونا ڈال رکھا تھا۔۔۔"

بابا سجاول چوکیدار بولا۔ "چوہدری جی! میرا یقین ہے کہ یہ کام تپڑواسیوں کا ہے' گاؤں میں کوئی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔۔۔ سونے کے لالچ میں ان کی کوئی عورت یہ کارروائی

ڈال گئی ہے۔"

منی طاری کا بیٹا بولا۔ "چوہدری جی! آپ ہمیں حکم دیں' ہم ابھی تپڑواسیوں کے ڈیرے جاتے ہیں۔۔۔"

سب لڑکوں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

"نہ پُترا یہ کام تمہارے بس کا نہیں۔۔۔ وہ لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔" سجاول چوکیدار نے انہیں سمجھایا۔

چوہدری فیض بولا۔ "چاچا! میں ابھی اپنے ابے سے بات کرتا ہوں' وہ دو منٹ میں کالے کو برآمد کروا لیں گے۔"

پیشتر اس کے کہ کوئی اسے جواب دیتا' وہ دہلیز پار کر چکا تھا۔ پھر دس منٹ بعد ہی چوہدری رب نواز اپنے کامے فقیرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

"یار' شکرو دینا! یہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔۔۔ سنا ہے کہ تمہارا کتورا گم ہو گیا ہے' مہتابی کو دورے پڑ رہے ہیں؟"

شکر دین' چوہدری رب نواز کو بٹھاتے ہوئے بولا: "چوہدری صاحب! یہ تو پاگل ہے۔۔۔ بڑا ہی سمجھایا کہ جانوروں سے اتنا پیار نہیں بڑھاتے مگر پیار تو پیار' اس نے اس کے کانوں میں سونے کی مُرکیاں بھی ڈال رکھی تھیں۔ اس کا تو یہ حساب تھا کہ گھر کھانے کو نہیں اور اماں پینے کو گئی ہوئی ہے۔۔۔ اب بیٹھی ٹسوے بہا رہی ہے۔"

"اچھا' یار! چھوڑ ان باتوں کو' پیار میں تو ایسا ہو ہی جاتا ہے۔۔۔ تیرا کیا خیال ہے کہ کتورا کہاں گیا ہے؟"

"اباجی! سب کا خیال ہے کہ یہ کام تپڑواسیوں کا ہے۔ ان کو پتہ تھا کہ آج کبڈی ہے' گاؤں خالی ہے۔ ان کی کوئی عورت اسے اٹھا کر لے گئی ہے۔" چوہدری فیض نے جواب دیا۔

"تمہارا کیا خیال ہے اوئے' سجاولا۔۔۔؟" وہ چوکیدار سے پوچھنے لگا۔

"چوہدری جی! مجھے تو پورا پورا یقین ہے کہ یہ ان ہی لوگوں کا کام ہے۔۔۔"

چوہدری رب نواز کچھ توقف سے بولا۔ "۔۔۔ اور میرا بھی یہی خیال ہے۔ اگر کتورا ان کے پاس ہی اور سلامت ہے تو مل جائے گا۔۔۔" چوہدری نے اپنے بیٹے فیض کو قریب

بلایا اور ہدایت کی۔ "ان بچوں اور فقیرے کے ساتھ دو چار آدمی اور بھی ساتھ لے جاؤ اور تیڑواسیوں کے ڈیرے کے گرد' کتوں کی پہنچ سے دور گھیرا ڈال کر بیٹھ جاؤ۔ پھر جو بھی آدمی ڈیرے سے باہر نکلتا ہوا دکھائی دے' اس کو پکڑ کر یہاں لے آؤ۔ یہ کام بڑی احتیاط' خاموشی اور ان کو پتا چلے بغیر ہونا چاہئے ورنہ کتورا نہیں ملے گا---" پھر بچوں سے مخاطب ہوا۔ "بچو! آپ کو کلا چاہئے---؟"

"جی' چوہدری جی---" سب بچے فلک شگاف آواز سے بولے۔

"ٹھیک ہے' اب تم جاؤ---" پھر وہ سجاول چوکیدار سے مخاطب ہوا۔ "سجاول! تم ابھی ان کے ڈیرے جاؤ اور بسرے کو ساتھ لے کر فوراً" میرے پاس یہاں پہنچو---"

مہتابی اٹھ کر بیٹھ چکی تھی' بولی۔ "اللہ آپ کا بھلا کرے چوہدری صاحب! اللہ' بچہ جیئے---" وہ جھولی اٹھا کر دعائیں دینے لگی۔

"مہتابی! اب رونا دھونا چھوڑ اور ٹکر پانی کا بندوبست کر--- یہ جو بارات تم نے اپنے وہڑے بٹھا رکھی ہے' اس کے کچھ کھانے پینے کا بھی تو خیال کرو---"

"چوہدری جی! میں تو پورے گاؤں میں بتاشے بانٹوں گی' میرا کلا مل جائے تو چُورے چڑھاؤں گی۔"

چوہدری صاحب کی موجودگی کے پیش نظر آس پاس سے بہت سے لوگ یہاں اکٹھے ہو گئے تھے' اتنی رونق شادی بیاہ یا الیکشن پہ ہی ہوتی ہے یا پھر اک بے زبان کی محبت کا اعجاز تھا کہ گاؤں بھر کے چھوٹے بڑے اس کی سلامتی اور بازیابی کے لئے بے قرار تھے--- ہمسائیوں نے سبز چائے کے دیگچے چڑھا دیئے۔ باقرخانیاں' خاتائیاں' رَس منگوائے گئے۔ عورتیں چادروں کی بُکلیں مارے باتوں میں معروف تھیں' مرد حقے اور کبڈی کی باتوں سے دل بہلا رہے تھے اور ایسے میں شکرا اپنے کسی شکار کی رُوداد سنانے بیٹھ گیا۔ علما ماشکی برتن صاف کر رہا تھا' بخشو چنگڑ دری بچھا رہا تھا۔ مولوی ثناء اللہ جو پہلے لاحول پڑھتا ہوا گزر گیا تھا' چوہدری صاحب کی موجودگی کو محسوس کرتا ہوا اندر آ گیا اور اب بے زبانوں پہ صلہ رحمی کی حدیثیں سنا رہا تھا۔ چائے کے دوران ہی چوکیدار کے پیچھے بسرا' اپنے ایک آدمی کے شانے پہ ہاتھ رکھے لنگڑاتا ہوا داخل ہوا اور اندر آتے ہی اس نے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر چوہدری صاحب کو سلام کیا پھر پاؤں کے پاس بیٹھتے ہوئے' چڑھی ہوئی خونخوار آنکھوں سے

سب کو ہٹر ہٹر دیکھنے لگا۔ صحن میں بیٹھے ہوئے سب ہی لوگ اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے' اندر سے تو وہ بھی جانتا تھا کہ اس کی طلبی کس ضمن میں ہوئی ہے پھر بھی وہ انجان بنتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"کیا حکم ہے چوہدری صاحب!--- کمین کو کیوں بلایا ہے؟"

چوہدری صاحب نے ایک آدمی کو چائے لانے کا حکم دیا اور بولے۔ "پہلے کچھ کھا پی لو' پھر تسلی سے بات کرتے ہیں۔"

وہ تیڑواسی تھا' اپنے ڈیرے کا چوہدری! بلا کا خرانٹ' مکار جو پیدا ہی گندگی میں ہوا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر پاؤں دابنے لگا۔

"چوہدری صاحب! رَبّ خیر کرے' کیا کوئی واردات ہو گئی ہے---؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بسرے! تمہیں یاد ہو گا کہ بڑی عید سے چند روز پہلے تم میرے پاس آئے تھے---"

"ہاں--- یاد ہے مائی باپ!" وہ یاد کرتے ہوئے بولا۔

"--- تو پھر تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ تم نے مجھے کیا کہا تھا اور میں نے کیا جواب دیا؟"

"جی--- میں نے آپ کی زمین پہ ڈیرہ لگانے کی اجازت مانگی تھی اور آپ نے مہربانی کر کے اجازت دے دی تھی---"

"--- اور کیا کہا تھا' وہ بھی یاد کر کے بتاؤ---؟"

وہ ہکلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ نے کہا تھا کہ بندے دا پتر بن کر رہنا' مجھے کوئی شکایت نہیں ملنی چاہئے---"

"اوئے حرامزادیا' پھر تم نے یہ حرکت کیوں کی؟" چوہدری صاحب نے اسے ایک دھول رسید کرتے ہوئے کہا۔

"کیا کیا ہے میں نے چوہدری صاحب---؟"

"بسرے! تجھے سب کچھ معلوم ہے--- ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر کتورا' سونے کی بالیاں یہاں اس جگہ مجھے واپس ملنی چاہئیں ورنہ تیرے کتے' بندر' عورتیں' ڈیرہ' سب کچھ برباد کر دیا جائے گا--- دیکھ! یہ سب لوگ میرے صرف اشارے کے منتظر ہیں' سیدھی طرح شرافت سے واپس کر دے ورنہ مجھے گھی ٹیڑھی انگلی سے نکالنا بھی آتا

ہے---"

وہ گڑگڑاتے ہوئے سر نیچا کر کے کہنے لگا۔ "مائی باپ! سر حاضر ہے، گن کر پانچ ہزار جوتے ماریں، میں اُف نہیں کروں گا۔ جب آپ کے دل کی بھڑاس نکل جائے تو پھر مجھے بھی کچھ کہنے کا موقع دیں---"

"بول--- بکواس کر، تو کیا کہنا چاہتا ہے؟"

"چوہدری صاحب! ہم آپ کے نمک خوار ہیں، آپ کے گاؤں اور پاس پڑوس کے دیہاتوں سے ہی ہمارا رزق پانی چلتا ہے۔ ہم بدنام ضرور ہیں مگر چور نہیں--- میرے ڈیرے والوں میں کسی نے یہ حرکت نہیں کی، ہم تو گھگوگھوڑے، کھلونے، کھیل تماشے سے روزی کماتے ہیں، ہم بھلا ایسی حرکت کیوں کریں اور پھر آپ جیسے مہربانوں کے ساتھ؟"

"اس کا مطلب ہے کہ تو سیدھی طرح نہیں مانے گا---"

چوہدری اٹھتے ہوئے بولا، ساتھ ہی کچھ جوان بھی آستینیں اُلٹی کرنے لگے۔ وہ گھبرا کر پاؤں سے لپٹ گیا۔

"چوہدری صاحب! میرے سر پہ قرآن رکھیں، میں کوڑھا ہو کر مروں، لاش میں کیڑے پڑیں جو ہم میں سے کسی نے یہ حرکت کی ہو--- بلاشک آپ ہمارے ڈیرے کی تلاشی لے لیں---"

مولوی ثناء اللہ نے مداخلت کی۔ "چوہدری صاحب! حدیث شریف ہے کہ---"

چوہدری صاحب نے بڑے ادب سے ان کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ حدیث شریف جمعہ کے خطبے میں سنائیے گا، یہ حدیث شریف اس ذات شریف کے لئے نہیں ہے--- بھولے بادشاہو! حدیثاں کتاباں بندیاں واسطے آئی ہیں، انہاں چوراں بدمعاشاں واسطے ڈنڈا پیر ہے---"

بسرا پھر گڑگڑایا۔ "چوہدری صاحب! مَیں بے قصور ہوں، آپ خواہ مخواہ ہم پہ شک کر رہے ہیں--- کوئی اور بھی تو یہ حرکت کر سکتا ہے، آپ بغیر ثبوت گواہی کے ہمیں رگڑا دے رہے ہیں۔"

مولوی ثناء اللہ شائد چپ ہی نہیں رہ سکتے تھے یا پھر اپنے نمبر بھی بنانا چاہتے تھے، پھر

بول اٹھے۔ "چوہدری صاحب! شرع شریعت---"

چوہدری صاحب نے پھر بات کاٹ دی۔ "بزرگو! گستاخی معاف، یہ شرع شریعت بھی انسانوں اور مسلمانوں کے لئے ہے--- آگے آکر اس کا منہ سونگھ لیں، یہ ابھی بھی دو کونڈے بھنگ اور ڈیڑھ چھٹانک چرس پیئے ہوئے ہے۔"

شریفے میراثی نے ہاتھ جوڑ کر لقمہ دیا۔ "مولا خوش رکھے، مولبی صاحب! جمعراتاں لگیاں رہن--- یہ باگڑبلا دو بلیوں کی یخنی بھی ہر روز پیتا ہے---"

پھر قہقہوں کا طوفان بپا ہو گیا، لوگ ہنس ہنس کے دہرے ہو رہے تھے۔

"چُپ اوئے! شریفیا---!" چوہدری صاحب نے اسے ڈانٹا۔

مولوی ثناء اللہ لاحول پڑھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اچھا جی، چوہدری جی! مَیں چلتا ہوں--- میری تو بے عزتی ہو گئی ہے، نہ یہاں کوئی حدیث سنتا ہے اور نہ کوئی شرع شریعت کی بات--- مَیں جب سے یہاں آیا ہوں، کتوں، باندروں، ریچھوں اور گدھوں کی باتیں سن رہا ہوں بلکہ یہاں یہ سارا اکٹھ ہی ایک کتورے کی وجہ سے ہوا ہے۔ مسجد میں اتنا اکٹھ تو کبھی جمعہ کی نماز پر بھی نہیں ہوا---"

مجلس ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ چوہدری صاحب نے موقع کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مولوی کو پکڑ کر بٹھایا۔

"قبلہ، آپ بیٹھئے، میں عرض کرتا ہوں--- جس طرح مسجد میں اللہ رسول قرآن حدیث کی باتیں ہوتی ہیں اسی طرح ہم دنیاداروں، دیہاتیوں، محنت کشوں کی روزمرہ کی زندگی میں دوسرے مسائل کے ساتھ ساتھ بیلوں، کھوتوں، گھوڑوں، کتوں وغیرہ کے مسائل بھی بڑے اہم ہوتے ہیں۔ یہ جانور ہمارے ساتھی ہیں، مددگار ہیں--- گستاخی معاف، آ کو تو پکی پکائی ون سوونی ہر روز مل جاتی ہے مگر ہم لوگوں اور ان جانوروں کو یہ رزق روزی پیدا کرنے کے لئے بڑی محنت مشقت اور جان مارنی پڑتی ہے--- آپ ان جانوروں کو اپنے یا مسجد کے نزدیک بھی نہیں آنے دیتے لیکن یہ جانور ہمارے گھروں میں ہمارے ساتھ رہتے ہیں مولوی صاحب! دنیادار یا مزدور بننا بڑا اوکھا ہے---"

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ چند لڑکے بھاگتے بھاگتے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اندر آئے اور خوشخبری سنائی کہ کلا مل گیا ہے--- بسرے کا رنگ فق ہو گیا۔ چوہدری صاحب

نے حکم دیا کہ ان دونوں کو دھریک کے ساتھ باندھ دو۔ بچے خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے آ رہے تھے۔ چوہدری فیض، فقیرا اور دوسرے لوگ اندر داخل ہوئے تو تیزواسی میستا بھی سر جھکائے ان کے آگے لگا ہوا تھا، کلا کوں کوں کرتا اس کے ہاتھوں میں تھا۔ میستا تیزواسی اندر آتے ہی چوہدری صاحب کے پاؤں پڑ گیا، اس کی اچھی خاصی مرمت پہلے ہی ہو چکی تھی۔ چوہدری صاحب نے سب بچوں کو خاموشی سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ تیزواسی تھر تھر کانپتا ہوا بسرے چوہدری کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ کلا اس کے ہاتھوں سے آزاد ہونے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا، مہتابی نے والہانہ انداز سے آگے بڑھ کر دو ہتھڑ رسید کرتے ہوئے کالے کو چھین لیا، گالیاں اور بددعائیں دیتی ہوئی وہ کالے کو پیار کرنے لگی۔ شکرے نے آگے بڑھ کر میستے کو ایک لات رسید کی۔

"۔۔۔کی ناں اوئے تیرا؟" چوہدری صاحب نے بھی ایک دھول جماتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جی، میرا نام میستا ہے۔۔۔"

"سچ سچ بتاؤ، یہ کتورا تم کو کس نے دیا اور تم اسے کہاں لے جا رہے تھے؟۔۔۔ یاد رکھو، اگر جھوٹ بولنے کی کوشش کی تو خیر نہیں۔۔۔"

"چوہدری صاحب! میں کیا بتاؤں، میں تو اندھیرے میں مارا گیا ہوں۔۔۔ یقین کریں، میں بالکل بے قصور ہوں۔"

چوہدری صاحب کے اشارے پہ دو تین آدمی اس پہ پل پڑے، وہ چیخیں مار کر رونے لگا۔

"مجھے معاف کر دیں، مَیں بے قصور ہوں۔۔۔"

"اوئے بسرے، تم بتاؤ کہ یہ تمہارا آدمی ہے۔۔۔ اس کے پاس کتورہ کہاں سے آیا؟"

بسرا دھریک کے ساتھ بندھا ہوا گھگھیایا۔ جی، یہ میرا آدمی ہے۔۔۔ چوہدری صاحب! ہمیں معاف کر دیں، غلطی ہو گئی ہے۔"

چوہدری صاحب اب مولوی ثناء اللہ سے مخاطب ہوئے۔ "مولوی صاحب! اب بتائیے کہ ان کے لئے شرع شریعت ہے یا ڈنڈا۔۔۔؟"

مولوی صاحب لاحول پڑھنے لگے۔ "چوہدری صاحب! یہ تو پکے چور ہیں مگر

شرع۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ شرع کے مطابق ان کی کیا سزا ہے، یہ بتائیے؟" چوہدری نے پوچھا۔

"شرع کے مطابق تو ان کے ہاتھ کاٹ دینے چاہئیں یا پھر معاف کر دیں۔۔۔"

"اچھا، تو آپ بسم اللہ کر کے اٹھیں اور ان کے ہاتھ کاٹیں۔۔۔ دو بھئی، ان کو کوئی تیز سا ٹوکہ۔۔۔"

بسرا اور اس کے ساتھی دھاڑیں مار کر رونے لور فریادیں کرنے لگے اور مولوی صاحب آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔

"مولوی صاحب! گھبرائیں نہیں، شرع شریعت کو پورا کرنا آپ کا فرض ہے۔"

مولوی صاحب کانپنے لگے۔ "جی، وہ تو ٹھیک ہے مگر میں ذرا دل کا کمزور ہوں۔۔۔ بوڑھا آدمی ہوں، یہ کام نہیں کر سکتا۔۔۔ ویسے بھی ہمارا قانون اس کی اجازت نہیں دیتا۔۔۔"

اب شکرا بولا۔ "چھوڑیں چوہدری صاحب! جانے دیں۔۔۔"

چوہدری صاحب نے بسرے سے پوچھا۔ "بتاؤ بسرے! تم لوگوں کو کیا سزا دی جائے۔۔۔ ہاتھ کاٹے جائیں یا۔۔۔؟"

وہ روتے ہوئے بولا۔ "مائی باپ! بس ایک دفعہ معاف کر دیں، ہماری توبہ۔ جو پھر ایسی حرکت کریں۔۔۔ ہم سونے کی والیاں واپس کر دیتے ہیں اور یہاں سے کہیں اور چلے جاتے ہیں، بس ایک دفعہ ہمارا قصور معاف کر دیں۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

"بولو بھئی، تمہارا کیا فیصلہ ہے۔۔۔؟"

سب بچے بڑے جوش میں تھے، مختلف مشورے دینے لگے، کوئی ہاتھ کاٹنے کا کہہ رہا تھا اور کوئی لترچھترول کے حق میں تھا، کوئی جرمانہ اور علاقہ بدر کے لئے کہہ رہا تھا۔ چوہدری فیض نے کہا کہ سزا تجویز کرنے کا حق چاچی مہتابی کو ملنا چاہئے۔ اس سے پوچھا گیا تو وہ کہنے لگی۔

"چوہدری جی، دفع کرو۔۔۔ میرا کلا مجھے مل گیا ہے مَیں نے ان کو معاف کیا۔۔۔"

مولوی ثناء اللہ نے خوش ہو کر کہا۔ "جزاک اللہ۔۔۔ چوہدری صاحب! آپ بھی ان کو معاف کر دیں۔"

"نہیں، نہیں — ان کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔" بچوں نے شور مچایا۔

چوہدری نے کافی سوچ بچار کے بعد فیصلہ سنایا۔

"ان کی سزا یہی ہے کہ یہ کل شام سے پہلے پہلے ہمارے گاؤں کی حدود سے باہر نکل جائیں، پنہ اور سونے کی تاریں واپس کریں—"

☆☆

کالا واپس تو آگیا تھا مگر تبدیلی کے ساتھ، اب وہ ڈر کے مارے باہر بھی نہیں جھانکتا تھا— پھر وہی کھیل تماشے اور قلابازیاں شروع ہو گئیں، چند دنوں میں سب بھول بھلا گئے کہ کوئی واقعہ بھی ہوا تھا یا نہیں، زندگی اپنے معمول پہ آگئی۔ آس پاس دیہاتوں میں اس کی دھوم مچی ہوئی تھی، کتوں کے شوقین بڑی دور دور سے اسے دیکھنے کے لئے آتے تھے، چند ایک معقول رقم کے عوض خریدنے کی پیش کش بھی کرتے لیکن شکرا انکار کر دیتا۔ چوہدری فیض اسے ہر روز اپنے ڈیرے پہ لے جاتا، نہلاتا دھلاتا، کھیتوں میں ورزش کراتا، کھانے پینے کا اہتمام کرتا، کالا بھی اس کے ساتھ گھل مل گیا تھا، چڑی بھی حسب معمول چکر لگا جاتی تھی۔ وہ بھی اب اس کی جانب سے مطمئن نظر آتی تھی— دن تھے کہ جیسے پر لگا کر اڑ رہے تھے۔

پار گاؤں کا چوہدری کرم داد جس نے شکرے کو کالا دیا تھا، ایک دن اس کا پیغام آگیا۔ شکرا اسے ملنے کے لئے پہنچا تو اس نے یاد دلایا کہ یہ پلا میں نے تجھے مفت دیا تھا اور چونکہ اب یہ تندرست ہو گیا ہے اس لئے تم حق محنت لے کر اسے واپس کر دو۔ شکرے نے انکار کر دیا اور کہا کہ اس پلے سے اس کی بیوی کی جذباتی وابستگی ہے، بڑی تکلیفوں اور محنت سے پالا پوسا ہے اس لئے واپس نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی بتایا کہ کالا بھی اب کہیں اور نہیں رہ سکتا۔ چوہدری کرم داد نے آخری پتا پھینکا اور ایک نہایت ہی معقول رقم کی پیشکش کر دی، عام حالات میں یہ پیشکش بڑی دلکش تھی جسے ٹھکرایا نہیں جا سکتا تھا مگر وہ اپنی بیوی کے سامنے مجبور تھا جو جسم کا کوئی حصہ تو کاٹ کر دے سکتی تھی مگر کالا نہیں— چوہدری نے اسے لاکھ سمجھایا کہ اس نسل کے باقی کتے اس کے پاس ہیں، وہ نہیں چاہتا کہ یہ نسل کسی اور کے پاس بھی ہو مگر شکرا کسی قیمت پہ راضی نہ ہوا— واپسی پہ ساری بات مہتابی کو بتائی اور خاص طور پہ چوہدری کی پیشکش کا ذکر کیا کہ بڑی معقول رقم ہے مگر مہتابی ٹس

سے مس نہ ہوئی— شکرے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"— کالا بڑا ہو گیا ہے، اپنی فطرت سے مجبور ہو کر کل کلاں کوئی خرابی کرے گا اور ہم کہاں تک رکھوالی کریں گے؟— اس سے نسل حاصل کرنے کے لئے لوگ ہر طریقہ استعمال کریں گے، اسی خدشے کے پیش نظر چوہدری کرم داد اسے واپس لینا چاہتا ہے۔ تم ٹھنڈے دماغ سے سوچ لو، ابھی بھی وقت ہے— میری مانو تو اسے چوہدری کرم داد کو دے دیتے ہیں۔ اس کی ماں اور بہن بھائی بھی وہاں ہیں، چوہدری اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے، ابھی وہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ انگلیاں ٹیڑھی بھی کر لے— ابھی تو یہ چوہدری صاحب کی مہربانی سے واپس مل گیا ہے مگر اسے پھر چوری بھی کروایا جا سکتا ہے، زہر دیا جا سکتا ہے—"

مہتابی نے بڑھ کر اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا۔ "کیوں بڑے بڑے لفظ اپنی زبان سے نکال رہے ہو؟ رب میرے کالے کو دشمنوں سے بچا کر رکھے— شکرے! تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے، دنیا میں لکھاں کروڑاں کتے ہیں مگر سب کی نظر اس معصوم کتورے پہ ہے، صرف اس لئے کہ اس سے مہتابی پیار کرتی ہے۔ کوئی اسے چوری کرتا ہے، کوئی اسے خریدتا ہے اور کوئی زہر دینے کی سوچتا ہے— شکرے! میرے تو نصیب ہی ایسے ہیں—"

وہ رونے لگی تو شکرا اسے دلاسا دینے لگا۔

"میرا دماغ خراب نہ کر— میں کہاں اسے دینا چاہتا ہوں؟ بس ذرا تم سے بات کی ہے اور تم ہو کہ بات کا بتنگڑ بنا لیتی ہو—" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے، کالا ہمارے قریب ہی رہے گا اور محفوظ بھی— اگر رونا دھونا چھوڑ دو تو بتاتا ہوں؟"

"چلو کیا بات آئی ہے؟" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

"— بات یہ آئی ہے کہ ہم کالے کو چوہدری فیض کو دے دیتے ہیں— ویسے بھی وہ اس کے ساتھ خوش رہتا ہے۔ وہاں اس کا کھانا پینا اور ٹریننگ بھی ہو گی اور حفاظت بھی اور یہاں بچوں کی کھل بھی ختم ہو جائے گی— بول کیا بولتی ہے؟"

"ہے تو ٹھیک مگر—"

"اگر گھر کو چھوڑ۔۔۔ جب دل چاہے وہاں چلی جایا کرنا، کلا بھی تو یہاں آتا جاتا رہے گا۔۔۔ کون سا دُور ہے، دو کھیتوں کا فاصلہ ہی تو ہے۔"

☆☆

چار پانچ مہینے پل جھپکتے ہی گزر گئے۔

کلا نئے گھر میں بڑا خوش تھا اور خوش بھی کیوں نہ ہوتا کہ دودھ، ملائیاں، مربّے، دو دو کامے نگہداشت اور خدمت کے لئے، کھلے کھیت کھلیان، نت نئی دلچسپیاں، بھاگ دوڑ، ورزش، ٹریننگ۔۔۔ کہتے ہیں کہ کتے، گھوڑے، ہاتھی اور دوستیاں صرف امیر لوگ ہی پال سکتے ہیں۔ یہ غریبوں، محنت کشوں کے بس کی بات نہیں ہوتی جنہیں صبح و شام دال روٹی کے لالے ہی پڑے رہتے ہیں۔ یہ چیزیں تو وقت، خدمت اور حفاظت مانگتی ہیں۔۔۔ کالے کو یہاں سب کچھ مل رہا تھا۔

کالے پہ جوانی کالی رات کی طرح اُتری تھی۔ لش لش کرتا ہوا چمکیلا سیاہ بدن، انگ انگ میں بجلیوں کے لپکتے کوندے، خوبصورت آنکھوں میں ہیرے کی کنی سی چمک، سیماب کی سی بے قراری، چلت پھرت میں بانکپن، کھڑا ہو تو جی چاہے کہ ساتھ کھڑے ہو کر تصویر کھنچوائی جائے۔ چوہدری فیض تو جیسے اسی کے لئے جیتا تھا۔ ہر دم ساتھ، پل پل اکٹھے، جب دونوں کھلے کھیتوں میں مست خرامی کرتے تو دیکھنے والوں کے سینے میں دل دھڑکنا بھول جاتا۔۔۔ چوہدری فیض جوانِ رعنا، اِک مسحور کر دینے والی شخصیت کا مالک! جانے کتنی آنکھوں کی نیندیں، کتنے دلوں کا چین، کتنی سانسوں کی مہکاریں اس پہ صدقے قربان تھیں اس کا اندازہ اس شیشہ خیال، سیماب صفت اور آہن بدن کو بھلا کیا ہوتا ہوگا؟ فکر فردا اور فکر روزگار سے بے نیاز، اپنی ترنگ، اپنی مستی میں سرشار یہ اپنی راہوں میں بچھے ہوئے ہر گل، دل اور ہر نگاہ پہ اک نگاہ غلط ڈال کر گزر جاتا۔ اس کے بدن کو چوم کر گزرنے والی ہوائیں، قرب و جوار میں مشک و عنبر کی برساتیں کر جاتیں۔۔۔ گلُ رُخ پار گاؤں کے چوہدری کرم داد کی اکلوتی چشم و چراغ تھی معصوم سی ہرنی کی آنکھوں والی اور یہ آنکھیں کوئی بھلا دینے والی چیز نہیں تھیں۔ وہ انہیں ابھی تک نہیں بھولا تھا۔ گلُ رُخ کو اس نے اپنے گاؤں میں ایک شادی کے موقع پہ دیکھا۔۔۔ آتش بازی ہو رہی تھی کہ ایک شرلی اس کے دوپٹے میں گھس گئی۔ وہ چیختی چلاتی گلی میں بھاگ کھڑی ہوئی، آگے سامنے سے یہ

آ رہا تھا، بے دھیانی میں جو ٹکر ہوئی تو دونوں کے سروں سے پٹاخے چھوٹنے لگے، سُدھ بُدھ ماری گئی۔ بس اس وقت سے اس کی آنکھیں اسی کے پاس تھیں، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پار گاؤں کے چوہدری کرم داد کی لڑکی ہے۔ اسی گاؤں میں اس کی پھوپھی بھی رہتی تھی، وہاں کبھی جانا بھی ہوا تو وہ آنکھیں کہیں دکھائی نہ دیں۔ پھوپھی سے پوچھنے کی کبھی جرأت نہ ہوئی، ناسمجھی کی کچی عمر سے آج پکے پاؤں تک ان آنکھوں نے پیچھے نہ چھوڑا، اکلوتا اور جوان ہونے کے ناتے اگر گھر میں کبھی شادی کی بات چلی بھی تو وہ طرح دے جاتا کہ شادی تو میں اپنی مرضی اور جب چاہوں گا کروں گا، ماں باپ بھی ہنسنے کھیلنے کے دن سمجھ کر خاموش ہو جاتے۔

گاؤں کے میدان میں سالانہ کتوں کے مقابلے بھی شروع ہونے والے تھے، زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں، اچھے اچھے کتوں کو تیار کیا جا رہا تھا۔ پار سال کی طرح اس مرتبہ بھی خوبصورت، صحت مند اور سدھائے ہوئے کتوں کے درمیان مقابلہ بازی تھی۔ کتوں کی لڑائی بھڑائی پہ پابندی تھی پھر بھی کسی نہ کسی طرح یہ سلسلہ بھی چل نکلتا، چھوٹی موٹی لڑائیاں بھی منہ کا سواد یا لہو گرم کرنے کا بہانہ سمجھ کر ہو جاتیں۔ پھر جہاں دو چار کتے مرتے وہاں پانچ سات جوان بھی زخمی ہو جاتے۔ عناد، رنجشوں اور رشک و حسد کے بیج، دلوں میں دبا لئے جاتے جو اگلے مقابلے تک تناور درخت بن جاتے اور پھر وہی سلسلہ چل نکلتا۔ شائد ان دیہاتیوں، کسانوں کے لئے لہو گرمانے کا یہی ایک مشغلہ تھا۔۔ کلا، کو عمر اور تجربے کے لحاظ سے ابھی اس قسم کے مقابلوں کے لئے موزوں نہیں تھا پھر بھی گاؤں والوں نے اصرار کر کے اس کو شامل مقابلہ کروا ہی دیا۔ چوہدری فیض تو دعوے سے کہتا تھا کہ میرا شیر ان سب پہ بھاری ہے، یہی مقابلہ جیتے گا۔ اب دن رات وہ اس کو تیار کرنے پہ جُت گیا۔ نت نئے مشورے، خوراکیں، ورزشیں، جیسے گاؤں والے پاگل ہو گئے ہوں۔ چوبیس گھنٹے باہر ڈیرے پہ میلے سا سماں رہتا۔۔۔ آخر مقابلے کا دن آ گیا۔ دُور و نزدیک سے بڑے بڑے اچھے، قد آور، تندرست کتے آئے تھے۔ ڈھول ڈھمکے، حمایتی، تماش بین، شوقین، چوہدری، منصف۔۔۔ پار گاؤں کا چوہدری کرم داد تو خاص طور پر بڑا اہتمام کر کے آیا تھا، اس کے کتے بڑی تیاریوں میں تھے۔ اسے پچھلے سال کی طرح اس مرتبہ بھی جیتنے اور کپ، سرٹیفکیٹ ملنے کا قوی یقین تھا۔ ہر گاؤں والوں کی الگ الگ منڈلی جمی ہوئی تھی۔ چوہدری

فیض بھی اپنے علیحدہ ڈیرے پہ تیاری کر رہا تھا۔ کلا خاص طور پر مقابلے سے پہلے مہتابی کے پاس گیا۔ مہتابی نے اسے چوری کھلائی' دعائیں دی۔ آخر مقابلہ شروع ہوا' سارا دن اسی ہنگامے میں گزر گیا۔ شام سے پہلے منصفوں نے نتیجے کا اعلان کیا تو کلا پورے پندرہ گاؤں کے بڑے بڑے کتوں کو شکست دے کر سارے انعام جیت چکا تھا۔ اس جیت نے بڑے بڑے تجربہ کار چوہدریوں اور کتوں کے شوقینوں کی توقعات کو تہس نہس کر دیا' بڑی بڑی گردنیں سینوں پہ لٹک گئی تھیں اور بڑے بڑے جلوس بے نیل و مرام مایوسی کے عالم میں ماتم کناں واپس لوٹے۔ ہزاروں روپوں کی شرطیں ادھر ادھر ہو گئیں اور خلاف توقع بغیر کسی سرپھٹول اور لڑائی جھگڑے کے مقابلے کا میدان خالی ہو گیا۔۔۔ چوہدری فیض کی حویلی اور شکرے کے گھر مبارک' سلامت کہنے والوں کا ہجوم تھا۔ پورے گاؤں میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں اور کلا دولہا بنا' ہار پہنے سب کی مبارکیں وصول کر رہا تھا۔ مہتابی تو جیسے چمکتا ہوا ماہتاب بنی ہوئی تھی مگر اس کا جی اچھا نہ تھا' اندر کوٹھڑی میں لیٹی سکھو دائی سے پیٹ ملوا رہی تھی۔ سکھو بڑے یقین سے کہہ رہی تھی۔

"مہتابی! اس مرتبہ تو اللہ پاک ضرور اپنا فضل کرے گا۔۔۔"

"اچھا' اللہ تیری زبان مبارک کرے اور مجھ نمانی کی فریادوں کو بھی قبولیت بخشے۔۔۔"

اس رات سارے گاؤں کی فضا خوشیوں کی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔ مٹھائیاں بانٹی گئیں' لوگ بڑھ بڑھ کر ایک دوسرے کو مبارکیں دے رہے تھے۔ کالے کی تعریفیں تھیں' چوہدری فیض کی محنت اور حکمت عملی کو سراہا جا رہا تھا۔ چوہدری رب نواز بھی اپنے حلقے میں بیٹھا خوش خوش آج کے مقابلے پر تبصرہ کر رہا تھا۔ چوہدری نے کالے کو انعام میں ملنے والی رقم شکرے کو دے دی تھی اور آج اس کی خوشی کا بھی کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔۔۔
ادھر پار گاؤں میں آج اداسی اور مایوسی کی اک دبیز لہر نے پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں جکڑا ہوا تھا' بظاہر لوگ روز مرہ کی طرح اپنے معمولات میں مگن نظر آتے تھے مگر اندر سے وہ لوگ بُری طرح ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ مسلسل کئی برسوں کی جیت کے بعد یہ ناکامی ان کی برداشت سے باہر تھی' چوہدری کرم داد کے کتے بڑے مشہور اور اعلیٰ نسل کے تھے۔ وہ ان کی نگہداشت' تربیت اور کھانے پینے پہ بے تحاشہ خرچ کرتا۔ گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ

موجود تھا مگر اولاد نرینہ کی کمی تھی۔ اپنے تمام چاؤ چونچلے اپنی بیٹی گُل رُخ یا کتوں کی پرورش پہ پورے کرتا۔۔۔ کلا بھی اسی کا دیا ہوا تھا' آج کالے نے ہی اس کی شہرت اور عزت پر کالا داغ لگا دیا تھا۔ چوہدری کرم داد کو جیسے چپُ سی لگ گئی تھی۔۔۔ ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے' وقتی طور پر اس کا اثر بھی رہتا ہے مگر پھر آہستہ آہستہ حالات' طبیعت اور زندگی اپنی ڈگر پر آ جاتی ہے لیکن یہ ہار تو جیسے اس کی انا اور وقار کا مسئلہ بن گئی تھی۔ اپنا کلہاڑا اپنے ہی پاؤں پہ پڑا اس لئے تکلیف زیادہ تھی اور پورا گاؤں اس کے غم میں شریک تھا۔ لوگ آتے' سلام کر کے دبی دبی زبان میں اظہار افسوس کر کے خاموشی سے بیٹھ جاتے' آپس کی باتوں میں مختلف تبصرے ہو رہے تھے' کوئی منصفوں کی ملی بھگت بتاتا' کوئی جانبداری کہتا' تعویذ گنڈوں کے اثرات بھی بتائے گئے۔ چوہدری بھی سب کچھ خاموشی سے سن رہا تھا۔۔۔ اسی رات چوہدری کرم داد بخار میں پھنک رہا تھا اور گُل رُخ آہستہ آہستہ سر دبا رہی تھی' وہ بھی اپنے باپ کے احساسات کو خوب سمجھ رہی تھی۔ اس شکست نے اس کے چہرے کے گلدان سے بھی گلاب نکال کر سرسوں جما دی تھی' غزالی آنکھوں میں کسی لق و دق صحرا کی اداسیوں اور وحشتوں نے ڈیرے ڈال دیئے تھے' سنہری زلفوں کا ابریشم چاندی کی صراحی جیسی گردن کے گرد پھیلا ہوا تھا۔ حُسنِ سوگوار کی سوندھی سوندھی باس ان اداس ساعتوں کی دھڑکنوں کو تیز کر رہی تھی۔۔۔ گلاب کے شگوفوں میں حرکت ہوئی۔

"ابا! آپ کو بڑا تیز بخار ہے۔۔۔"

"ہاں' پتری! بس ذرا تھکاوٹ ہو گئی ہے' صبح تک ٹھیک ہو جاؤں گا۔۔۔"

"۔۔۔ ہار جیت تو ہوتی رہتی ہے' آپ کو اتنا گہرا اثر نہیں لینا چاہئے۔۔۔ اس بار نہیں' تو اگلے برس ہم پھر جیت جائیں گے۔۔۔"

"پتر! بات ہار جیت کی نہیں' کالے کی ہے۔ میرا بخشا ہوا کتا آج میرے ہی مقابلے پہ لایا گیا اور اسی کتے نے مجھے شکست دے دی۔ اس سے زیادہ میری بے عزتی اور کیا ہو سکتی ہے؟"

"مگر ابا! انہوں نے یہ کتا آپ سے زبردستی تو نہیں لیا تھا بلکہ آپ نے خود ہی ان کو مفت دے دیا تھا اور یہ بات سب جانتے ہیں۔ اب اگر یہی کتا اتفاق سے آج جیت گیا ہے تو اس سے ہماری بے عزتی کیسے ہوئی؟۔۔۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ جیت بھی ہماری ہی ہے'

بات ساری سمجھنے اور غور کرنے کی ہے۔"

"نہیں پُتر! کتا چاہے ہمارا ہی دیا ہوا کیوں نہ ہو' عزت اور جیت تو ان کو ملی--- یہ ساری بے ایمانی شکرے کی ہے۔ مَیں نے شرافت سے اسے کئی بار کتا واپس کرنے کو کہا ہے' روپے پیسے کا لالچ بھی دیا مگر اس نے یہ کتا چوہدری فیض کو دے دیا' اسی بات کا مجھے دُکھ ہے---" وہ کھانستے ہوئے بولا۔ "مَیں کالے کو ہر قیمت پر حاصل کروں گا' چاہے کچھ بھی ہو---؟"

پھر زبردست کھانسی کا دورہ پڑا' وہ بے حال ہو کر بے دھیانی میں اُٹھا تو گلُ رُخ کے سر سے سر ٹکرا گیا' اک دَم لاکھوں ستاروں کے غبار کی کہکشاں روشن ہو گئی۔ وہ شرلی' دوپٹہ' بال' بھاگنا' ٹکر' خوبصورت سا نوجوان فیض!--- جیسے وقت کئی سال' مہینے' ہفتے' دن' پہر' پَل واپس پلٹ گیا ہو--- وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

"لگی تو نہیں پُتر---؟" وہ بھی سر پکڑ کر دوہرا ہو گیا۔

"نہیں' نہیں ابّا! یہ تو پہلے ہی کی لگی ہوئی ہے---" باپ نے سنا' یا نہیں' اس کے تو منہ سے نکل گیا تھا۔

وہ باقی رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ اس کی کچی عمر میں یہ پہلی رات تھی کہ اس نے بڑے پکے پکے خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھے۔ صبح گلُ رُخ جیسے کئی سال آگے نکل آئی تھی مگر چوہدری کرم داد کے دل میں آیا ہوا مایوسی اور اپنی بے عزتی کا بل نہ نکل سکا--- زندگی دھیرے دھیرے اپنی ڈگر پہ لوٹ آئی' چوہدری نے کالے کو حاصل کرنے کے لئے ہر پہلو پہ سنجیدگی سے غور کیا مگر ہنوز اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ کالے والا معاملہ اب شکردین کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے' کلا اب چوہدری فیض کی فتح اور عزت کا نشان بن چکا ہے اور ان چوہدریوں سے اسے نہ تو خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی اور طریقے سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی سوچ و بچار اور خجالت کی دھند میں کئی روشن دن منہ چھپا کر گزر گئے۔

ایک دن اس نے شکر دین کو بلا بھیجا۔ شکر دین کو پیغام ملا تو وہ سوچ میں پڑ گیا کہ چوہدری نے کیوں بلایا ہے؟--- اندازہ تو اسے تھا کہ پھر وہی کالے کا معاملہ ہو گا' چوٹ کھایا ہوا چوہدری ہر قیمت پہ کالے کو حاصل کرنا چاہتا ہے جس پہ اب اس کا اتنا ہی حق تھا

جتنا چوہدری کرم داد کا بنتا ہے--- وہ چوہدری رب نواز اور چوہدری فیض کے پاس پہنچا اور اس بلاوے کا ذکر کیا۔ آپس میں صلاح مشورے اور سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ شکرے کو وہاں جانا چاہئے' بات تو وہ کالے ہی کی کرے گا یا ممکن ہے کہ کسی اور مسئلے میں بلایا ہو۔

بہر حال' جانے یا ملنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر کالے ہی کی بات کرے تو کہا جائے کہ کلا اب چوہدریوں کی ملکیت ہے اور وہ اسے اپنی جان سے بھی عزیز رکھتے ہیں۔ چوہدری رب نواز نہیں چاہتا تھا کہ خوامخوہ محض ایک کتے کے لئے کرم داد سے کوئی رنجش یا دشمنی پیدا ہو۔ دُور دراز کی ذات برادری اور رشتہ داری بھی تھی اور زمینوں' کھیتوں' پانیوں کے معاملات اور سلسلے سانجھے تھے۔ ان سب چیزوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے چوہدری کرم داد کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا لہٰذا طے پایا کہ شکر دین اکیلا نہ جائے بلکہ چوہدری فیض اور کلا فقیرا بھی ساتھ جائیں۔ چوہدری فیض اپنی پھوپھی کے ہاں ٹھہرے اور شکر دین چوہدری کے پاس ہو آئے اور اگر حالات کے تحت مناسب سمجھے تو چوہدری فیض' چوہدری سے بھی مل آئے۔ شائد اس طرح چوہدری کی زُود رنجی کا زور ٹوٹ جائے اور اسے یہ بھی احساس رہے کہ شکرا اکیلا نہیں--- دوسرے دن یہ صبح صبح گھر سے نکلے تو کلا بھی پھلانگتا ہوا ساتھ ہو لیا۔ فقیرے نے اسے قابو کرنا چاہا تو وہ بھاگتا ہوا دُور کھیت آگے نکل گیا' پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بھونکنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ دوستو! مجھے بھی تو ساتھ لے چلو' مَیں بھی ذرا اپنی ماں' بہن بھائی سے مل آؤں' سیر سپاٹا بھی ہو جائے گا۔ چوہدری رب نواز یہ صورت حال اور اس کی وارفتگی دیکھ کر مسکرانے لگا۔ آخر اس نے بھی کہہ دیا کہ جاؤ' اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔ اس فیصلے پہ شکر دین کہنے لگا۔

"چوہدری جی! کہیں وہ کالے پہ قبضہ ہی نہ کر لے---؟"

"شکر دین! تمہارا اندیشہ غلط ہے۔ وہ ہمیں اچھی طرح جانتا ہے' ہمارے اس برتاؤ سے اسے یقیناً حیرت تو ہو گی لیکن وہ اسے اپنی عزت افزائی سمجھے گا اور اس کا بڑا خوشگوار نتیجہ نکلے گا۔ جیتنے والا اگر ہارنے والے کے پاس چلا جائے اور اس کے ساتھ دوستانہ ماحول میں بات چیت کرے تو کدورت اور بدمزگی کے تناؤ میں بے پناہ لچک پیدا ہو جاتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس طرح یہ تاثر بھی قائم ہو گا کہ ہم بزدل یا تنگ نظر نہیں ہیں'

میدانی جیت کی طرح نفسیاتی جیت بھی ہماری ہو گی---"

منشی فیروز دین بولا۔ "واقعی' چوہدری جی! سرداری اور چوہدراہٹ ڈانگوں' بندقوں زمینوں یا محض مقابلے جیتنے سے نہیں ملتی۔ یہ تو خدمت' عزت' برداشت' بردباری اور دوسروں کو اپنے جیسا انسان سمجھنے سے ملتی ہے--- محض بڑے سر یا بڑی مونچھوں سے ہی انسان بڑا نہیں ہوتا' سر کے اندر عقل اور مونچھوں کے نیچے زبان میں شیرینی بھی ضروری ہے۔"

"اچھا بھئی' جاؤ۔ ربّ راکھا---" چوہدری فیض سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

"پُترا! شام تک لوٹ آنا' پھوپھی کو میرا سلام دینا---"

بہت اِدھر ہی چوہدری کرم داد اور گاؤں والے ان کی آمد سے باخبر ہو چکے تھے۔ چوہدری کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے' یہ سب کچھ اس کی توقع کے برعکس تھا لیکن وہ اپنے اندر کہیں خوشی کی کرنیں پھوٹتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے متزلزل پندار کو قدرے ڈھارس نصیب ہوئی تو۔ اس نے گاؤں والوں سے کہا کہ کھلے دل سے ان کا استقبال کیا جائے۔ یہ مختصر سا قافلہ جب گاؤں داخل ہوا تو بچوں بڑوں کا ایک جمِ غفیر ان کو اپنے جلو میں لئے ہوئے تھا' لوگ اشتیاق بھری نظروں سے دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ اس کی پھوپھی بھی آ پہنچی۔ مبارک بادیوں' تعریفوں' دعاؤں کے ڈونگرے برس رہے تھے--- لڑکیاں بالیاں' عورتیں کوٹھے' منڈیروں پہ لگی ان کو تحسین بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ مرد اور کتے ان کے گاؤں میں بھی بے شمار تھے مگر ان دونوں کی تو چھب ہی نرالی تھی۔

سانس لینے کا عمل تو فطری طور پر جاری و ساری رہتا ہے' اس کے لئے کسی ارادے کی ضرورت نہیں ہوتی مگر کبھی کبھی نظارے میں محویّت کا ایک ایسا بھی عالم آتا ہے کہ انسان سانس لینا بھی بھول جاتا ہے' یہی عالم اس وقت ایک غزال چشم' آئینہ بدن پہ طاری تھا۔ دنیا مافیہا سے بے خبر وہ ہاتھوں کے شفاف کنوَل پہ چہرے کا چاند رکھے اپنے سورج کو تک رہی تھی جس سے وہ ایک بار ٹکرائی تھی لیکن اس کی یادوں کے شہابِ ثاقب آج بھی اس کے دل پر برس رہے تھے' ہونٹوں کے ادھ کھلے گلاب کی پنکھڑیوں پہ لرزہ طاری تھا۔ چُنے ہوئے قرمزی دوپٹے کی لہروں میں سنہری کاکلوں کا ابریشم جھلمل جھلمل کر رہا تھا' سانس لینا تو کب کی فراموش کر چکی تھی اور اس عالمِ دید میں سانس لینا بھی کیا ضروری ہے؟ اس

وارفتگی میں تو وجود کا روم روم دل بن جاتا ہے' نظارہ نظر بن جاتا ہے اور نظر نظارہ---

اچانک ایک منہ چڑھی سہیلی اس کی محویّت کو دیکھتے ہوئے اس کے پاس آئی۔

"نی' کتھے ویں--- گزر تے نئیں گئی؟"

وہ چونکتے ہوئے اسے پٹ پٹ دیکھنے لگی۔ ایک اتنی لمبی سانس کھینچی کہ اس کی سہیلی بھی گھبرا کر اسے دیکھنے لگی۔

"نی' کب کا سانس روکا ہوا تھا؟"

"پتہ نہیں' کچھ یاد ہی نہیں--- ہائے کتنا خوبصورت ہے---"

"نی کون---؟" وہ سامنے بوڑھ کے نیچے دیکھتے ہوئے بولی۔ "چوہدری فیض یا کلا؟"

"دونوں---" وہ سنبھلتے ہوئے بولی۔ "چل' ماسی فیروزاں کے گھر چلتے ہیں۔"

وہ کوٹھے سے اُتر کر وہاں چل دیں۔

چوہدری فیض ان گنت لوگوں میں گھرا ہوا تھا جیسے پورا گاؤں اکٹھا ہو گیا ہو۔ آنکھیں پٹ پٹا کر وہ جن آنکھوں کو تلاش کر رہا تھا وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں' دل و دماغ کی عجیب سی کیفیت تھی۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دولہا ہو' یہاں کسی کا ڈولا لینے آیا ہو اور ارد گرد باراتی کھڑے ہوں--- ایسے میں پھوپھی بھی بولی۔

"چل پتر' گھر چلئے۔"

وہ چونکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا' شکر دین کو چوہدری کرم داد کی حویلی کی جانب روانہ کرتے ہوئے وہ پھوپھی کے گھر آ گیا۔ یہاں بھی لوگوں کا ہجوم ساتھ تھا' کلا اور فقیرا کلا ساتھ تھا اور ہرنی جیسی آنکھیں بھی ساتھ ساتھ تھیں--- اکیلا شکر دین جب چوہدری کی حویلی پہنچا تو چوہدری باہر دالان میں بہت سے لوگوں کے درمیان بیٹھا پٹواری سے گفتگو کر رہا تھا' اسے دیکھتے ہی بڑی خوش دلی سے بولا۔

"آ بھئی' شکر دین! بڑے اچھے وقت پر آیا ہے' مَیں بھی کچھ دیر پہلے شہر سے واپس آیا ہوں--- بھئی' سنا ہے کہ چوہدری فیض بھی کالے کے ساتھ آیا ہے--- کہاں ہے وہ؟"

"جی' اسے پھوپھی زبردستی اپنے گھر لے گئی۔ مجھے بھی ساتھ لے جا رہی تھی لیکن مَیں نے کہا کہ چوہدری صاحب نے بلایا ہے' پہلے مَیں ان کی بات سن آؤں' پھر آؤں گا--- فرمایئے' کیا حکم ہے؟"

چوہدری کرم داد مسکراتے ہوئے بولا۔ "یار! پہلے کچھ لسی پانی پیو' حقے کا دم لگاؤ۔ پھر بات کرلیں گے۔۔۔" لسی پانی سے فارغ ہوئے تو چوہدری اسے ساتھ لے کر اندر بیٹھک میں آگیا' کہنے لگا۔

"شکر دین! پہلے تو کالے کے جیتنے کی مبارک ہو' دوسری بات یہ ہے کہ تم نے میرے ساتھ ناانصافی کی ہے جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔۔۔ تم جانتے ہو کہ کتے میری کمزوری ہیں۔ تمہاری وساطت سے یہ کتے میں نے منہ مانگی قیمت پہ حاصل کئے تھے' صرف اس لئے کہ یہ نایاب نسل صرف میرے پاس ہی رہے۔۔۔ میں مانتا ہوں کہ کالا میں نے اپنی مرضی سے تمہیں دیا تھا' اب اس پہ میرا کوئی حق نہیں بنتا مگر جن حالات اور جس وجہ سے میں نے اسے دیا تھا وہ کچھ اور تھے۔ اب اگر کالا تمہاری محنت اور کوشش سے ٹھیک ہو گیا تھا تو تمہارا اخلاقی فرض بنتا تھا کہ تم اسے واپس کر دیتے۔ میں شکریئے کے ساتھ تمہاری محنت کا معاوضہ بھی ادا کرتا مگر تم نے ایسا نہیں کیا بلکہ اسے تیار کر کے چوہدریوں کے ساتھ میرے ہی مقابلے پہ کھڑا کر دیا۔ میری جگہ تم ہوتے تو یقیناً یہی محسوس کرتے جو اس وقت میں کر رہا ہوں' میں پوری ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ تم نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔۔۔" وہ سانس لینے کے لئے رُکا۔

"چوہدری صاحب! آپ نے جو کچھ کہا ہے' اپنی جگہ پہ بالکل بجا ہے۔ آپ کی جگہ اگر میں ہوتا تو بالکل یہی محسوس کرتا۔۔۔ اب میں عرض کروں کہ اگر آپ میری جگہ ہوتے تو بالکل یہی ہوتا جو میں کرنے پر مجبور ہوا۔ یہ جو کچھ بھی ہوا ہے' اس میں میری مرضی یا ارادے کا کوئی دخل نہیں بلکہ حالات ہی ایسے پیدا ہوئے کہ یہ سب کچھ ہو گیا۔"

"کھل کر بات کرو۔۔۔ میں سمجھا نہیں؟"

"چوہدری جی! کالے کے بارے میں آپ کو معلوم ہے کہ اس کی حالت کیسی تھی' مجھے بھی آپ کی طرح یقین نہیں تھا کہ زیادہ دیر زندہ رہ سکے گا مگر جسے خدا زندہ رکھنا چاہے تو اسے کون مار سکتا ہے؟۔۔۔ میری بیوی جس کی گود میں کوئی بچہ نہیں ہے' اس نے اسے بچے کی طرح لیا۔ دن رات اس کی حفاظت' دوا دارو' منتیں کیں' رو رو کر دعائیں مانگیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دوا دارو سے زیادہ اس کی دعاؤں اور ممتا کے جذبے نے اسے نئی زندگی دی۔ اسی کی حالت کی بناء پہ گاؤں والوں' خصوصاً بچوں کو بھی اس سے جذباتی لگاؤ ہو گیا

اور پھر جب یہ چوری ہوا تو یہ واپس ملا' بعد میں وہی اس کی حفاظت اور ٹریننگ میں دلچسپی لینے لگا۔۔۔ آگے جو کچھ ہوا' آپ اچھی طرح واقف ہیں۔ میں ان حالات میں کیا کر سکتا تھا؟ اگر کہیں آپ کو میرا قصور نظر آتا ہے تو جو جی میں آئے' سزا دے دیں۔"

چوہدری کرم داد غور سے اس کی دلیلیں سُن رہا تھا۔ پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو' اس کہانی میں تمہارا قصور نظر نہیں آتا لیکن میں بھی تو سچا ہوں۔ چوہدری فیض کو تو مفت میں ایک خزانہ ہاتھ لگ گیا جبکہ اس پہ زیادہ حق میرا بنتا ہے۔۔۔ بہر حال' اب تو یا یہ کتے بھی چوہدری فیض خرید لے یا پھر کالا منہ مانگے داموں مجھے دے دے۔ تم اس سے بات کرو' اس کے علاوہ مجھے کوئی بات قبول نہیں۔۔۔"

"ٹھیک ہے' چوہدری صاحب! اب یہ معاملہ آپ دو چوہدریوں کے درمیان ہے اور میرے لئے آپ دونوں برابر ہیں۔ میں نے کالے کو بیچا ہوا نہیں ہے' وہ بیچنے یا خریدنے کی چیز بھی نہیں۔۔۔ میں چوہدری سے بات کروں گا۔"

شاباش!۔۔۔ ٹھیک ہے' اب تم جاؤ اور چوہدری فیض کو کہنا کہ میں کالے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔ اور ہاں! تم سب لوگ دوپہر کا کھانا میرے ہاں کھاؤ گے۔ تم میرے بلاوے پہ یہاں آئے ہو' میرے مہمان ہو۔"

شکر دین' پھوپھی کے ہاں پہنچا تو صحن لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ کالے کی خاطر داریاں ہو رہی تھیں' کچھ مرد اور جوان لڑکے چوہدری فیض کو گھیرے بیٹھے تھے۔ پھوپھی کے پاس دو عورتیں اور لڑکیاں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ شکرا بھی چوہدری فیض کے پاس بیٹھ گیا۔ کالا ہجوم سے گھبرایا گھبرایا سا لگ رہا تھا۔ شکرے نے فقیرے کالے اور ایک لڑکے سے کہا کہ کالے کو باہر کھیتوں میں لے جا کر ذرا گھما پھرا لاؤ۔ کالے کے جاتے ہی ہجوم بھی ساتھ ہو لیا' شاید اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ فالتو لوگ یہاں سے ہٹیں۔ چوہدری فیض بھی بڑا مضطرب دکھائی دے رہا تھا' بار بار ادھر ادھر دیکھتا' شاید اسے بھی کسی کی تلاش تھی۔ ہر چہرہ اس کے سامنے تھا' یہ سب چہرے تھے مگر جس کی تلاش تھی وہ چاند کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔ اسے کیا معلوم کہ باورچی خانے میں جو میٹھی سویاں' خالص گھی میں بگھار رہی ہے وہ "میٹھی" کون ہے؟ وہ میٹھا میٹھا سینک جو پتلی کے پینڈے کے نیچے اور سویاں پکانے والی کے بدن میں ہے' کیسا جلوہ جگا رہا ہے۔ ٹپلوں کے ساتھ توت کی خشک ٹہنیاں تڑخ

تڑخ جل رہی تھیں، شرمیلے شرمیلے شعلوں کا عکس اس کے شہابی چہرے پہ چھو چھوائی کھیل رہا تھا، چولہے سے اٹھتے ہوئے دھوئیں اور سینے میں مچی ہوئی دھوم سے، آنکھوں اور من کے آنگن میں دھنک کے سارے رنگ اترے ہوئے تھے۔ ادھر سیویوں کا رنگ بھی گہرا ہو گیا جیسے نئی نئی دلہن کے میٹھے ہاتھوں پہلی پہلی بار کا پکا ہوا کھانا یا تو جلا ہوا ہوتا ہے یا پھر بے مزہ اور جیسے وہ بھی اسی مرحلے سے گزر رہی تھی--- سیویاں جل کر مُرنڈا ہو گئی تھیں، اب کیا کرے، کیا نہ کرے؟ آنکھیں ملتی ہوئی، گھبراہٹ کے عالم میں جو باہر نکلی تو ایک چھناکا سا ہوا، دماغ ہل گیا، سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی--- دو ہاتھ اس کے شانوں پہ آئے۔

"چوٹ تو نہیں لگی---؟" آنکھ اٹھا کر جو دیکھا تو فیض مسکرا رہا تھا۔ "اتنی موٹی موٹی آنکھیں ہیں، دکھائی نہیں دیتا؟--- یہ دوسری ٹکر ہے۔"

پھوپھی پاس آ چکی تھی۔

"ہائے ہائے، گل!--- نی، کی ہویا؟" وہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں ماسی، بے دھیانی میں ٹکر ہو گئی--- سیویاں سڑ گئی تھیں، تجھے بتانے نکلی تھی۔"

"کوئی بات نہیں پُترا--- آ، اِدھر چارپائی پر بیٹھ---"

"پھوپھی! میرے سر میں درد ہے، میں ذرا اندر لیٹ رہا ہوں--- سردرد کی گولیاں اور پانی مجھے دے دیں۔" فیض اندر کوٹھڑی میں جاتے ہوئے بولا۔

پھوپھی گولیاں اور پانی لے کر اندر آئی تو فیض نے پوچھا۔

"پھوپھی! یہ لڑکی کون ہے؟--- بڑی بے وقوف ہے، ٹکر مار کر میرا سر ہلا دیا۔" اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"پُتر فیض! یہ گلو ہے، چوہدری کرم داد کی لاڈلی دھی--- مجھ سے قرآن شریف پڑھتی ہے، بڑی کاہی تے پیاری بچی اے---"

"پھوپھی! اس کی شادی وادی ہو گئی ہے یا ابھی---؟"

"نہیں فیضے! ابھی تو بالڑی ہے، گڈیوں پٹولوں سے کھیلتی ہے--- پر تو کیوں پوچھ رہا ہے؟" وہ اسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں پھوپھی، بس ایسے ہی پوچھ لیا ہے--- ویسے ہے بڑی خوبصورت، یوں

لگتا ہے جیسے---"

"بس بس پترا! یہیں تک رہنے دے۔ اس کا باپ بڑا سخت ہے اور یہ تو اس کی جند جان ہے، کہتا ہے کہ میں نے اس کی شادی نہیں کرنی--- بڑے بڑے رشتے آتے ہیں، یہ بھی کہتی ہے کہ میں اپنے لالے کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی---"

"پھوپھی---!" وہ اس کے گلے میں بانہیں لیتے ہوئے بولا۔ "مگر یہ تو اپنے لالے کو چھوڑ کر ضرور جائے گی۔"

"وے، کیا کہہ رہا ہے؟" وہ اس کی بانہیں ہٹاتے ہوئے بولی۔

"پیاری پھوپھی! لڑکیاں بھی کبھی گھروں میں بٹھائی جاتی ہیں؟--- یہ تو چڑیاں ہوتی ہیں، چڑیاں یوں پھُر سے اُڑ جاتی ہیں۔" وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ "کسی لاے یا بے بے کا پیار لاڈ انہیں نہیں روک سکتا۔"

"کہتا تو، تو ٹھیک ہے---" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "مجھے تو دال میں کلا کلا دکھائی دیتا ہے--- بتا! کیا بات ہے؟"

"پھوپھی جی! دال میں کلا نہیں، مجھے تو کالے میں اس کا لالہ دکھائی دیتا ہے----"

شکرا اندر داخل ہوا تو پھوپھی حیران و پریشان سی باہر نکل گئی۔ شکرے نے اپنے اور چوہدری کرم داد کے درمیان ہونے والی گفتگو سنائی۔ فیض ہوں، ہوں کرتا ہوا خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ کیا جواب دیتا، یہی کہہ کر خاموش ہو گیا کہ دیکھتے جاؤ چاچا، کیا ہوتا ہے؟--- وہ تنہائی چاہتا تھا، دماغ کہیں اور پرواز کر رہا تھا۔ اس نے شکرے سے پوچھا۔

"چاچا! گاؤں میں کوئی اور کام تو نہیں؟--- اگر کہیں جانا ہے تو ہو آؤ، میں بھی ذرا آرام کر لوں پھر چوہدری کے ہاں چلیں گے---"

شکرے کے جاتے ہی اس نے آنکھیں مُوند لیں جام سے جام ٹکرانے کا نشہ ابھی باقی تھا، وہ لطف لینا چاہتا تھا۔ خوبصورت موٹی شربتی اکھیاں اسے مسلسل گھُور رہی تھیں، سرہانے کے نیچے تکئے پہ گرفت مضبوط کرتے ہوئے وہ حسین خیالوں میں ڈوب گیا۔ کچھ دیر بعد پھوپھی سیویوں کی پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"لے پُترا کھا--- جلدی کر، اٹھ کر منہ ہاتھ دھو۔ چوہدری کے گھر سے دو دفعہ پیغام آ چکا ہے، وہ کھانے پہ انتظار کر رہے ہیں۔"

"---- بڑی مزیدار سیویّاں ہیں پھوپھی! کس نے بنائی ہیں؟" وہ سیویوں کا مزہ لیتے ہوئے بولا۔

"آرام سے کھا' تجھے کیا کہ کس نے بنائی ہیں----؟" وہ اس کی شرارت کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔

"بڑی لذیذ ہیں پھوپھی! مَیں بنانے والی کو انعام دینا چاہتا ہوں----"

پانی کا گلاس تھامے گلؔ اندر داخل ہوئی۔

"پھوپھی! انھیں کہو کہ انعام دینا ہے تو کلا مجھے دے دیں۔"

فیض اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ "پھوپھی! اسے کہو کہ آج سے کلا بھی ان کا---- اور چِٹا بھی----"

پھوپھی پھیلی ہوئی آنکھوں سے دونوں کا مُنہ تکنے لگی---- گلؔ تو انعام لے کر غائب ہو چکی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے پلیٹ چاٹ رہا تھا۔ پھوپھی نے اسے کہنی سے ٹہوکا دیا۔

"فیض پُتر! میرے سفید بالوں کا خیال کرنا' اس کا باپ بڑا جابر آدمی ہے---- پُتر! تیرے لئے رشتے بتیرے' خیر سے آیا ہے تو خیر سے واپس جا۔ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کرنا' پرایا پنڈ ہے۔"

"پھوپھی! تو فکر نہ کر' سنتے ہی خیراں ہیں بلکہ خیراں ہی خیراں ہیں----" وہ شرارت بھری نظروں سے پھوپھی کو دیکھ رہا تھا۔

"وے' بھارتیں نہ ڈال---- ہوش کر' اتنی تیز گھوڑا نہ دوڑا---- جا' چوہدری انتظار کر رہا ہوگا؟"

چوہدری کرم داد واقعی انتظار کر رہا تھا' کلا تو آگے آگے چلتے ہی چوہدری کے قدموں میں بیٹھا لاڈیاں کر رہا تھا۔ اس کی ماں' بہن بھائی بھی خوش خوش پاس کھڑے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی چوہدری نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا' بڑی عزت سے بٹھایا' کلے کے جیتنے کی مبارک دی' چوہدری صاحب اور گاؤں والوں کا حال احوال پوچھا۔ پھر کلے کی کارکردگی اور مصروفیت پہ بہت سی باتیں ہوئیں' خوش خوش کھانے پینے سے فارغ ہوئے تو چوہدری فیض آگے بڑھ کر کلے کی زنجیر اسے پیش کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"چوہدری صاحب! کلا آپ کو مبارک ہو' یہ اب آپ کے پاس ہی رہے گا۔ اسے

ہماری جانب سے قبول فرمالیں----"

"کیا مطلب----؟" چوہدری حیران پریشان ہو کر پوچھنے لگا۔

"---- یہ دیکھیں' کلا خود ہی آپ کے قدموں میں بیٹھ گیا ہے۔ اب ہم اسے اٹھا تو نہیں سکتے----"

"پُتر! جب جاؤ گے' یہ خود بخود اٹھ جائے گا----" چوہدری ہنسنے لگا۔

"جی نہیں---- چند روز یہ ہمارے پاس ضرور رہا ہے' اپنے نصیب کا کھایا پیا مگر یہ اتنا بے وفا جانور نہیں جو اپنے مالک کو نہ پہچانے اور آپ کے قدموں سے اُٹھ جائے---- آپ آزما کر دیکھ لیں۔"

فیض اٹھا اور باہر نکل گیا۔ کلے نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا---- تھوڑی دیر بعد فیض اندر آگیا۔

"دیکھ لیا آپ نے؟---- یہ زنجیر حاضر ہے' آج سے کلا آپ کا ہے---- مَیں آپ کا پُتر ہوں۔ ہماری وجہ سے اگر آپ کا دل میلا ہوا ہو تو ہمیں معاف کر دیں----"

چوہدری کرم داد کے ماتھے پہ پسینہ تھا' الفاظ جیسے ہونٹوں پہ جم کر رہ گئے تھے۔ اس حسنِ سلوک پہ حیران و پریشان' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے؟ آخر اپنی قوتوں کو یکجا کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"چوہدری فیض! یہ تمہاری برخورداری ہے لیکن پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ تم جتنی رقم چاہو' مَیں دینے کے لئے تیار ہوں---- یہ مَیں اپنی خوشی سے کہہ رہا ہوں۔ آخر آپ لوگوں نے بھی تو محنت کی ہے۔"

"چوہدری جی! اللہ کا دیا بہت کچھ ہے' کسی چیز کی ضرورت نہیں---- اگر آپ کچھ دینا چاہتے ہیں تو مجھے اپنا پُتر سمجھتے ہوئے یہ دُعا دیں کہ جو کچھ مَیں نے رَبّ سے مانگا ہے' وہ مجھے مل جائے۔"

"اچھا بھئی! اللہ تیری مُراد پوری کرے' عمر لمبی کرے---- اللہ خیر کرے۔"

دو خوبصورت آنکھیں' ایک کھڑکی کی اوٹ سے دیکھ رہی تھیں۔

کافی دیر کے بعد وہ جانے کے لئے اُٹھے تو کلے نے ان کی جانب مڑ کر بھی نہ دیکھا' جیسے وہ انہیں جانتا تک نہ ہو۔

☆☆

گاؤں پہنچتے پہنچتے شام ہو گئی تھی۔ گاؤں کے باہر کئی لوگ بیٹھے انتظار کر رہے تھے' کلا کسی کو دکھائی نہ دیا تو خاموشی اور پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ چوہدری فیض سے پوچھنے کی ہمت کسی میں نہ تھی' شکر دین سے پوچھنے لگے مگر وہ بھلا کیا جواب دیتا؟---
چوہدری فیض جب حویلی میں داخل ہوا تو چوہدری رَبّ نواز انتظار کر رہا تھا' پھوپھی بھی ساتھ آئی تھی۔ وہ بہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

"اوے' کلا کہاں ہے؟" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"ابا جی! بیٹھنے تو دیں---- ساری بات بتاتے ہیں۔"

"---- اندر آ کر پہلے میری بات سُن لو' پھر اس پاگل کی بات سننا---" پھوپھی بولی۔

بہن اور بیٹے سے ساری بات سُن کر چوہدری خلاؤں میں گھورنے لگا۔ کافی دیر بعد اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تو فیض کی بھی جان میں جان آئی۔ وہ فیض کو شاباش دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"پُترا! تو نے میرا شملہ اور اونچا کر دیا ہے' انشاء اللہ اس میدان اور مقابلے میں بھی جیت ہماری ہے--- آخر تو پُتر کس کا ہے؟"

فیض کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے لیکن یہ بات وہ کس طرح سے باپ کو بتاتا کہ کتوں اور میدانوں کے مقابلوں اور دلوں کے میدانوں میں ہونے والے مقابلوں میں کون جیتا اور کون ہارا ہے؟--- ادھر پار گاؤں' چوہدری کرم داد اسی حالت میں بیٹھا سوچوں کے کنوئیں میں گردن گردن ڈوبا ہوا تھا۔ کلا اس کے سامنے دوسرے کتوں کے ساتھ اُچھل کود میں مصروف تھا' وہ نظریں جمائے اسے گھور رہا تھا۔ کبھی کبھی اسے محسوس ہوتا جیسے یہ کتا نہ ہو' کوئی شہزادہ ہو جسے جادو کے زور سے کتا بنا دیا گیا ہو' ایک دن یہ اپنے اصل روپ میں جلوہ گر ہو جائے گا--- چوہدری فیض کا معاندانہ رویّہ بھی اس کی سمجھ سے بالا تر تھا پھر بھی وہ اندر سے خوش تھا' گاؤں والے خوش خوش مبارکیں دے گئے تھے لیکن پھر بھی نہ سمجھ میں آنے والی کوئی اُلجھن اس کے اعصاب پہ دھول کی مانند جمی ہوئی تھی--- وہ رات ٹھیک سے سو بھی نہ سکا۔

ٹھیک سات روز بعد چوہدری رَبّ نواز' فیض' اس کی والدہ پھوپھی' شکر دین اور فقیرا کلا سوغاتوں سے لدے پھندے اس سے ملنے کے لئے آئے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لوگ اس طرح اس کی عزت افزائی کریں گے--- اصل بات پہ تو ابھی تک اس کی نظر نہیں پڑی تھی' وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ یہ سب کالے کی وجہ سے ہے۔ خاطر مدارت کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ گلُ اور اس کی والدہ بھی ہنسی خوشی باتوں میں مصروف تھیں۔ چوہدری رَبّ نواز اور اس کی بیوی نے گلُ کو پہلی نظر میں ہی پسند کر لیا تھا بلکہ دل ہی دل میں اپنے بیٹے کی پسند پہ داد بھی دی--- آخر چوہدری رَبّ نواز مطلب کی بات زبان پہ لے ہی آیا۔

"بھائی کرم داد! یہ کتوں کے درمیان ہار جیت سے اگر تمہاری دل شکنی ہوئی ہو تو اسے بھول جاؤ' کھیلوں مقابلوں میں ہار جیت ہوتی رہتی ہے۔ یہی ہار جیت ہمیں مزید محنت اور کوشش پہ اکساتی ہے' دلچسپیوں اور لہو گرمانے کا باعث ہوتی ہے' بڑی بڑی تبدیلیاں لاتی ہے--- تمہاری خواہش پہ بیٹے فیض نے کلا تمہیں واپس کر دیا ہے' شائد قدرت نے ہمیں ایک دوسرے کو قریب لانے کے لئے ہی یہ حالات پیدا کئے ہوں--- تم بھی جانتے ہو کہ تمہاری طرح ہمارے بھی ایک ہی اولاد ہے' تمہیں اللہ نے بیٹی دی ہے اور ہمیں بیٹا' ہماری خواہش ہے کہ تم فیض کو اپنا بیٹا بنا لو اور ہم گل کو اپنی بیٹی--- اس طرح ہم دونوں کے بیٹے بیٹی کی کمی بھی پوری ہو جائے گی اور ہم ایک دوسرے کے قریب بھی آ جائیں گے۔"

چوہدری کرم داد نے بڑے تحمّل اور خاموشی سے ساری گفتگو سُنی' سر جھکا کر سوچوں کے سمندر میں اتر گیا' کمرے میں خاموشی جیسے ٹھہر سی گئی--- فیض کی والدہ بولی۔

"بھرا کرم داد! تم دوُر سے ہمارے رشتہ دار بھی ہو' ہم ایک دوسرے سے لُکے چھپے نہیں۔ اگر خدا نے ہمیں اب اکٹھے ہونے کا موقع دیا ہے تو سوچ بچار کس بات کی؟--- بسم اللہ کر کے ہماری جھولی میں خیر ڈال دو۔"

پھوپھی بھی بولی۔ "چوہدری جی! بیٹیاں تو پرائی امانت ہوتی ہیں' ایک نہ ایک دن ان کو جدا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہاں کھان' عزت شرافت' گھر گھرانہ برابر کا مِل جائے تو خوش قسمتی ہوتی ہے--- ہم لوگ بڑی آس لے کر آئے ہیں۔"

"ہاں ہاں' بھائی! ہم تو گلُ کا ہاتھ لئے بغیر نہیں جائیں گے۔" چوہدری رَبّ نواز نے حقے کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

چوہدری کرم داد نے سر اٹھایا' کچھ کہنے کے لئے ہونٹ کھولے مگر سر ڈال کے بیٹھ گیا--- ایک دفعہ پھر خاموشی نے ڈیرے ڈال دیئے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے--- اپنے والد کی اجازت سے چوہدری فیض بولا۔

"چاچا! آپ بزرگوں کے بیچ مجھے بولنے کا حق تو نہیں' پھر بھی آپ کی اجازت سے صرف اتنا کہنے کی جسارت کروں گا کہ آپ نے مجھے کہا تھا کہ کالے کے بدلے میں کچھ مانگ لو۔ مَیں نے یہی عرض کیا تھا کہ مجھے صرف یہ دُعا دے دیں کہ ربّ میری مُراد پوری کرے--- آپ میرے والدین کی بات کا جواب دیں یا نہ دیں' صرف مجھے یہ دُعا پھر دے دیں کہ رَبّ میری مُراد پوری کرے بس!"

چوہدری کرم داد نے پھر سر اٹھایا' فیض کو گھورنے لگا جیسے اس میدان میں بھی اس نے شکست دے دی ہو۔ ایک لمبا سانس کھینچ کر دھیمی آواز میں کہنے لگا۔

"چوہدری رَبّ نواز! مَیں تمہیں سوچ کر جواب دوں گا--- تم نے تو مجھے چند لمحوں میں بوڑھا کر دیا ہے۔ مَیں نے کبھی سوچا تک نہیں کہ گلُ کو کبھی اپنے سے جُدا کروں گا۔ اس کے علاوہ میرا ہے بھی اور کون؟--- آج آپ لوگوں نے مجھے احساس دلایا ہے کہ مَیں بھی ایک جوان بیٹی کا باپ ہوں۔"

وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ فیض کی والدہ بھی سُبکنے لگی۔

"بھرا کرم داد! بیٹیاں تو چڑیاں ہوتی ہیں' اپنے وقت پہ یہ اڑ جاتی ہیں۔ فقیر ہو یا بادشاہ' ایک دن ان کو جدا کرنا ہی پڑتا ہے--- دُعا مانگو۔۔ کہ اللہ ان کے نصیب اچھے کرے۔"

چوہدری رَبّ نواز نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ "چوہدری! تم وارث ہو' سوچ لو' گھر والوں سے مشورہ کر لو--- ویسے مَیں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ تسلی دیتا ہوں کہ گلُ کو ہم تم سے بڑھ کر پیار دیں گے' شادی کے بعد بھی کوئی پابندی نہیں ہو گی۔ ہم تم سے تمہارے گھر کی رونق دُور نہیں کریں گے بلکہ فیض جیسا بیٹا دے کر تمہارے گھر کے اُجالے میں اور اضافہ کر رہے ہیں---" وہ رُک کر کہنے لگا۔ "ابھی ہم بہن فیروزاں کے گھر جا رہے ہیں' شام کا کھانا یہیں کھائیں گے اور شگن لے کر جائیں گے--- رَبّ

راکھا!"

وہ باہر نکلے تو چوہدری کرم داد انہیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ گلُ بظاہر کام کاج میں مصروف تھی مگر جو کچھ اس کے اندر کشیدہ کاری ہو رہی تھی' اس کو کون جانے؟--- چوہدری کرم داد کی بیوی نے اپنے خاوند کو اس طرح خاموش خاموش دیکھا' تو بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو---؟"

وہ چونکتے ہوئے بولا۔ "وہی جو تم سوچ رہی ہو---" وہ گمبھیر لہجے میں کہنے لگا۔ "اب مَیں سمجھا کہ چوہدری فیض اتنی نیاز مندی سے کلا کیوں واپس کر کے گیا ہے۔ مجھ پہ کتے کا احسان دھر کر بیٹی کا رشتہ مانگنے آ گئے--- یہ--- یہ تو---"

"---آگے ایک لفظ بھی مَت کہنا گلُ کے اَبّا!" اس نے اپنے خاوند کی غلط فہمی دُور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "وہ کالے کو ہمیں دینے کے لئے نہیں لائے تھے' وہ تو گلُ نے مانگا تھا---"

"گلُ نے---؟" وہ غُصّے سے کھڑا ہو گیا۔

"--- آرام سے بیٹھ جاؤ خوامخواہ تتا ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا--- گلُ بیچاری نے تیری پریشانی کو دُور کرنے کے لئے فیروزاں کے گھر کہہ دیا کہ کلا ہمیں واپس کر دو تاکہ بات آگے نہ بڑھے' باپ کے پیار میں باؤلی ناسمجھ بچی نے جو سمجھ میں آیا' کہہ دیا مگر تو تو ناسمجھ نہ بن--- کس چیز کی کمی ہے ان کے پاس' ایک ہی لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا' جوان گبھرو' نیک' عزت غیرت والا--- یہ تو سوچ کہ وہ گھر رکھنے والی چیز کلا تمہاری خواہش پہ تمہیں دے گئے اور تم گھر نہ رکھنے والی چیز ان کی خواہش پہ انہیں نہیں دو گے؟--- آج نہیں تو کل' کہیں نہ کہیں اسے بیاہو گے۔ جانو پچھانو' عزت برادری والے لوگ ہیں۔ یہیں دے دو---" وہ قریب ہو کر بولی۔ "بچوں کی مرضی خوشی بھی تو دیکھنی پڑتی ہے۔ گلُ بھی خوش ہے اور--- مَیں بھی---"

چوہدری جھاگ کی مانند بیٹھ گیا' چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے گلُ سے پانی کا گلاس طلب کیا۔ پانی پیتے ہوئے وہ گلُ کا رنگ بدلتا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔ پھر کانپتی آواز میں اس نے گلُ سے پوچھا۔

"پُتر! تیری ماں کیا کہہ رہی ہے؟"

وہ کیا جواب دیتی' شرماتے ہوئے منہ چھپا کر اندر بھاگ گئی--- چوہدری چارپائی پہ نیم دراز ہو گیا' پگڑی اتار کر سرہانے رکھی اور بیوی سے کہنے لگا۔

"ابھی چند روز پہلے تم دونوں ان کی دشمن تھیں۔ اب یہ اچانک تبدیلی---؟"

"کچھ عرصہ پہلے کالا بھی تو تیرے لئے لک ٹٹا اور بیکار تھا مگر اللہ نے اسے صحت دی' عزت اور شہرت دی اور اب تم ہی اسے حاصل کرنے کے لئے تڑپنے لگے۔ کلا' کلا کہتے تمہاری جیب کلی ہو گئی--- اب وہی کلا ہے جس کے لئے ایک بھینس اور چار چار کامے آگے پیچھے ہیں۔ دشمنیاں' دوستیوں میں اور دوستیاں' دشمنیوں میں بدلتی رہتی ہیں' اسی کا نام دنیا ہے۔ سدا بادشاہی سچے رَبّ کی ہے---"

"مجھے یہ بتاؤ کہ گلُ کبھی فیض سے ملی ہے---؟"

"کھے تے سواہ' ملنا کہاں--- وہ بیچارا کبھی یہاں آیا ہی نہیں اور نہ ہی ہماری بیٹی کا ایسا ذہن ہے--- فیروزاں کے گھر دوسری لڑکیوں کے ساتھ یہ بھی قرآن شریف پڑھنے جاتی ہے۔ پچھلے ہفتے جب وہ اپنی پھوپھی کے گھر آیا تو یہ لڑکیاں بھی کالے کو دیکھنے وہاں چلی گئیں۔ وہاں کالا دیکھ کر' ویسے ہی اس کے مُنہ سے نکل گیا کہ کالا ہمیں دے دو۔ اس کمّاں والے نے بغیر سوچے سمجھے' باپ یا کسی اور سے مشورہ کئے کالا دے دیا---"

چوہدری کے کانوں میں فیض کے وہ الفاظ گونجنے لگا کہ میرے لئے دُعا کریں کہ اللہ میری مُراد پوری کرے--- وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "اس نے کالا تمہیں واپس کرتے ہوئے کوئی شرط ورط نہیں رکھی۔ اب تمہاری عزت اور شان اسی میں ہے کہ تم بھی ان کی خواہش پوری کر دو' حالات اور وقت کا تقاضہ بھی یہی ہے۔"

"وہ لمبی سی "ہوں" کرتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب کچھ گلُ کی ناسمجھی اور کالے کی وجہ سے ہوا ہے---"

"نہیں یہ تو سب کچھ نصیبوں کا لکھا ہوا ہے--- سبب چاہے کالا ہو یا چٹا' سنا نہیں کہ حیلے رزق تے بہانے مَوت--- تمہیں یاد نہیں کہ میری منگنی کہاں ہوئی تھی؟ تم تو ہمارے وہم و خیال میں بھی نہیں تھے' وٹے سٹے کے مسئلے پر منگنی ٹوٹ گئی--- میرا نصیبہ تم سے جڑا ہوا تھا مگر بہانہ وٹہ سٹہ بن گیا---"

کالا وہیں تھا۔ اس نے اپنی تھوتھنی چوہدری کے پاؤں پہ رکھ دی۔ اس نے کالے کو

دیکھا' وہ آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ اس نے پیار سے کالے کے سر پہ ہاتھ پھیرا' گلُ کو آواز دی۔

"پُتر باہر آ---!"

وہ باہر آئی تو اسے ایسے لگا جیسے وہ اپنی عمُر سے ایک دم آگے نکل گئی ہو۔

"جی---" وہ کانپتی ہوئی آواز سے بولی۔

وہ اسے دیکھنے لگا--- شائد وہ اسے دیکھتا ہی رہتا مگر گلُ کی ماں بولی۔

"کج بولو وی--- میری لاڈلی نوں نظر نہ لا دیئو۔"

"پُتر! دو چار عورتوں کو ساتھ لے کر کھانے کا انتظام کرو--- خیر سے تمہارے ہونے والے سسرال والے شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔"

فضاؤں میں جیسے لاکھوں شہنائیاں گونج اُٹھی ہوں۔

☆☆

اگلی فصلوں کی کٹائیوں کے بعد کھلے موسم میں جب وہ گلُ رُخ کی ڈولی لے کر لوٹے تو پورے گاؤں میں چراغاں ہو رہا تھا۔ گاؤں میں داخل ہونے سے پہلے وہ سائیں پھل شاہ کے مزار پہ سلام کے لئے رُکے--- چوہدری کرم داد نے بھی بیٹی کے بیاہ پہ دل کے سارے ارمان نکالے۔ جہیز سے لدے کیموں' نوکروں چاکروں کے پیچھے پیچھے بھوری بھینس معہ اپنی کٹی کے دھَب دھَب چلی آ رہی تھی۔ کلا بھی اپنی ماں اور بہن بھائی' بھتیجوں' بھتیجیوں کے ساتھ آ رہا تھا۔ چوہدری نے اس نسل کا پورا خاندان' سوائے ایک کتورے کے جہیز میں دے دیا تھا۔ یہ کتورا بھی کالے کی طرح اپاہج پیدا ہوا تھا یا شائد زچگی کے دوران کسی بے احتیاطی سے ایسا رہ گیا--- گاؤں داخل ہوتے ہی کلا تیر کی مانند اپنے گھر پہنچا جہاں ایک خوشخبری سب کا انتظار کر رہی تھی--- چارپائی پہ ایک نوازئیدہ بچہ مہتابی کے پہلو میں ہمک رہا تھا۔ چوہدری رَبّ نواز نے مبارک دی' بچے کو گود اٹھا کر پیار کیا--- مہتابی سر پہ دوپٹہ باندھے' کالے کو دیکھ رہی تھی اور شکرا بچے کو دیکھ کر رَبّ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ چوہدری فیض نے بچے کو اٹھایا' پیار کیا اور کہا۔

خوش کیتا ای او پترا' چاچے شکرے دا شملہ اُچا کر دتا ای---"

✿✿✿

میں اپنے "دھیانے" گیٹ بند کر کے جونہی باہر سڑک پر آیا' وہ دُوسری جانب واپڈا والوں کے پول کے نیچے کھڑا' مجھے گھُور رہا تھا۔ ظاہر ہے' جو کوئی آپ کو اس طرح گھُورے گا تو آپ کے اندر بھی کھُدبُد پیدا ہو گی کہ یہ کون ہے' کیوں اس طرح دیکھ رہا ہے؟--- مَیں نظریں چراتا ہوا اپنی لہر میں مسجد کی جانب بڑھ گیا' گو میری ٹھہری ہوئی طبیعت میں وہ پھیلتے ہوئے دائرے پیدا ہو چکے تھے جو پُر سکون پانی میں کنکر پھینکنے سے ازخود جنم لے لیتے ہیں۔ مسجد والی گلی میں موڑ مُڑتے ہوئے مَیں نے بڑی ہوشیاری سے پلٹ کر دیکھا' وہ کمبخت میری جانب ہی دیکھ رہا تھا۔ میری طبیعت کچھ ایسی موم ملائی ہے کہ مَیں کسی کی آنکھ' چہرے' بول کلام اور نیت میں کوئی تنکا' مٹی' مچھر' مکھی برداشت کر ہی نہیں سکتا۔ اس اجنبی بدمعاش کے اس طرح بلاوجہ گھورنے سے میرے اندر اِک عجیب سا تکدّر پیدا ہو گیا تھا--- خیر' اللہ کے دارالامان میں داخل ہوتے ہی طبیعت کچھ پُر سکون ہو گئی۔ نماز سے فارغ ہوا تو سب کچھ بھول چکا تھا۔

اپنے دھیان سر جھکا کر چلنے والوں کے منہ ماتھے اکثر ٹوٹتے پھوٹتے رہتے ہیں۔ بجلی کے کھمبے' سڑک کنارے رُکی ہوئی گاڑیاں' درخت و دیوار یا کسی بھلے مانس راہ گزر سے ٹکرانا' سر پھوڑنا ان کا معمول اور نصیب ہوتا ہے۔ یہ بیماری یا عادت' مجھ ایسے بھول بھلکڑے' سٹھیائے ہوئے کھوسٹ بڈھوں میں کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ پرانے خیالات' حالت طلے اور ہر وقت نصیحت فضیحت کی عادت قبیحہ کی بنا پر کوئی عدیم الفرصت انسان' بالخصوص نوجوان طبقہ تو انہیں منہ نہیں لگاتا بلکہ کئی رستہ کاٹ کر گزر جاتا ہے۔ یہ بے چارے کسی سے

پوپلے منہ ایک آدھ بات کرنے کے لئے ترستے رہتے ہیں۔ جب کوئی بھی نہیں ملتا تو خود ہی باتیں شروع کر دیتے ہیں' آپ اسے بڑبڑانا بھی کہہ سکتے ہیں —— سٹھیانا یا دماغ کا کھسکنا بھی —— کبھی دیکھا ہو گا کہ آپ فراٹے بھرتی تیز گام میں سفر کر رہے ہیں۔ کسی اجاڑ بیابان' بابے آدم کے وقتوں کے پرانے اسٹیشن سے گولی کی مانند گزر رہے ہیں۔ ساتھ والی لائن پہ لمبی سی مال گاڑی کھڑی ہوتی ہے۔ پرانے' اپنی معیاد کار کردگی سے کئی برس آگے پہنچے ہوئے ناکارہ کھڑکھڑ کرتے ڈبے جنہیں کوئی مجہول ابوالہول قسم کا انجن گھسیٹ کر ریلوے کے قبرستان میں پہنچانے کے جتن میں کئی دنوں سے محوِ سفر ہوتا ہے۔ ان بڈھوں کے اجتماعی جنازے کے جلوس کو روک کر "یارانِ تیز گام" کو "شوں شڑنگ" کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح زندگی کی لائن پہ گھسٹتے لڑھکتے یہ ناکارہ' بوسیدہ میعاد نکالے ہوئے' خستہ حال' خشک بانسوں والے مشتِ استخواں بڈھے بھی قدم قدم پہ ٹھوکریں کھاتے' لڑھکتے' درختوں پتھروں سے منہ ماری کرتے ہوئے بڑبڑاتے اپنے سکریپ یارڈ کی طرف بڑھتے رہتے ہیں۔

گھر کے ذرا قریب پہنچا —— استغفراللہ' وہ بدمعاش وہیں کھڑا خونبار نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میرے بڈھے دریا کے ٹھہرے ہوئے کائی زدہ پانی میں اب کے بھاری پتھر پڑ گیا تھا۔ میں غصّے سے لرزنے لگا۔ بڈھوں کا غصّہ ان کے وارثوں کو بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ اول تو یہ غصّے میں آتے ہی نہیں' اور اگر آ جائیں تو پھر ضرور کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے جو کم از کم ہسپتال یا زیادہ سے زیادہ کسی میانی صاحب تک دراز ہو سکتا ہے —— ایسی کی تیسی اس بدمعاش کی! —— میں بھی جرات بزرگانہ پیدا کر کے سڑک کے اس کنارے کھڑا ہو کر اسے گھورنے لگا —— توبہ! اس کے چہرے پہ نظریں پڑتے ہی متلی سی آ گئی۔ دائیں آنکھ سے باچھ تک گہرے زخم کا نشان' آنکھ کا ڈیلا سرخ بوٹی سا بیٹھا ہوا' کچی پکی جلد جیسی روئی دھنکنے والی مشین سے کھینچ کر نکالا ہو۔ کریہہ اجڈوں سا جسم' کھلے کھلے زانو پاؤں' سراپا وحشت و خباثت —— مجھے جھرجھری سی آ گئی —— اس نے میری دیدہ دلیری دیکھتے ہوئے دانت کچکچائے۔ میں نے بھی ادھر ادھڑی ہوئی سڑک پر سے ایک نوکیلا پتھر ہاتھ میں لے لیا۔ ویسے بھی اب مرنے جینے میں کون سا فرق باقی تھا' سوچا کہ لڑھکتے لڑھکتے ایک سماج دشمن کو تو ٹھکانے لگا جاؤں۔ بڈھے ویسے بھی کسی کے سر چڑھنے کے بہانے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ عقلمند ان کی اس پالیسی کو سمجھتے ہوئے ہمیشہ ان کے منہ لگنے سے اجتناب کرتے

ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا بزرگو! آپ کی مہربانی۔ ہم آپ کے بچے ہیں' معاف کر دیں۔ غلطی ہو گئی وغیرہ وغیرہ —— یہ اور پھیلتے ہوئے کانپنے لگتے ہیں اور آخر دودھ' شربت اور پاؤں دبوا کر جان خلاصی کرتے ہیں۔ وہ بھی شائد سمجھ گیا کہ یہ بڈھا مارنے سے زیادہ مرنے پہ تُل گیا ہے۔ بڑی لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے انگڑائی توڑ کر نیواں نیواں رہمائی کوٹھی کی جانب ہو لیا۔ میں نے سینہ صاف کرتے ہوئے بھرپور تھوک اس کی جانب اچھالا۔ خس کم' جہاں پاک —— پتھر پھینک' ہاتھ جھاڑ کر میں بھی گھر آ گیا۔ کیا زمانہ لگا ہے۔ گلی گلی غنڈے بدمعاش جنگلی گھاس کی مانند اگ آئے ہیں۔ کم بخت' بدقماش لچا! —— مجھ بڈھے فقیر سے تجھے کیا لینا دینا۔ جا' کسی برابر والے سے ہتھ جوڑی کر —— طبیعت سارا دن بیزار سی رہی' پوپلے منہ سے خود بخود مغلظات کی پھوں پھوار نکلتی رہی۔ رات حسب معمول قطب ملا تو میں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"قطب' ایک میان میں دو تلواریں رہ سکتی ہیں؟"

"نہیں' میان ٹوٹ جائے گی' یا تلواریں آپس میں بھڑیں گی۔"

"اچھا' ایک اقلیم میں دو بادشاہوں کا گزارہ ہو سکتا ہے؟"

"نہیں' بالکل نہیں۔ نظامِ سلطنت تہہ و بالا ہو جائے گا۔ دونوں میں سے ایک نہیں یا دونوں نہیں' کوئی تیسرا بادشاہ آ جائے گا۔"

"دوست —— یہ بتاؤ کہ ایک علاقے میں دو بدمعاش سما سکتے ہیں؟"

وہ جھٹ کانوں کو الٹے ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔ "توبہ توبہ کریں بابا جی! ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بدمعاشوں' دہشت گردوں' رنگ بازوں اور جگا ٹیکس گیروں کے بھی کچھ طور طریقے اور اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ سب کے اپنے اپنے علاقے اور تعلقے ہوتے ہیں۔ مگر آپ یہ سب کچھ کیوں دریافت فرما رہے ہیں؟"

میں نے قطعیت سے کہا۔ "آج سے تمہارے سگریٹ ختم' مخلفام کبابیئے کے "کھابوں" کے بل میں آئندہ نہیں دوں گا اور تمہارے دو نمبری بدمعاش دوستوں پہ لعنت ——" پھر میں نے اسے ساری سٹوری بتائی اور کہا۔ "میاں' تمہارے دن لد گئے' اب تم کہیں صابن یا بچوں کے فراک بیچ کر حلال کی کھاؤ۔ ادھر تمہاری جگہ لینے اب اور بدمعاش آ گیا ہے۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسا۔ آپ اسے نیم قہقہہ زنی بھی کہہ سکتے ہیں جس سے میری بڑی جان جاتی۔ جلال کو ہنسنا بھی نہیں آتا تھا۔ ہنسنے اور قہقہے کے مابین جو نمایاں فرق ہوتا ہے' اس کے ہاں ایسا کوئی مقام ہی نہیں تھا۔ بس وہ زانووں پر ہاتھ مار مار' ڈکارتا' ہنکارتا' سسکارتا لگتا جیسے ابھی منہ بھر کے قے کر دے گا۔ یوں بھی محسوس ہوتا' مفت کی مچھلی کا کوئی کانٹا اس کے حلقوم میں حلقہ بند ہو گیا ہے یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ سری پائے کے شوربے کی تری اس کی سانس کی نلی سے چمٹ گئی ہے جس کی سرسن کو وہ خشک لقمے' پانی یا چینی کی پھکی سے مٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کئی بار اسے ٹوکا کہ برخوردار! اپنی اس مکروہ ہنسی کی ٹون کو ٹیون اپ کرو حتیٰ کہ اسے عملی طور پر ہنس اور قہقہہ لگا کر درمیانی نمایاں فرق کو واضح کر کے بتایا بھی مگر اس کی بدمعاشانہ کھوپڑی میں میری بات بیٹھتی ہی نہیں تھی۔ آج بھی وہ ہنسا تو میں نے اسے ٹوکا تو وہ بولا۔

"برا نہ مانیں' باباجی! یہ آپ ہنس کر یا قہقہہ لگا کر جو مجھے بتا رہے ہیں' دراصل یہ دونوں ہی ہنسی یا قہقہے کی ذیل میں نہیں آتے۔ ہنسی میں چاندی کی پازیب کی چھنن چھنن اور چینی کی پیالیوں کی جو جلترنگ ہوتی ہے وہ بے دانت کے منہ' غلاف زبان' مندھی آنکھوں اور بے قابو لٹکے ہوئے ہونٹوں سے پیدا ہو ہی نہیں سکتی ——— رہا قہقہہ تو اس کے لئے جاندار پھیپھڑوں کی دھونکنی' مضبوط جبڑا مع بتیسی دانتوں اور جوانی کا دم خم ضروری ہے۔ خیر' چونکہ آپ مقام دم و دو سے گزر چکے ہیں لہٰذا آپ ہنسنے یا قہقہہ آور ہونے کی کوشش نہ کیا کریں' آپ کی چند روزہ زندگی کے لئے بہتر ہو گا۔"

میرا تو رہا سہا خون کھول اٹھا' میں نے کہا۔ "ارے گھامڑ! بدمعاشی میں تو تم خیر اچھا بڑا دم مار لیتے ہو مگر اس نازک معاملے میں تم نکل کر تم میری ذاتی توہین کے مرتکب ہو رہے ہو۔ میں تو تمہیں اس علاقے کا بدمعاش اور اپنا برخوردار سمجھ کر خیر خواہی کر رہا تھا کہ تمہارے ہوتے ہوئے یعنی تمہاری ناک کے عین نیچے میرے گھر کے سامنے کوئی کن ٹٹا مجھے اس طرح گھورنے کی جرأت کیسے کر گزرا ہے۔ یہ تو ڈائریکٹ تمہاری گردن پر جوتے سمیت پاؤں رکھنے والی بات ہے۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ——— آپ بے فکر ہو جائیں۔" وہ نیفے میں اڑسے دیسی موزر کو تھپتھپاتے ہوئے مجھے تسلی دینے لگا۔ "میرا خیال ہے کہ فائر ٹھوکنا ہی پڑے گا"

آئندہ وہ آپ کو دکھائی دے تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔"

میں ساری رات سو نہ سکا۔ یہ نہ تھا کہ میں بدمعاشوں' کن ٹٹوں سے ڈرتا ہوں یا میرا کبھی ان لوگوں سے واسطہ نہیں پڑا۔ میں تو پیدا ہی اس شہر میں ہوا جہاں کے اکثر نونہال مسجد میں قاعدہ پکڑنے سے پہلے گلیوں اور بدمعاشیوں میں ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں' باقی ماندہ تعلیم کو تو وہ محض اضافی گرواتے ہیں۔

☆☆

اپنے شہر سیالکوٹ میں' میں نے پہلی مرتبہ جس باقاعدہ بدمعاش کو دیکھا تھا اس کا اسم گرامی کُجا بدمعاش تھا۔ اللہ بہتر جانتا ہے یا اس زمانے کے لوگ کہ اسے کُجا بدمعاش کیوں کہتے تھے جبکہ مرتبان یا مٹکا بدمعاش بھی کہا جا سکتا تھا۔ کُجا تو بہت چھوٹا اور عام سا برتن ہوتا ہے جس میں ڈھنگ سے لسوڑوں کا اچار بھی نہیں ڈالا جا سکتا۔ ایسے نیکے' دبدبے اور اثر و رسوخ والا مستند بدمعاش جو بدمعاش سے کہیں زیادہ ایک اچھا انسان بھی تھا' اس کے لئے یہ کُجے کا لاحقہ کسی طور بھی موزوں نہیں تھا۔ بڑا خوبصورت' صحت مند' گورا چٹا جوان ——— سلیقے' قرینے سے سنورے ہوئے ملائم بال' روغنی چمکتا ہوا گول مٹول چہرہ' لٹھے کا صاف ستھرا لباس' پاؤں میں پمپ شوز' ٹوٹے کان میں سونے کا بالا' سینے پہ جھولتا ہوا تعویذ' بالوں سے بھری کھلی چھاتی۔ اس کی ہیرے کی مانند دمکتی ہوئی موٹی موٹی آنکھوں میں بڑی شرم تھی' حیا دید اور لحاظ تھا۔ محلے گلیوں سے یوں سر جھکائے گزرتا جیسے قرض خواہوں سے چھپتا پھر رہا ہو۔ وہ اکثر بڑے نفیس' بنے سنورے قیمتی تانگے میں سوار دکھائی دیتا۔ بچپن کا وہ زمانہ جب بچہ بدمعاشی کے معنوں سے بھی صحیح طرح واقف نہیں ہوتا' میں اس بڑے اشتیاق سے دیکھا کرتا بلکہ سوچا کرتا کہ کاش! میں بھی ایسا ہی بدمعاش ہوتا۔ ایسے قیمتی کپڑے اور آن بان شان سے ایسے خوبصورت تانگے کی اگلی سیٹ پہ بیٹھتا۔ کوچوان پیچھے بیٹھا ہو' باگیں میرے ہاتھ' لوگ مجھے سلام کریں۔ امپلیا ہوٹل' گرین کیفے میں بیٹھ کر خوب کیک پیسٹریاں' کریم رول اور شامی کباب اڑاؤں۔ سینماؤں میں گیلری میں بیٹھ کر مزے سے فلم دیکھوں مگر جب اس کی لڑائی بھڑائی کے قصے سنتا تو بدمعاشی سوچوں پہ لعنت بھیج کر چپ سادھ لیتا۔

مجھے یاد ہے' تالاب مولا بخش میں کوئی بڑی جوڑوں کا دنگل تھا۔ مقامی لوگوں کے علاوہ

دوسرے شہروں سے بھی ہزاروں شوقین یہاں موجود تھے' معززین شہر بھی مدعو تھے۔ سر پرست اعلیٰ ڈپٹی کمشنر تھا اس لئے بڑے اعلیٰ پیانے پہ انتظامات تھے۔ ڈھول تاشے' پٹاخے' پھول ہار' پہلوانوں کے جھومر سجے ہوئے تانگے' اِک میلے کا سماں--- ہمارا گھر قریب ہی تھا؛ ہم سب بچہ لوگ بھی وہاں موجود' تالاب کی دیوارں پہ بندروں کی مانند جھولتے ہوئے بڑے بڑے ہاتھیوں' گینڈوں' ببر شیروں کو گتھم گتھا دیکھ رہے تھے۔ پھر کسی بڑے جوڑ کی ہار جیت پہ جھگڑا ہو گیا۔ متنازعہ پہلوان گوجرانوالیہ تھا' اس کے ساتھ سینکڑوں حامی اور جھگڑے باز تھے۔ منصفوں کے فیصلے کے باوجود معاملہ ٹھنڈا نہ پڑا بلکہ اُلٹا بگڑ گیا۔ گرز' لاٹھیاں' فولادی مُکے' چاقو چھریاں تک نکل آئیں۔ آتشیں اسلحہ کا کوئی رواج نہ تھا ورنہ سوپچاس ٹھنڈے ہو گئے ہوتے۔ پولیس بے بس ہو گئی۔ کجا بدمعاش میدان میں نکل آیا۔ خدا جانے اس نے کون سا منتر پھونکا کہ پل بھر میں معاملہ ٹھنڈا کر دیا۔ زخمیوں کو ہسپتال پہنچایا' خدمت تیمارداری کی۔ اپنی جیب سے اخراجات برداشت کئے۔ ہم بچوں میں بھی کچھ بچے کچلے گئے' مَیں خود ٹخنہ تڑوا بیٹھا۔ مجھے یاد ہے' کجے بدمعاش نے مجھے اپنے کندھوں پہ بٹھا کر ہسپتال پہنچایا۔ مرہم پٹی کروائی' مٹھائی کھلائی اور گھر چھوڑ کر گیا۔ میری بدمعاش بننے اور تانگے پہ بیٹھنے کی خواہش تو پوری نہ ہو سکی لیکن کجا بدمعاش کے کاندھے پہ بیٹھ کر مَیں برسوں دوستوں میں سر بلند رہا--- برسوں بعد ایک بچے کو کاندھے پہ بٹھانے والا' ایک بچے کی ہاتھوں ہی قتل ہوا۔ اس نے چھریاں مار مار کر کجے کو چیر کر رکھ دیا تھا' شاید بدمعاشوں کا انت یہی ہوتا ہے۔

کجے کے مرنے کے بعد مدتوں حسرت ہی رہی کہ کوئی ڈھنگ رنگ کا بدمعاش زیارت کرنے کو ملے۔ ہم بھی بچپن کی چھوٹی چھوٹی بے ضرر قسم کی بدمعاشیاں کرتے کرتے اِک عمر کو آ لگے۔ شریف بدمعاش دیکھنے کی تمنا' آخر کراچی پہنچ کر پوری ہوئی۔

ایوب خان کا دور تھا' اس مردِ کوہستان نے اور کچھ کیا یا نہ کیا' مگر ایک بھلا ضرور کر گیا کہ ہزاروں لاکھوں لوگوں کے لئے یورپ کے دروازے کھول گیا' ہر ایرا غیرا جو تین ہزار خرچ کر سکتا یا ادھار پکڑ سکتا تھا' کراچی پہنچ جاتا۔ وہاں بے شمار ایجنٹ تھے جو مہینے سوا مہینے میں پاسپورٹ' زرمبادلہ جو پانچ پونڈ ہوتا تھا' ہوائی ٹکٹ بنوا کر بکرے کو انگلینڈ پارسل کر دیتے تھے۔ ویزے کا کوئی جھنجھٹ نہ تھا۔ لندن ایئرپورٹ پہ امیگریشن والے الٹے سیدھے

پاکستانی پاسپورٹوں پہ آنکھیں بند کر کے غیر معینہ مدت کے لئے مُہر لگا دیتے تھے بلکہ مسکرا کر ویلکم بھی کہتے۔ ہم لنڈورے' کام نہ کوئی کاج' پڑھائی نہ لکھائی' ہر جگہ دَر دَر اور دُر دُر۔ اپنے ایسے لفنگوں کے علاوہ کہیں عزت آبرو نہ تھی۔ آوارگیاں' شرارتیں' رَت جگے' اُدھار کھاتے' اپنے گھر میں چھوٹی موٹی چوریاں۔ فلم بینی' سگریٹ نوشی' غرض ہر وہ حرکت اور کام جس سے مجبور اور تنگ ہو کر' عقلمند ماں باپ یا تو شادی کر دیتے ہیں' پولیس فوج میں بھرتی یا پھر کہیں باہر بھیج دیتے ہیں۔ اللہ بخشے ہمارے والد صاحب کو' انہوں نے جھٹ ہمیں شادی کے کھونٹے سے باندھ دیا کہ ذمہ داری محسوس کر کے خود ہی کہیں چار پیسے کمائے گا' بُری صحبت اور یارباشی سے بھی جان چھوٹے گی۔ ایک دو ماہ بڑے چاہ چونچلوں میں گزرے' سلامیوں اور نیوندروں کے مال سے اپنی اور دوستوں کی خوب گزران ہوئی۔ جب شادی کی سسرالی انگوٹھی بھی گم ہو جانے کے بہانے پیٹ میں اُتر گئی تو گھر والوں کو "یک نہ شُد دو شُد" کے معانی سمجھ میں آئے۔ تنگ آ کر حربہ نمبر دو استعمال کیا گیا۔ والد صاحب مرحوم نے انگلینڈ ایک عزیز کو خط لکھا کہ اس نالائق کو وہاں بلا لو' اس نیک خُونے جواب میں ہمیں کراچی پہنچ کر ایک جاننے والے ایجنٹ سے ملنے کی تاکید لکھی۔ کراچی پہنچتے ہی اس نے ہماری تصویریں بنوائیں' پندرہ بیس فارموں پر دستخط کروائے۔ نیپئر روڈ بازار حسن کے قریب اکھاڑہ بلڈنگ کے ساتھ چارپائی مارکیٹ ایک فٹ پاتھی سرائے میں بھجوا دیا۔ یہاں پنجاب اور آزاد کشمیر کے لوگ رہتے تھے جو سارا دن چارپائیاں بُنتے رہتے اور رات انہیں دو چار آنے پہ انگلینڈ جانے والے بکروں کو کرائے پہ اُٹھا دیتے۔ علی الصبح یہ چارپائیاں سونے والوں کے نیچے سے کھینچ لی جاتیں۔ جو ادوائنیں کَس کَسا کر پھر فروخت کے لئے رکھ دی جاتیں۔ صبح سویرے یہ نوواردانِ کراچی اِدھر اُدھر پھیل کر حوائج ضروریہ سے کسی نہ کسی طور فراغت حاصل کر کے قرب و جوار کے ہوٹلوں سے ناشتہ کرتے' پھر گروپوں کی شکل میں منوڑہ' کلفٹن' مزارِ قائد' چڑیا گھر وغیرہ سیر سپاٹے کے لئے بکھر جاتے' اکثریت ان لوگوں کی ہوتی جو پہلی مرتبہ کراچی آئے ہوتے--- یہاں کی سڑکیں' سمندر' بڑی بڑی بلڈنگز' ان کے اندر لگی ہوئی لفٹس ان کے لئے خاص دیکھنے کی چیزیں ہوتیں۔ ٹرام میں بیٹھ کر بڑے خوش ہوتے۔ پاس ہی قدموں میں بازار حسن تھا اور شراب خانے بھی۔ ہر کسی کے ذوق اور شوق کا سب سامان تھا۔ کئی ایک کے لئے تو کراچی ہی لندن تھا۔

بولٹن مارکیٹ سے اپنے اپنے سائز میچ کے پرانے کوٹ پتلون' بوٹ ٹائیاں پہنے کراچی کی سڑکوں پر اینڈتے پھرتے تھے۔ رات نئی نئی چارپائیوں پہ لیٹ کر یورپ میں میموں کے خواب دیکھتے۔ مہینے سوا مہینے میں یہ لوگ باری باری جہاز پہ سوار ہو جاتے اور ان کی جگہ نئے آ جاتے۔ ہمارے لئے یہ ماحول بڑا اجنبی تھا۔ دیہاتوں' پہاڑوں کے گنوار لوگ' انگریزی تو ایک طرف' اردو بولنے لکھنے پڑھنے سے بھی عاجز تھے۔ الٰہی! یہ لوگ وہاں پہنچ کر کون سا پہاڑ کھودیں گے' ایک انتہائی متمدن معاشرے میں کس طرح اپنے آپ کو ایڈجسٹ کریں گے؟--- یہاں گروپ تھے۔ کوئی آزاد کشمیر کا ہے تو کوئی پنڈی کا' ادھر چھاچھی ہیں تو ادھر سرحدی قبائل کے لوگ' پنجاب کے اصل پنجابی اپنی بات چیت' چلئے اور لباس و انداز میں الگ ہی نظر آتے--- مجھے مہینہ سوا مہینہ یہیں رہنا تھا' کسی اپنے گرائیں کی تلاش میں آس پاس چکر لگانے لگا۔ چارپائی مارکیٹ سے ذرا آگے ایک سیالکوٹئے کا جھونپڑا تھا۔ مستری نیامت--- لوہار کا کام کرتا تھا۔ چھوٹی موٹی ڈائیاں' رگڑائی' پالش گھسائی۔ ایک آنکھ میں کوڑی پڑی ہوئی تھی۔ بڑے تپاک سے ملا۔ سیالکوٹ میں اپنے محلے اور بزرگوں کا تعارف کرایا۔ بڑا خوش ہوا' کچھ واجبی سی واقفیت بھی نکل آئی۔ بے اولاد تھا' بیوی کبھی کی مر چکی تھی۔ دو بھتیجے ساتھ تھے جو کہیں اور کام کرتے تھے' جو رات یہاں آ کر پڑ جاتے۔ سارا دن یہ شریف محنت کش لوہے کی ٹھپائی کرتا رہتا۔ حقے کی نے منہ میں' میلے کچیلے کپڑے' دھوئیں اور راکھ سے اَٹے ہوئے بال۔ جو کچھ کماتا' بھتیجوں کے چونچلوں میں جھونک دیتا۔ مجھے بھی اس نے بیٹے کی جگہ اپنے دل اور جھونپڑے میں رکھ لیا۔ جھونپڑا کیا تھا' کھانا پکانا بھی وہیں تھا۔ ایک کونے میں ٹاٹ کا پردہ باندھ کر بیت الخلا بنا ہوا تھا۔ ساتھ لوہا اوزار' کاٹھ کباڑ۔ ایک چارپائی' بانسوں کے اوپر ٹارزن کی مچان ایسی پرچھتی تھی جس پر ایک دو ٹین کے پرانے کنستر تھے۔ ایک بے تالے کا صندوق' گندے لحاف اور ایک ٹوٹی ہوئی سائیکل کا فریم پڑا ہوا تھا۔

ایجنٹ کے پاس کیس جمع کروا کر اب میرے لئے فراغت ہی فراغت تھی۔ ہر روز شام کو ایجنٹ کا گماشتہ یہاں آتا' سب لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ جس کا کام ہو جاتا وہ اگلی صبح اس کے دفتر چلا جاتا' ادائیگی کر کے دو چار روز میں جہاز پہ چڑھ جاتا۔ میں بھی صبح ناشتے سے فارغ ہو کر اِدھر اُدھر وقت گزاری کے لئے نکل جاتا۔ شام چھ سات بجے واپس پلٹتا' کبھی

کبھی رات کے کھانے میں چاچا نیامت کو بھی شامل کر لیتا۔ پھر ہم دونوں چچا بھتیجا آدھی رات تک اِدھر اُدھر کی باتوں سے ایک دوسرے کو بہلاتے رہتے۔ وہ پرانے وقتوں کی باتیں سناتا رہتا اور میں نئے زمانے کی سنا سنا کر اسے حیران کرتا رہتا۔

پندرہ بیس روز بعد ہمیں انگلینڈ والے مہربان نے تین ہزار روپے بذریعہ ہنڈی بھیجے جو اس کے لکھے ہوئے پتہ پہ جا کر ایک میمن سے وصول کر لئے۔ اتنی بڑی رقم زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھی اور ہاتھ آئی تو ہاتھوں میں پسینہ آ گیا۔ رقم لا کر چاچا نیامت کے حوالے کی کہ لو چاچا' ہماری امانت رکھو۔ وہ کافی دیر اکلوتی آنکھ سے یہ ڈھیر سارے نوٹ دیکھتا رہا' پھر بولا۔

"پُتر! یہاں تو میں نے کبھی سو روپے نہیں رکھے' تم ہزاروں رکھوا رہے ہو--- دراصل مجھے اپنے بھتیجوں پہ اعتبار نہیں۔ کراچی آ کر انہیں بری عادتیں پڑ گئی ہیں--- خیر' اللہ وارث ہے۔ لاؤ اللہ نبی کے سپرد کر دیتے ہیں۔" اس نے نوٹ بغیر گنے ایک پوٹلی میں باندھ کر مچان کے اوپر ایک کنستر میں ڈال دیئے۔

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔

ایک شام ہمیں ایجنٹ کا پیغام ملا کہ پاسپورٹ' زرمبادلہ' ٹکٹ سب تیار ہے۔ دفتر آؤ' اپنے کاغذات پاسپورٹ' ٹکٹ وصول کرو اور ادائیگی کر کے چار روز بعد جانے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ لندن میں برف باری ہو رہی ہے لہٰذا اپنے لئے بولٹن مارکیٹ سے کوٹ پتلون' ضرورت کے مطابق گرم کپڑے اگر خریدنا چاہو تو خرید لو۔ میں اور چاچا نیامت بہت خوش ہوئے۔ مٹھائی منگوائی' ایک دوجے کا منہ میٹھا کروایا۔ خوش خوش باتیں کرتے ہوئے سو گئے صبح میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی چاچا نیامت نہا دھو کر ناشتہ بنا رہا تھا۔ فارغ ہوئے تو کنستر نیچے اتارا' الٹ پلٹ کیا' روپوں کی پوٹلی غائب تھی۔ دوسرا کنستر دیکھا۔ لحاف' کپڑے' ہر چیز جھاڑی پٹکی۔ روپے ہوتے تو ملتے۔ جھونپڑے کی ہر چیز الٹ پلٹ کر دی۔ چاچا سر جھکا کر ڈھیر ہو گیا۔ میرا تو خون خشک ہو گیا۔ اتنی بڑی رقم اور آج ادائیگی کرنی ہے' چار روز بعد روانہ ہونا ہے' اب کیا ہو گا؟--- چاچا' جیسے کسی نے اس کا لہو نچوڑ لیا تھا' مجھے کہنے لگا۔

"تم یہیں میرا انتظار کرو' میں گھنٹے بھر میں واپس آتا ہوں۔"

"کہاں جا رہے ہو چاچا---؟"

اس نے ایک بڑی سی گالی اپنے بھتیجوں کو دیتے ہوئے کہا۔ "مَیں ذرا ان کی خبر لے کر آتا ہوں--- مجھے شک ہے کہ یہ حرکت انہوں نے کی ہے۔"

ایک گھنٹے کی بجائے وہ دو ڈھائی گھنٹے لگا آیا' ساتھ دونوں بھتیجے بھی تھے۔ انہوں نے آتے ہی وضو کیا اور قرآن ہاتھ میں لے کر یقین دلایا کہ یہ حرکت انہوں نے نہیں کی۔ اب تو کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہی تھی۔ اب چوری کی بات پوری مارکیٹ میں پھیل گئی تھی۔ یہ دن اسی پریشانی اور غور و خوض میں گزر گیا۔ رات میں سویا' نہ چاچا۔ لاکھ تسلی دی' یقین دلایا کہ چاچا! مجھے تم پہ شک نہیں' تم پریشان نہ ہو۔ مَیں ایجنٹ سے بات کرتا ہوں۔ یہی ہو گا کہ چند روز لیٹ ہو جاؤں گا' پیسے اور منگوا لوں گا۔

"بات پیسوں کی نہیں' پُترا میری عزت کی اور میرے احساس کی ہے۔ تم میرے مہمان ہو' کیا سوچو گے کہ چاچا کو امانتاً" پیسے دیئے اور وہ چوری ہو گئے---؟"

مَیں خاموش ہو گیا۔ چاچا بھی حُقے کی نَے دبائے کہیں سوچوں میں غرق ہو گیا۔ سارا دن ہم دونوں بغیر کچھ کھائے پیئے لیٹے رہے۔ شام کے قریب چاچا نے مجھے نہا کر تیار ہونے کا حکم دیا۔ وہ خود بھی نہایا' کپڑے تبدیل کئے۔ چاچا کچھ بدلا بدلا سا تھا جیسے اسے روپے مل گئے ہوں--- ہم باہر نکل کر ہوٹل میں آ بیٹھے' چاچا نے خلاف معمول بڑا اچھا اور لذیذ کھانا منگوایا سگریٹ منگوائے۔

"پُترا انشاء اللہ تم اپنی تاریخ پہ انگلینڈ ضرور جاؤ گے۔ تم نے مجھے امانت رکھنے کے لئے دی تھی اور مَیں نے اللہ نبی کے سپرد کر دی تھی' ہمیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ہم دونوں پیدل ہی نکل کھڑے ہوئے نیپئر روڈ کے آس پاس مختلف گلیوں بازاروں میں گھومتا گھماتا وہ مجھے ایک ہوٹل میں لے آیا۔ کھُلے میدان میں وہ عجیب سا ہوٹل تھا۔ معمولی سے بینچ میز۔ بے شمار کھدڑے' شاید یہ ہیجڑوں کا ہوٹل تھا۔ ناچ گانا' ایک طوفان بدتمیزی برپا تھا۔ مَیں سوچ رہا تھا کہ چاچا کو یہاں آنے کی کیا سوجھی۔ کئی' بلوچی' مکرانی بیٹھے دادِ عیش دے رہے تھے۔ ریکارڈنگ پر بیہودہ گانے' طبیعت بڑی بوجھل ہو گئی۔ چاچا نے ایک ملازم سے کسی شخص کے بارے میں دریافت کیا تو اس نے ہوٹل کے اندر ایک

کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ چاچا کا مطلوبہ شخص بھی ایک مکرانی کھدڑا تھا۔ مکرانی طرز کا شیشوں والا لمبا سا گھاگرا' بے انداز میک اپ' مصنوعی بالوں کی چٹیا۔ گھٹیا شراب پیتے ہوئے وہ دو تین آدمیوں سے اپنے ریچھ جیسے پاؤں دبوا رہا تھا۔ چاچا نے اسے سلام کیا' اس نے چائے منگوائی۔ چاچا کی ساری بات بڑی تسلی سے سُنی اور بغیر کسی ردِ عمل کے مجھ سے مخاطب ہوا۔

"بیٹا! تم تیاری پکڑو' جہاز تم کو لئے بغیر ائیرپورٹ سے اُڑ نہیں سکتا۔" پھر چاچا سے کہا۔ "چاچا! تم ڈیرے پہنچو' ہم بھی تھوڑی دیر بعد اُدھر آئے گا۔"

واپس ہم رکشہ پہ آئے۔ ڈیرے پہنچے تو چاچا چلم کے لئے آگ دہکانے بیٹھ گیا۔ اور میرے پاس چند لوگ آ گئے یہ بھی انگلینڈ جانے کی تیاریوں میں تھے' چوری کے واقعہ پہ اظہارِ ہمدردی کرنے لگے۔ چِلم تیار کرنے کے بعد چاچا نے انگیٹھی پہ چائے کی کیتلی بھی دَھر دی تھی۔ حُقہ تیار ہوا تو چاچا کے آس پاس والے حُقہ باز بھی آ گئے۔ چائے' حُقہ اور باتیں!--- پھر وہ ہی ہوٹل والا کھدڑا' آٹھ دس ساتھیوں کے ساتھ حسبِ وعدہ آ گیا۔ چاچا نے بڑی عزت سے انہیں بٹھایا۔ اس نے آتے ہی اپنے غنڈوں کو اپنی زبان میں کچھ کہا۔ انہوں نے ادھر اُدھر پھیل کر آگے پیچھے' دائیں بائیں ساری چارپائیاں خالی کروا کر الٹ دیں۔ دس منٹ میں وہاں کے سارے چھوٹے بڑے بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر جمع کر لئے' پھر ان سے مخاطب ہوا۔

"دیکھو' بھائیو! اس بابو کے تین ہزار روپے چوری ہوئے ہیں۔ مَیں نے تسلی کر لی ہے' یہ کام یہیں کسی نے کیا ہے۔ میں دس منٹ کی مہلت دیتا ہوں' جس کسی نے یہ حرکت کی ہے وہ سامنے آ جائے۔ میرا وعدہ ہے' میں اسے معاف کر دوں گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر میں اپنا طریقہ استعمال کروں گا۔"

دس منٹ گزر گئے--- سب لوگ سامنے سر جھکائے کھڑے تھے' کوئی بھی چوری اپنے سر نہیں لے رہا تھا۔ وہ کھدڑا چارپائی سے اٹھا' لوگوں کو ایک لائن میں کھڑا کر دیا اور ایک ایک کے پاس پہنچ کر اسے گھورنے لگا۔ پانچ آدمی اس نے علیحدہ کر لئے تھے۔ پھر خود چارپائی پہ بیٹھ کر انہیں سامنے کھڑا کر لیا اور سب کو گھور کر دیکھتا ہوا بولا۔

"تم پانچ میں ایک چور ہے۔ اب بھی وقت ہے۔ جس نے یہ حرکت کی ہے' ایک

قدم آگے آ جائے۔ میں پھر کہتا ہوں اسے معاف کر دیا جائے گا۔۔۔"

پانچوں میں ایک نوجوان لڑکا تھا جو چاچا کے جھونپڑے کے پیچھے فرنچ پالش کا کام کرتا تھا' وہ آگے بڑھا اور کہنے لگا۔

"میں چور نہیں ہوں لیکن مجھے پتہ ہے چوری کس نے کی ہے۔"

"شاباش۔۔۔بولو' وہ کون ہے؟"

"وہ چاچا نیامت کا بھتیجا نذیر ہے۔"

اب وہ چاچا سے مخاطب ہوا۔ "چاچا! نذیر کدھر ہے؟"

چاچا نے جواب دیا۔ "اس کے آنے کا یہی وقت ہے مگر کچھ دنوں سے وہ بارہ ایک بجے واپس آتا ہے۔۔۔ کہتا ہے' "میں اوور ٹائم لگاتا ہوں۔"

کھدڑے نے اپنے دو آدمی اسی لڑکے کے ساتھ روانہ کئے کہ وہ اسے کام سے پکڑ کر لائیں۔ وہ کہیں قریب ہی کام کرتا تھا مگر وہاں سے معلوم ہوا کہ وہ تو کئی دنوں سے کام پہ ہی نہیں آ رہا۔ اسی لڑکے کی نشاندہی پہ اسے نیپئر روڈ کے ایک کوٹھے پہ ایک طوائف کے ہاں سے پکڑا۔ وہ غنڈے' چاچا کے بھتیجے کو اس طوائف اور نائیکہ سمیت اٹھا کر لے آئے۔ بھتیجے نے یہاں پہنچ کر جو تماشا لگا دیکھا تو ساری بات سمجھ گیا' آتے ہی کھدڑے کے پاؤں پڑ گیا' شلوار کی جیب الٹ دی۔ روپے گنے تو کوئی بارہ تیرہ سو نکلے۔

"باقی کدھر ہیں؟"

کھدڑنے سے سرسری لہجے میں پوچھا لیکن سب جانتے تھے کہ اس کا یہ لہجہ' شاہی حکم جیسا بھاری تھا۔ نذیر نے طوائف کی جانب اشارہ کیا تو طوائف کی ماں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگی۔

"بادشاہ! جو باقی ہیں' میں واپس کرتی ہوں۔ تماش بین آتے ہیں' ہمیں کیا پتہ کہ وہ مال کہاں سے لاتے ہیں۔ چور ہیں یا شاہ۔"

اس نے جھٹ باقی کے پیسے نکال کر کھدڑے کے سامنے رکھ دیئے۔ کھدڑے بادشاہ نے سب لوگوں سے تکلیف کی معافی مانگی اور جانے کے لئے کہا۔ اس نے حسبِ وعدہ ان لڑکوں کو وارننگ دے کر معاف کر دیا اور چاچا سے کہا۔

"چاچا! چور تم نے گھر رکھے ہوئے ہیں' پریشان مجھے کرتے ہو۔۔۔"

"بادشاہ! جب کوئی قرآن اٹھا کر اپنی بے گناہی ظاہر کرے تو ایک مسلمان کی حیثیت سے اعتبار کرنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے تو اس بچے کی امانت اللہ نبی کے سپرد کی تھی' اللہ نبی نے ہی میری عزت رکھی ہے۔۔۔ بادشاہ! تمہیں اللہ جزا دے۔" چاچا نے انکساری سے کہا۔

بادشاہ اٹھ کر کہنے لگا۔ "کل اس بابو کی ہماری طرف دعوت ہے' شام کو سات بجے تم لوگ ادھر آؤ گے۔" وہ برآمد ہونے والے روپے جیب میں ڈال کر چل دیا۔

وہی کھدڑا یعنی کھسروں کا ہوٹل۔۔۔ وہی ناچ گانا' ہلڑبازی' شور شرابا' فحش گانے۔۔۔ بادشاہ نے اندر کمرے میں میز سجائی ہوئی تھی۔ بریانی' تلی ہوئی مچھلی' نان۔ کھاپی کر ہم واپس آنے لگے تو بادشاہ نے پورے تین ہزار روپے دیتے ہوئے کہا۔

"بابو! ادھر کوئی مائی کا لال تم لوگوں کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ تم لوگ پنجاب سے ادھر روزی کمانے کے لئے آتے ہو بیوی بچوں' ماں باپ کو چھوڑ کر تم یہاں ہمارے مہمان ہو۔۔۔ تم لندن جا رہے ہو۔ میں تمہیں خود ائیرپورٹ پہ الوداع کہنے پہنچوں گا۔ اُدھر جا کر میموں کے پیچھے مت پڑ جانا' پڑھائی کرنا' پیسے کمانا۔ اِدھر اپنے وطن کا بھی خیال رکھنا۔" اس نے مجھے ایک فونٹین پین تحفے میں دیا۔ "تم مجھے اس فونٹین پن سے اپنے ادھر خیریت سے پہنچنے کی اطلاع لکھنا۔"

چاچا نیامت اور بادشاہ مجھے ائیرپورٹ چھوڑنے آئے تھے۔ چاچا مجھے گلے لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"پتر! میں ایک چور بھتیجے کا چاچا ہوں' میں بھی چور ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔"

بادشاہ نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "بابو! میرے لئے لندن سے کوئی خوبصورت سی میم پارسل کر دینا۔۔۔" ادھر کراچی میں چاچا نیامت کی ایک آنکھ جس میں ساری دنیا کی آنکھوں کی حیا اور مہربانیاں سمٹی ہوئی تھیں' وہ کھدڑا بادشاہ بدمعاش جس کی بدمعاشی پردیسیوں کے لئے چارہ گری اور حفاظت تھی اور ادھر ایک یہ کانا بدمعاش جو مجھے میرے گھر کے سامنے ہی عدم تحفظ کا احساس دلا رہا ہے۔ ہزار بار لعنت تری اوقات بدمعاشی پر!

★★

ایک اور بدمعاش مجھے امرتسر میں ٹکرا تھا۔ اجمیر شریف سے واپسی پہ میرا چند روز

امرتسر میں ٹھہرنے کا پروگرام تھا' دربار صاحب' جلیانوالہ باغ اور اپنے سسرال والوں کا محلّہ اور مکانات دیکھنے جاؤں گا' جی بھر کر سیر کروں گا۔ یہ وہ شہر ہے جس نے سیاست' ثقافت' ادب' موسیقی اور سب سے بڑھ کر علومِ دین و دنیوی میں ایسی نابغہ روزگار انسان پیدا کئے ہیں جن کی قد آور شخصیت کا ذکر اور ان کی خراج تحسین پیش کئے بغیر ہم برصغیر کی تاریخ کا ورق پلٹ نہیں سکتے۔۔۔ یہاں کے گلی کوچوں' بازاروں' باغوں' نہروں' میدانوں میں آج بھی انہی بزرگ ہستیوں کی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ ان کے قدموں کی چاپیں اُبھرتی ڈوبتی سی محسوس ہوتی ہیں۔ کہیں موسیقی کا آہنگ' کہیں علمی و ادبی فنی مباحث کا غوغا' کہیں سیاسی بیداری کی شورش' کہیں تدریس و تعلیم کی تکراریں۔ جلیانوالہ باغ کا بہیمانہ سانحہ' سن سنتالیس کا قتل عام اور پھر دربار صاحب کا خونچکاں آپریشن۔ امرتسر ہر بار خون کے آنسو رویا۔ اس کی صُبحیں اُجالنے والے' اس کی دوپہریں دُو آتشہ کرنے والے' اس کی شامیں آئینہ رو اور راتیں روشن کرنے والے مسلمان یہاں سے نکلے تو امرتسر جیسے مرگیا۔ اب تو یہ ایک حنوط کیا ہوا شہر ہے۔ جسم ہے تو روح نہیں' آنکھیں ہیں تو نور نہیں' حسن وحسب ہے لیکن ظہور نہیں۔ یہ کچھ مسلمانوں کے دَم برکت سے ہی تو تھا۔۔۔"

ساری رات دَم پخت ہوتی ہوئی شب دیگین' ہریسے اور نہاری کی اشتہا انگیز خوشبوئیں۔ گجردم کلچے اور باقرخانیوں کی تیاریاں' کشمیری چائے کے لبالب دیگچے۔ وہ بیٹھکیں' محفلیں جمگھٹے' مباحث' مناظرے' دنگل' مشاعرے' جلسے جلوس۔ کیا کیا کہئے کیا کیا یاد کیجئے۔ کلیجہ مُنہ کو آنے لگتا ہے۔ اُمرتسر کے ماتھے کا چندن' اس کا نور ظہور سب کچھ ختم ہوگیا۔ آج بھی پرانے امرتسریئے سوتے تو پاکستان میں ہیں لیکن خوابوں میں گھومتے پھرتے امرتسر میں ہیں۔ امرتسریا اور لاہوریا کہیں بھی ہے' وہ لاہوریا اور امرتسریا ہی ہے۔ یہ دونوں شہر ہی نہیں' تہذیبیں بھی تھیں۔۔۔ آہ! یہ سب کچھ اِستداد زمانہ کے ہاتھوں ریخت و تاراج ہوکر رہ گیا۔

امرتسر اسٹیشن سے باہر نکلا تو ایک بھلے سے سکھ ٹیکسی ڈرائیور سے واسطہ پڑا۔ میور ہوٹل چلنے کے لئے کہا۔ جی ٹی روڈ پر اٹاری کی جانب یہ ایک خوبصورت اور آرام دہ ہوٹل ہے' ایک آدھ مرتبہ پہلے بھی یہاں قیام کرچکا تھا۔ چند ہی منٹ کے بعد وہاں پہنچ گئے۔ آسانی سے ایک ڈبل روم مل گیا۔ ہلکا سا دستی سامان پھینکا' بغیر کپڑے تبدیل کئے بستر پہ لمبا

پڑ گیا۔ پچھلے دو دن مسلسل سفر میں بے آرامی سے کٹے تھے۔ اگلا پورا دن بھی گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔ دہلی' اجمیر شریف میں کھانے پینے کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ دیسی مغلائی' چٹ پٹے حلال کھانے وافر دستیاب تھے۔ یہ امرتسر' اب خالص سکھوں کا شہر۔ سب سے بڑی یہی پریشانی کہ کھایا کیا جائے' یہ تین چار روز کس طرح گزارہ ہوگا؟ پنجابی' خاص کر لاہوریا تو چٹخارے دار کھابے کھائے بغیر زندہ تو خیر رہ سکتا ہے' خوش اور صحت مند نہیں رہ سکتا اور چٹخارہ کھابا' مرغ و ماہی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ایک آدھ دن سلائس' آملیٹ' چپس وغیرہ سے ٹال لیا تھا' منہ کا سواد بگڑا ہوا تھا۔ رہ رہ کر لاہوریاد آرہا تھا۔ مجبوری تھی' دو چار روز بہر طور کچھ نہ کچھ انتظام کرنا تھا۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور بات کی۔

تو وہ بولا۔ "بادشاہو' چلو مسلمان ہوٹل لے چلنے آں۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے نوید مسرت سے نوازا تھا۔ مَیں بہت خوش ہوا' حلال کھانا بھی اور مسلمان بھائی بھی' امرتسر میں۔۔۔ ہوٹل پہنچے تو بھوک کے غبارے اور جذبہ مسلمانی دونوں کی ہَوا نکل گئی۔ کشمیری مسلمانوں کی دو تین ڈربہ نماخستہ حال دکانیں' سہمے سہمے مدقوق سے دکاندار جیسے کسی نے زبردستی بیگار میں باندھے ہوں۔ ٹوٹی پھوٹی کرسیاں' ہِلتے میز۔ بڑی بے دِلی سے علیک سلیک ہوئی۔ مکھیوں کی غلاظت اور سالن کے دھبوں سے اَٹی ہوئی میز' ایک گندی سی صافی سے صاف کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ المونیم کا گلاس اور پانی کا جگ سامنے رکھ دیا گیا ظاہر ہے کہ ہم نے تو گوشت مانگا تھا مگر سامنے پیلے پیلے ربڑ کے ٹکڑے کشمیری گو ٹکوؤں کے ساتھ پڑے ہوئے تھے۔ پلیٹ اور سالن کا رنگ روپ دیکھتے ہی بھوک اُڑ نچھو اور طبیعت مکدّر ہوگئی۔ خدا جانے سالن نام کا یہ ملغوبہ صرف ہلدی میں پکایا تھا یا سکھوں کا مقدّس شہر ہونے کی وجہ سے ان کے قومی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ بہرحال' اَزراہ مروّت و اخلاق ایک آدھ لقمہ زہر بُر جان کیا۔ پھر نہایت انکساری سے عرض کیا۔

"یا برادر عزیز! اس کے علاوہ کچھ اور ہے جو یہ مسافر بے نوا کم از کم کھا تو سکے؟"

پنیر اور مٹر کا سالن اور کچھ رائتہ آیا۔ کھانا' محض غذائیت ذائقے اور لذت کا نام ہی نہیں۔ اس کے علاوہ رنگ' مہک' روپ' سجانے بنانے اور قرینے سے پرونے کا ڈھنگ بھی ہے۔ یہی چیزیں تو اشتہا پیدا کرتی ہیں' بھوک کُھلتی اور چمکتی ہے۔ معدے اور کام و

دہن میں تقویت اور طلب کا موجب ہوتی ہے مگر یہاں تو سرے سے بھوک ہی معدوم ہو چکی تھی۔ دونوں سالن سامنے پڑے میری آنکھوں کا پڑوال بنے ہوئے تھے لاہور ہوتا تو انہی سالنوں کے حوالے سے ایک آدھ قتل ہو سکتا تھا یا کم از کم کسی کا سر کھل سکتا تھا مگر یہاں مجبوری تھی--- پھر عرض گزاری کہ کوئی کباب نما چیز جس میں تیز مرچ مصالحے ہوں اور ہو سکے تو کچھ گوشت بھی ہو۔ شیطانی وسوسہ اٹھا کہ چاہے جھٹکے کا ہی ہو، مگر صحت مند گوشت تو ہو--- پھر جھٹ لاحول پڑھی۔

"بیس پچیس منٹ دیں تو تیار کر دیتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، یہ اٹھالیں---"

مَیں نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ وہ کبڑا کشمیری بجلی کے جھٹکے سے اُٹھ کر میری پاس آیا، بولا۔ "آپ سگریٹ نہ پئیں تو آپ اور میرے، دونوں کے لئے بہتر ہو گا۔"

مَیں نے سگریٹ کا پیکٹ کھولتے ہوئے پوچھا۔ "بھائی! کیوں نہیں پی سکتا--- یہاں سرعام شراب پی جا رہی ہے، مَیں ایک بے ضرر سا سگریٹ نہیں پی سکتا؟"

"شراب آپ بھی چاہیں تو پی سکتے ہیں مگر سگریٹ سے نقصِ امن کا اندیشہ ہے۔"

"مجھے میرے ہوٹل میں تو کسی نے نہیں روکا---" مَیں نے سگریٹ واپس پیکٹ میں رکھ دیا۔

"وہ ہوٹل ہے اور یہ بازار--- ویسے آپ کی مرضی؟"

کباب آئے تو دل جل کر کباب ہو گیا، تشبیہ دینے کے لئے دائرۂ اخلاق میں کم از کم میرے پاس کوئی الفاظ نہیں، مکروہات استعمال کروں تو آپ کو گھن آئے گی۔ بل ادا کر کے مَیں وہاں سے بغیر الوداعی کلمات ادا کئے بھاگ لیا--- ہت تیری مجبوری مکوی کی، امرتسر سے کہیں بہتر تھا تو بڈگام میں رہتا۔ گوشتابہ نہ سہی محض گوگو ہی پکاتا، کم از کم تیری کشمیری مٹی کی ہنڈیا کی خوشبو تو اس میں ملی ہوتی۔ وہاں کے چشموں کا اَمرت دھارا تو اس میں شامل ہوتا۔ تیری مکوی نے تیرے نایاب زعفران کو یہاں خچروں کے پاؤں تلے روندی ہوئی گھاس کے تنکوں سے بھی کہیں زیادہ ارزاں کر دیا ہے--- مَیں دل ہی دل میں روتا ہوا بھوکے پیٹ مَن پرَ جانے کی سوچنے لگا۔ تارا چندا سورج سینما میں آخری شو دیکھا، واپس ہوٹل پہنچا۔ وہی آملیٹ، سلائیس اور گرما گرم پکوڑے منگوائے۔ کھا پی کر کپڑے تبدیل

کئے کتاب کھول کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ پڑھتے پڑھتے ہی کسی لمحے آنکھ لگی ہو گی۔ باہر کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا، وہم یا خواب سمجھ کر کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔ پھر قدرے زور سے کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ چاروناچار اٹھا۔

"کون ہے؟" مَیں نے قدرے جھنجلاہٹ سے پوچھا۔

"پلیز! ذرا دروازہ کھولئے۔"

دروازہ کھولا۔ ایک کھڑی مونچھوں والا ٹی شرٹ پتلون میں ملبوس مودّب کھڑا تھا۔ پہلی ہی نظر میں، مَیں پہچان چکا تھا، یہ کوئی سی آئی ڈی والا ہے۔

"جی--- فرمایئے؟"

وہ بڑی منافقانہ سی مسکراہٹ اپنے مکروہ چہرے پہ پھیلاتے ہوئے اندر آنے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ مَیں نے گھڑی پہ وقت کا اندازہ کیا۔ وہ جو بھی تھا، اس وقت آدھی رات کو کسی شریف مسافر کو بلاوجہ بے آرام کرنے کا کوئی جواز نہیں رکھتا تھا۔ ایک لمحہ اس کے سوال پہ غور کیا اور راستہ چھوڑ کر ہاتھ کے اشارے سے اسے اندر داخل ہونے کے لئے کہا۔ وہ کمرے اور میرے مختصر سے دستی سامان کو گہری نظروں سے دیکھتا ہوا صوفے پہ بیٹھ گیا، تعارفی کارڈ نکال کر مجھے دکھاتے ہوئے اپنا تعارف کرانے لگا۔

"پرشاد ناتھ ہنڈوال، اسسٹنٹ انسپکٹر اسپیشل برانچ سی آئی ڈی--- بے وقت آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں ابھی آپ سوئے نہیں تھے۔" وہ میرے بستر پہ کتاب دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "شاید کتاب پڑھ رہے تھے۔" ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر وہ بڑے سکون سے اپنی ڈائری کھول کر پڑھنے لگا۔ "آپ کا شبھ نام، محمد یحییٰ خان سیالکوٹ--- انیس سو چھتیس میں آپ کا شبھ جنم ہوا۔ آپ کے برٹش انٹرنیشنل پاسپورٹ کے مطابق آپ برٹش نیشنل ہیں۔ اس وزٹ کے علاوہ نوبار آپ پہلے بھی اسی پاسپورٹ پہ بھارت آ چکے ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے بزنس مین۔ تین مرتبہ آپ سری نگر اور باقی سفر آپ نے بمبئی، دہلی، احمد آباد، اجمیر، میرٹھ، حیدر آباد، لکھنؤ، امروہہ، شجاع آباد اور امرتسر جموں کے کئے ہیں۔"

میں اس کی آمد اور ہرزہ سرائی سے بے زار بیٹھا تھا۔ طبیعت پہ بڑا جبر کر کے اس سے مخاطب ہوا۔ "آپ کی معلومات لفظ بہ لفظ درست ہیں--- فرمایئے، اس وقت میں آپ کی

کیا سیوا کر سکتا ہوں؟"

وہ رُوسیاہ کھیسیں نکال کر ہنسنے لگا۔۔۔ "آپ بزنس مین ہیں' آپ تو سب کچھ اچھی طرح سمجھتے ہیں' سیوا تو ہمیں ایک دوسرے کی کرنی ہی پڑتی ہے۔۔۔" وہ ذرا قریب سرک کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگا۔ "جہاں آپ اس وقت ٹھہرے ہوئے ہیں' سرحد سے صرف چند کوس کا فاصلہ ہے۔ یہ بارڈر ہے' بڑا حساس علاقہ۔ یہاں ہمیں ہر فرد پہ نظر رکھنی پڑتی ہے' خاص کر جو غیر ملکی ہوتے ہیں۔" وہ پھر ڈائری پر نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "آپ آنے جانے' بلکہ ایک ایک موومنٹ کی تفصیل میرے پاس موجود ہے۔۔۔ ویسے آپ رہتے تو انگلینڈ میں ہیں' کاروبار کرتے ہیں۔ یہ بار بار انڈیا آنے کی کوئی خاص وجہ؟"

مَیں اس کی خباثت سے پہلے ہی جُھنجھلایا ہوا' جلا بھنا بیٹھا تھا۔ "مہاراج! آپ میری نیند اور موڈ خراب نہ کریں۔ آپ کے پاس میرا سارا ریکارڈ موجود ہے۔ مَیں برٹش سٹیزن ہوں' دنیا کے کسی بھی ملک میں آ جا سکتا ہوں۔ آپ کے انڈین ہائی کمیشن آفس لندن میں بھی میرا پچھلا بیس سالہ ریکارڈ موجود ہے۔ جب انہوں نے کبھی مجھ سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تو آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا بلکہ سارا نقشہ ہی تبدیل ہو گیا' لہجے میں ذرا سختی پیدا کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھئے' مسٹر! وہ لندن ہے۔ آپ اس وقت بارڈر پہ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس بڑے اختیارات ہیں۔ یہاں ہر آٹھواں آدمی اسمگلر ہے' گھس بیٹھیا ہے یا پھر جاسوس۔۔۔ آپ کا پاسپورٹ ضبط کر کے ضائع کر دیا جائے' دو کوس پر لے جا کر شوٹ کر دیا جائے تو آپ کیا کر لیں گے؟" پھر اس نے لہجے کا گیئر بدلا۔ "میری ڈیوٹی ہے کہ مَیں روٹین کی چیکنگ کے مطابق آپ کو چیک کروں۔ آپ یہاں مہمان ہیں' جم جم آئیں۔ ہم آپ کی سیوا کریں اور کچھ آپ بھی ہمارے ساتھ تعاون کریں کہ ہم آپ کی رپورٹ اوکے کریں۔۔۔ پیاس لگی ہے' ایک بوتل شراب تو منگوائیں۔" وہ اپنی اوقات پہ آ گیا تھا۔

"آپ میرے کمرے میں ہیں۔ فریج کا ٹھنڈا پانی نکال کر پیش کر سکتا ہوں' شراب پینا پلانا میرے مذہب میں حرام ہے۔" مَیں نے جیب سے پاسپورٹ نکال کر اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ پاسپورٹ ہے' اسے پھاڑ دیں۔ مَیں بھی تیار ہوں' مجھے بارڈر پہ لے

جا کر شوٹ کرنے کا انتظام کریں اگر ممکن ہو سکے تو یہ کام صبح کریں۔ کیونکہ اس وقت میرے آرام کا ٹائم ہے۔"

مَیں اٹھا' پاسپورٹ پکڑ کر باہر آیا۔ وہ بھی پیچھے پیچھے تھا۔ اسسٹنٹ مینجر اپنے دفتر میں موجود تھا' مَیں اس پر چڑھ گیا۔

"یہ تمہارا ہوٹل ہے یا بھٹیار خانہ کہ جب بھی جس کا جی چاہے' مہمانوں کو دھمکاتا پھرے۔ آدھی رات کو یہ شخص میرا دماغ خراب کر رہا ہے' مجھ سے رشوت طلب کر رہا ہے' مجھے شوٹ کرنے کی دھمکی دے رہا ہے۔ مَیں ایک معزز برٹش شہری اور بزنس مین ہوں۔ یہاں آتا ہوں تو پونڈ اسٹرلنگ خرچ کرتا ہوں۔ جب برٹش ہائی کمیشن لندن مجھے کلیئر کرتا ہے تو یہ دو ٹکے کا کارندہ مجھے کیوں پریشان کرتا ہے؟"

مَیں ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھا۔ میری بڑی عادت ہے کہ غصے کی حالت میں پنجابی یا پھر انگریزی شروع ہو جاتی ہے۔ اس وقت میں انگریزی کی گرفت میں تھا اور انگریزی بھی یارکشائر لہجے کی جوان کے سر کے اوپر سے گزر رہی تھی' انسپکٹر کو مَیں بولنے کا موقع ہی نہیں دے رہا تھا۔ لاؤنج کے بار میں ایک لمبا تڑنگا جونخوار قسم کا سکھ اپنے جیسوں کے ساتھ مے نوشی میں مشغول تھا' میری تلخ و ترش گفتگو سن کر اس نے وہیں سے ہانک لگائی۔

"باؤ جی! اپنے تتے نہ ہووو' ایدر آؤ۔"

مینجر نے مجھے انگلش میں ہی کہا۔ "پلیز! آپ ان کے پاس جائیں' ذرا دھیرج سے بات کیجئے گا۔۔۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کو ہمارے ہوٹل میں پریشانی ہوئی۔"

مَیں نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے خوبصورت سکھ دیکھے ہیں۔ اس سکھ کی چھب ہی زالی تھی۔ گورا چٹا' نفیس سی ترشی ہوئی داڑھی' کیس ندارد' باریک سے سرخ ہونٹوں پہ تلی سی مونچھیں' کالے تُسر کا تہبند اور لمبا کُرتہ' چوڑی بالوں سے بھری ہوئی چھاتی' کھلے کھلے ہاتھ پاؤں۔ پاؤں میں طِلّے کا کھُسہ' چار پانچ ہتھیار بند مصاحبوں کے درمیان وہ کسی ریاست کا ولی عہد دکھائی دے رہا تھا۔ پینے والوں سے زیادہ ملکی' غیر ملکی شراب کی بوتلیں تھیں۔ کھانے کے لوازم بھی تھے۔ مچھلی' مونگ پھلی' تلے ہوئے جھینگے۔۔۔ مَیں پاس آیا تو وہ دوستوں کی طرح مسکرایا' سامنے ایک آرام دہ کرسی پہ بٹھایا۔ وہائٹ سکسٹی نائن وسکی کا ایک ڈبل پیگ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔

"لو چکھو' لاہور دیئے بادشاہو! غصہ تھوکو --- دھیرج نال دسو' کی گل اے؟"

غصہ تو اسے دیکھتے ہی غائب ہو چکا تھا۔ شراب سے معذرت کی تو اس نے جوس منگوایا۔ شروع سے آخر تک ساری بات اسے بتائی۔ کھا جانے والی نظروں سے انسپکٹر کو دیکھتے ہوئے اپنے پاس بلایا' اس سے مخاطب ہوا۔

"موتیاں والیو! بندہ کبندہ ویکھ لیا کرو' سارے اِکو جیہے تے نئیں ہوندے --- اے لو بوتل' تے جاکے عیش کرو۔"

وہ جان چھڑا کر بھاگا تو یہ میری جان پکڑ کر بیٹھ گیا۔ صبح پانچ بجے تک اس نے مجھے سیالکوٹ' لاہور اور انگلینڈ تک کھنگال ڈالا۔ اس کے دو بھائی میرے شہر بریڈ فورڈ میں کپڑے کا کاروبار کرتے تھے جو اتفاق سے میرے جاننے والے تھے۔ مَیں نے اسے ان کے بچوں کے نام تک بتا دیئے' بس وہ تو میرا دیوانہ ہو گیا۔ کچھ رات کا جادو' کچھ شراب کی ترنگ' کچھ میری اچھی بُری گفتگو --- اس نے مینجر کو بُلا کر زبردستی میرا سامان نکلوایا اور مجھے ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ مَیں نے لاکھ انکار کیا' اپنی مجبوریاں اور مصروفیات بیان کیں مگر وہ سکھ ہی کیا جو اڑیل نہ ہو۔ پیار اور رویہار کے معاملے میں تو یہ بڑے ضدی ہوتے ہیں۔ اس کی ایک ہی ہٹ۔ "ہو ہی نہیں سکدا کہ میرے ویراں دا یار میرے ہوندیاں ہوٹل وچ رہوے۔ اپنا گھر' اپنی گاڈی' اپنا ڈیرا' اپنا امرتسر --- موتیاں والیو! اسی تہاڈے سیوک' اُٹھو چلو' اپنے گھر چلو --- ایسی مٹھاس' ایسا خلوص' ایسی اپنائیت۔ سب کچھ اپنی جگہ پہ درست لیکن اس کے باوجود آدھی رات' غیر ملک' امرتسر کا شہر' سرحد کا حساس علاقہ' ان سکھوں کی الٹی کھوپڑی' نہ داد نہ فریاد' محض چند منٹ کی بات چیت۔ میرا کسی طور بھی اس کے ساتھ جانا مناسب نہیں تھا۔ پتہ نہیں بدمعاش' چور' اچکا' ڈاکو' کون ہے؟ یہ تو کھائی سے نکل کر کھڈے میں اُترنے والی بات تھی۔ شاید وہ انسپکٹر اور یہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہوں۔ لوٹنے والے اسی طرح ڈھنگ رنگ سے شکار پھانستے ہیں --- مَیں کھڑے کھڑے فیصلہ کر چکا تھا کہ کسی طور ہوٹل نہیں چھوڑوں گا۔ اس کا ایک ساتھی میرا مختصر سا سامان اٹھا کر ہوٹل سے باہر لے گیا' میں یہ دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اسسٹنٹ مینجر سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے منہ سے انگریزی کا فوارہ پھوٹا۔

"آپ یہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور خاموش ہیں۔ میں اس ہوٹل کا رجسٹرڈ مہمان

ہوں' ایڈوانس زرمبادلہ میں پے منٹ کے ساتھ میری چار روز کی بکنگ ہے۔ ایسی بھی کیا اندھیر نگری کہ ایک بدمعاش یہاں اپنا حکم چلائے اور زبردستی ایک مسافر کو اٹھا کر لے جائے بلکہ اغوا کرے اور آپ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میرا سامان واپس منگوا کر میرے کمرے میں رکھوائیں' مَیں کسی قیمت پہ اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا اور اگر آپ نے مجھے تحفظ نہ دیا تو کل مَیں برٹش ہائی کمیشن میں آپ اور آپ کے ہوٹل کے خلاف رپورٹ کروں گا۔"

وہ تو منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کھڑا تھا جیسے وہ میری بکواس سرے سے سُن ہی نہیں رہا تھا۔ سردار صاحب کسی مست ہاتھی کی مانند جھومتے ہوئے باتھ رُوم سے باہر آئے تو مَیں مینجر سے مغزماری کر رہا تھا' میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر وہ پوچھنے لگا۔

"کی گل اے موتیاں والیو! بڑی گٹ مِٹ کر رہے او ---؟"

"سردار جی! آپ کی محبت اور ہمدردی کا بہت بہت شکریہ --- مجھے افسوس ہے کہ مَیں اس وقت آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ کرپا کر کے میرا سامان واپس میرے کمرے میں رکھوا دیں۔"

"اوئے خان صاحب' اے کِداں ہو سکدا اے۔ تسی میرے مہمان او۔ ایس ہوٹل وچ نئیں رہ سکدے ---"

جان عجیب ضیق میں پھنس چکی تھی --- الٰہی! کس قسم کے میزبانوں سے واسطہ پڑا ہے جو مہمانوں کو دہشت گردی سے اپنا مہمان بناتے ہیں --- مَیں نے بڑی مایوسی سے مینجر کی جانب دیکھا جو بے بس چپ چاپ کھڑا تھا۔ مَیں نے آخری کوشش کرتے ہوئے پھر قدرے سختی سے کہا۔

"سردار صاحب --- مَیں بیماری کی وجہ سے آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا۔ آپ مجھے پریشان نہ کریں۔"

وہ باہر کے دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بڑے آرام سے کہنے لگا۔ "ایسے لئی تے لے کر جاریا واں موتیاں والیو! بیمار نوں اپنے گھر رہنا چاہیدا اے' ہوٹل وچ نہیں۔" اس نے اپنے دوسرے کارندوں کو حکم دیا۔

"خان صاحب نوں چک کر لے آؤ' اے بیمار ہیں۔"

ایک اُچکّے نے مجھے اُلٹ کر اچک لیا۔ مَیں اس کی مضبوط بانہوں میں کسی بلونگڑے کی طرح جھولتا ہوا نفرت بھری نظروں سے مینجر کی طرف دیکھ رہا تھا--- مَیں امرتسر آ کر بہت پچھتایا۔ رات کا دوسرا پہر' سنسان سڑکیں' نیم سوئے جاگے درخت' ٹھنڈی ہوا جو شاید پاکستان کی جانب سے محوِ خرام تھی۔ ایسے میں مجھے شدّت سے لاہور یاد آ رہا تھا۔ بیوی بچے' یار دوست! ایک ایک چیز آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ یقیناً یہ بَردہ فروش یا ڈاکو ہیں جو پاکستانیوں کو اپنے جال میں پھنسا کر لوٹ مار کر کے قتل کر دیتے ہوں گے' ہوٹل والے بھی ان سے ملے ہوں گے اسی لئے تو وہ ہوٹل کا مینجر سر جھکائے خاموش کھڑا تھا--- مَیں زیرِ لب آیات قرآنی کا وِرد کر رہا تھا۔ چار بدمعاشوں کے بیچ مُرغے کی طرح پھنسا ہوا تھا۔ جیپ بڑی تیز رفتاری سے کسی نامعلوم منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ سڑک کے کنارے چھوٹے چھوٹے دیہات' کارخانے' فیکٹریاں تھیں۔ ہم امرتسر سے مخالف سمت اٹاری کی جانب سفر کر رہے تھے۔ اٹاری سات کوس کے فاصلے پہ تھا' سنگ میل کے ساتھ ہی بائیں جانب جیپ ایک پتلی سی سڑک پہ اتر گئی۔ پھر ایک نہ ختم ہونے والا سفر شروع ہوا۔ کبھی کچا' کبھی پکا' ہچکولے۔ کئی چھوٹی چھوٹی نہریں اور پُل آئے۔ جنگلی جانوروں کی دور نزدیک چمکتی ہوئی آنکھیں--- میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں' لمحہ لمحہ مجھے موت قریب آتی دکھائی دے رہی تھی۔ خدا جانے یہ ظالم کس کھڈے میں لے جا کر پھینکیں گے۔ ذرا آگے جا کر چھدرا سا جنگل جسے آپ درختوں کا ذخیرہ بھی کہہ سکتے ہیں' شروع ہو گیا۔ جنگلی سوروں کا گروہ ہماری جیپ کے آگے آگے سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ آگے فاصلے پہ موڑ مڑتے ہی جیپ ایک حویلی کے صحن میں جا کر رُک گئی۔ کئی ایک سیاہ پوش اسلحہ بردار' اندھیرے سے بھوتوں کی مانند نکل کر ہمارے ارد گرد ہو گئے۔ ہلکی سی پیلی پیلی روشنی میں یہ دُور افتادہ حویلی پُراَسرار' بھوتوں کی مسکن کی طرح دکھائی دے رہی تھی جس کے پچھواڑے نمود سحر کا ہلکا ہلکا سپیدا' دودھیائی غبار کی طرح پھیل رہا تھا۔ پاکستان ہوتا تو اس لمحے موذّن اذان کی تیاریوں میں ہوتے' اللہ کے نیک بندے بستر چھوڑ کر کلمہ شریف کا وِرد کر رہے ہوتے۔ دیہاتوں میں گھڑ عورتیں ڈھور ڈنگروں کو چارہ ڈال کر لسی بلوانے کا اہتمام کر رہی ہوتیں۔ میرے لاہور میں نہاری اور سری پائے والے دیگیں کھڑکا رہے ہوتے' نانبائیوں کے دہکتے تنوروں پہ پچ مارنے کے لئے پانی کے چھینٹے پڑ رہے

ہوتے۔ خمیرے آٹے کی ناندیں اُبل رہی ہوتیں۔ بچے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے ہوتے اور میری بیگم تہجد پڑھ کر میرے لئے دُعائیں مانگ رہی ہوتی--- سردار صاحب نیچے اترتے ہی اپنے کارندوں سے مخاطب ہوئے۔

"ساڈے پروہنے پاکستانوں آئے نے' ذرا دِید لحاظ رکھیو--- بابے فضلے نوں جگاؤ' ککڑ پکا کے منوں پہلے لے کے آوے۔ ساڈھے خان صاحب نوں بھک لگی ہوئی اے--- آؤ جی موتیاں والیو! اس گھر نوں اپنا گھر ہی سمجھو۔ اے تہاڈے اپنے ویر دا گھر اے۔"

وہ آگے آگے' ایک سکھ میرا سامان اٹھائے پیچھے اور میں درمیان میں۔ ورانڈے کے آگے ایک پتلی سی راہداری سے گزر کر ہم ایک کمرے میں آ گئے۔ فرش پہ قیمتی قالین' آرام دہ صوفے' کرسیاں' ڈائنگ ٹیبل' ٹیلی فون' ٹیلی ویژن' وی سی آر' ساتھ ہی ماڈرن قسم کا بیڈ روم' اَٹیچ باتھ روم--- وہ مجھے میرے قیام و آرام کی جگہ دِکھا رہا تھا اور مَیں اس ویرانے میں اس حویلی کی سج دھج دیکھ کر حیران ہو رہا تھا' یوں جیسے مَیں کسی ماڈرن قسم کے گیسٹ ہاؤس میں آنکلا ہوں۔ وہ مجھے ایک قیمتی صوفے پہ بٹھاتے ہوئے انگریزی میں مخاطب ہوا۔

"میرا نام اقبال سنگھ ہے۔ لیکن یہاں اپنے علاقے اور باہر میں لاہوریئے کے نام سے مشہور ہوں۔ اس کی وجہ بھی بتاتا چلوں--- پارٹیشن سے پہلے ہم لاہور' قلعہ گجر سنگھ میں رہتے تھے۔ وہیں میرے سورگباشی باپو سردار دھیان سنگھ کی بہت بڑی جائیداد تھی۔ انہیں لاہور سے عشق تھا۔ امرتسر میرے ننھیال تھے۔ ہندوستان' پاکستان بنا تو میرے باپو اپنا سب کچھ چھوڑ کر' صرف ٹوٹا ہوا دل لے کر یہاں آ گئے۔ میرے سورگباشی نانا کی میری ماں کے علاوہ کوئی اور اولاد نہ تھی' وہ یہاں بہت بڑے زمیندار تھے۔ ان کے دیہانت کے بعد ان کی ساری زمین جائیداد میری ماں کو مل گئی۔ باپو نے یہاں آ کر پھر اپنا کاروبار جما لیا مگر وہ لاہور کو نہ بھول سکے۔ ہر وقت لاہور' لاہور کی مالا جپتے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے لوگ انہیں لاہوریا کہتے تھے اور وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ زیادہ بے تاب ہوتے تو لاہور کی جانب رُخ کر کے پہروں آنسو بہاتے رہتے۔ ٹھنڈی ہوا چلتی تو کہتے کہ میرے لاہور کی ہَوا ہے۔ کوئی لاہوریا مل جاتا تو زبردستی اسے اپنا مہمان بناتے' اس کے پاس بیٹھ کر لاہور کی سنتے سناتے رہتے۔ میں نے جنم لیا تو پیار سے میرا نام لاہوری سنگھ رکھ دیا۔ مجھ سے

چھوٹے دو بھائی جو آپ کے بھی مترّ ہیں، آپ کے بریڈفورڈ میں رہتے ہیں۔ پچھلے سال مَیں نے چنڈی گڑھ سے گریجوایشن کی ہے---"

مَیں مبہوت سا اس کی باتیں سُن رہا تھا، یقین نہ کرنے والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کا نفیس سا انگریزی کا لب ولہجہ، شائستگی اور پُروقار شخصیت۔ یہ کرّوفر اور رَکھ رکھاؤ۔ وہ ہوٹل میں شراب پیتے ہوئے اکھڑ سے سکھ سے بالکل مختلف تھا، مَیں اس کی اصل نقل میں پھنسا ہوا تھا تبھی ایک بڑا مہذب سا ملازم، بڑی نفیس اور قیمتی کراکری میں کافی لے کر اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک ادھیڑ عمر کی صحت مند آدمی بھی تھا جس نے بڑی چاہت سے اندر داخل ہوتے ہی مجھے "السلام علیکم" کہا۔ یہ اس کا مسلمان ملازم بابا فضل تھا۔ یہ قلعہ گجر سنگھ کا رہنے والا بلکہ اب بھی وہیں رہتا تھا۔ کسی فوجی میس میں ہیڈ کک تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد وہ لاہوریئے کی محبت میں یہاں امرتسر آ گیا تھا۔ جب جی چاہتا، لاہور گھر بھی پھیرا ڈال آتا اور پھر یہاں آ جاتا--- لاہوریئے کا کھانا بھی یہی بناتا تھا۔ دونوں ملکوں کے درمیان اسے آنے جانے کے لئے کسی پاسپورٹ یا ویزے کی ضرورت نہیں تھی۔ لاہوریئے کے اپنے راستے اور اپنے طریقے تھے۔ لاہوریا خود بھی تو زیادہ تر لاہور میں ہی رہتا۔ قلعہ گوجر سنگھ میں ان کی آبائی حویلی کا ایک حصہ اس نے منہ مانگے داموں خرید لیا تھا۔ یہاں اس کا وسیع کاروبار بھی تھا اور دوستوں کا وسیع حلقہ بھی۔ اقبال لاہوریئے کی بڑی دُور دُور تک جان پہچان تھی۔ اوپر سے سکھ، اندر سے مسلمانوں سے زیادہ مسلمان۔ شراب بھی پیتا، نماز بھی پڑھتا، جھٹکے کے قریب نہیں جاتا تھا۔ ٹوپی پہنے جب وہ مسجد میں نماز پڑھ رہا ہوتا تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ امرتسر کا سکھ ہے۔ خالصتان کا زبردست حامی، ہندوؤں کا بیری، مسلمانوں کا یار۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ضرور تا" اسمگلر تھا۔ چاندی، سونا، زعفران، سلک اور اسپیئر پارٹس، انسان و حیوان تک وہ سرحد سے آرپار کرتا رہتا۔ امرتسر میں وہ بڑے ٹھکے کا بدمعاش تھا۔ پولیس اور دیگر سرکاری محکمے چوہے کی مانند اس سے دبکتے تھے۔ وہ سرحد پہ ایک وسیع اراضی کا مالک و مختار بھی تھا۔ گاؤں کے گاؤں اس کی عملداری میں تھے۔ یہ حویلی سرحد سے محض چند کوس کے فاصلے پہ تھی--- مَیں نے بڑے محتاط لہجہ میں زبان کھولی۔

"اقبال صاحب، آپ صاحبِ اقبال و ثروت بھی ہیں، پڑھے لکھے اور ہوش مند انسان

بھی ہیں مگر اس کے باوجود آپ---؟"

"میں سمجھ گیا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یہ سب کچھ میری معاشی ضرورت نہیں ہے صرف سیاسی اور سماجی مجبوری ہے۔ مَیں تفصیل سے عرض نہیں کر سکتا، صرف اتنا کہہ کر بات کو ختم کروں گا کہ اگر میں ایسا نہ کروں یا ایسا نہ بنوں تو یہاں کے ہندو مجھے کتے کی موت مار دیں۔ مجھے طاقت ور بن کر اپنے علاقے کے غریب، سادہ لوح بے بس لوگوں کی مدد کرنا ہے، ان کو پروٹیکشن دینا ہے۔ میری آدھی سے ذرا کم زمین سرحد پہ ہے۔ مَیں دونوں ملکوں کے درمیان گویا کرپان کی دھار پہ رہتا ہوں۔ جتھہ دار اسمگلر بننا میری زندگی کی بقا کے لئے بڑا ضروری ہے۔ پاکستان میری دائیں تو ہندوستان میری بائیں آنکھ ہے۔ لاہور میرا ددھیال اور امرتسر میرا ننھیال ہے۔ مَیں ماں اور باپ دونوں کا سعادت مند اور خیر خواہ ہوں۔ مَیں دونوں کی خوشحالی اور سلامتی چاہتا ہوں۔ مَیں دُکھی انسان کی خدمت سیوا کرتا ہوں، ظلم اور بے انصافی کا بازو پکڑتا ہوں تو مظلوم کمزور کا بازو بنتا ہوں۔"

اچانک "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی صدا بلند ہوئی۔

"اللہ! امرتسر اور اذان---" میرے منہ سے اچانک نکلا۔

"بابا فضلا ہے--- صبح ہو گئی۔ آپ باتھ روم میں وضو کر لیں، مَیں بھی ابھی آتا ہوں۔" اقبال اٹھ کر چل دیا۔

واپس آیا تو سفید چادر اور چار پانچ مصلے ساتھ تھے۔ اقبال سنگھ، دو اور سکھ۔ بابے فضلے نے امامت کی۔ سفید ٹوپی پہنے ہوئے، کتنا نور تھا اس کے چہرے پہ۔ نماز سے فارغ ہوئے، بابے فضلے نے دیسی مرغ بھونا تھا۔ دیسی گھی سے تر تراتے پراٹھے، چاٹی کی لسی، لسوڑوں کا اچار، تازہ تازہ مکھن، سرسوں کی گندلوں کا گھوٹواں باسی ساگ۔ ناشتہ تھا یا ظہرانہ۔ پہلا لقمہ مُنہ میں رکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ بابا فضلا کس کمال کا باورچی ہے اور لاہوریا اس کا کیوں قدردان ہے۔ بڑے بڑے دسترخوانوں پہ اچھے اچھے، لذیذ اور نفیس ترین پر لطف کھانے کھائے لیکن جو بات اس "مولوی مدن" کے ہاں تھی اس کی نظیر کہیں کم ہی نظر آئی۔

سارا دن بے سُدھ سا گھوڑے بیچ کر پڑا رہا، شام کے وقت انگڑائیاں توڑتا ہوا اٹھا۔ تو کمرا تازے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ سلک کا نیا لمبا کرتہ، گھیرے دار ریشمی پنجابی

لاچا اور میرے سائز کا خوبصورت کُھسّہ پاس پڑا تھا۔ دیکھ ہی رہا تھا کہ لاہوریا اندر آ گیا۔

"آج تو آپ خوب سوئے۔ اچھا کیا۔۔۔ جلدی سے اٹھئے' نہائیے' یہ کپڑے پہنیں۔ چائے پی کر ذرا آپ کو اپنی زمینیں اور سرحد' کی سیر کروائیں۔ پھر واپس آ کر کھانے سے فارغ ہو کر شہر چلیں گے۔"

کپڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے مَیں نے عرض کی۔ "ایسے کپڑے مَیں نے کبھی نہیں پہنے۔ میرے سامان میں جو کپڑے موجود ہیں' کسی سے کہہ کر استری کروا دیں۔"

ایک ہاتھ سے مجھے اور دوسرے ہاتھ میں کپڑے تھامے وہ باتھ روم کی طرف دھکیلتا ہوا لے گیا۔

"صاحب! یہاں میرا حکم چلتا ہے۔۔۔ یہ کپڑے مَیں نے آپ کے لئے سپیشل منگوائے ہیں' انھیں انہیں پہنیں گے تو خود ہی اچھے لگیں گے' شاباش!"

وہ مجھے بچوں کی مانند پچکارتا ہوا باہر نکل گیا۔۔۔ روؤں کہ ہنسوں؟ چند لمحے کپڑوں کو گھورتا ہوا کھڑا سوچتا رہا۔ بالآخر سر کو جھٹک کر غسل خانے گھس گیا۔ کیا کچھ نہیں تھا وہاں۔۔۔ ہر چیز امپورٹڈ شیمپو' کریمیں' آفٹر شیو لوشن' خوشبوئیں' باتھ ببل لوشن' ہیئر ڈرائیر' مختلف سائز کے تاول۔ پورا فائیو سٹار ہوٹل کا سامان تھا۔ خوب نہانے دھونے کی عیاشی کی۔ کپڑے پہنے تو جیسے جون ہی بدل گئی۔ کُھسّہ بھی پورا فٹ بیٹھا' ماجھے کا جٹ بنا باہر نکلا تو لاہوریا بہت خوش ہوا۔

"اب بنی نا' بلت۔۔۔ مُوتیاں والیو! جو مزہ اور عزت اپنے پہناوے میں ہے وہ کسی اور لباس میں کہاں۔۔۔ کھلے ڈھلے پھرو' چاریاراں وچ بیٹھے اِکو جئے لگو۔"

باہر کھلے صحن میں منڈلی جمی تھی۔۔۔ سکھ ہوں اور شراب نہ ہو۔ چارپائیاں' کرسیاں' میز۔ چائے کا سامان' شراب کی بوتلیں' بھنے تیتر' بٹیرے' کیک' بسکٹ۔۔۔ لاہوریئے نے اپنے چند یار بیلی بلائے ہوئے تھے۔ وہ بھی سب لاہوریئے جیسے' چھ فٹ سے کوئی بھی کم نہیں تھا۔ لمبے لمبے کرتے' ریشمی تہبند' گھبرل مونچھیں' سر پہ کیس' پگڑیاں' کرپانیں۔ پندرہ بیس اسلحہ بردار ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ تین چار جیپیں اور دو تین کاریں بھی کھڑی تھیں۔ یہ چائے تھی تو پھر کھانے کا عالم کیا ہو گا؟۔۔۔ چائنابون کی نازک سی پیالی میں چائے کی مہک نے بڑا لطف دیا۔ ایک آدھ تیتر بٹیر بھی اڑائے۔۔۔ سبحان اللہ!

بڑا مزہ آیا۔ چائے کے بعد ہم سب گاڑیوں میں سوار ہو کر سرحد کی جانب نکل گئے۔ گنے چُنے گھروں پر مشتمل چھوٹے چھوٹے گاؤں' مفلوک الحال' پسماندگی میں دبے ہوئے محنت کش' کاشت کار۔ جہاں جہاں گئے' مرد و زن' بچے سب ہی ہمارے سواگت کے لئے پہنچے۔ عین باؤنڈری پہ کھڑے تھے کچھ قدم اس طرف میرا پاکستان تھا۔ جی چاہا کہ کہوں' بس یار! مجھے یہیں سے اِدھر دھکیل دو۔۔۔ سرحد بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ آپس میں جُڑی ہوئی زمین' مٹی جو اندر سے ایک جان ہے تو باہر انچوں' فُٹوں میں اپنی شناخت حیثیت بدل لیتی ہے۔۔۔ نہیں' وہ نہیں بدلتی بلکہ ہم اسے بدل دیتے ہیں۔ کتنی خوش نصیب ہیں وہ ہوائیں' خوشبوئیں' روائتیں' قدریں' رَسمیں' پرندے اور نغمے۔ وہ ندی نالے' دریا' سمندر اور گھنگور گھٹائیں جو بلا امتیاز تفریق سب کو نہال و سرشار کرتی ہیں۔۔۔ مَیں انسان کی سیاست اور قدرت کی عنایات و فراست پر غور کرتا ہوا بڑے بوجھل دماغ اور قدموں کے ساتھ وہاں گھومتا رہا۔ واپسی پہ ڈیرے آنے کے بجائے شہر کی جانب نکل گئے۔ امرتسر بائی نائٹ بڑا ہی بور ہے' بے کار ادھر اُدھر سڑکوں پہ پڑول ڈیزل پھونکتے رہے۔ شراب خانے' ہوٹل' ہُلڑ مچاتے ہوئے مدہوش سکھ۔ لاہور کی دیکھا دیکھی وہاں بھی تکے' کباب' کڑاہی گوشت' فالودہ' مٹھائیاں' سینک بار' آئس کریم پارلر وغیرہ کھُل گئے ہیں۔ سکھ کھانا کھانے کے بجائے پیٹ بھر کر پینے کا شوقین ہے۔ کھانا چٹخارہ بس نام کا ہوتا ہے۔ ویسے بھی سکھ مزاجاً اس سے زیادہ ساگ بھاجی پسند کرتا ہے' یہی اس کی صحت مندی اور خوش مزاجی کا راز بھی ہے۔۔۔ گھومتے گھومتے ایک بازار میں آ کر رُکے۔ لاہوریئے نے کان کے قریب ہو کر ہلکی سی سرگوشی کی۔ "خان صاحب! گانا سننے کا موڈ ہو تو۔۔۔"

مَیں نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "سردار جی! اس وقت سخت تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں' سر میں بھی ہلکا ہلکا درد ہے۔" مَیں نے ٹالنا چاہا۔

"مُوتیاں والیو۔۔۔!" اس نے آنکھ دبا کر کہا۔ "یہاں اس کا بھی علاج ہے' ذرا اوپر چوبارے پہ تو چڑھیں۔"

مَیں نے ترپ کا پتا پھینکا۔ "کسی مسجد کا راستہ دکھائیں' میری تھکاوٹ اور سر درد کا یہی علاج ہے۔"

یہاں وہ زچ ہو گیا' دوستوں کو اُوپر چڑھا کر وہ میرے ساتھ واپس آ گیا۔ بابا فضلا'

کھانے پہ منتظر تھا۔ اس اللہ کے بندے نے جیسے پوری بارات کے کھانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ سب لاہوری اسٹائل کے کھانے' ایک سے ایک بڑھ کر لذیذ اور مزیدار--- کھا پی کر صبح کا پروگرام بنایا' کچھ دیر باتیں ہوئیں پھر رات بھر خوب سویا۔

صبح سب سے پہلے دربار صاحب حاضری دی۔ جلیانوالہ باغ' ڈپٹی باغ "کٹڑہ مہان سنگھ' بانسانوالہ بازار' محلّہ قاضیاں' لوہاری دروازہ' لاہوری گیٹ "گول باغ' ہاتھی دروازہ' شنکر شاہ" کا مزار' چوک پراگ داس' ہال بازار' فتح شاہ بخاری" کا مزار اپنا سسرالی محلّہ' مکان' بے نام و نشان مسجدیں۔ نئی آبادی' مارکیٹیں--- شہر اور نواح میں دو چار بزرگوں کے مزار ابھی تک باقی تھے۔ وہاں گئے' فاتحہ پڑھی۔ وہیں کچھ مسلمانوں سے ملاقات ہوئی۔ واپسی پہ لاہوریئے نے زبردستی کچھ کپڑے' سلک کے دو تھان' چوڑیاں اور گجرے وغیرہ میرے لئے خریدے۔ تیسرا دن آلگا تو میں نے لاہور جانے کی اجازت چاہی' اپنی بیماری اور مجبوری بھی بتائی۔ بڑی مشکل سے وہ مانا۔ اس نے جو سامان میرے لئے خریدا تھا' میں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا البتہ جو ایک دو چیزیں اس نے میرے ہاتھ انگلینڈ اپنے بھائیوں کو بھجوانے کے لئے خریدی تھیں' وہ میں نے لے لیں۔ اٹاری تک وہ مجھے چھوڑنے آیا۔

"خان جی! میں آپ کی کوئی سیوا نہ کر سکا۔" وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ انکھیں بھیگی ہوئیں' لرزتے ہونٹ الٰہی! یہ کس قسم کا بدمعاش اور جتھے دار ہے۔ ایک معمولی سا آدمی جس سے اس کی کوئی غرض یا مقصد مطلب وابستہ نہیں' اس کے سامنے مجرموں کی طرح کھڑا لرز رہا ہے۔ "میں نے ہوٹل میں آپ سے زیادتی کی۔" اس نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔ "مجھے علم تھا کہ آپ میرے ساتھ نہیں آئیں گے مگر میں آپ کو وہاں چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ یہ سی آئی ڈی والے آپ کو تنگ کرتے' پھر ہوٹل کا خرچہ--- یہ بھی جانتا تھا کہ یہاں آپ کو کھانے پینے کی تکلیف ہو گی۔ یہ باتیں سوچ کر میں نے آپ کو زبردستی وہاں سے اٹھوایا۔ میں پھر ایک بار آپ سے معافی چاہتا ہوں--- انگلینڈ جا کر میرے بھائیوں کو یہ بات نہ بتایئے گا---"

میں درویش ہونے کے باوجود ایک عملی قسم کا انسان ہوں۔ ساری زندگی حقیقت مندانہ انداز فکر میں گزری۔ لیکن اپنی اس کیفیت کو احاطہ تحریر میں لانا میرے لئے مشکل ہو رہا ہے۔ بھیگی آنکھوں والا وہ لمبا تڑنگا شہہ زور سکھ ہاتھ باندھے میرے سامنے کھڑا تھا۔

آخر وہ کس گناہ کی معافی مانگ رہا تھا' چکی کے دو پاٹوں بیچ کیوں پس رہا تھا؟ آنسوؤں کے چند قطرے جو اس کی پلکوں پر لرز رہے تھے' میرے عمر بھر کے فلسفے کو تنکوں کی طرح بہا لے گئے۔ میں خدا کو حاظر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اگر میں ایک پل مزید برداشت کرتا تو ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاتا شاید میری حرکت قلب ہی بند ہو جاتی۔ میں لپک کر اس کے سینے سے یوں چپک گیا جیسے لوہ چون' طاقتور مقناطیس سے چمٹ جاتا ہے۔

"اوئے جگر! سجناں کولوں معافی تلافی نہیں منگی دی--- پاغلا! گرم اتھرو پلکاں اوہلے سنبھلے رہن تے حیاتی دی چابی بن جاندے نیں۔"

جانے میں کیا خرافات بک رہا تھا لیکن وہ لمحات کھری سچائی کے حامل تھے اور میرے لہجے کی لرزش اقبال سنگھ کے دل پر دستک دیئے بغیر نہ رہ سکی--- لاہور تک میں خاموش رہا۔ سمٹا ہوا' اکیلا اکیلا بیٹھا تھا جیسے میں اپنی کوئی قیمتی چیز امرتسر چھوڑ آیا ہوں۔ واہگہ پہ کسٹم والوں نے جو میرے ساتھ "اپنوں والا" سلوک کیا' وہ الگ داستان ہے۔ مختصر یہ ہے کہ انہوں نے میری آدھی نوکری پان' ایک کشمیری شال' شمع اور روبی میگزین کی ساری کاپیاں ضبط کر لیں۔ صرف اس پاداش میں کہ میں ان سے "مک مکانہ" نہ کر سکا۔ اس وقت مجھے اس امرتسر کے لاہوریئے بدمعاش اسمگلر کی کہی ہوئی بات خوب یاد آئی۔

"بدمعاش' سمگلر' جتھے دار بننا میری معاشی ضرورت نہیں بلکہ سیاسی اور وقت کی مجبوری ہے۔"

واقعی وہ شریف اور بااصول بن کر امرتسر میں پالتو سوروں کی گلے بانی تو کر سکتا تھا یا سرحد پہ زمین کے کسی ٹکڑے پہ جوار یا کماد اگا کر اپنا پیٹ تو بھر سکتا تھا مگر کسی مظلوم کی مدد یا کسی مسافر کی میزبانی نہیں کر سکتا تھا۔ قومی' سماجی یا انسانی سطح پہ کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتا تھا۔

ٹھیک تیسرے دن ایک نئی گاڑی میرے گھر کے سامنے آ کر رکی۔ ایک آدمی میرے لئے ایک رقعہ لایا جس میں لکھا تھا۔

"اس آدمی کے ساتھ فوراً" اسی وقت گاڑی میں بیٹھ جاؤ--- ورنہ میں خان صاحب کو یہاں سے بھی اٹھوا سکتا ہوں۔

یقین کریں کہ میں اپنے پیچھے دروازہ بھی بند نہیں کیا' گاڑی میں بیٹھ گیا۔ فلیٹیز ہوٹل

کے ایک کمرے میں وہ چند احباب کے ساتھ بیٹھا ڈرنک کر رہا تھا' اٹھ کر جپھا ڈال کر ملا۔

"مُوتیاں والیو! ہوٹل وچ آئے ہو' کپڑے تے ڈھنگ دے پالینے سن---"

مَیں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مُوتیاں والیو! جو مزہ اور عزت اپنے پہناوے میں ہے۔ وہ کسی اور کے لباس میں کہاں؟--- کھُلے ڈُھلے پھرنے آں تے چاریاراں وچ اِکّو جئے لگنے آں---"

وہ اپنے کہے ہوئے الفاظ یاد کر کے کھلکھلا کر قہقہے لگانے لگا' مَیں اتفاق سے اسی کا دیا ہوا کرتا اور لاچا کُھسّہ پہنے ہوئے تھا۔ جواب سُن کر وہ بہت خوش ہوا۔ خوب باتیں ہوئیں' کھانا کھایا' ایک بڑا پیکٹ میرے حوالے کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"مُوتیاں والیو! مَیں جانتا تھا کہ کسٹم والے آپ کو پریشان کریں گے اسی لئے مَیں نے آپ کو یہ سامان ساتھ لے جانے پہ مجبور نہیں کیا تھا اور اب مَیں خود ہی پہنچانے آ گیا ہوں۔"

وقت آگے بڑھ گیا۔ ایک لمبا عرصہ لاہوریئے سے قلب و نظر کے تعلقات رہے۔ انگلینڈ میں اس کے بھائیوں سے بھی اس کے حوالے سے بڑی اچھی دعا سلام رہی--- کچھ عرصہ بعد دربار صاحب والے گرینڈ مسلح آپریشن میں وہ بھی اپنے جتھہ داروں کے ساتھ لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس کے بھائی نرمل سنگھ نے مجھے بتایا کہ لگ بھگ بتیس گولیاں اس کے جسم سے آر پار ہوئی تھیں۔ اب بھی جب میں امرتسر جاتا ہوں' اپنے "بدمعاش لاہوریئے" کے ڈیرے ضرور حاضری دیتا ہوں جو مجھے کبھی نہیں بھولے گا۔ رہے سدا نام اللہ کا! کیسے وضع دار' سیر نظر' کشادہ ظرف شیر دل جیسے بدمعاش تھے۔ وہ جس قماش سے بھی کماتے تھے' غریبوں مظلوموں اور حاجت مندوں کی داد رسی کرتے تھے۔ کمزور سے نہیں' اپنے سے تگڑے سے بھڑتے تھے۔ مسافروں' بیماروں بوڑھوں کا بوجھ اٹھا کر گھر تک چھوڑ کر آتے تھے۔ ان کی سیس دُعا لیتے تھے--- اور کہاں یہ جعلی بدمعاش! ذات کا' نہ اوقات کا۔ منہ نہ متھا' جن پہاڑوں لتھا۔ ایک ناتواں بڈھے کو اس بدیدی سے گھورے' وہ بھی میری ناک کے نیچے چچک رو' راہ زادہ' ہیچ' رذیل---!

★★

ایک چھوٹا سا بدمعاش اور یاد آ گیا۔ چھوٹا اس لئے کہا ہے کہ وہ واقعی چھوٹا' دبلا پتلا سا

تھا۔ چھریرا سا بدن' پتلی پتلی سینک سلائی انگلیاں' بے گوشت جسم' بازو' اسے دیکھ کر عمر کا اندازہ لگانا بڑا مشکل تھا۔ شائد بائیس' چوبیس برس کا سِن ہو گا۔ چوہے منہ' دھانے پانے' کوتاہ قامت مرد ہوں یا عورتیں' اپنی عمر کے معاملے میں ہمیشہ دوسروں کے اندازے غلط ثابت کرتے ہیں۔ سکول کی بچی دکھائی دینے والی چھ بچوں کی ماں بھی ہو سکتی ہے۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ لڑکی والے بڑے بھائی کی بجائے چھوٹے بھائی میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا کہ وہ چھوٹا دراصل بڑا بھائی ہے' خیر سے شادی شدہ' پانچ بچوں کا باپ ہے۔ میرے بھی ایک دوست طالب حسین جعفری ہیں۔ ماشاء اللہ دو کنالوں میں پھیلے ہوئے اور بیگم بے چاری چھٹنکی بھر کی۔ اپنے ہی سات بچوں میں بیٹھی' طالب صاحب کی منجھلی بیٹی دکھائی دیتی ہے۔ ایک دفعہ امروہہ سے ایک شیعہ بزرگ ان کے ہاں مہمان تھے۔ ان کی زیارت کی غرض میں بھی وہاں موجود تھا۔ بات چیت کے دوران چائے کی طلب محسوس ہوئی تو جعفری صاحب نے پاس بیٹھے ہوئے اپنے چھوٹے بیٹے کو چائے کا کہہ کر اندر بھجوایا۔ جعفری صاحب خود بڑے "گوڑی" ہیں' خاص طور پر موضوع اہل بیت یا خلافت ہو تو پھر ان کا جوش' ولولہ اور زورِ خطابت دیکھنے والا ہوتا ہے۔ منہ سے کف' آنکھیں شعلہ بار' مٹھیاں' مُکّے۔ ایسے مواقع پر مَیں ان سے چار ہاتھ ہٹ کر بیٹھتا ہوں۔ ان سے خوف سا لگنے لگتا ہے۔ وہ لرزنے لگتے ہیں' ایسے میں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ مقابل کو گھیر کر رکھیں۔ اکثر وہ دوسرے کی کلائی یا ہاتھ پکڑ لیتے ہیں۔ پھر ان کے دلائل اور خطاب کا زور آپ اپنے بازو کی ہڈی یا ہاتھ کے پنجے پہ محسوس کرتے ہیں۔ ماضی میں کئی بار میں ان کے دستِ استبداد کی زد میں آ چکا تھا۔ اب میری خوش قسمتی یا ان بزرگوں کی بدقسمتی کہ مَیں سامنے تھا اور وہ پاس بیٹھے تھے۔ جعفری صاحب نے اپنی علت کے مطابق انہیں بھی پکڑ لیا۔ ابھی وہ بزرگ اپنی کلائی پہ گرفت کی سنگینی کا صحیح سے اندازہ نہیں کرنے پائے تھے کہ خوش قسمتی سے جعفری صاحب کی بچی نما اہلیہ چائے کے لوازمات بمشکل تھامے اندر وارد ہوئیں۔ بڑے ادب سے سلام کیا۔ تپائی پہ سامان رکھ کر پلٹنے لگیں تو بزرگ نے بڑے دلار سے پاس بلایا۔ سر پہ دستِ شفقت رکھا' گود میں بٹھانے کی کوشش فرمائی تو وہ خجل سی سمٹی سمٹائی پاس پہلو میں ہی صوفہ پہ ٹِک گئیں۔

"ماشاء اللہ' جعفری صاحب! آپ کی بچی بڑی پیاری ہے--- آنسہ! کیا نام ہے

تمہارا؟"

جعفری صاحب کے ساتھ اس قسم کے مُغالطے اکثر ہوا کرتے تھے جن کے وہ اب ایسے عادی ہو چکے تھے کہ اب انہیں دَرخورِ اعتناہی نہیں سمجھتے تھے--- بات بمبئی کے اس چھوٹے سے بدمعاش سے شروع ہوئی تھی۔ اِک نظر دیکھنے سے وہ کسی نِیم سرکاری ادارے کا مفلوک الحال چپڑاسی لگتا تھا جس نے بمشکل میٹرک پاس کرکے دے دلا کر بڑے جتنوں سے ملازمت حاصل کی ہو۔ بدمعاشوں کے لئے جو جسم' رُعب و دابَ' طوَر طریقے اور جس گٹ اَپ کی ضرورت ہوتی ہے' یہ سب کچھ یہاں سِرے سے ہی مفقود تھے۔ چپل سمیت کرتے پاجامے کی قیمت پچاس روپے ہو گی اور وہ بھی میلے' بے استری۔ ہندو تھا یا مسلمان' سکھ یا عیسائی' وہ گوٹی دادا کے نام سے مشہور تھا' طرّہ یہ کہ وہ بول نہیں سکتا تھا۔ دادر' پارسی گھاٹ' باندرہ' میرین ڈرائیور' پالی ہل' جوہو بیچ اور چوپاٹی کے قریب قریب سارے علاقے اس کی عملداری میں تھے۔ ان علاقوں کے چھوٹے بدمعاش اور دادا لوگ اسی سے احکامات لیتے تھے۔ یہ خود سارا دن اور رات کا ایک بڑا حصہ جُوہو بِیچ پہ ایک کیرم بورڈ کلب میں پڑا رہتا یا سمندر کنارے گیلی ریت پہ کیرم بورڈ پہ جُھکا گوٹیاں ہِٹ کرتا رہتا جیسے کوئی جرنیل پیچھے وارہیڈ کوارٹر میں وار ٹیبل پہ اپنی افواج کی نقل و حمل کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ وہ سڑائیکر (Striker) کی ہِٹ' گوٹیوں کی پوزیشن' حرکت' زاویوں سے اپنے احکام جاری کرتا رہتا۔ یہ ایک طرح سے اس کا کمپیوٹر تھا۔ بورڈ پہ ہر حرکت' اس کی زبان تھی جس کو صرف دو آدمی سمجھتے تھے جو دائیں بائیں مستعد کھڑے سوا چھ چھ فٹے غنڈے اور اس کے خاص آدمی تھے' مہاراشٹر کے نامی بدمعاش اور کیرم بورڈ کے چیمپئن تھے۔ وہ دونوں ٹکٹکی باندھے بورڈ پہ گوٹیوں کی پوزیشن اور زاویئے دیکھتے رہتے اور آگے احکام جاری کرتے رہتے۔ عجیب سی سائنس تھی جو ان تینوں سے ہی شروع اور انہی پہ ختم تھی۔ گوٹی دادا نظر اٹھا کر اوپر بہت کم دیکھتا تھا۔ وہ کسی خبطی ماہر نجوم کی طرح دنیا و مافیہا سے بے نیاز و بے خطر' انہماک سے نظریں' جمائے گوٹیوں سے بَرسرِپیکار رہتا۔ کوئی نووارد دیکھنے والا اسے محض سڑی' دین و دنیا سے بیزار سَرپھِرا نوجوان ہی تصوّر کر سکتا تھا۔

میری اس سے ملاقات بڑے ڈرامائی انداز میں ہوئی--- بمبئی میں میرا دس پندرہ روز رُکنے کا پروگرام تھا' فلمی اور کچھ ذاتی نوع کی مصروفیات تھیں۔ میرے ایک مرحوم دوست

کے صاحبزادے مجھے کئی بار اپنے ہاں آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ ان سے ملنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا گھر محمد علی روڈ کے قریب تھا۔ یہ میرا پسندیدہ علاقہ ہے۔ مسلمانوں کا گڑھ' یہاں آپ کم از کم اجنبیت محسوس نہیں کرتے' خاص کر پاکستانیوں کو جیسے جامع مسجد دہلی کے آس پاس' قیام و طعام سے ایک طرح کی طمانیت و تحفظ کا احساس رہتا ہے۔ علیک سلیک' ٹوپیاں داڑھیاں' مسجدیں مینار اور اذانیں ۔ قورمے کباب' مٹھائیاں' اردو میں لکھے ہوئے بورڈ۔ قیام و طعام کے لئے مسلمانوں کے بڑے بڑے ہوٹل' خاص طور پر ایرانی ہوٹل جہاں کے مغلی اور دیسی کھانے اپنی نفاست اور لذت کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہیں۔ اس سے پیشتر بھی میں اس علاقے میں کئی بار قیام کر چکا تھا۔ پرنس ہوٹل میرا پسندیدہ ہوٹل تھا۔ میناروں والی مسجد کے قریب مارکیٹیں' ہوٹل' بنک' چوبیس گھنٹے سواری کی سہولت' نیچے ہوٹلوں میں بمبئی بھر کے قوال' گویئے' موسیقار اور فلمی لوگ' چھوٹے موٹے ایکٹر' ہر وقت گہما گہمی۔ خیال یہ تھا کہ بمبئی پہنچ کر اسی ہوٹل میں قیام کروں گا۔ عارف بھی قریب رہتا ہے۔ اس کی معاونت اور مصاحبت بھی میسر رہے گی' اکٹھے گھومیں پھریں گے اور جس مقصد کے لئے آیا ہوں' وہ بھی پورا ہو جائے گا۔

وہ مجھے ایئرپورٹ پہ لینے آیا تھا۔ بہت عرصے بعد دیکھا تھا' دُبلا پَتلا اور خاموش سا لڑکا اب اچھا خاصا قد کاٹھ نکال چکا تھا۔ صحت بھی اچھی' چہرے پہ ہلکی ہلکی داڑھی' جین کی قمیض پتلون میں وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ اس کا مرحوم باپ بڑا اچھا میوزیشن تھا' میوزک ڈائریکٹر روشن کے ساتھ کام کرتا تھا' کئی اور موسیقاروں کے ساتھ بھی بطور اسسٹنٹ کام کیا۔ بڑا دھیما مزاج' شعر بھی بہت اچھے کہتا تھا۔ عارف اس کا اکلوتا بیٹا--- جس کے مستقبل کے بارے میں وہ بڑا فکر مند رہتا تھا۔ ایک طائفے کے ساتھ جب وہ انگلینڈ آیا تو مجھے کہنے لگا کہ کسی طور عارف کو ادھر بلا لو۔ وہاں کا ماحول اچھا نہیں' اس کا اٹھنا بیٹھنا بھلے لوگوں میں نہیں ہے--- کچھ عرصے بعد ہارٹ اٹیک سے اس کا انتقال ہو گیا۔ عارف نے مجھے اطلاع دی اور لکھا کہ ابا آخری دنوں میں آپ کو بہت یاد کرتے رہے ہیں۔ یہاں آنے کا ایک مقصد عارف سے مل کر اس کے خیالات معلوم کرنا بھی تھا۔

وہ مجھے ایئرپورٹ سے سیدھا اپنے گھر لے آیا۔ ایک بہت بڑی پرانی بلڈنگ کے نیچے ایک ڈربہ سا فلیٹ۔ چار بہنیں' ایک بوڑھی بیمار ماں' ایک نابینا بوڑھا جو رشتے میں اس کا

ماموں تھا' سات افراد اور دو چھوٹے چھوٹے کمرے۔ کھانا' سونا' نہانا' سب اندر۔ تعفن اور بُری طرح گھٹن کا احساس۔ اللہ! یہ انسان کس طرح یہاں زندگی بسر کرتے ہیں؟--- وہ سب بڑے تپاک سے ملے' کھانا پینا ہوا۔ اظہارِ تعزیت کیا۔ میں چند ایک کپڑوں کے جوڑے اس کی بہنوں کے لئے لایا تھا' پیش کئے۔ عارف کے لئے ایک گھڑی تھی۔ اپنے ذاتی کپڑوں میں ایک جوڑا ان کے ماموں کو بھی دیا۔ ان کا اصرار تھا کہ میں ان ہی کے ساتھ یہاں گزارہ کروں۔ ایک کونے میں انہوں نے میرے لئے ایک چارپائی کی گنجائش بھی نکال رکھی تھی۔ یہاں یہ عالم کہ کون سا وقت ہو جو میں یہاں سے باہر بھاگوں۔ جہاں کم از کم سانس لینے کے لئے تازہ ہوا تو میسر آئے--- عارف کو پکڑ کر میں باہر نکل آیا۔

"دیکھو دوست' تمہارا خلوص اور محبت اپنی جگہ--- میری مجبوری یہ ہے کہ میں بیمار اور اپنی بُری علاتوں سے بیزار ہوں۔ پھر یہاں میری مصروفیات بھی ایسی ہیں کہ آنے جانے اور وقت بے وقت کسی چیز کا کوئی اندازہ اور بھروسہ نہیں۔ میں گھریلو ماحول میں رہ ہی نہیں سکتا۔ پھر جہاں بچیاں اور بزرگ ہوں وہاں تو دس منٹ بھی بیٹھ نہیں سکتا لہٰذا مہربانی کرو' مجھے پرنس ہوٹل چھوڑ آؤ۔ قریب ہی ہے' روزانہ ملنا ملانا بھی رہے گا اور کھانا پینا بھی' یہاں بھی روزانہ ایک آدھ چکر لگ جایا کرے گا۔"

اس کی سمجھ میں میری بات آگئی۔ ہوٹل پہ آئے تو "سوری" کی تختی لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اندر آگئے اپنا تعارف کرایا کہ کئی بار پہلے بھی یہاں قیام کر چکے ہیں مگر جگہ ہوتی تو ملتی۔ آس پاس کئی ہوٹل تھے۔ معلوم ہوا کہ حج کا سیزن ہے' کہیں جگہ نہیں ملے گی۔ سب ہوٹل اوور لوڈ ہیں۔

"آپ میری مانیں' گھر میں ہی گزارہ کر لیتے ہیں۔ اگر کہیں جگہ ملی بھی تو دام زیادہ ہوں گے اور جگہ بھی مناسب نہیں ملے گی--- ہم آپ کو پورا کمرا خالی کر دیتے ہیں۔ گھر میں کھانے پینے' کپڑے استری کی بھی سہولت رہے گی۔" عارف نے خلوص سے پیشکش کی۔

"اچھا--- میرے لئے کمرا خالی کر کے آپ لوگ کہاں جائیں گے---؟"

آپ ہماری فکر نہ کریں--- ہم سب اسی کمرے میں آرام سے رہیں گے' اور ہمیں کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔"

"آپ سات انسان اگر ساتھ ساتھ بھی لیٹیں تو پہلا چولہے پہ اور اُدھر آخری فردسنڈاس میں ہوگا--- مجھے رات بھر کم از کم سات آٹھ بار پیشاب کی حاجت ہوتی ہے' یہی میری بیماری ہے اور بُری عادت یہ ہے کہ اگر بیت الخلاء کے آس پاس دو فرلانگ کے علاقے میں بھی کوئی انسان تو انسان' لال بیگ بھی ہو تو میں فارغ نہیں ہو سکتا--"

وہ ہنسا' پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"چلئے آپ کو جُوہو کی سیر کراتے ہیں اور اپنے دادا سے ملواتے ہیں۔ آخری حل ان کے پاس ہی ہے--"

"ماشاء اللہ آپ کے دادا--- آپ کے والد مرحوم نے تو کبھی ان کا ذکر خیر نہیں کیا۔ آپ کی دادی محترمہ بھی بقید حیات ہوں گی؟"

اب کے اس نے قہقہہ لگایا اور بولا۔

"یہ وہ دادا نہیں' یہ بمبئی کے دادا ہیں۔ بمبئی میں دادا بدمعاش' غنڈے اور قابل احترام بزرگ کو بھی بولتے ہیں۔ بزرگوں اور بوڑھوں کے لئے ایک لفظ بڑو بھی ہے جیسے چھوٹے طبقے میں ہمارے ہاں "وڈیو" بھی بولتے ہیں۔"

"کیا میرا ان سے ملنا ضروری ہے؟"

"کوئی حرج بھی نہیں--- ویسے مجھے یقین ہے کہ آپ ان سے مل کر اور انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور یہ ہوٹل والا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔"

"کیا ان کا کوئی ہوٹل وٹل ہے---؟" میں نے اظہارِ حیرت کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں' یہ سارے ہوٹل ان ہی کے ہیں---"

"عارف میاں! پہیلیاں مت بجھواؤ' ذرا سلیقے سے ان کا تعارف کراؤ--- وہ کون ہیں' تمہارے کیا لگتے ہیں اور کیا کرتے ہیں؟"

"وہ گپت بزرگ ہیں' میرے ہی نہیں بلکہ سب کے گوٹی دادا ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے میں ان حالات میں زندہ ہوں۔" وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا۔ "اگر ان کا ہاتھ میرے سر پہ نہ ہوتا تو یہ بمبئی مجھے کب کا نگل گیا ہوتا--- باقی رہا یہ سوال کہ وہ کیا کرتے ہیں' یہی دکھانے کے لئے تو آپ کو وہاں لے جا رہا ہوں تاکہ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ وہ کیا کرتے ہیں---"

"بمبئ رات کی بانہوں میں" خواجہ احمد عباس مرحوم نے ایک ڈاکو منٹری فلم بمبئ کی رات کی زندگی کے بارے میں بنائی تھی' اچھا ہوتا کہ کوئی ان جیسا جرات مند شخص "بمبئ دن کے اجالے میں" بھی بنا دیتا۔ یہاں بارشیں بہت ہوتی ہیں۔ اس روز بھی ہلکی سی بوندا باندی ہو رہی تھی' موسم خوشگوار تھا۔ بمبئ کی رونق' رَواں دَواں زندگی اپنے جوبن پہ تھی۔ ٹیکسی شہر کی گھٹن سے پیچھا چھڑا کر کھُلے علاقے میں آ گئی۔ سکائی اسکیپر' اونچی اونچی ملٹی سٹوری بلڈنگز' پام ناریل' کیلے اور یوکلپٹس کے جھُنڈوں میں بڑے بڑے شاندار وسیع و عریض بنگلے' جابجا گرین بیلٹ' پھولوں کے قطعے' صاف ستھرے فٹ پاتھ --- ذرا آگے سمندر کی پٹی شروع ہو گئی۔ چوپاٹی اور جُوہو' میرین ڈرائیو' گیٹ وے آف انڈیا' ایشیا کے خوبصورت بیچ ہیں' ان جگہوں پہ بڑی رونق ہوتی ہے' یوں لگتا ہے جیسے پورا بمبئ یہاں اُمڈ آیا ہو۔ آگے شیواجی مندر کے پاس ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ سڑک اور سمندر کے درمیان پتھریلی دیوار پھلانگ کر ریت پہ آ گئے۔ ٹھنڈی نم آلود نمکین ہوا' فضا میں کچے ناریل اور مچھلی کی مِلی جُلی بو۔ بھیل پوری' تلی ہوئی مچھلی' چاٹ' ناریل جل' گول گپے' ٹُو۔ دکانیں ہی دکانیں' صاف ستھری سجی بنی ہوئی' میلے کا سا سماں۔ ہم پہلو سے گزرتے ہوئے' ناریل کے درختوں کے جھنڈ میں ایک کیرم بورڈ کلب میں آ گئے۔ کھُلے ساحل پہ دُور تک کیرم بورڈ' ٹیبل' کرسیاں۔ جوان لڑکے اور لڑکیاں' بیئر اور مشروبات کے ٹِن سامنے رکھے۔ گیم کھیل رہے تھے --- عارف مجھے لے کر سمندر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ذرا دُور سامنے سمندر کی طرف پیٹھ کئے علیحدہ اکیلی ٹیبل پہ مجھے ایک کبُڑا سا لڑکا نظر آیا۔ وہ اکیلا کیرم بورڈ پہ ٹِزک ٹِزک گوٹیاں ہٹ کر رہا تھا' دو ہٹے کٹے سانڈ سے غنڈے اس کے دائیں بائیں کھڑے تھے' کچھ اور لوگ بھی جو کافی ہٹ کر کرسیوں پہ بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی ان لوگوں کے قریب جا کر بیٹھ گئے۔ باری باری ایک ایک فرد کو طلب کیا جاتا اور وہ پولے پولے پگ اُٹھاتا ہوا بڑے اَدب سے پاس پہنچ کر پرنام کرکے اپنا مسئلہ بیان کرتا۔ پھر کچھ دیر انتظار کرتا اور جواب لے کر الٹے پاؤں واپس آتا۔ میں عارف کے پاس بیٹھا بڑے انہماک اور دلچسپی سے یہ سارا ڈرامہ دیکھ رہا تھا۔ عارف کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ لونڈا کیا چیز ہے؟"

عارف نے بڑی ناگواری سے میری جانب دیکھا' "بڈو! آئندہ یہ لفظ زبان پہ مت

لایئے گا --- یہ ہمارے دادا ہیں' ہم سب ان کا اپنے بڑوں سے بھی زیادہ احترام کرتے ہیں اور ان کے ایک اشارے پہ اپنی گردن کاٹ کر ان کے قدموں میں رکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔"

مَیں سہم سا گیا' بولا۔ آئی ایم سوری' عارف! انجانے میں میرے مُنہ سے نکل گیا --- مگر یہ تو یار' کوئی لڑکا سا دکھائی دے رہا ہے اور عمر میں شاید تم سے بھی چھوٹا یا برابر ہو گا۔ مَیں تو کسی داڑھی والے سِن رسیدہ بزرگ کا تصوّر لے کر یہاں آیا تھا ---"

"یہی تو دیکھنے' سمجھنے اور پرکھنے کا پھیر ہے کہ جو دکھائی دیتا ہے وہ ہوتا نہیں اور جو ہوتا ہے' وہ دکھائی نہیں دیتا --- بس دیکھتے جائیں' بولیں نہیں پلیز!"

گھنٹے بھر میں ہماری باری بھی آ گئی۔ عارف میرا ہاتھ تھامے قریب چلا گیا اور سلام کرکے قریب مودّب ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا' مَیں نے بھی سلام کیا مجرموں کی طرح جو کسی عدالت میں جج کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ مجھے بڑی ہتک سی محسوس ہوئی مگر پھنسا ہوا تھا' صبر اور جبر کئے خاموش ہو لیا۔ اس بچے نے آنکھ اٹھا کر بھی ہماری جانب دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ چند لمحے اسی خاموشی کی اذیّت میں گزرے' مَیں نے چور نظروں سے عارف کی جانب دیکھا' وہ شاید ساگر یا دادا کے سامنے کسی مراقبے میں مگن تھا۔ آنکھیں بند' لٹھ کالٹھ' گیلی ریت میں گڑا ہوا۔ مجھے بڑی کوفت ہو رہی تھی کسی بچے کے سامنے اس طرح بھکشو بن کر بے حِس و حرکت کھڑا ہونا۔ تبّت ہوتا تو کہتا کہ یہ کوئی لامہ بچہ ہو گا --- مَیں بھاگنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ٹِزک سے گوٹی ہٹ ہونے کی آواز ابھری۔

"دادا --- یہ میرے بڈو ہیں' لندن والے' ابّا کے دوست --- آپ کے درشن کے لئے آئے ہیں۔ بڑی کوشش کی مگر پرنس ہوٹل میں انہیں رہنے کے لئے جگہ نہیں ملی۔"

ادھر وہی خاموشی اور بے نیازی جیسے کہ کچھ سُنا ہی نہیں' نہ ہی نظرِ کرم اُٹھی۔ مَیں اندر ہی غصّے سے کھول اٹھا۔ مجھے تو عارف کھینچ لایا تھا ورنہ مجھے اس لونڈے کے درشن کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ واقعی ہندو اور ہندوستان میں رہنے والے بھی عجیب ضعیف العقیدہ لوگ ہیں' ہر الٹی سیدھی چیز میں انہیں کوئی دیوتا' اوتار یا بھگت بھگوان نظر آتا ہے۔ یہ تو پھر بھی انسان کا بچہ تھا۔ یہ تو بندروں' سانپوں' ہاتھیوں کے آگے بھی ماتھا' ٹیک دیتے ہیں۔ یہ چھٹانک بھر کا چھوکرا' میرے جیسا مرنجان مرنج آدمی بھی اگر اسے ایک جھانپڑ جما

دے تو یہ کم از کم دو دن سینکائی کرتا پھرے۔ یہ دونوں سانڈ جو اس کے سر پہ کھڑے تھے اگر اپنے جوتے اس پہ رکھ دیں تو یہ مچھر کی طرح مسلا جائے۔ خیر' دیکھو کہ تھیلی سے باہر کیا نکلتا ہے؟--- وہ جیسے کسی گوٹ کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ آخر وہ ایک ہلکی سی چوٹ سہہ کر' کارنر پاکٹ میں لڑھک گئی۔ دائیں جانب والا مسٹنڈا اچانک بار کی جانب چل دیا' دوسرا میرے لئے ایک کرسی اٹھا لایا۔ بار سے میرے لئے بیئر کی بوتل' لِمکاسافٹ ڈرنک اور ناریل جَل منگوایا گیا' حکم ہوا کہ کرسی پہ تشریف رکھیں اور جو پسند ہو' وہ پئیں۔ عارف کھڑا تھا' مجھے بٹھا دیا گیا۔ لِمکا' ہمارے ہاں کی سیون اپ قسم کا مشروب ہے۔ ادھر ہنوز کھیل جاری تھا' دونوں مسٹنڈے دائیں بائیں اپنی پوزیشن میں آ گئے۔ بوتل ختم کی تو ادھر بھی کوئی اور گوٹی ہٹ ہو گئی تھی۔ ایک مسٹنڈا بولا۔

"دادا نے پوچھا ہے کوئی اور سیوا ہو تو بتائیں؟"

عارف نے میری جانب کنکھیوں سے دیکھا' جیسے کہہ رہا ہو کہ بڑو' ذرا خیال سے---
اب بادل نخواستہ مجھے کچھ تو کہنا تھا۔

"بہت بہت شکریہ! دادا سے کہیں' مَیں آپ کے دَرشن کرکے بہت خوش ہوا ہوں۔"
جو جھوٹ تھا۔ "عارف بہت اچھا بچہ ہے' اس کا والد میرا دوست تھا۔ یہ بچہ پریشان رہتا ہے' دادا سے عرض ہے کہ اس کے سر پہ کرپا کا ہاتھ رکھیں۔"

وہ اپنی کئے جا رہا تھا جیسے بکتے جاؤ' ہم تو اپنے کھیل میں مگن ہیں۔ کیرم بورڈ کی زبان تو مَیں نہیں سمجھتا تھا کہ وہاں سے کیا جواب آیا' دائیں جانب والا بولا جو کیرم بورڈ پہ نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"دادا آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں' کہہ رہے ہیں کہ آپ بیٹھیں اور کھانا کھا کر جائیں گے۔ پرنس ہوٹل میں آپ کا کمرا تیار ہے۔"

الٰہی! یہ کیا چیز ہے۔ بدمعاش ہے یا کوئی ولی اللہ یا کوئی مہاتما جس کی افہام و تفہیم' نطق و سماعت' بصیرت و بصارت' سب کچھ کیرم بورڈ اور اس کی گوٹیں ہیں۔ یہ کون سی سائنس اور کیسی زبان ہے؟ میرا تو دماغ ماؤف ہو گیا تھا--- دائیں طرف کھڑے مسٹنڈے نے ادھر بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ ایک نحیف و نزار بوڑھا بڑی دِقت سے لنگڑاتا ہوا آیا اور دادا کے رُوبرو پرنام کرکے کھڑا ہو گیا' پیچھے پیچھے سر جھکائے ایک

خوبصورت سا لڑکا جو کسی آسودہ حال گھرانے کا چشم و چراغ دکھائی دیتا تھا' وہ بھی ایک مجرم کی طرح آ کر حاضر ہو گیا۔ چند اذیّت ناک لمحے خاموشی میں گزر گئے لیکن کیرم بورڈ پہ گوٹیوں کی گُتھم گتھا جاری تھی۔ پھر دائیں والا مسٹنڈا مخاطب ہوا۔

"دادا پوچھ رہے ہیں' تمہیں وارننگ دی تھی کہ اس غریب آدمی کی بیٹی کو آئندہ کبھی تنگ نہ کرنا مگر تم باز نہ آئے۔ پھر تمہیں بلایا لیکن تم نے دادا کے حُکم کی کوئی پرواہ نہ کی' اُلٹا تم نے لڑکی کو کہا کہ مَیں کسی دادا وادا سے نہیں ڈرتا لہٰذا آج ہمیں مجبوراً" تمہیں زبردستی یہاں لانا پڑا۔"

اچانک کیرم بورڈ کی تڑک تڑک میں تیزی آ گئی۔ دادا کی انگلیاں بجلی کی مانند لپکنے لگیں۔ پھر نہ کسی نے دیکھا اور نہ ہی کسی کو احساس ہوا' ایک گوٹ ٹیبل سے میزائل کی مانند اُڑی اور لڑکے کی بائیں آنکھ کا ڈیلا پھوڑتی ہوئی آنکھ میں پھنس گئی۔ لڑکا چیختے ہوئے گیلی ریت پہ لَوٹنے لگا--- میرا تو کلیجہ حلق میں آ گیا' وہ مسٹنڈا بولا۔

"آئندہ اس لڑکی کو چھیڑا تو دوسرا ڈیلا بھی نِکل جائے گا۔"

دادا کے لئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا' وہی بے حِس پتھر سا چہرہ' سمندر کی طرح خاموش--- وہ غریب ریت پر پڑا لوٹنیاں کھا رہا تھا۔ کلب کی جانب سے دو غنڈے آئے' اسے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اُٹھا کر لے گئے۔

کھانے میں تلی ہوئی مچھلی' اُبلے چاول اور لَوکی بینگن کی تَرکاری تھی۔ ایک آدھ لقمہ زہر مار کیا۔ یہ حشر دیکھ کر کون سفاک ہو گا جو کھانا ٹھونسنے بیٹھے۔ کلیجہ بَلّیوں اُچھل رہا تھا' میرے بس میں نہ تھا کہ اُٹھ کر بھاگ نکلوں۔ یہی خدشہ تھا کہ کہیں کوئی گستاخی یا دادا کی مرضی کے خلاف کوئی بات ہوئی تو اچانک کوئی گوٹی اڑتی ہوئی آئے گی اور میرا کچھ نہ کچھ غائب کر دے گی۔ اسی طرح عورتیں مرد آتے رہے' دادا انہیں گوٹیوں کی سائنس سے نبٹاتے رہے' خیر ہوئی کہ پھر ڈیلے دیلے نکلنے کی کوئی نوبت نہ آئی۔

شام کے سائے اُترتے ہی ہمیں اِذنِ رُخصت مِلا۔ واپسی پہ میں خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ عارف سے پیچھا چھڑا کر کہیں اور نکل لوں۔ سچ بات یہ تھی کہ دادا سے مجھے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ پرنس ہوٹل پہنچتے پہنچتے مَیں بے سکت سا ہو گیا تھا۔

"بڑو! کیا بات ہے' بڑے خاموش خاموش ہیں؟" عارف نے پوچھا۔

"عارف! مَیں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ایسی بَربرّیت کا مظاہرہ دیکھا ہے' مَیں اس نوجوان کی آنکھ پھوٹنے کے منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے سے ابھی تک ہٹا نہیں سکا۔ کیا ہُوا جو ایک لڑکی کو دیکھ لیا--- یار! جوانی میں تو قریب قریب سب ہی سے ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اس معمولی سی دِل لگی کی اتنی کڑی سزا---؟"

وہ ہنسا--- "بڑو' آپ اپنے حساب سے ٹھیک سوچ رہے ہیں لیکن دادا کے حساب سے یہی کچھ ہونا چاہئے تھا۔ دادا' بمبئی کا دادا ہے' کسی مسجد کا مولوی نہیں--- وہ صرف حکم دیتا ہے۔ اگر اس پہ عمل نہ ہو تو وہ اسی قسم کی سزائیں دیتا ہے۔ آپ نے ابھی صرف یہی دیکھا ہے' میں اور بہت سے لوگوں نے ایسے بہت سے مناظر دیکھے ہیں۔ دادا اگر ایسے نہ کرے' اسے تو کوئی جیب میں ڈال کر لے جائے۔"

"جو بھی ہے' لیکن یہ زیادتی ہے۔ وہ بے چارا تو زندگی بھر کے لئے ایک آنکھ سے معذور ہو گیا۔" وہ خشمگیں نظروں سے مجھے تولتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"آپ یہ بتائیں کہ ایک کنواری کنیا کی عزت قیمتی ہے یا کسی لوفر لونڈے کی آنکھ؟" عارف نے دلیل پیش کی۔ "دادا نے اسے وارننگ دی تھی لیکن وہ باز نہ آیا۔ اسے بلایا مگر وہ ٹال گیا--- دادا حتی الوسع کبھی کسی سے زیادتی نہیں کرتا' وارننگ اور موقع دیتا ہے' سمجھاتا ہے۔ اگر پھر بھی بات نہ بنے تو پھر--- ویسے جو گوٹ اس کی آنکھ لے گئی' وہ کنپٹی سے ٹکرا کر اس کی جان بھی لے سکتی تھی۔ پھر اس کی لاش صبح سویرے کسی سڑک پہ پڑی ہوتی۔"

مجھے جُھرجُھری سی آ گئی--- ہوٹل میں داخل ہوئے تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ منیجر نے بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا' دیگر عملہ بھی آگے پیچھے آنکھیں بچھا رہا تھا۔ ہوٹل کا سب سے بہترین' کشادہ' آرام دہ کمرا پھولوں اور اضافی لوازمات آرائش و زیبائش سے آراستہ میرے لئے تیار تھا' نہ کسی نے پاسپورٹ اور شناخت کے متعلق دریافت کیا--- نہ ڈیپازٹ اور نہ کہیں دستخط' نہ ٹپ کا جھنجھٹ--- کمرے پہ قابض ہوتے ہی مَیں نے عارف سے کہا کہ میرے غسل کرنے تک تم گھر سے میرا سامان لے آؤ۔ اس کے آنے تک میں نہا چکا تھا۔ چائے پیتے ہوئے مَیں نے عارف سے کہا۔

"آج تم یہیں میرے پاس رہو' تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ مجھے نیم مسکراہٹ کے ساتھ گھُورتے ہوئے کہنے لگا۔ "بڑو! مَیں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے دادا کے حوالے سے بہت کچھ پوچھنا چاہتے ہیں--- ہمارا دادا بہار کا رہنے والا ہے' بچپن میں ہی اپنے ماں باپ اور ایک بہن کے ساتھ اِدھر آ گیا تھا۔ باپ اسی جُوہو گھاٹ پر غبارے بیچتا تھا' ماں ایک سیٹھ کے ہاں رَسوئی کا کام کرتی تھی۔ دادا جب بڑا ہوا تو باپ کے ساتھ ہی غباروں پر لگ گیا۔ عمر میں بڑی بہن نے بھی قد کاٹھ نکال لیا تھا' وہ بھی باپ بھائی کے ساتھ غباروں میں ہوَا بھرنے پر لگ گئی۔ ماں اِدھر سیٹھ کے بنگلے پر ہی رات ٹھکانا کر لیتی تھی۔ یہ تینوں باپ' بیٹا' بیٹی یہاں گھاٹ پر بار کے پچھواڑے پڑ جاتے' آدھی رات جب بھیڑ چھٹ جاتی تو یہ تینوں باروالے کے ساحل پر دُور دُور تک بکھری فولڈنگ کرسیاں سمیٹتے جس کے معاوضے میں سیٹھ نے انہیں دو وقت کی روٹی اور رات سونے کے لئے جگہ کی سہولت دے رکھی تھی--- ایک طوفانی رات غنڈوں نے انہیں پکڑ لیا۔ باپ نے شور مچایا تو اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا۔ پھر یہ غنڈے دادا اور اس کی بہن کو اسی جگہ لے آئے جہاں اس کا کیرم بورڈ ہے۔ طوفانی رات' بپھرا ہوا سمندر' چیختی ہوئی ہوائیں' سنسان ساحل۔ وہ معصوم روئی' چلائی' تڑپی' مچلی مگر وہاں کون تھا جو اس کی مدد کرتا۔ دادا کمزور سا لڑکا' دم سادھے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بے بس' لاچار۔ نہ آہ نکلی' نہ فریاد اور لڑکی ان وحشیوں کے آگے زندگی ہار گئی۔ دادا کی زندگی ابھی باقی تھی۔ کمر تک ریتلے کیچڑ میں پھنسا ہوا انہیں شاید نظر نہ آیا' اسے بے ضرر یا مردہ سمجھ کر اس کی جانب توجہ ہی نہ دی۔ دادا نے اپنی زبان دانتوں تلے دابی ہوئی تھی یا خود ہی دب کر کٹ گئی تھی۔ وہ دن اور یہ دن' دادا نے وہ جگہ نہیں چھوڑی۔ اٹھارہ برس بیت گئے' وہ اسی کیرم بورڈ کلب ہی میں پڑا رہا۔ سارا دن کام کرتا' ساری رات کیرم بورڈ کھیلتا رہتا۔ کیرم بورڈ اس کی زندگی اور گوٹیاں اس کی دوست بن گئیں۔ بڑے بڑے مقابلے جیتے' بڑے بڑے انعام و اعزاز حاصل کئے مگر دادا کی زندگی کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ اس نے پلاسٹک کی گوٹی کو گولی سے زیادہ مہلک بنا دیا۔ گوٹی کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کی ایسی ٹیکنیک ایجاد کی جس کے سامنے بڑے بڑے مہلک ہتھیار بیکار ہیں۔ بڑے بڑے غنڈوں' بدمعاشوں کو ان ہی گوٹیوں سے سیدھا کیا۔ دادا کے پاس ایک ساتویں حِس بھی ہے' وہ اتنی تیز اور بے خطا ہے کہ وہ سامنے کھڑے انسانوں کے ذہنوں اور ارادوں کو پڑھ لیتا ہے۔ دشمن اور

دوست اس کے سامنے ننگے ہو جاتے ہیں۔ دادا لمحے کے ہزارویں حصے سے بھی پہلے فیصلہ کر کے عمل کر گزرتا ہے۔ اگلے کا دماغ ابھی سوچ ہی رہا ہوتا ہے، دادا کی گوٹ کام کر جاتی ہے۔" عارف نے اس داستانِ الم کے وَرق الٹتے ہوئے کہا۔ "دادا نے اپنی بہن کے ہتیا کاروں کو بھی انجام تک پہنچایا۔ اس کی زندگی کا مشن ہی یہی ہے کہ وہ بدکاروں، ظالموں اور دوسروں کا حق چھیننے والوں کو سیدھا کرے۔ بمبئی کا کوئی مظلوم اس کے پاس کیسا ہی مسئلہ لے کر چلا آئے، وہ مایوس نہیں لوٹتا ہے۔ دادا ایک مہاتما ہے، ہم سب کا بزرگ ہے جو غریبوں، مظلوموں کی بہو بیٹیوں کی عزت کی رکھشا کرتا ہے۔ بے گھروں کے لئے گھر کا انتظام کرتا ہے، بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے۔ بے روزگاروں کی نوکری کا انتظام کرتا ہے، غریبوں مفلسوں کی جوان بیٹیوں کے بیاہنے کے جتن کرتا ہے۔ ایسے کام ہی دادا کی طاقت ہیں--- وہ کڑیل آدمی آپ نے دیکھے ہیں جو اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوتے ہیں، یہ اس کے خاص شاگرد ہیں--- باڈی بلڈر ہونے کے علاوہ وہ بھی گوٹیوں کے استاد ہیں۔ چھٹے ہوئے بدمعاش، سفاک قاتل اور انتہائی نڈر دَرندے۔ ایسے کئی ایک شاگرد ہیں جو باری باری اس کے پاس کھڑے ہونے کی ڈیوٹی دیتے ہیں--- آپ حیران نہ ہوں تو کہوں کہ ان میں سے مَیں بھی ایک ہوں۔"

مجھے تو جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا--- "یعنی تم بھی ان جیسے غنڈے بدمعاش---" بے اختیار میرے مُنہ نکل گیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں مسکرایا، بولا۔ "برو، آپ ہمیں کوئی بھی نام دے لیں، کچھ بھی کہہ لیں ہم بُرا نہیں مانتے۔ انسان کا اپنا من اور ضمیر مطمئن ہونا چاہئے، کسی کے اچھا بُرا کہنے سننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا--- مجھے ایک بات یاد آ گئی ہے ذرا اسے بھی سُن لیں۔ ابا کی اچانک موت کے بعد ہماری بلڈنگ کے سیٹھ نے ہمیں فلیٹ خالی کرنے کا نوٹس بھجوا دیا۔ ایک پریشانی کے بعد دوسری مصیبت آ پڑی۔ محلے داروں، مسجد کی کمیٹی، سب نے ہماری مدد کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ ہمارا سامان سڑک پر پھینکا جانے ہی والا تھا کہ دادا کو خبر ہو گئی۔ اگلے ہی روز وہ سیٹھ ہاتھ باندھے ہمارے پاس پہنچا اپنی حماقت کی معافی مانگی اور آئندہ کے لئے توبہ کر لی--- دادا کے چیلوں میں کوئی سگریٹ نہیں پیتا، شراب کے قریب نہیں پھٹکتا۔ سب محنت سے روزی کماتے ہیں۔ ہم بدمعاش یا غنڈے صرف

ظالموں اور ان بڑے پیٹ والوں کے لئے ہیں جو غریبوں، محنت کشوں اور مجبوروں کا حق دباتے ہیں۔ انہیں حقیر مخلوق سمجھ کر غیر انسانی سلوک روا رکھتے ہیں یا پھر جو غیر قانونی طریقے سے کالا دھن جمع کرتے ہیں--- آپ اپنی ہی مثال لے لیں۔ دادا کسی کو اپنے سامنے کرسی پیش نہیں کرتا چاہئے وہ بمبئی کا لارڈ میئر ہی کیوں نہ ہو۔ آپ کے لئے کرسی منگوائی، کھلایا پلایا، ہوٹل میں رہنے کے لئے شاندار بندوبست کیا۔ آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ دادا نے آپ کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ جب تک آپ بمبئی میں ہیں، کوئی بھی آپ کی جانب آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھے گا۔ صبح آپ کے لئے شاہانہ ناشتہ، دوپہر کو دارالسلام ہوٹل سے بہترین لنچ بکس آئے گا۔ دھوبی، ہوٹل کی گاڑی، سب کچھ آپ کو میسّر ہو گا۔ جتنے دن بھی آپ یہاں رہیں، دل وجان سے وی آئی پی کی طرح آپ کی خدمت عزت ہو گی۔ کوئی بھی آپ سے ایک پیسہ طلب نہیں کرے گا کیونکہ آپ دادا کے مہمان ہیں، میرے بزرگ اور میرے بابا کے دوست ہیں--- اب آپ بتائیں کہ دادا بدمعاش ہے، غنڈہ ہے۔ مہاتما یا کوئی اللہ کا نیک بندہ---؟"

مَیں اس کی باتیں غور اور تعجّب سے سُن رہا تھا۔ مَیں نے کہا۔ "دادا اپنی بدمعاشی اور رُعب داب سے یہ سب کام کرواتا ہو گا جیسے ان ہوٹل والوں سے مجھے کمرا دلوایا ہے۔"

وہ پھر ہنسا جیسے کوئی بزرگ کسی نادان کے اوٹ پٹانگ سوال پر مسکراتا ہے۔ "آپ بتائیں، اگر دادا آپ سے کوئی کام کرنے کے لئے کہیں، آپ محسوس بھی کریں کہ یہ کام کرنے سے کسی کا بھلا ہو گا تو آپ انکار کریں گے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ مَیں نے جو کچھ دیکھا اور جیسا سلوک میرے ساتھ ہوا، جتنا مان اور عزت مجھے دی گئی، مَیں تو دادا کی بات کبھی نہیں ٹال سکتا۔"

"پھر آپ بھی میری طرح دادا کی محبت کے دائرے میں داخل ہو گئے ہیں، مَیں بھی ایسے ہی ہوا تھا۔ دادا جسموں پر نہیں، دلوں پر حکومت کرتا ہے۔"

بمبئی چھوڑنے سے ایک روز پیشتر میں عارف کے ساتھ دادا کے درشن اور شکریہ ادا کرنے کی غرض سے گیا۔ ہوٹل والوں نے میرے اصرار کے باوجود بل لینے سے معذرت کر دی تھی بلکہ الٹا کہنے لگے کہ ہم آپ کی خاطر خواہ سیوا نہ کر سکے۔ سٹاف کو اچھی خاصی رقم بطور ٹپ دینا چاہی تو وہ بھی کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔

دادا بڑے تپاک سے ملے۔ سامنے کرسی منگوا کر بٹھایا' کھلایا پلایا۔ مَیں نے ڈرتے ڈرتے پانچ ہزار کے نوٹ لفافے میں ڈال کر پیش کئے جو مجھے واپس لوٹا دیئے گئے ارشاد ہوا---- آپ یہاں ہمارے مہمان ہیں' ہم آپ کی صحیح طرح سے خدمت سیوا نہیں کر سکے اس کے لئے ہم معافی چاہتے ہیں۔"

ایک نائب کے وسیلے سے ارشاد ہوا۔ "عارف بڑا نیک بچہ ہے۔ اس کو ریفریجریشن کا ڈپلومہ کورس کروایا ہے۔ اس کا من کہیں باہر جانے کو چاہتا ہے۔ آپ اگر اس کے لئے کچھ کر سکیں تو باہر بلالیں۔ بڑا خود دار بچہ ہے' بہنوں کا بوجھ بھی ہے۔"

مَیں دادا کی بات کیسے ٹال سکتا تھا جبکہ دادا نے پہلی بار مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا بھی تھا۔ یوں لگا جیسے کوئی دادا' میری ہی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

* *

یہ تو چند ایک بچپن اور جوانی کے قصے ہیں۔ ساری عمر صحرانوردی اور آوارگی میں کٹی۔ صبح کہیں' شام کہیں۔ پاؤں میں اِک چکر تھا جو کسی طور رُکتا نہ تھا۔ دنیا کا چپہ چپہ چھانا' ہاٹ ہاٹ کا کھاجا کھایا' گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ بھلے بُروں سے واسطہ پڑا' فرشتہ صورتوں میں شیطان طبیعت اور بدمعاشوں بدقماشوں کے اندر بڑے بڑے ولی اور مسیحاصفت انسان چھپے دیکھے۔ اتفاق تو نہیں کہا جا سکتا' میرا نصیب ہی ایسا کہ چمن کا شگفتہ پھول میرے ہاتھ کبھی نہیں آیا یا مجھے کبھی بھایا ہی نہیں کہ جس کی شادابی اور مُسکان کے پیچھے کسی کہنہ مشق باغبان کی شفقت ہُنر اور نگہ داری کا دخل عمل ہو۔ میرے سامنے' میرے حصے تو کیچڑ بھرے جوہڑوں اور ہاتھی نگلتی دلدلوں میں کھلتے شفاف اُجلے کنول' سنگلاخ چٹانوں کی دراڑوں سے پرِ طاؤس کی مانند' خودرو نرم و نفیس مسکراتے جھانکتے ننھے ننھے پھول یا پھر غلاظت کے انباروں پر اُگتی ہوئی کھمبیاں آئیں جن کی جڑوں میں نہ تو تربیت کا صاف پانی تھا اور نہ ہی صحبتِ صلحاء کی خیراندیش کھاد' جن کی بوائی کے لئے نہ تو خواہش و تمنا تھی' نہ سینچائی کے لئے کوئی نظر بینا' پھر بھی یہ اُجلوں سے اُجلے' بھلوں سے بھلے---

مَیں نے آج تک یہی دیکھا کہ اکثر اچھے دکھائی دینے والوں میں بُرے زیادہ ہوتے ہیں اور بیشتر بُرے نظر آنے والوں میں اکثریت بھلے مانسوں کی ہوتی ہے۔ بُرا ہو کر جو اچھا بن جاتا ہے اس میں استحکام' خیر اور عجز نمایاں ہوتا ہے۔ وہ اب محتاط و محجوب ہوتا ہے' اپنی

کوتاہیوں اور گناہوں کی تلافی کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں وہ اپنی جان ہارنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ وہ اس منزل پہ ہوتا ہے کہ کسی طرح اس کا اللہ اسے معاف کردے اور راضی ہو جائے جبکہ بزعمِ خود اچھے' اپنی پاکی داماں کے داعی بڑے مغرور اور متکبّر ہوتے ہیں۔ وہ بات بات پر چھوٹی چھوٹی غلطیوں اور خامیوں پر دوسروں کو مشرک اور کافر سمجھنے اور کہنے میں رتی بھر نہیں شرماتے' فٹ سے بدمعاش رذیل' گناہگار اور شیطان یا جہنمی کی مہرثبت کردیتے ہیں۔

سن پینسٹھ کی جنگ میں جو کارہائے نمایاں غنڈوں اور بدمعاشوں نے سرانجام دیئے گو وہ باقاعدہ ریکارڈ پر موجود نہیں اور ان کا عشرعشیر بھی بڑی بڑی تقریریں' مسجدوں میں بڑی بڑی تفسیریں اور فلسفہ جہاد پر لمبے لمبے وعظ جھاڑنے والے فضیلت مآب صاحبِ جبہّ و دستار بھی پیش نہ کر سکے۔ سیالکوٹ' چونڈہ' لاہور شکرگڑھ کے میدانوں میں جہاں پاکستانی فوجی سرفروشوں نے ہندوستانی آہنی ہاتھیوں کے سامنے اپنی جان کے نذرانے پیش کئے اور ان کے ٹڈی دل یلغار کے آگے سیسہ پلائی دیوار کی طرح ڈٹ گئے وہیں ان ناپسندیدہ عناصر نے بھی دشمن کے کلیجے کے اندر گھُس کر بھرپور وار کئے۔ سفید پوش (زعم برتری و پاکی داماں کے معنوں میں) اپنے اُجلے دامن پر داغ دھبہ برداشت نہیں کر سکتا چاہے وہ خون کا ہو یا خاک کا' جب بھی معرکہ حق و باطل' یورش یلغار یا معاملہ معصیت و مصائب کا درپیش ہوا یہ زبانی کلامی تو پیش پیش رہے مگر اپنے ایوانوں اور حجروں' مسجدوں سے باہر نہ نکلے۔ اگلی صفوں اور مورچوں میں یہی سیاہ پوش' سیاہ معاش اپنی فوج کی مدد کرتے رہے یا پھر فلمی اداکار تھے جنہوں نے اپنے انداز میں اپنی فوج کے ساتھ مل کر یہ جنگ لڑی اور جیتی۔ میں سیالکوٹ' گنڈا سنگھ' شکرگڑھ اور لاہور کے کئی ایک بدمعاشوں سے واقف ہوں جو اپنے علاقوں کے چھٹے ہوئے بدمعاش اور اسمگلر تھے۔ سرحدی علاقوں کے چپّے چپّے سے واقف' چور راستوں اور محفوظ کمین گاہوں کے جاننے والوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرکے دشمن کی فوج کو بہت بڑا نقصان پہنچایا۔ گولیوں کی بارش اور توپوں ٹینکوں کے گولوں کی یلغار میں وہ نیولوں کی طرح دشمن کی ٹانگوں کے نیچے سے گزر کر ان کے اسلحے کے ڈپو اور بڑے بڑے رسدی کانوائے تباہ کر آئے یا وہیں کام آگئے۔ یہ اوپر سے سیاہ پتھر' اور اندر سے شفاف ہیرا ہوتے ہیں۔ کوئی مصیبت زدہ نادار مظلوم کسی مولوی مولانا' پیر کے پاس جا

کر اپنی بپتا سنائے' مدد کا طالب ہو کر تماشا دیکھے۔ پہلے تو وہ صبر و شکر کے بارے میں دو چار آیتیں سنا کر راضی بہ رضا رہنے کی تلقین فرمائیں گے لیکن کیا مجال کہ جیب سے چھدام نکال کر اس کی مُشکل کُشائی کر دیں۔ نمازیوں کی طرف ٹہلا دیں گے۔ وہ بیچارہ کھڑا ہو کر فریاد کرے گا' اچھے برُے نمازی حسبِ توفیق ضرور اس کی مدد کریں گے۔ یہ دستار کلاہ درست کرتے ہوئے بڑے طمطنے سے اس پر نگاہِ مغائرت ڈالتے ہوئے حَجلہ' حجرہ میں تشریف لے جائیں گے۔ اس بھوکے کے فاقے کو نظر انداز کرتے ہوئے حلوے کی پلیٹ سامنے رکھ کر حدیث کی کتاب کھول لیں گے۔ اگر یہیں مظلوم کسی بدمعاش کے پاس چلا جائے' شرط یہ کہ وہ اصلی بدمعاش ہو۔ تیلی میراثی' چنگڑ بھنگڑ نہ ہو تو وہ ضرور اس کی داد رسی کرے گا۔ اس کا حق دلائے گا' اس کی عزت کرے گا۔ میری نگاہ میں اسی لاہور میں بے شمار بدمعاش گزرے ہیں اور موجود بھی ہیں جو کئی کئی کنبوں کو پال رہے ہی۔ یتیموں' بیواؤں اور غریب طالب علموں کی تعلیم کے اخراجات برداشت کر رہے ہیں۔ کئی بچیوں کی ڈولیاں اپنے کندھوں پر اٹھا چکے ہیں' کتنوں کو ان کے مکانوں کے قبضے دلوا چکے ہیں اور کئی ایک کو حج عمرے کرا چکے ہیں۔ عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر روحانی مجالس نعت خوانی کی محافل کے انتظامات کرتے ہیں' لاوارثوں کی میتوں کو غسل دیتے بلکہ خود قبر کھودتے دیکھا ہے۔ اندر لیٹ کر کشادگی کا اندازہ کرتے ہیں' مٹی ڈالتے ہیں اور اپنی جیب سے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ فیض اور وفا ہمیشہ اس سے ملتی ہے جو بظاہر برُا ہوتا ہے۔ ٹوٹے پھوٹے اجڑے ہوئے خانہ برانداز لوگوں میں بڑی حیا ہوتی ہے۔ یہ منافق' خود غرض' مطلب پرست اور موقع شناس نہیں ہوتے۔ اپنے داغ' پھولوں کی طرح سجا کر سامنے رکھتے ہیں۔ دوستوں کے دوست' دشمنوں کے دشمن۔۔۔ ۔

ڈھونڈ اُجڑے ہوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزینے تجھے شاید کہ خرابوں میں ملیں

نام نہاد مولویوں کے ذکر سے ایک "مولوی بدمعاش" بھی یاد آ گیا۔ قریب قریب پینتیس چالیس برس پیچھے ہم نے ایک آدھ برس کھاریاں چھاؤنی میں ایک انگلش کمپنی جی ای سی میں الیکٹریشن کی حیثیت سے کام کیا۔ ادھر سرحد میں وارسک ڈیم بھی شروع تھا' یہاں کی نسبت وہاں تنخواہیں بڑی پُرکشش تھیں۔ ہمارے کئی ایک ساتھی اور دوست یہاں

سے چھوڑ کر وہاں چلے گئے تھے۔ ہم محض سیالکوٹ سے نزدیکی کی وجہ سے یہاں ٹکے پڑے تھے۔ ہر ہفتے عشرے گھر چلے جاتے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ مرحومہ ملکۂ موسیقی روشن آراء بیگم لالہ موسیٰ میں رہتی تھیں۔ ان کا ایک سوتیلا بیٹا' ریڈیو مکینک ہمارا دوست تھا۔ ہم قریب قریب روزانہ رات کو ان کے ہاں پہنچ جاتے' انہیں اور ان کے خاص شاگردوں کو وہاں ریاض کرتے دیکھتے رہتے۔ میڈم نور جہاں' نزاکت علی' سلامت علی' مرحوم امانت علی' فیروز نظامی مرحوم' رفیق غزنوی' ماسٹر عنایت حسین' رشید عطرے' مختار بیگم' خواجہ خورشید انور مرحوم اور بہت سے اساتذہ کو ہم نے وہاں دیکھا' ملے۔ ہم تو کَن رَسِیئے تھے' کچھ سیکھنے سکھانے کے لئے نہیں جاتے تھے۔ محض موسیقی کے بڑے بڑے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا شوق' کچھ ملکۂ موسیقی کی شفقت اور خاص عنایت تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی طرح ہمیں بھی بڑی محبت سے نوازتی تھیں۔ ایک وجہ مرحوم عالم لوہار بھی تھے جن کے والد کی وہاں دکان تھی۔ خورَبانو' ممگی شاہ کے تھیٹر کی مشہور فنکارہ بھی یہیں رہتی تھی۔ عالم لوہار سے میرا ایک خاص تعلق تھا۔ میں ان کے لئے گیت اور نعتیں بھی لکھتا رہا۔ وہ زمانہ ان کے عروج کا تھا اور ظاہر ہے کہ عوامی تھیٹروں میں ہی ان کی مصروفیات تھیں۔ جہاں بھی ان کا پروگرام ہوتا ہم بھی ساتھ ہوتے۔ انگلینڈ' خاص طور پر بریڈ فورڈ میں بھی اکثر ان کا قیام میرے پاس یا ڈاکٹر غلام ربّانی کے ہاں ہوتا۔ ان کے ایک بیٹے میرے قریب رہتے تھے جبکہ بیٹی برمنگھم میں بیاہی ہوئی تھی' یہ عارف لوہار تو بہت بعد میں پیدا ہوا۔۔۔۔ بھلا یہ پیارے اور نادر روزگار لوگ اور ان کی قربتیں اور محفلیں چھوڑ کر کون بے آب و گیاہ پہاڑوں میں چند ٹکوّں کی خاطر جاتا مگر کیا کہتے ان دوستوں کو جو زیادہ تنخواہ کے لالچ میں وارسک چلے تو گئے تھے مگر اب وہاں کے خشک ماحول میں ہماری کمی شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ ہماری غزلیں' گیت لطیفے' چَٹ پٹی باتیں اور ہمارے ہاتھوں سے بنے ہوئے طرح طرح کے کھابے انہیں سخت بے چین کر رہے تھے۔ جب کبھی ملنے کے لئے آتے تو وہاں کی سہولتیں' آب و ہوا اور دریائے کابل کی دلفریبیاں' وہاں کی موسیقی اور اچھے لوگوں کا ذکر کر کے مجھے وہاں چلنے کی ترغیب دیا کرتے مگر میری ایک ہی "نہ" تھی جو انہیں بہت کُھلتی۔ اتنا ضرور ہوا کہ ایک بار مَیں نے ایک آدھ روز کے لئے وہاں پہنچنے کا وعدہ ضرور کر لیا۔ پشاور تو کئی مرتبہ آنا جانا ہوا لیکن اس سے آگے کبھی جانے کی جراُت نہ ہوئی

تھی۔ اگلے ہفتے یہی سوچ کر چل دیا کہ چلو' وارسک اور علاقہ غیر بھی دیکھ لیں گے۔ دوستوں کا دل بھی خوش ہو جائے گا۔ وہاں پہنچے تو وہی کچھ جو کھاریاں چھاؤنی اور گرد و نواح میں ہو رہا تھا۔ بڑے بڑے دیو ہیکل بلڈوزر' مشینیں' ہیوی ٹرک' کرینیں' دھول مٹی اور بے پناہ شور۔ پٹھان' بلوچی' پنجابی ہزاروں محنت کش ہنر مند اپنے اپنے کاموں میں جٹے ہوئے تھے۔ غیر ملکی انجینئر اور ہائی گریڈ شاف علیحدہ ہی پہچانا جاتا ہے۔ باقاعدہ یونیفارم' نام عہدے کا سٹیکر' سر پر پیلے پلاسٹک کا ہلمٹ' آنکھوں پر گاگل۔ نیچے امپورٹڈ فور وہیل ڈرائیو گاڑیاں۔ ان کی رہائش اور دفاتر کے لئے علیحدہ کالونیاں بنی ہوئی تھی جس کے گرد خاردار تار کے باڑ اور پہرے دار مسلح گارڈ۔ اندر کلب' شراب خانے' ٹینس کورٹ اور ہر وہ سہولت جو انہیں اپنے ملک میں میسر تھی۔ ادھر اپنا ملک' اپنے وسائل' اپنی زمین اور اپنے لوگ۔ جوتا ہے تو ٹوپی غائب' پھٹے پرانے میلے کپڑے' پسینے سے شرابور چہرے' محنت و مشقت اور احساس کمتری میں جلا محنت کش جنہیں صاف ٹھنڈا پانی بھی میسر نہیں تھا۔ جو کھلے دریا میں نہاتے' وہیں غلاظت صاف کرتے' وہیں پیاس بجھاتے' وہیں مُردہ بوڑھے بیلوں کے قیمے کے چپل کباب اور افغانی روٹیاں کھا کر پتھروں اور خار دار جھاڑیوں پر بازو تکیہ کرکے سو جاتے۔ صبح باجماعت قطار دَر قطار چھوٹی موٹی آڑ لے کر حاجات ضروریہ سے فارغ ہوتے۔ چھوٹے موٹے چمکیلے گیٹوں پتھروں سے رَگڑ رَگڑائی کرکے آزار بند تھامے وہیں دریا پر اکڑوں بیٹھ کر باقاعدہ طہارت کرتے' انہیں قدموں پر بیٹھے نہاتے یا منہ ہاتھ دھو کر مولوی مدنی کے ہوٹل پر آ بیٹھتے۔ چائے نام کا ملغوبہ اور بڑے ظالم قسم کے پراٹھے ٹھونس کر پہلے سائرن پہ اپنی اپنی راہ لگ لیتے۔

مَیں ادھر ادھر کا جائزہ لیتا ہوا کسی پنجابی کی تلاش میں تھا جس سے مَیں اپنے دوستوں یا الیکٹریکل ڈیپارٹمنٹ کے بارے میں معلوم کر سکوں۔ میری دائیں جانب کی پہاڑی پر بلاسٹنگ ہونے والی تھی' سرخ رنگ کے جھنڈے لہراتی ہوئی گاڑی گھوم رہی تھی۔ آخری سائرن چیخا جس کا مطلب تھا کہ جہاں کوئی ہے' وہاں دَبک جائے۔ مجھے معلوم نہ تھا' مَیں بے دھڑک ادھر پہاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ ایک پٹھان نے نسوار چرلٹ کرتے ہوئے پشتو میں مجھے کچھ کہا جو یقیناً کوئی دبنگ قسم کی پٹھانی گالی تھی۔ اچھا ہوا' مَیں پشتو سے نابلد تھا ورنہ خوامخواہ موڈ خراب ہوتا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی گالی میرے سر پر سے گزر گئی

ہے تو اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں گہرافشانی کی۔

"او' خانہ خراب کے پُتّر' اِدھر بیٹھ جاؤ۔ ادھر بم پھوٹنے والا ہے۔"

مَیں فوراً" بیٹھ گیا۔ انہوں نے دامنِ کوہ میں پٹھان بٹھا رکھا تھا جو سامنے ایک آڑ میں سمٹا ہوا مجھے خونباز نظروں سے گھوُر رہا تھا۔۔۔ الٰہی خیر! بلاسٹنگ سے تو شاید بچ جاؤں' پٹھان سے بچ نکلنا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ پانچ دس منٹ خوب دھماکے ہوئے' دُور پہاڑی پہ بڑے بڑے پتھر لڑھک رہے تھے۔ پانچ منٹ مزید گزر گئے' کچھ سکون ہوا تو دوبارہ سائرن چیخا۔ گاڑیوں پہ سفید جھنڈے نکل آئے۔ مزدور کمین گاہوں سے نکل کر مصروف کار ہو گئے۔ وہ پٹھان کپڑے جھاڑتا ہوا میرے پاس آیا۔

"اوئے' تم نہیں جانتا ادھر کیا ہوتا ہے۔ کل دو آدمی مر گیا' تم بھی ادھر مرنے کو جا رہا تھا؟"

مَیں پینٹ اور شرٹ میں تھا' ہاتھ میں ایک چھوٹا بیگ۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ ادھر کسی کو ملنے آیا ہے یا نوکری کی تلاش میں ہے۔ اس نے قدرے ملائمت سے پوچھا۔

"ادھر کس کو ملنا ہے یا نوکری مانگنا ہے؟"

مَیں نے اپنے دوستوں کے نام بتائے کہ ان سے ملنا ہے۔ وہ مجھے دریا کے جانب اشارہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

"اُدھر مدنی خان کے ہوٹل پہ جاؤ' چائے پیو' آرام سے بیٹھو۔ شام کو سارے پنجابی اِدھر ہی بیٹھتے ہیں' کھانا کھاتے ہیں۔۔۔ اس ٹیم کو تو کوئی بھی نہیں ملے گا' سب اپنی اپنی ڈیوٹی پہ ہیں۔"

ہوٹل کیا تھا' فوجیوں کا کیموفلاج کیا ٹینٹ تھا۔ جابجا بھیڑ بکریوں کی خشک پوست کے لٹکے ہوئے سڑیل ٹکڑے' غلاظت کے انبار' باہر پتھر کے تھڑے پہ چھ فٹ قطر' لوہے کا چپٹا کڑاہا جس کا آگے کا جھکا ہوا حصہ آگے کے چولہے پہ تھا۔ پچھلا قدرے اٹھا ہوا حصہ جس میں بوری پر ایک خونخوار قسم کا پٹھان بیٹھا ہوا چپل کباب جسے ہم پنجابی پیار سے "چِھتّر کباب" کہتے ہیں' تل رہا تھا۔ وہ پاس پڑی مٹی کی ناند سے قیمہ کا مُچا لیتا۔ اپنے پاؤں سے دو انچ آگے اسی لوہے کے کڑاھے میں انگلیوں سے پھیلاتا۔ کچا انڈا' ہری پیاز کے کترے ڈنٹھل' دادھڑ سُرخ ثابت مرچ اور ثابت خشک دھنیے کے بیج شامل کرکے گوندھتا۔ لڈو سا بنا

کر دو چار لوٹنیاں دیتا' کھُلے ہاتھ برابر پھیلا کر وہیں سے آگے کھَولتی ہوئی چربی میں دھکیل دیتا۔ افریقہ کے آدم خور قبائل بھی اپنے شکار آدمی کو نہلا دھُلا' صاف ستھرا کر کے' صاف مانجھے ہوئے برتن میں بڑی دِھیمی دِھیمی آنچ پہ دَم پُخت کرتے ہیں۔ اِرد گرد بھنگڑا ڈالتے ہوئے اس کی تفریحِ طبع کا سامان پیدا کرتے ہیں' وقفے وقفے سے نیزے کی اَنی سے اس کے گلنے کا مزاج پوچھتے رہتے ہیں۔ اس اُجڈ پٹھان کو اتنا سلیقہ بھی نہیں تھا کہ جس کڑاھے میں تَل رہا ہے' وہیں خود بھی گندے ننگے پاؤں بیٹھا ہے۔ قیمہ بھی دیکھا۔ جو قیمہ ہم نے پنجاب میں دیکھا وہ سرخ یا گلابی رنگ کا ہوتا ہے۔ ان کا قیمہ سفید رنگ باجرا' مکئی کا آٹا' پسے ہوئے جَو' قیمہ بھی شاید کہیں ہوتا ہو گا جو شرما کر اپنا مُنہ ڈھانپ لیتا ہو گا--- پہلے تو ہم کافی دیر ذرا فاصلے پہ کھڑے' اس کے کارنامہ ہائے کباب ملاحظہ کرتے رہے۔ جب خوب کباب ہو لئے تو آگے بڑھ کر سلام داغا۔

"کتنے کباب کھاؤ گے---؟" اس نے بھوکا سمجھ کر پوچھا۔

"شام کو کھاؤں گا--- میرے کچھ دوست یہاں بجلی کا کام کرتے ہیں' ان سے ملنا ہے---"

"بابا' نام بولو۔ ادھر تو سینکڑوں آدمی بجلی کا کام کرتے ہیں۔"

مَیں نے اپنے دوست عزیز الرحمٰن اور اقبال چوہدری کے نام بتائے--- وہ تو کِھلکھلا اُٹھا۔

"جان برادر! ادھر بیٹھو' کھاؤ پیو--- وہ اپنا جگر ہیں' شام کو آئیں گے--- تم کھاریاں سے آیا ہے۔ تم شاہ جی ہے' عزیز الرحمٰن نے ہم کو بتایا تھا کہ شاہ جی ادھر ملاقات کے واسطے آئے گا---"

"خان صاحب! میرا نام محمد یحیٰی---"

"شاہ صاحب' چھوڑو--- ہم سیدّوں کا کُتا ہے' ہم نام نہیں لیتا--- بے ادبی' توبہ توبہ---"

وہ خود اُٹھا۔ ہمارے لئے چارپائی جھاڑی' ٹھنڈی بوتل منگوا کر پلائی۔ آگے پیچھا بچھا جا رہا تھا۔ ہم اندر سے ہلے ہوئے تھے' یہ شاہ جی والا چکر سمجھ نہیں آ رہا تھا اور پٹھانوں سے کون متھا پھوڑے۔ پھر خیال آیا کہ عزیز الرحمٰن کا کوئی اور ملنے والا ہو گا جو سیدّ ہو گا' یہ

اس کے مغالطے میں مجھے شاہ جی سمجھ بیٹھا ہے--- مَیں بتانا بھول گیا کہ ہمارے چہرے پہ ہلکی ہلکی داڑھی بھی تھی۔ باتیں تو ہماری ہمیشہ سے لچھے دار رہی ہیں۔ وضع قطع' لہجے میں بھی قدرے دَرویشانہ رنگ ہوتا ہے' اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں اور ہمیں کوئی توپ قسم کی چیز سمجھ لیتے ہیں۔ شاہ جی کا لاحقہ تو ابھی تک کسی نہ کسی طور میرے ساتھ چمٹا ہوا ہے' تردید کرتے ہوئے بوڑھے ہو گئے۔ اب تو بس استغفراللہ پڑھ کر چپُ رہتے ہیں' نام کے ساتھ خان کو نمایاں لکھتے ہیں لیکن اس کو کیا کہئے کہ جو خان کو شاہ ہی پڑھنے پر بضد ہو۔

کسی نہ کسی طور دوپہر سے شام کی۔ مزدور اور دوسرے لوگ آنا شروع ہوئے لیکن جن شیطانوں کی راہ میں ہماری آنکھیں پتھرئی ہوئی تھیں وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مدنی خان نے بوتلیں اور اسپیشل انڈوں والے چھِتر کباب کھلا کھلا کر ہمارا انست مار دیا ہوا تھا۔ پکا ارادہ تھا کہ عزیزالرحمٰن سے سلام دعا ہی چھِتّروں سے شروع کروں گا۔ اس شُدنے سے کچھ بھی بعید نہ تھا۔ شکر ہے کہ اس نے ہمیں سیدّ ہی بنایا' منشّیات کا تاجر نہیں ورنہ مدنی خان مجھے کب کا باڑھ کے اس طرف علاقہ غیر میں پہنچا چکا ہوتا۔ یہ گجراتیا تھا' تیکھے حرفوں کا بنا ہوا' بہت بڑا رنگ باز' شرارتی' ہر لحظہ کسی نئی شرارت کی کھوج میں رہتا۔ نچلا اور چکنی مٹی' آپ اسے کچھ بھی کہہ دیں' کسی بھی حد تک بے عزت کر لیں' وہ مسکراتا ہوا پھر آپ کی دُم میں تڑتڑی پٹاخہ باندھ دے گا۔ اس کے باوجود وہ بے انتہا مخلص تھا۔ یاروں کا یار' دل و جان سے مدد کرنے والا' شعروشاعری اور موسیقی کا رسیا۔ بے پناہ اشعار اسے یاد تھے' سُر اور لَے میں بھی تھا۔ میری اس کی دوستی بھی شعرو شاعری اور موسیقی کے حوالے سے تھی۔ وہ میرے ترنّم کا عاشق اور مَیں اس کی گائیکی اور سُریلی آواز کا دیوانہ--- مَیں نے اسے دوُر سے دیکھ لیا' بیلی برج پہ وہ اپنی گینگ کے ساتھ حسبِ معمول شرارتیں کرتا ہوا آ رہا تھا۔ مَیں مسکراتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اچانک وہ مجھے یہاں دیکھے گا تو کتنا خوش ہو گا۔ آج ساری رات خوب ہنگامہ آرائی' گلوکاری ہو گی۔ وہ مجھ سے "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" اور "جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں" اصرار کر کے بار بار سنے گا اور مَیں اس سے استاد جلال آبادی کی غزلیں سنوں گا۔ پھر لطیفے ہوں گے۔ وہ میرے منع کرنے کے باوجود گندے لطیفے سنسر کئے بغیر سنائے گا۔ میرے ناک بھوں چڑھانے پہ کہے گا کہ ایمان سے بتائیں' مزہ آیا ہے یا نہیں؟ پھر خود ہی جواب دے گا

کہ مزہ تو آیا ہے' چہرہ ہی بتا رہا ہے۔ اچھا' ناراض نہ ہوں ایک اور لطیفہ' پورے کا پورا سنسر کر کے--- میں مسکرانے لگوں گا تو پھر شروع ہو جائے گا--- اس نے مجھے برج سے اُترتے ہی دیکھ لیا تھا۔ بَرنوٹے کی مانند قلانچیں بھرتا آیا اور سینے سے چمٹ گیا۔ مدنی خان بھی دیکھ کر بَرات سے باہر نکل آیا۔ اسے آتے دیکھ کر گھبراتے زئلی نے سرگوشی کی۔

"مجھ سے ایک غلطی ہو گئی ہے' مَیں نے آپ کو یہاں بڑے اونچے شاہ صاحب کی حیثیت سے متعارف کروایا ہوا ہے--- پلیز! آپ کوئی ہنگامہ نہ کھڑا کروایئے بلکہ خاموشی سے برداشت کرتے رہئے غلطی تو ہو گئی ہے۔ اگر اس بدمعاش کو اس کا پتہ چل گیا تو گولی چل جائے گی--- اور یہاں مُردوں کو' خاص طور پر پنجابیوں کے مُردوں کو دفن نہیں کرتے' اس دریا میں پھینک دیتے ہیں کہ پنجابی' پنجاب میں لاش وصول کر لیں گے۔"

مَیں تو پہلے ہی اس کی اس مذموم حرکت پہ جُلا بُھنّا بیٹھا تھا' اس کی یہ ہَرزہ سرائی سن کر آگ بگولا ہو گیا۔

"عزیزالرحمٰن! تم سے تو مَیں علیحدگی میں نبٹوں گا۔" مدنی خان سر پہ پہنچ چکا تھا۔

"اوئے یار' عزیز الرحمٰن! تمہارا دوست شاہ صاحب' اِدھر آیا اور سارا دن تیرا انتظار کیا۔ خو' تم ہم کو بتاتا' ہم پشاور جا کر شاہ صاحب کا استقبال کرتا' ہار پہناتا--- تم کیسا دوست ہو' شاہ صاحب اِدھر بکری کی مانند بھٹکتا تم کو تلاش کرتا رہا۔" وہ میرا ہاتھ چومتے ہوئے بولا۔ "شاہ صاحب ہمارا مہمان--- تم جاؤ اپنا کام کرو---"

دوستوں کی ساری منڈلی' چارپائیوں پہ بیٹھ گئی۔ کبابوں' چھابے برابر بڑی بڑی روٹیوں اور پیاز کے علاوہ اگر کچھ تھا تو وہ بوتلیں تھیں جنہیں ٹھونس ٹھونس کر مَیں بیزار ہو چکا تھا۔ اُدھر مدنی خان ہم سب کے لئے اسپیشل انڈوں والے کباب کوٹ رہا تھا اور زور زور سے پشتو میں باتیں بھی کرتا جا رہا تھا۔ پشتو ایک مستند زبان ہے' عامتہ النّاس کے علاوہ یہ شعراء' صوفیاء امراء کے لئے بھی ذریعہ اظہار و ابلاغ اور وجۂ جلال و جمال رہی ہے۔ کراچی سے گوادر' گنڈون' بلوچستان' ایران' کابل و قندھار' روس کی ریاستوں تک بولی سمجھی اور لکھی جاتی ہے۔ اس میں شاعری اور نثر بھی کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے مگر ہماری بدقسمتی یا کور سمجھی کہ ہم اس سے استفادہ نہ کر سکے۔ موسیقی کی زبان میں اس میں کومل سُر نہیں' تیور سر ہیں۔ اس زبان میں اظہارِ محبت بھی بہ انداز دگر ہوتا ہے۔ یہ گُردے

کپورے کی ٹکاٹک جیسی زبان ہے' اس زبان سے شاہی ٹکڑے یا بالائی کی لوَز نہیں بنائی جا سکتی۔ یہ گولیوں کی دَھڑ دَھڑ ہے۔ جھَرنوں کی ترنّم ریزیاں اس میں نہیں' اس میں دَمدموں کے دَھماکے ہیں۔ بانسری کی رُوح میں اُترتی تان کی لہک اس میں نہیں' یہ خالص ان مَردوں کی زبان ہے جو جلال مآب ہوں۔ صاحبِ جمال اور آئینہ خیالوں سے یہ لگا نہیں کھاتی۔ اس زبان میں سرگوشی نہیں ہو سکتی' شور مچایا جا سکتا ہے' اعلانِ جنگ کیا جا سکتا ہے۔ صلح و آشتی' امن و امان کی سہج گفتگو اس کا مزاج نہیں۔ پشتون' نکاح کی ہاں کرے یا طلاق کے الفاظ تین بار دھرائے' لہجے کا آہنگ' دبنگ ہی رہتا ہے۔

بہرحال' مَیں نے پہلے بھی عرض کی ہے کہ یہ میری جہالت اور ناسمجھی ہے کہ مَیں اس عظیم اور قدیم زبان کے باطنی محاسن کو کماحقہٗ سمجھ نہ پایا حالانکہ مَیں خود بھی افغانی شیروانی پٹھان ہوں' یقیناً میرے بزرگوں کی بھی یہی پشتو اور فارسی زبان رہی ہو گی۔ فارسی سے یاد آیا کہ لہجے کی شیرینی' الفاظ کی نرم خوئی' مترنم آہنگ اور چھوٹے چھوتے جملوں کی نشست و برخاست کا جو قرینہ اور خوبصورت اسلوب عربی اور فارسی میں ہے وہ اور کہاں نظر آئے گا۔ اس کے بعد ایسی ہلکی سی جھلک فرانسیسی یا ترکی زبان میں پائی جاتی ہے۔ شیرینی اور ملائمت کے جرثومے سرائیکی اور پوربی' سندھی میں بھی پائے جاتے ہیں۔ ہندی' بنگالی' انگریزی' پنجابی اور اردو بتدریج بعد کی چیزیں ہیں۔ روسی' جرمن' اٹالین' اسپینش' رومن اور افریقن زبانوں کا ذِہن کچھ علیحدہ ہی ہے--- بات ہو رہی تھی مدنی خان کی گالیوں کی کہ وہ چھتر کباب تیار کرتے ہوئے اپنے ملازموں کو ہمارے بارے میں ہدایات جاری کر رہا تھا۔ مَیں نے موقع پاتے ہی عزیز الرحمٰن کی دُم پہ پاؤں رکھا۔

"اُلّو کی دُم! یہ تم مجھے یہاں شاہ جی بنا کر کون سا چکر چلایا ہے--- جانتے ہو کسی غیر سید کو سید کہنا یا کہلوانا' کتنا بڑا گناہ ہے۔ مَیں تو ابھی مدنی خان کو ساری حقیقت بتاؤں گا۔ نتیجہ کچھ بھی نکلے' کم از کم مَیں تمہاری اس حماقت میں شامل نہیں ہوں گا--- کیا تم بار بار اس لئے مجھے یہاں آنے کی دعوت دے رہے تھے کہ یہاں مجھے سیّد بنا کر میرا مذاق اُڑاؤ--- یاد رکھو' پٹھان خاص کر سیّدوں کے بارے میں بڑے سنجیدہ ہوتے ہیں' یہ ان کا بڑا احترام کرتے ہیں--- غور سے سنو' میں تمہیں ایک دو نمبر سیّد کا واقعہ سناتا ہوں۔ تھا وہ مصلی دو چار دینی کتابیں' موٹے موٹے مسئلے مسائل اور چند سورتیں یاد کر کے' داڑھی

بڑھا' چوغہ پہن کر وہ پیر بن بیٹھا۔ نام کے ساتھ سیّد اور قادری صابری بھی لگا کر اُلٹے سیدھے تعویذ گنڈے بھی کرنے لگا' ایک دیہاتی مسجد سنبھال کر امام بن بیٹھا۔ دال ساگ سے جب معدہ پتلا پڑا اور سادہ لوح انسانوں کو شیشے میں اتارنے کا کچھ تجربہ بھی ہو گیا تو کسی نئے جزیرے کی کھوج میں وہاں سے بھاگ لیا۔ اس کی قسمت بُری کہ وہ گھُومتے گھُومتے ادھر سرحد میں پٹھانوں کے پاس آ گیا۔ ایک گاؤں کے حجُرے میں مہمان پڑا رہا۔ آدمی شاطر اور رنگ باز تھا۔ دو چار روز میں اس نے گاؤں کے سادہ لوح لوگوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں اور سیدّ ہونے کی نوید سُنا کر شیشے میں اتار لیا' اتفاق سے گاؤں کا بڑا خان کسی مقدمے میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے اسے ایک عمل کرنے کو بتایا اور خود بھی چِلّہ کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اس کا 'تکا' تیر بن کر بیٹھا تھا۔ خان تو کیا' سارا گاؤں اور آس پاس کا علاقہ اس کے مُرید ہو گئے۔ اتفاق سے کچھ اور لوگوں کے بگڑے کام بھی بن گئے--- گاؤں والوں نے اسے سیّد بادشاہ اور اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے لئے ایک شاندار حجُرہ تعمیر کروایا' رات دن اس کی خدمت اور خاطر میں رہنے لگے--- بہترین کھانے' قیمتی کپڑے' سونا چاندی' نذرانے' اناج۔ کچھ ہی عرصے بعد جب اس نے کافی مال و دولت جمع کر لیا تو خیال آیا کہ کہیں میرا جھوٹ اور رنگ بازی پکڑا نہ جائے۔ بہتر ہے کہ یہاں سے بھاگ لو مگر مُرید اور خدمت گزار ایسے تھے کہ رات دن کے کسی لمحے بھی اس کی حاضری سے دُور نہ رہتے تھے۔ گاؤں تھا' آنے جانے والوں پہ میلوں نظر رہتی تھی۔ بھاگنے' نکلنے کا موقع مشکل تھا۔ آخر ایک دن خان سے کہا کہ بہت عرصہ ہو گیا۔ میرے کچھ مُرید اور عزیز پنجاب میں بھی رہتے ہیں' چند دنوں کے لئے وہاں جانے کا قصد ہے۔ ان کے بھی مسئلے مسائل ہیں اور ویسے بھی کسی سیّد اور اللہ والے کا ایک جگہ پہ ٹِک کر بیٹھنا مناسب نہیں ہوتا۔ اس کا کام اللہ کی زمین پہ گھُوم پھر کر اس کی مخلوق کی دستگیری کرنا ہے--- گاؤں والے' مُرید اور خاص کر بڑا خان بڑے کبیدہ خاطر ہوئے۔ وہ تو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے شاہ صاحب کی جُدائی کا تصوّر نہیں کر سکتے تھے۔ گاؤں والوں نے ان کی تکریم و تہذیب میں اور اضافہ کر دیا' نذرانے اور چڑھاوے اور بڑھا دیئے کہ کسی طرح شاہ صاحب مراجعت فرمانے کا ارادہ بدل دیں۔ شاہ صاحب کی جیبیں نوٹوں سے پھٹی پڑ رہی تھیں' کلّے پہ کلّہ چڑھا ہوا اور توند' بکرے اور تکّے کھا کھا کر اپنی حدود سے تجاوز کر چکی تھی۔ آخر ایک دن موقع پا کر وہ نکل لئے' ابھی چند

قدم ہی بڑھائے تھے کہ بسم اللہ' اللہ اکبر' اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ فائر کی آواز گونجی' پھر دوسرا' تیسرا۔ شاہ صاحب کے جسم سے کسی سوراخ زدہ ٹینکی کی مانند خون دھاروں کی صورت میں نِکل کر زمین کو سُرخ کر رہا تھا۔ شاہ صاحب کے کچھ سانس باقی تھے۔ بڑا خان بچوں کی طرح روتا سسکیاں بھرتا پاس آ کر سر مبارک زانو پہ رکھ کر اپنے کئے کی معافی کا طلب گار ہوا' بولا کہ شاہ صاحب!--- آپ کی جُدائی ہم برداشت نہیں کر سکتے' ہم سب آپ کے بغیر زندہ رہنے کا تصوّر نہیں کر سکتے۔ ہماری خطا معاف کر دیں۔ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ مَیں کابل کے سنگ مرمر سے آپ کا مرقد بنواؤں گا۔ ہر سال عرس پہ بڑے بڑے قوّال بلواؤں گا' خود مجاور بن کر آپ کے مزار پہ بیٹھوں گا۔ آپ مجھے اپنا خلیفہ مقرر فرما دیں۔ ادھر شاہ صاحب کے آخری گھنگرو بج رہے تھے' آنکھیں تارے لگی ہوئی تھیں' بھلا وہ کیا خرقہ یا خلافت عطا کرتے۔ یہ کام بھی بڑے خان نے بصدِ مجبوری اور شاہ صاحب کی معذوری کی بنا پہ خود ہی انجام دے لیا۔ نوٹوں اور سونے چاندی کے زیورات سے بھرا ہوا شلوکا زبردستی اتار کر خود پہن لیا۔ ایک کھوٹا روپیہ بھی نکلا جو شاید شاہ صاحب کی حلال کی کمائی کا تھا۔ اسی شام بڑے سوگ و غم کی فضا میں' کھوٹے روپے کے ساتھ' کھوٹے شاہ صاحب کو حجرے کے اندر قبر میں اتار دیا گیا۔ باہر لکھوا دیا گیا' مزارِ اقدس سیّد سجاول حسین شاہ' قادری صابری!"

چھتر کبابوں کی سڑاند یہاں چارپائیوں تک مار کر رہی تھی اور یہاں جیسے سارے شاہ صاحب کی طرح مَرے ہوئے تھے۔ عزیزی عزیزالرحمٰن کی ساری شگفتگی میرے قصّے نے جیسے چوس لی۔ وہ رَس نکلے گنے کی طرح لُجلجا سا دکھائی دے رہا تھا' مَیں نے اسے ہلایا۔

"مَیں یہ کباب پانچویں بار زہر مار کر کے' خاموشی سے پشاور نکل جاؤں گا۔ اس مدنی خان کے روپ میں مجھے میرے قصّے والا بڑا خان نظر آ رہا ہے--- ذرا سوچو! مَیں اور مدنی خان کی ہوم میڈ رائفل کی گولی' میرے ساتھ بڑی زیادتی ہے' بھئی' مَیں تو ماتھے پہ پڑی تیکھی چتون یا کسی نازوالے کی نگاہِ غلط سے ہی فوت ہو جانے والا معصوم سا انسان ہوں۔ میرے ساتھ میرے گھروالوں سے دُور یہ ظلم نہ کرو۔ مَیں تو انہیں ان کے لئے کپڑا لانے کا لالچ دے کر یہاں آیا تھا اور تم ان سے میرے لئے کفن منگوانے کا انتظام کر رہے ہو۔"

وہ مجھ سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ "تم نے یہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا قِصّہ

مجھے کھاریاں میں کیوں نہیں سنایا۔ اگر وہاں کہیں میرے کانوں میں ڈال دیتے تو مَیں تمہیں یہاں کوئی راجہ' چوہدری یا ملک' شیخ وغیرہ بنا دیتا۔"

"پیارے بھائی! وہاں کھاریاں میں کوئی مدنی خان پٹھان نہیں تھا--- ویسے تمہیں میرے خان ہونے پہ کیوں اعتراض ہے۔ یہ لوگ بھی پٹھان ہیں' اگر تم مجھے سیّد کے بجائے پٹھان ہی رہنے دیتے تو یہ کیا مجھے گولی مار دیتے؟ مَیں تو اسے صاف صاف بتا دوں گا' مَیں پٹھان ہوں' سیّد نہیں چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے---" مَیں نے فیصلہ کنُ لہجے میں کہا۔

"نہ' نہ--- خدا کے لئے ایسا غضب مت کرنا۔" وہ بولا۔ "واقعی مجھ سے غلطی سرزد ہو گئی ہے اور اس کے لئے تم سے معافی چاہتا ہوں' دراصل میرے منہ سے نکل گیا تھا اور جب تیر کمان سے نکل ہی گیا تو سوچا کہ چلو تمہیں سیّد بنا کر ہمارا بھی یہاں ٹھکہ بن جائے گا۔ یہ مدنی خان سیّدوں کی بڑی عزت کرتا ہے۔ اسی کی وجہ سے یہاں ہم پنجابی ٹِکے ہوئے ہیں ورنہ یہاں کے پٹھان کبھی کے ہمیں غائب کر چکے ہوتے۔ یہ مدنی خان یہاں کا بدمعاش اور مقامی باشندہ ہے۔ اسے یہاں "مولوی بدمعاش" کہتے ہیں۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں' یہ اس کی آبائی زمین تھی۔ ڈیم کا منصوبہ بنا تو اس نے کمپنی کے ساتھ پھڈا ڈال دیا' بڑی مشکلوں کے بعد منہ مانگی قیمت اور دیگر بہت سی مَراعات لے کر اس نے جان چھوڑی۔ یہ تو یہاں کسی کو ہوٹل تک بنانے نہیں دیتا۔ یہ اس کا واحد ہوٹل ہے جہاں کے غلیظ کباب کھانے پہ سب مجبور ہیں۔ سائیکل اسٹینڈ کا ٹھیکہ اور آنے جانے پہ ٹول ٹیکس بھی یہی لیتا ہے۔ کئی مقامی اسلحہ بردار غنڈے اس کے کارندے ہیں' علاقہ غیر سے اسمگلنگ بھی کرتا ہے لیکن ہے بڑا مذہبی' پانچ وقت کا نمازی اور ہمدرد قسم کا انسان' سیّدوں کا غلام اور غیر ملکیوں کا دشمن---"

"ہو گا' مجھے کیا لینا دینا---" مَیں نے بیزاری سے کہا۔ "کل مَیں واپس جا رہا ہوں--- ویسے دوستی کے ناتے' میرا مشورہ ہے کہ یہ پنجاب نہیں' علاقہ غیر ہے۔ تم اپنی اُلٹی سیدھی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ میری مانو' تو واپس کھاریاں آ جاؤ۔ گھر بھی نزدیک اور اپنے لوگ' اپنا علاقہ---"

"مَیں تو تمہیں یہاں روکنا چاہتا ہوں اور تم مجھے وہاں جانے کا مشورہ دے رہے ہو؟"

میرے دوست نے کہا۔ مدنی خان کبابوں اور روٹیوں سمیت آ گیا اور بولا۔

"شاہ صاحب! بڑے کڑک کباب بنائے ہیں' خوب پیٹ بھر کر کھاؤ' بعد میں گرما گرم قہوہ بھجواتا ہوں۔"

اس کے جاتے ہی مَیں نے کبابوں کو زہر بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا۔

"اگر تم مجھے یہاں سپروائزر بھی لگوا دو اور ہزار روپے تنخواہ بھی دلوا دو تو پھر بھی مَیں یہاں رکنے والا نہیں--- مجھے پاگل کتے نے کاٹا ہے جو گھر کی نزدیکی لالہ موسیٰ کی محفلیں' دیسی کھانے' مرغیاں انڈے چھوڑ کر یہاں ویرانے میں چھتر کباب اور یہ جناتی روٹیاں توڑتا پھروں---"

وہ کمبخت ایک بڑا سا نوالہ توڑ کر مجھے کھِلانے کی کوشش کرتے ہوئے ہنسا۔ "شاہ جی!--- سوری' خان صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو مَیں آپ کو محض پیار سے شاہ صاحب کہہ لیا کروں؟"

مَیں نے اسے گھُورا۔ "تم اتنے چکنے گھڑے ہو کہ معقولیت کی ایک بوند تک تم پہ نہیں ٹھہرتی۔ تم نے اپنی بیہودگیوں سے باز تو آنا نہیں لہٰذا تم کل صبح تک جو چاہو' مجھے کہہ لو---"

کسی مسمریزم کے عامل کی طرح میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر پوچھنے لگا۔ "کیا آپ کسی کا ذہن بھی پڑھ لیتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟" مَیں نے اظہار حیرت کیا۔

"یقین کریں' مَیں یہی سوچ رہا تھا کہ آپ کو یہاں سپروائزر کی جاب دلواؤں گا---" اس نے خوشخبری سنانے والے انداز میں کہا۔ "انہیں ضرورت بھی ہے اور آپ کے پاس تجربہ بھی' اچھی معقول تنخواہ ملے گی۔ ہم سب کا وقت بھی اچھا گزرے گا۔" میرا ہاتھ تھامے ہوئے التجا کرنے لگا۔ "یار خان! تمہارے بغیر یہاں دل نہیں لگتا۔"

مَیں نے اس سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔ "نامعقول انسان! مَیں یہاں کسی قیمت پہ نہیں رہ سکتا--- مَیں وہاں الیکٹریشن ہی بھلا--- تم چھڑیئے انسان ہو' میرے جیسے تم کئی یہاں جمع کر سکتے ہو۔"

کھانا پینا ہوا تو پشاوری قہوے کی چینک آ گئی' مدنی خان بھی فارغ ہو کر پاس آ بیٹھا۔ دو گندے چھوکروں کو میرے انکار کے باوجود میرے پاؤں دابنے پہ لگا دیا اور ساتھ ہی پٹھانی لہجے میں کہنے لگا۔

''اوئے' شاہ صاحب! آپ اِدھر آئے' میرا دل باغ باغ ہو گیا--- ادھر سب ہمارا بات چلتا ہے' بھائی عزیز الرحمٰن نے ہمیں سب کچھ بتایا۔ آپ بہت نیک' پڑھے لکھے' اچھے انسان ہیں۔ ہم سب اِدھر گدھے کے مافق ہیں۔ آپ اِدھر رہے گا' ہم کو اللہ رسولؐ کی باتیں بتائے گا' قرآن شریف سکھائے گا۔ ہم سب آپ کی بہتر خدمت کرے گا۔ ہم بہت خوش ہے کہ اللہ پاک نے ہمارے پاس ایک سیّد بادشاہ بھیجا ہے۔''

عزیز الرحمٰن نے لقمہ دیا۔ ''خان صاحب! شاہ جی کھاریاں میں ہی رہنا چاہتے ہیں--- کہتے ہیں' ادھر ان کا دل نہیں لگے گا۔''

''اوئے عزیزا' ان کا دل اِدھر کیسے نہیں لگے۔ ہم ان کا دل بالکل اِدھر لگائے گا--- ادھر شاہ صاحب کو مسجد کا امام بنائے گا' چپل کباب اور دُنبے کے تِکّے کِھلائے گا' قہوہ' کشمش' اخروٹ اور بادام کھلائے گا--- بابا' دل کیسے نہیں لگے گا؟''

مَیں نے بصد اَدب عرض کیا۔ ''خان صاحب! ادھر کھاریاں میں ہم ملازمت کرتا ہے۔ وہاں سے ہمارا گھر بھی نزدیک ہے' ہر ہفتے ہم گھر ماں باپ اور عزیزوں کو ملنے جاتا ہے۔ ادھر کا پانی' چپل کباب اور تنور کی موٹی روٹی بھی ہمیں موافق نہیں۔ ہمارا پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔''

''شاہ صاحب! آپ عالم آدمی ہیں' اتنا چھوٹی بات ہی نہیں سمجھتا--- کتنا پختون بھائی ادھر پنجاب میں محنت مزدوری کرتا ہے۔ ان کا بیوی بچہ' مائی باپ ادھر ہوتا ہے--- ادھر وہاں سے اچھا نوکری ہم آپ کو دلائے گا۔ گولی مارو چپل کباب کو' ہم آپ کو حجرہ رہنے کے لئے دے گا' مرغی انڈا ادھر آئے گا۔ ادھر آپ کے رہنے سے لوگوں کا بھلا ہو گا۔ یہاں سب تیلی' مصلّی اور خدائی خوار جولاہے کا بچہ اکٹھا ہو گیا ہے۔ آپ سیّد بادشاہ' بہت برکت ہو گا۔''

''خدایا! کہاں پھنس گیا---'' مَیں نے دل میں سوچا' اس سیدھے سے پٹھان کو کیا معلوم کہ ہم کیا ہیں۔ ہمارے رتجگے' تاش کی بازیاں' موسیقی کی محفلیں' گندے لطیفے'

سینما' فلمی رسالے' شطرنج' جن کے بغیر پردیس کٹتا ہی نہیں۔

دَریا کے ساتھ جنگلی بیریوں کا جُھنڈ تھا۔ دریائی پتھر جمع کر کے ایک چھوٹا سا ہموار تھڑا سا بنا کر مسجد کی صورت بنائی ہوئی تھی۔ تین چار چٹائیاں بچھی تھیں--- امام کے آگے محراب کی جگہ مٹی کا ایک اُلٹا گھڑا پڑا تھا' وہیں ایک پٹھان لڑکا اذان دے رہا تھا--- مدنی خان اٹھتے ہوئے بولا۔

''بسم اللہ شاہ صاحب! پہلی برکت' آپ نماز پڑھائیں---''

مَیں نے ذبح ہونے والے بکرے کی طرح عزیز کی جانب دیکھا' وہ کم بخت نظریں چُراتا ہوا زیرِ لَب مسکرا رہا تھا۔ مَیں نے **یاحل المشکلات** کا وِرد شروع کر دیا--- مَیں اور اَمامت؟ ٹھیک کہ مَیں بالغ تھا' اس عمر میں جتنی دین کی سمجھ بوجھ ہونی چاہئے وہ بھی شاید تھی۔ داڑھی بھی لیکن 'فیشنی' مقتدی تو بن سکتا تھا مگر امامت کا اہل ہرگز نہیں تھا۔ بچپن کی چند سورتیں رَٹی ہوئی تھیں' زیرِ لَب دُہرانے لگا۔ امامت بھی ایک طرح سے پروفیشن بن گئی ہے۔ آئمہ حضرات کے ہاں جو انداز' لہجہ' نشست و برخاست اور جو مخصوص دُعائیں اور وِرد ہوتے ہیں وہ کہاں سے لاؤں گا؟--- دل دُھک دُھک کر رہا تھا اور پاؤں لرز رہے تھے۔ عزیز الرحمٰن میری کیفیت اور تیور دیکھ کر چُپکے سے دریا کی جانب کِھسک لیا۔ دائیں بائیں سے لوگ اکٹھے ہو رہے تھے۔ بوڑھے' جوان' بچے۔ چار و ناچار اُٹھا۔ جب انسان کے لئے کوئی چوائس ہی باقی نہیں رہتی اور صرف ایک ہی راستہ سامنے ہوتا ہے تو پھر خود بخود ہمت اور اعتماد پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر موت اسی جگہ لکھی ہے تو پھر مجھے اس قصّے والے جھوٹے پیر کی طرح پیٹھ پہ گولی کھا کر نہیں مرنا چاہئے' نماز پڑھتے پڑھاتے اگر یہ وقت آ جائے تو بہتر ہے--- دَریا کے کنارے لوگ بڑی آزادی سے طہارت اور وضو کر رہے تھے۔ کم بخت عزیز الرحمٰن اور دوسرے دوست ذرا آگے نکل گئے ہوئے تھے۔ مَیں بھی اللہ کا نام لے کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر وضو کرنے لگا۔ اتفاق تھا یا میری امامت کا تماشا لگنا تھا کہ اچھے خاصے لوگ جمع ہو گئے۔ مسجد کے باہر بھی چٹائیاں بچھ گئیں۔ دو چار کمپنی کی گاڑیاں بھی آئیں۔ افسر ٹائپ کے کچھ سوٹڈ بوٹڈ لوگ بھی تشریف لے آئے۔ سُنتوں سے فارغ ہوئے تو مدنی خان سر پر ٹوپی جماتے ہوئے اٹھا۔

''بھائیو! ہمیں بہت خوشی ہے کہ آج سے شاہ صاحب جو کھاریاں سے آئے ہیں'

ہمیں نماز پڑھایا کریں گے۔"

اس نے مجھے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ مَیں نے کَن اکھیوں سے عزیز الرحمٰن کی جانب دیکھا جو میری دائیں طرف دو چار نمازی چھوڑ کر سر جھکائے بڑا مومن بنا بیٹھا تھا۔۔۔ "بچو! اگر آج میں یہاں سے بچ گیا تو تو میرے ہاتھ سے نہیں بچے گا۔۔۔" مَیں دل ہی دل میں اسے کوس رہا تھا۔ اچانک میرے اندر سے ایک آواز ابھری کہ یہ مسجد ہے۔ تو جیسا بھی ہے لیکن یہ سادہ لوگ تجھے سیّد سمجھ کر تیری اقتدا میں نماز پڑھیں گے۔ اللہ قبول کرنے والا ہے جب کہ تو جانتا ہے کہ تو سیّد نہیں۔ ان لوگوں کو دھوکے میں نہ رکھ' ان کی نماز ضائع نہ کر' یہ گناہ اپنے کھاتے میں نہ ڈال۔ کوئی تیرے پیچھے نماز پڑھے' نہ پڑھے تو ان کو سچ بتا دے' انجام کچھ بھی ہو۔ اپنے ضمیر کی آواز کو نہ دبا' اللہ کے گھر میں کسی سے نہ ڈر۔ اُٹھ ہمت کر۔۔۔ مجھے جیسے کسی نے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

"بھائیو! میرے بھائی نے میرے متعلق جو فرمایا ہے' مَیں اس میں صرف ایک بات کی تصحیح کرنا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔۔۔ مَیں ایک کمزور سا مسلمان ضرور ہوں لیکن سیّد نہیں' میرے بھائی مدنی خان کو میری ذات کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے چند دوست جو یہاں کام کرتے ہیں' مجھے پیار سے کبھی کبھی مُرشد یا شاہ جی کہہ دیتے ہیں جبکہ مَیں شیروانی پٹھان ہوں۔ یہاں اس وقت بہت سے بزرگ بھی تشریف فرما ہیں جو ہر لحاظ سے امامت کے اہل ہیں۔ شرعاً" بھی' بزرگوں کی موجودگی میں کسی نو عمر کے پیچھے نماز صائب نہیں۔"

مَیں یہ کہہ کر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی۔ ایک ہاتھ میرے کندھے پر آیا۔

"شاہ صاحب! اٹھو' نماز پڑھاؤ۔"

سر اٹھا کر دیکھا تو مدنی خان تھا۔

"بھائی! مَیں نے وضاحت کر دی کہ میں سیّد نہیں ہوں' آپ پھر مجھے شاہ جی کہہ رہے ہیں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "پیار سے کہہ رہا ہوں خان صاحب!"

تکبیر کے بعد مَیں نے مصلے پہ کھڑے ہو کر مولویوں کی طرح دائیں بائیں صفوں کو

دیکھا' ڈوبی ہوئی لرزتی آواز میں "اللہ اکبر" کہہ کر ہاتھ باندھ لئے' آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں' یوں محسوس ہوا جیسے دل اُبل کر سینے سے باہر آ گرے گا۔ ٹانگوں میں ہلکا سا لرزہ' ہاتھوں کے پنجوں میں کپکپاہٹ' مَیں نے مضبوطی سے ہاتھوں کو ایک دوسرے کی گرفت میں جکڑ لیا۔ چند ثانیے سکوت کیا۔ "اللہ! میری مدد فرما۔" مَیں نے صدقِ دل سے تصوّر کیا۔ "میری نماز قبول کر نہ کر' یہ لوگ جو میرے پیچھے کھڑے ہیں' ان کی نماز کو قبولیت بخش۔" ثنا زیرِ لب پڑھی' قدرے بلند آواز میں سورۃ الفاتحہ شروع کی' اللہ جانے کہاں سے سوز اترا' گداز آیا۔ لحن داؤدی کا القا ہوا' قرأت کی گرہ کھُلی۔ قیام' رکوع' قعدہ' سجود' مختصر سی دُعا۔ الحمد للہ!۔۔۔ "عزتِ سادات" رہ گئی۔ پھر جو مصافحوں کا سلسلہ شروع ہوا تو ختم ہونے ہی کو نہ آیا۔ ہر نمازی خوشی خوشی بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کر رہا تھا۔ مدنی خان نے تو سینے سے سینہ بھی ملایا۔ آخر میں کمبخت عزیز الرحمٰن خجل خجل سے آیا' مصافحہ کیا۔

"شاہ جی! بس اب آپ پکّے۔۔۔"

مَیں نے آہستہ سے کہا۔ "تیری تو۔۔۔ تجھ سے تو بچو! مَیں بعد میں نبٹوں گا۔"

رات مدنی خان نے میرے سونے کے لئے چارپائی اور صاف ستھرے بستر کا اہتمام کیا تھا۔ کپڑے بدل کر "نیکی" لینے کے لئے لیٹ گیا۔ انسان سے بھول چُوک ہو ہی جاتی ہے' بے ارادہ یا محض ضرورتاً" جھوٹ سے بھی کام چلا لیتا ہے۔ کبھی تو کسی کو آزار یا نقصان پہنچانے کا مقصد بھی نہیں ہوتا' محض دل لگی یا تفنّن کے لئے ایسا کر گزرتا ہے۔ یہاں کچھ ایسا ہی تھا' اللہ نے توفیق عطا کی۔ شروع سے ہی شر پیدا کرنے والے جھوٹ کے شرارے کو بجھا دیا تھا ورنہ نہ جانے کتنے جھوٹ اور بولنے پڑتے۔ کوہستانی ٹھنڈی ہوا' دریا کی ترنم ریزیاں' کھُلا آسمان' جھلمل جھلمل کرتے ستارے' سفر کی تھکاوٹ' خوب پاؤں پسارے سویا۔۔۔ علی الصبح کسی پہاڑی جانور کے چیخنے کی آواز پر آنکھ کھلی تو دیکھا مدنی خان دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھا کچھ لوگوں سے باتیں کر رہا ہے۔ بڑے لمبے تڑنگے ڈاکوؤں جیسے پٹھان' ڈھیلے ڈھالے لباس' سروں پر مشہدی کلے' کندھوں پر جھولتی ہوئی خطرناک بندوقیں۔ وہ آپس میں کسی سنجیدہ سے معاملے پر بڑی راز داری سے گفتگو کر رہے تھے۔ مَیں کوئی زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ صبح کے نیم اُجالے میں بڑی بڑی داڑھیاں' خوفناک چہرے بھوتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ نیند اڑ گئی' مَیں خوف اور تجسّس کے مِلے جُلے

انداز میں لیٹے لیٹے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کا آپس میں کچھ لین دین بھی ہوا' کپڑے کی پوٹلیاں اور کرنسی نوٹ ادھر ادھر ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھے اور خار دار آہنی باڑ کی جانب چل دیئے جو ڈیم اور علاقہ غیر یعنی محفوظ کے درمیان حد بندی کے طور پر کھڑی کی ہوئی تھی اور جس پر جا بجا اردو' پشتو اور انگریزی میں وارننگ بھی لکھی ہوئی تھی کہ ڈیم سے متعلقہ عملہ اور دیگر لوگوں کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اس باؤنڈری سے آگے نہ جائیں' بدیں صورت انتظامیہ کسی کے جان و مال کی ذمہ دار نہ ہو گی۔ انہیں باؤنڈری سے پار کروا کر وہ واپس پلٹا--- پہاڑوں کی اوٹ سے دودھیا سا اُجالا ابھر رہا تھا اور ادھر میرے دل میں بھی بے شمار خدشات ابھر رہے تھے۔ مَیں نے اپنے تئیں تہیہ کر لیا کہ کسی صورت بھی یہاں نہیں رہوں گا' یہ جگہ میرے رہنے کے قابل ہی نہیں--- یہ خطرناک سمگلر لوگ ہیں' خوامخواہ کسی مصیبت میں پھنسنے کی کیا ضرورت ہے--- مدنی خان پوٹلیاں لے کر اپنے ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ نیند تو کب کی اُڑ چکی تھی۔ کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا۔ رات بھر کے جگے ہوئے ستارے بھی آنکھیں مل رہے تھے۔ اُٹھا' چپل پہن کر دریا کے سیدھے رُخ چل دیا۔ مَیں رفع حاجت کے لئے کوئی مناسب سی اوٹ تلاش کر رہا تھا۔ یہاں دریا بڑی تیزی اور قدرے شوخیاں کرتا ہوا بہتا ہے پتھروں سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا' چٹانوں سے چھیڑ چھاڑ' جھاگ اڑاتا ہوا۔ یہاں رقص ماہی کا نظارہ بھی دیکھنے کو ملا۔ اَبرق کے ٹکڑوں کی مانند' اُچھلتی مچلتی' چکا چوند پیدا کرتی ہوئی مچھلیاں۔ یہی کچھ دیکھتا ہوا کنارے کنارے بہت دُور نکل گیا۔ واپسی پر جنگلی کیکر کی ایک جھاڑی سے مسواک توڑی' داتن کرتا ہوا آ رہا تھا کہ سامنے مدنی خان کھڑا نظر آیا۔ وہ شاید میری چارپائی خالی دیکھ کر مجھے تلاش کر رہا تھا۔"

"السلام علیکم' شاہ صاحب! آپ صبح صبح کدھر نکل گیا تھا؟"

سلام کا جواب دے کر مَیں نے پھر تردید کی۔ "خان صاحب! مجھے آپ بھائی کہا کریں یا خان صاحب کہہ لیا کریں' آپ کی بڑی مہربانی ہو گی۔"

"شاہ صاحب! چھوڑو اس قصّے کو---" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "جو میرا دل بولے گا' وہی ہم بولے گا--- نماز کا ٹائم ہو رہا ہے۔ آج اذان بھی تم دے گا' ماشاء اللہ آپ کی آواز بہت سُریلی ہے--- آپ وضو وغیرہ کر لیں' مَیں اِدھر بچہ لوگوں کو جگاتا ہوں۔" میرا جواب سنے بغیر وہ جا چکا تھا۔ عزیز الرحمٰن اور دیگر دوستوں کا ٹینٹ ذرا دُور تھا'

اُدھر گیا تو وہ سب گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے' انہیں جگایا۔

"اٹھو' نہا دھو کر وضو کرو--- نماز کا وقت ہو گیا ہے۔"

عزیز الرحمٰن آنکھیں ملتا ہوا بڑی ناگواری سے بولا۔

"یار! ہم نے تمہیں اپنی تفریح طبع کے لئے بلایا تھا اور تم نے یہاں آ کر مُلاگیری شروع کر دی ہے۔ رات بھی ہم انتظار کرتے رہے کہ تاش کی بازی جمے گی مگر تو اُدھر چار پائی بستر دیکھ کر پڑ گیا' بڑا افسوس ہے---" وہ کہنا کچھ اور بھی چاہتا تھا مگر جانے کیوں لحاظ کر گیا۔

"پٹڑی! ابھی کہاں--- تُو نے میرے ساتھ جو واردات کی تھی' میری قسمت اچھی تھی جو سچ بول کر مَیں نے اپنی جان اور ایمان بچا لئے۔ اب دیکھنا' مَیں تیرا کیا حشر کرتا ہوں--- نماز ناشتے سے فارغ ہو کر مَیں سیدھا پشاور جا رہا ہوں اور وہاں سے کھاریاں---"

"اب جانے والی بات دل سے نکال دے' مدنی خان کی اجازت کے بغیر چڑیا بھی کہیں نہیں جا سکتی۔ رات اس نے تمہاری نوکری کے بارے میں پاشا صاحب سے بات کر لی ہے۔ اب تم یہاں سپروائزری بھی کرو گے اور پانچ وقت نماز بھی پڑھاؤ گے۔ اسے کہتے ہیں' چپڑی نالے دو دو یعنی پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔"

"صبح صبح کیا بکواس کر رہے ہو؟--- مَیں اِدھر کھاریاں میں ملازمت کر رہا ہوں' پچاس آدمی میرے نیچے کام کر رہے ہیں' سائٹ کے سٹور کی چابیاں میری جیب میں اور کمپنی کی پک اپ لالہ موسیٰ کھڑی ہے اور تم مجھے یہاں ملازمت دِلوا رہے ہو؟"

"یہ سب معمولی باتیں ہیں۔" اس نے سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ "گاڑی بھی واپس پہنچ جائے گی اور سٹور کی ڈبل چابی آفس میں موجود ہے--- وہاں تمہارے نیچے پچاس کی لیبر تھی' یہاں ڈیڑھ سو آدمی ہوں گے۔ تنخواہ ڈبل سے بھی زیادہ' اور تمہیں کیا چاہئے؟--- بھائی! گھر سے پیسے کمانے نکلے ہیں۔ جہاں فائدہ ہو وہیں کام کرنا چاہئے۔" پھر سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ " مدنی خان تمہاری بے انتہا عزت کرتا ہے۔ یہاں نماز بھی پڑھاؤ' کام بھی کرو اور عیش بھی۔ ہمارا بھی بھلا ہو گا' پنجابیوں کی بھی عزت ہو گی۔"

اس لپاٹئے کے آگے میں زچ ہو گیا اور وضو کر کے مسجد میں آ کر اذان شروع کر دی۔

آج اذان کا لُطف بھی عجیب تھا' مجھے عِلم نہیں کہ ایسا سُوز اور یہ گداز کہاں سے آگیا تھا۔ کبھی کبھی محلے کی مسجد میں جا کر شوقیہ اذان دے لیا کرتے تھے' نعتیں بھی پڑھا کرتے کہ ہمیں۔ ترنم ریزیاں بکھیرنے کا بڑا شوق ہوتا تھا۔ صبح صبح نور ظہور کا وقت' اِرد گرِد ایستادہ پہاڑ' دریا کا کنارہ' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا' بانگ کا بلند و بالا آہنگ۔ رَبِّ کائنات کی بڑائی' اس کے یکتا ہونے کی شہادت' اس کے محبوب کے سچا رسول ہونے کی گواہی' دل عجز و نیاز سے معمور ہو گیا۔ پہاڑوں' پتھروں' چٹانوں سے ٹکرا کر پلٹ کر آنے والا آہنگ جب میری سماعت کے پَردوں سے ٹکرایا تو وجَدان کے اندر ہزاروں لاکھوں جلترنگ جھنجھنا اُٹھے جیسے اس وادی کا ایک ایک پتھر' ایک ایک ذرّہ میرے ساتھ آواز مِلا رہا ہو' جیسے پوری کائنات ہم آہنگ ہو گئی ہو--- اس روز نماز کا بھی بہت لُطف آیا۔ گو نمازی کم تھے لیکن محسوس ہو رہا تھا جیسے یہاں کی ہر چیز ہمارے ساتھ اللہ کی حمد و ثنا میں شامل ہے۔ نماز' تسبیح و تہلیل کے بعد زبردست قسم کے ناشتے کا بھی جواب نہیں تھا۔ فرائی انڈے' دیسی گھی کے بڑے بڑے پراٹھے' تیز کڑک چائے۔ اپنی اپنی ڈیوٹی پر جانے والے ناشتے کے بعد اپنے اپنے ٹھکانوں کی جانب بڑھ گئے۔ عزیز الرحمٰن نے بھی اجازت چاہی اور بولا۔

"شام کو ملاقات ہو گی--- تمہارا دستی سامان مدنی خان اٹھا کر لے گیا ہے۔ تم جانو اور وہ جانے' وہ جانے دے تو چلے جانا ورنہ--- ویسے میرے مشورے پر غور کرنا۔" وہ آنکھ دبا کر پھر تاکید کرنے لگا۔ "ہم سب کا فائدہ تمہارے یہاں رہنے میں ہے---"

مدنی خان اپنے ملازموں کو کام دھندے میں لگا کر مجھے گھسیٹتا ہوا ایک طرف چل نکلا۔ عجیب مختل الحواس پٹھان تھا۔ اَزار بند لٹکا ہوا' شلوار کے پائنچے ایک نیچے دُوسرا اُوپر' اَلم غَلم اشیاء سے ٹھُسی ہوئی جیبیں' شیشوں کی ٹکڑیوں والی واسکٹ۔ وہ ایک مجہول سا سَر پھرا دکھائی دیتا تھا۔ نسوار کی چٹکی کلّے میں دَبا کر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔

"شاہ جی! آپ نے سچ بول کر بڑی جراُتِ ایمانی اور اخلاقی قوّت کا مظاہرہ کیا ہے' مَیں آپ کی سچ بیانی پر بہت خوش ہوا۔ آپ خاموش بھی رہ سکتے تھا مگر آپ نے واقعی سیّدوں والا کام کیا ہے۔ سیّد کے گھر پیدا ہو اور کام کرے موچیوں والے' نہیں--- سیّد میں جراتِ ایمانی ہوتی ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا' دھوکہ نہیں دیتا چاہے اس کی جان چلی جائے۔" ایک پتھر پر مجھے بٹھاتے ہوئے وہ خود بھی پاس بیٹھ گیا۔ "شاہ جی! ہم اچھا آدمی

نہیں ہے۔ ہم چھپاتا نہیں' سب کو معلوم ہے۔ ہم سمگلنگ بھی کرتا ہے۔ چرس' کوکین کا کاروبار بھی کرتا ہے۔ اسلحہ بارود بھی سپلائی کرتا ہے۔ نہ ہمارا باپ' نہ ماں' نہ بی بی بچہ--- ایک بہن اپنے خاوند کے پاس رہتی ہے۔ ایک بھائی تھا چھوٹا' وہ ادھر آپ کے پنجاب جیل میں بند ہے۔ ہم بڑا دُکھی ہے۔ ہمارا بہت دشمن ہے۔ ہمارے بھائی کو ان ہی دشمنوں نے جھوٹے مقدمے میں پھنسایا۔ ہم بھی ان کا پیچھا کرتا ہے۔ ان کو قتل کرے گا' جہنم واصل کرے گا۔ آپ ہمارے بھائی جیسا ہے۔ ویسا ہی داڑھی' ویسی ہی شکل' ویسی ہی علوت فطرت--- تم کو دیکھا' دل میں ٹھنڈک پڑی جیسے ہمارا مکّی خان ہم کو مِل گیا۔ آپ کے آنے سے مجھے بڑا حوصلہ ملا' رُوح خوش ہو گئی۔" وہ میرے پاؤں میں بیٹھ گیا اور ملتجی لہجے میں کہنے لگا۔ "ہم آپ سے التجا کرتا ہے' ہمیں چھوڑ کر اِدھر سے مَت جاؤ۔"

وہ بجلی کی سی سُرعت سے اٹھا' میرا ہاتھ تھام کر پتھروں کے پیچھے لے گیا۔ وہاں چند پرانی سی پتھریلی قبریں تھیں۔ ایک قبر کے سرہانے ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنے لگا۔ مَیں نے بھی ہاتھ اٹھا لئے۔ پھر دوسری' تیسری--- آنکھوں میں آنسو' جسم لرز رہا تھا' فارغ ہوا تو بتانے لگا۔

"یہ قبر میرے والد کی ہے' یہ میرے دادا یہ میری ماں کی--- ہم روز اِدھر آتا ہے' روتا ہے' ان کی بخشش کی دُعا مانگتا ہے۔ میرا باپ بھی قتل ہوا' دادا بھی---" چند لمحے وہ قبروں کو دیکھتا رہا۔ "شاہ جی! مجھے معلوم ہے' دشمن مجھے بھی قتل کر دیں گے۔ میرا قبر بھی اسی جگہ بنے گا لیکن مرنے سے پہلے مَیں بھی ان کا آدھا خاندان ختم کر دوں گا۔ ہم اِدھر اس لئے پڑا ہوا ہے کہ ایک تو یہ جگہ محفوظ ہے' دُوسرے میرے بزرگوں کی قبریں اِدھر ہیں۔ یہیں ہمارا گاؤں تھا' مَیں اِدھر ہی پیدا ہوا۔ اب ان کافروں نے ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا۔ ہمیں بہت سی دولت دے دی' ہمارے کس کام کی---؟"

وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ لوگ اِدھر آتے ہوئے نظر آئے۔ ہم بھی اُٹھے اور ہوٹل کی جانب چل دیئے۔

"شاہ جی! آپ کے لئے نوکری کی بات کی ہے۔ شام آپ پاشا صاحب کے پاس جائیں۔ بہت اچھے افسر ہیں' کل نماز پڑھنے آئے تو مَیں نے بات کی تھی۔ آپ یہیں نوکری کریں' میرے پاس رہیں۔ جب چاہیں' جا کر اپنے گھر ہو آیا کریں۔ بس آپ مجھے حوصلہ دیا

کریں، میری خواہش ہے کہ مَیں قرآن شریف پڑھوں، ایک اچھا انسان بنوں۔ اپنے ماں باپ، دادا کے لئے حج کروں--- یہ کام صرف آپ کر سکتے ہیں۔ آپ سچّے انسان ہیں۔ مجھے پتا ہے کہ آپ جو وعدہ کریں گے، پورا کریں گے۔ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ مجھے قرآن شریف پڑھائیں گے۔"

مَیں نے اسے سینے سے لگالیا۔ "مَیں وعدہ کرتا ہوں لیکن تمہیں بھی ایک وعدہ کرنا ہو گا کہ تم یہ سارے غیر قانونی کام اور دشمنوں سے انتقام لینے کی بات چھوڑ دو گے۔" وہ میرے سینے سے لگا، پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا--- "مدنی خان! جس سینے میں انتقام کی آگ دہکتی رہے، وہ جہنم بن جاتا ہے۔ دیکھ، تیرا سینہ بھڑکتے الاؤ کی طرح تپش دے رہا ہے۔" مَیں نے سرگوشی کی۔

وہ آستین سے آنسو پوچھتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہم پختونوں میں یہی تو ایک خانہ خرابی ہے کہ یہ دشمن کو معاف نہیں کرتے، قتل کرتے کراتے پورا خاندان صاف کرا دیتے ہیں مگر دل صاف نہیں کرتے---"

"ایک اور بات بھی میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔" مَیں نے دو ٹوک بات کی۔ "دیکھو، میری عمر امامت کرنے کی نہیں ہے۔ شرع شریعت کا مسئلہ ہے۔ امامت کے لئے متقی، پرہیز گار، دین کو اچھی طرح سمجھنے والا بزرگ ہونا چاہئے اور پھر تم مجھے یہاں نوکری بھی دِلوا رہے ہو۔ میرے گھریلو حالات بھی ایسے ہیں کہ میرا پنجاب آنا جانا بھی لگا رہے گا، بہتر ہے کہ تم اس کل وقتی کام کے لئے مجھ سے بہتر کسی آدمی کا انتظام کر لو۔"

اس کی سمجھ میں میری بات آگئی۔

"ٹھیک ہے، مولوی گل زمان ہی نماز پڑھا دیا کرے گا مگر اس کی آواز بڑی خراب ہے۔ سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ آیتیں پڑھتا ہے یا بابا خوشحال خان خٹک کا کلام پڑھتا ہے---"

ہوٹل، ملازموں کے حوالے کر کے وہ مجھے ڈیم دکھانے کے لئے نکل کھڑا ہوا، ہزاروں آدمی کام کر رہے تھے۔ بیلی برج کراس کر کے ہم دریا کی دوسری طرف آگئے۔ یہاں ورکشاپس، دفاتر، سٹورز وغیرہ تھے۔ جدھر بھی گئے، لوگ آگے بڑھ بڑھ کر مدنی خان اور مجھے سلام کر رہے تھے۔ پٹھانوں کا سلام، مصافحہ اور بغلگیری کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، میرے ہاتھ

اور پسلیاں دُکھنے لگی تھیں۔ وہاں کی ایک اور بُرائی، سوئی چلم اور نسوار جن سے میری جان جاتی تھی اور پختون ان دونوں کے بغیر خاطرداری کو اُدھورا سمجھتے ہیں--- گھومتے گھومتے ہم پہاڑی کی طرف آئے جس کے نیچے سرنگیں بن رہی تھیں۔ بڑی بڑی دیوہیکل مشینیں پہاڑوں کی چٹانوں کو مولی گاجر کی مانند کاٹ رہی تھیں۔ یہاں کام کرنے والے انسان نہیں، جن دکھائی دیتے تھے۔ سینکڑوں وزنی پہاڑوں جیسے پیلے پیلے بلڈوزر، کریشر، کرین، لوڈر۔ ہم ان مشینوں کے آس پاس چیونٹیوں کی طرح رینگ رہے تھے۔ وہاں سے پہاڑی کی دوسری طرف سائٹ کی جانب آگئے، نیچے اونچے پہاڑی راستے، پیدل چل چل کر میں ہلکان ہو گیا۔ مجھے مضمحل دیکھ کر مدنی خان نے کہا۔

"شاہ صاحب! مَیں آپ کو سلاجیت دوں گا، رات دودھ کے ساتھ کھایا کریں--- آپ نے بندر دیکھا ہو گا۔ یہ خانہ خراب ادھر پہاڑوں پہ پھلانگتا رہتا ہے مگر تھکتا نہیں۔ کیوں؟--- وہ سلاجیت کھاتا ہے۔"

مَیں ہنسنے لگا۔ "چلو، اب واپس چلیں۔ مَیں بہت تھک گیا ہوں۔"

واپس ہوٹل پہ آنے کی بجائے وہ مجھے افسروں کی رہائشی کالونی لے آیا۔ ادھر دنیا ہی علیحدہ تھی۔ صاف ستھری تارکول کی سڑکیں، گرین بیلٹ، پھولوں بھری کیاریں، سٹریٹ لائٹس، کالونی کے صدر گیٹ پہ سکیورٹی گارڈ، چھوٹے بڑے کاٹیج، کوٹھیاں جیسے یورپ کا کوئی علاقہ ہو۔ ایک ہی قطعہ زمین پہ اتنا بڑا تضاد--- ٹھیک ہے کہ یہ بڑے بڑے انجینئرز ہیں، بلڈرز پلانر اور ماہرین ہیں۔ ایک اور اہم وجہ غیر ملکی، سفید رنگت والے فرفر انگریزی بولنے والے ہیں مگر ہیں تو انسان، ہم جیسے--- کسی کے سر تلے پتھر اور کوئی سنبل کے نرم تکئے پہ محو استراحت، ہمارے لئے بہتے دریا کا پانی اور ان کے لئے فرانس کے معدنیاتی چشموں کا منرل واٹر، ہمارے معدوں کے لئے فائر سٹون ٹائروں کے بنے ہوئے چپتر کباب، جَو کی باسی کچی روٹی اور پیاز کی گانٹھیں مگر ان کی لذت کام و دہن کے لئے آسٹریلیا کا لیمب، برطانیہ کا بیف، برازیلین کافی، سکاش مشروبات۔ وہ افسر اور ہم ڈرائیور، چوکیدار، اردلی، مالی اور باورچی۔ غلامی کا طوق تو جھٹ سے اُتر جاتا ہے لیکن غلامانہ ذہنیت اور سوچ کو بدلنے کے لئے ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے جبکہ ہم پاکستانیوں کے لئے تو کئی قرن بھی کم ہیں۔ آج بھی ہم اونچی سطح پہ ان ہی کے غلام ہیں، ان کا لباس، طور طریقے اور زبان اپنانے میں

تفاخر محسوس کرتے ہیں۔ ان کی ٹیکنالوجی' ایجادات و اختراعات' ان کی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں ڈپلوموں کے لئے ان کے محتاج ہیں۔ جس قوم کی سوچ و فکر' جتن و جستجو' طمع و طلب معمولی نوکری' چوکیداری' بوٹ پالش' ہوٹلوں میں چھوٹا بننے' منشیات کے سونے لگانے' قانون اور قومی قدروں کا مذاق اڑانے' فساد اور نعرے لگانے سے لے کر سلاجیت تک محدود ہو وہ کس طرح کہہ سکتی ہے کہ ہم آزاد ہیں۔ ہم تو غلام ابن غلام ہیں۔ پہلے ہم سفید چمڑی والے غیر ملکیوں کے غلام تھے' اب ہم سانولی چمڑی والے' سیاہ ذہنیت والوں کے غلام ہیں۔ اپنی تن آسانی' ہڈحرامی' بے فکری اور جہل کے اسیر ہیں۔ ہماری یہ غلامی اس غلامی سے ہزار درجہ ابتر و بدتر ہے۔ اس پرندے کو آپ کیسے آزاد کہہ سکتے ہیں جو قفس سے اڑ کر' صیادہی کے محل کے کنگرے پہ جا بیٹھے اور وہیں دانے دنکے کا طلب گار ہو--- فرق بس اتنا ہے کہ پہلے وہ ہمارے آنگن میں بیٹھ کر ہمیں کنٹرول کرتا تھا اور اب واشنگٹن' لندن اور جنیوا میں بیٹھ کر کنٹرول کرتا ہے۔ پہلے وہ ہمارے ہیرے جواہرات' تخت و تاج کے بدلے ہمارے لئے ریلوے پل' یونیورسٹیاں' ہسپتال اور بیراج بنواتا تھا۔ اب وہ ہماری آئندہ آنے والی نسلوں کو رہن دکھ کر ہمارے لئے ڈیم بجلی گھر' بندرگاہیں' سٹیل ملز بنواتا ہے۔ آزاد کر کے پاؤں میں زنجیر بھی ڈال دیتا ہے۔ جہاز دیتا ہے' پرزے اپنے پاس رکھتا ہے۔ ٹیکنالوجی فراہم کرتا ہے تو ماہرین اپنے بھجواتا ہے۔ ڈیم شاہراہیں' سرنگیں بنواتا ہے تو لیبر اور میٹریل خود دیتا ہے' بائیں ہاتھ سے دے کر دائیں ہاتھ سے پھر جیب میں ڈال لیتا ہے۔ آم کے آم' گٹھلیوں کے دام اسی کو کہتے ہیں--- میں اپنی ان بے سروپا اور لاحاصل سوچوں میں ڈوبا ہوا' جنگل میں منگل کا نظارہ کر رہا تھا کہ مدنی خان نے مجھے کہنے سے ٹہوکا دیا۔

"شاہ صاحب! کدھر گم ہے؟--- دیکھو' ادھر صاحب لوگ رہتا ہے۔ ہمارا پاشا صاحب بھی وہ سامنے سفید رنگ کی کوٹھی میں ہوتا ہے۔ آج شام تم ادھر آئے گا' پاشا صاحب سے ملے گا۔ بہت اچھا افسر ہے' ادھر بجلی کا بڑا انجینئر ہے۔ ہم نے اس سے بات کیا تھا۔" وہ اشارے سے مجھے بتانے لگا۔ "وہ سفید رنگ کا کوٹھی' کھمبے کے پاس---"

میں شام کو ادھر ذرا دیر سے پہنچا۔ پاشا صاحب اپنی کاٹیج کے چھوٹے سے لان میں کسی سفید چمڑی والے کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے۔ چند لمحے میں باہر ہی کھڑا رہا' پھر چند

قدم آگے بڑھ کر کھانسا۔ مقصد تھا کہ وہ میری جانب توجہ دیں اور میں اجازت لے کر اپنے آنے کا مقصد بیان کروں مگر وہ شطرنج ہی کیا جو کھلاڑی کو اتنی فرصت دے۔ ایک آدھ قدم اور آگے سرکا' اب کے ذرا کھل کر کھانسا میرے حلق میں پھندا پڑ گیا مگر ادھر کچھ اثر نہ ہوا--- شطرنج' تاش' چوسر' گنجفہ' یہ بڑے نحس کھیل ہیں۔ فوتیدگی کی خبر سن کر بھی کھیل نہیں چھوڑتے۔ قبر پر مٹی پانی ڈال' دُعا بھی ہو چکی ہوتی ہے تو یہ حضرت اگلی چال کے چُنگل میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں۔ ہارنے کے بعد اٹھتے ہیں' سر پہ ہاتھ رکھ کر دھاڑیں مارنا شروع کر دیتے۔

"ہائے نی' میریئے بے بے!"

مَیں نے ایسے بڑے بڑے کمینے کھلاڑی دیکھے ہیں۔ آگ لگ جائے' گھر کی چھت بیٹھ جائے گھر میں مہمان اُترے ہوں یا بچے نے مٹی کا تیل پی لیا ہو۔ بیوی دردِزہ میں مبتلا ہے' صبح سے اپنا پیشاب رُکا ہوا ہو' بیٹھ بیٹھ کر پاؤں کا پٹھا چڑھ گیا ہو' بھٹو کے پھانسی کی خبر ہو یا ضیاء الحق کا جہاز کریش ہو جائے وہ بساط پہ اپنے پیادے کو کریش سے بچانے کے تدابیر سوچ رہے ہوتے ہیں۔ گنجفے پہ جمے ہوئے اچھے اچھے ثقّہ بزرگوں کے پاجامے تربہ تر دیکھے ہیں' مگر کیا مجال جو ہونٹوں سے حقّے کی منہال اور نظریں مہرے سے ہٹی ہوں۔ بکہ بند تاشئے تو دین دُنیا سے گزرے ہوتے ہیں۔ بیوی کبھی کی روپیٹ اپنے میکے بیٹھی' سلائی سے بچوں کا پیٹ پال رہی ہوتی ہے۔ رشتہ دار عزیز سارے فاتحہ پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ کوئی لینے دینے والا ہی ان سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ورنہ یہ ہر طرف سے فارغ ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ کمینے اور پاپی وہ ہوتے ہیں جو انہیں کھیلتا دیکھ کر اپنی ہوس پوری کرتے ہیں۔ صحیح چال پہ بغلیں بجائیں گے' غلط پہ دو ہتھڑ پیٹیں گے' افسوس کریں گے۔ ان کا جوش خروش دِیدنی ہوتا ہے۔ گناہِ بے لذت' سارا سارا دن ان کی بغلوں میں بیٹھے یا سروں پہ سایہ کئے کھڑے رہتے ہیں۔ کھیلنے اور دیکھنے والوں میں اکثر گئے گزرے بڈھے ہوتے ہیں۔ اولاد' بیوی' گھر والے بھی سکریپ سمجھ کر انہیں ان کے حال پہ چھوڑ دیتے ہیں کہ چلو لڑائی بھڑائی نصیحتوں فضیحتوں سے تو جان چھوٹی' ان کا گھر سے تعلق صرف چارپائی توڑنے کی حد تک ہوتا ہے' رہا کھانا پینا تو وہ ان کا کب کا ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ ہاں' بازی بدلنے پہ چائے' حقے' سگریٹ کا دَور ضرور چلتا ہے۔ ان لوگوں میں اکثر وجع المفاصل اور وجع الظہر کے

مریض ہوتے ہیں۔ ٹانگیں، جوڑ اور کمر ماری جاتی ہیں۔ آخیر دنوں فالج سے واسطہ پڑتا ہے تو معالج بے بس ہوتا ہے۔ دو چار دن مالش کروا کر پُر لوک سُدھار جاتے ہیں۔ ان کی ارتھی، آل اولاد سے زیادہ ان کے ساتھ تاش کھیلنے والے ساتھ اٹھاتے ہیں جن کی جیبوں میں اس وقت بھی تاش کی گڈیاں موجود ہوتی ہیں۔

پاشا صاحب کا انہماک بھی ایسا ہی تھا۔ مَیں خوب جانتا تھا کہ میری بجائے اگر ملک الموت بھی کھڑا ہو تو وہ توجہ نہیں دیں گے لہٰذا کھانس کھانس کر گلا خراب کرنے کی بجائے مَیں آگے بڑھ کر ان کے پہلو میں جا لگا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی میری جانب دیکھنے تک کی زحمت گوارا نہ کی۔ زبان اگر بند تھی مگر آنکھیں تو بند نہیں کی جا سکتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ مَیں بھی بازی دیکھنے لگا۔ پاشا صاحب بُری طرح پھنسے ہوئے تھے۔ سفید چمڑی والے نے دو طرف سے بُری طرح گھیرا ہوا تھا۔ صرف ایک طرف راستہ تھا، جدھر وہ اپنا فرضی ایک پیادہ اور ہاتھی لئے کھڑا تھا۔ مَیں نے چند لمحوں میں پوری بازی کسی کمپیوٹر کی طرح اپنے ذہن میں فیڈ کر دی۔ پاشا صاحب کی سٹی گم تھی، ان کی سمجھ میں یہ صریحاً" مات تھی۔ وہ شاید "ڈیڈ اوور" کہنے ہی والے تھے کہ ان کا ایک اجڈ قسم کا پٹھان ملازم جو شاید باورچی تھا، چائے کی ٹرے اٹھائے چلا آیا۔ ساتھ تپائی پہ رکھ کر وہ واپس مڑنے لگا تو میرے منہ سے اچانک نکلا۔

"خان! گدھے کی طرح نہیں، گھوڑے کی طرح چلا کرو۔"

وہ بیچارہ گھوڑا گدھا کیا سمجھتا، احمقوں کی طرح منہ اٹھائے اندر چلا گیا لیکن پاشا صاحب سمجھ گئے۔ مَیں ان کی نظروں کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی ساری توجہ اپنے گھوڑے پر مرکوز ہو چکی تھی۔ ان کے چہرے پر ہلکی مسکراہٹ نمودار ہوئی، کَن انکھیوں سے میری جانب دیکھا۔ اگلے لمحے ان کا گھوڑا غنیم کے بادشاہ کو حصار میں لے چکا تھا۔ یہیں شہہ مات تھی۔ بازی ہٹی تو دونوں کھلاڑی چائے کی طرف متوجہ ہوئے۔ مَیں نے سلام کیا اور کہا۔

"اجازت دیں تو مَیں آپ کے لئے چائے بناؤں؟"

پاشا صاحب نے میری طرف بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ملازم کو آواز دے کر ایک کپ اپنے لئے بھی منگوا لیں۔"

وہ شاید مجھے مسجد اور مدنی خان کے حوالے سے پہچان چکے تھے۔ ملازم چند جلے ہوئی

چپس اٹھائے خود ہی باہر آ گیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ چپس سامنے لاتا، میں آگے بڑھا، پلیٹ اور اسے پکڑ کر اندر چلا گیا۔ میری یہ حرکت کسی طور بھی مناسب نہ تھی، بغیر اجازت پہلی ہی ملاقات میں کسی کے کچن میں جانا مگر غلطی سرزد ہو چکی تھی جس میں میرے کسی ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اندر گیا، بڑا خوبصورت ماڈرن قسم کا کچن، کھانے پینے کی ہر چیز موجود، کچن ٹیبل پہ ایک کھُلے پیکٹ میں فروزن امپورٹڈ چپس دکھائی دیئے، فرائنگ پاٹ بھی موجود تھا، مَیں نے فوراً" کچے چپس اس میں ڈالے، ٹمپریچر سیٹ کر کے اسے آن کر دیا۔ تازہ بریڈ پڑی نظر آئی۔ کنارے کاٹے، فرائی پان میں مکھن ڈالا، انڈے پھینٹے۔ پانچ سات منٹ لگے۔ فرنچ ٹوسٹ تیار تھے۔ پٹھان آنکھیں پھاڑ پھاڑ میرے کرتب دیکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی مَیں نے الیکٹرک کیٹل میں پانی ابلنے کے لئے رکھ دیا۔ کافی سیٹ نکالا، دودھ گرم کیا۔ مزید دس منٹ اور صرف ہوئے۔ فرنچ فرائی گولڈن چپس، فرنچ مسٹرڈ ٹوسٹ، کیچپ اور فرنچ کافی جب باہر تپائی پہ آئی تو دونوں شطرنج کے کھلاڑی میری پھرتی، نفاست، قرینہ، شام کی کافی اور لوازمات دیکھ کر مجھ سے مات کھا چکے تھے۔ کھا پی، تعریف کر کے وہ غیر ملکی افسر چلا گیا۔ پاشا صاحب نے مجھے سامنے بٹھا لیا۔ کبھی اس طرف، کبھی اس طرف۔ نیچے اُوپر، پہلو بدل بدل کر مجھے گھورتے رہے۔ مَیں گھبرا گیا کہ یا اللہ، یہ مجھ میں کیا چیز تلاش کر رہے ہیں؟ لبِ خنداں سے گویا ہوئے۔

"واہ مولانا! ہم تو مُرشد تھے، آپ ولی نکلے۔ آپ کو بھی شطرنج سے دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ جس گھوڑے کی چال کی جانب آپ نے اشارہ کیا تھا، میرا تو ادھر دھیان ہی نہیں تھا، کون سا سٹائل آپ کھیلتے ہیں؟"

"جی، مَیں بس یونہی واجبی سی دلچسپی رکھتا ہوں، باقاعدہ کھلاڑی نہیں ہوں۔ ویسے مَیں ہر سٹائل میں اچھا بُرا کھیل لیتا ہوں۔۔۔ لیجئے، مَیں جس کام سے آیا تھا وہ تو ادھر رہ گیا۔"

بساط پھر بچھ گئی۔

"لو، مولانا! دو دو ہاتھ ہم سے بھی ہو جائیں۔ دیکھیں، آپ کتنے پانی میں ہیں؟"

مَیں اس وقت کھیلنے کے موڈ میں نہیں تھا اور پھر کھیل برابر والوں سے ہی کھیلنا چاہئے۔ اپنے سے بڑوں، خاص طور پر اپنے افسر یا واجب الاحترام بزرگوں سے تو قطعی نہیں کھیلنا چاہئے۔ جیتو تب برائی، ہارو تو تب ہنسائی، بڑا بند بندھا کر کھیلنا پڑتا ہے۔ بے

ایمانی سے اجتناب' حفظِ مراتب کا خیال' ٹھٹھا نہ چُہل' کُھلی نہ تمسخر' ہارنے پہ اگلے پہ بے ایمانی کا الزام' نہ جیتنے پہ دوسرے کی بھد' حکمِ حاکم مرگِ مفاجات ——— ہم تذبذب میں اُلجھے ہوئے اور وہ اپنے مہرے جما رہے تھے۔

"مولانا! کیا سوچ رہے ہو' مہرے سیدھے کرو؟" پاشا صاحب نے زیرِ لب مسکرا کر کہا۔

مَیں نے اٹھتے ہوئے عرض کی۔ "جناب' مَیں آپ کے مقابل کھیلنا سوئے ادب تصوّر کرتا ہوں' ویسے بھی میرا کھیل اُکل پچّو سا ہوتا ہے۔ آپ میری معذرت قبول کر لیں۔"

وہ پائپ میں تمباکو کو بھرتے ہوئے بولے۔ "مولانا! آپ کو شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہونی چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ اس صنف میں بھی آپ کا ذوق بڑا نفیس ہے' آپ کوئی اچھا سا شعر ارشاد فرمائیں۔"

لیجئے' شطرنج سے بات ہٹی تو شاعری پہ ٹک گئی۔ میری حالت تھی کہ تک تک دیدم' دم نہ کشیدم ——— تمباکو کو شعلہ دکھاتے ہوئے فرمانے لگے۔

"اجازت ہو تو پھر میں ہی آپ کے سامنے ایک شعر عرض کرنے کی جراُت کروں؟"

مَیں نے شرمساری سے کہا۔ "آپ ارشاد فرمائیں' مجھ سے آپ اجازت طلب کر کے شرمندہ کر رہے ہیں' بسم اللہ ———"

"قمارِ محبت میں بازی سدا
وہ جیتا کیا' میں ہارا کیا"

مہک آلود دُھواں چھوڑتے ہوئے وہ مجھے داد طلب نظروں سے دیکھنے لگے۔

"سبحان اللہ' بہت خوبصورت شعر ہے۔ مَیں نے شعر کو دُہرا کر پڑھا' بڑا لطف آیا۔"

"ارشاد ———" وہ اب مجھ سے کوئی شعر سننا چاہتے تھے۔

مَیں نے مسکراتے ہوئے بساط پہ مہرے جمانے شروع کر دیئے۔ دراصل مَیں اس تذبذب میں تھا کہ کیا سناؤں؟ ہزاروں اشعار یاد تھے لیکن یہ تو خوش وقتی' آزادانہ سخن و سوز کا ماحول اور شادابیٔ طبع پہ منحصر ہوتا ہے۔ کشیدہ وقتی' ذہنی اُدبار اور ناموزونی طبع کی حالت میں بس زبردستی اور کھینچا تانی والی بات ہوتی ہے۔ ایسے ہی ایک شعر سامنے آ گیا۔ مَیں نے اپنی بری عادت سے مجبور ہو کر پہلے اسے زیرِ لب گنگنایا' پھر ترنم کی دھار پہ رکھ کر

شمشیرِ براں کی مانند پیش کر دیا ؎

"اِک جہاں تشنہ اندازِ خود آرائی ہے
آپ جو چاہیں کریں' آپ کی بن آئی ہے"

یہ کچھ دیر محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے رہے۔ مَیں اس اثنا مہروں کی نشست درست کرتا رہا' انہیں تو جیسے کنگ سی لگ گئی تھی۔ داد نہ تحسین' ماشاء اللہ نہ سبحان اللہ۔

"شعر' ذوقِ نفیس پہ بار گزرا ہو تو شرمندہ ہوں۔ استاد کا شعر ہے' پڑھنے کی گستاخی کر بیٹھا ہوں۔" مَیں نے اپنے انداز میں کہا۔

"نہیں' مولانا! گستاخی کیسی؟ ——— میری خاموشی کا کوئی غلط مطلب مت نکالئے' برمحل شعر اور آپ کی ترنم ریزی نے مجھے جل تھل کر دیا ہے۔"

وہ دھوئیں کے سرمئی مرغولے اڑاتے ہوئے کافی دیر شعر کو دہراتے رہے' چبا چبا کر ایک ایک لفظ کی چولیں بٹھاتے رہے۔ اسی مشقت میں پائپ کا تمباکو بھسم ہو گیا تھا۔ پائپ کو گارڈن چیئر کی بغلی پہ جھاڑتے ہوئے مسکرائے اور فرمانے لگے۔

"ایک شعر پہ آپ کی توجہ کا طالب ہوں۔" ایمن کی بندش میں وہ ترنم ریز ہوئے۔

"بھلا مَیں دل کو کس سے کبھی ہو کے ہم سخن
اس بزم میں کسی سے ہمیں راہ ہی نہیں"

مدھم سے تیور اُٹھا کر جو انہوں نے پلٹا لیا تو مَیں اُلٹ پلٹ ہو گیا۔ شاہد احمد دہلوی اور ابوالاثر حفیظ جالندھری کی یاد تازہ ہو گئی کہ "وہ ہم سے بھی زیادہ کشتہ تیغ ستم نکلا"

پاشا صاحب کا تعلق بجنور سے تھا۔ الیکٹریکل انجینئرنگ انہوں نے دہلی سے کی تھی' بعد میں اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ چلے گئے' پارٹیشن کے بعد وہ ڈیموں کے منصوبوں کے سربراہ رہے۔ وہاں سے ریٹائرمنٹ لی تو وارسک ڈیم کی فارنر کمپنیوں نے ان کی خدمات حاصل کر لیں۔ یہاں وہ چیف سائٹ الیکٹریکل انجینئر تھے۔ کالے بھجنگ' نانا ساقد' مسکراتا شگفتہ چہرہ' حلیم الطبع' موسیقی اور شعر و سخن کے دلدادہ۔ بیوی انتقال کر چکی تھی۔ جوان تعلیم یافتہ بچے کراچی میں ہی اعلیٰ عہدوں پہ فائز تھے۔ زندگی میں فراغت ہی فراغت تھی۔ جو کماتے وہ دعوتوں' غریبوں' محتاجوں میں بانٹ دیتے یا کہیں مسجد بنوا دیتے۔ چار یاری اور اُجلی محفلوں میں بیٹھنے والے خوش ذوق اور رکھ رکھاؤ والے انسان تھے۔ کراچی میں تو یہ

سارا سلسلۂ وابستگی میسر تھا۔ ایک سے ایک بڑھ کر صاحبِ سخُن و سوز' خوش نوا و خوش فہم' خوش کمال و خوش جمل پڑا ہوا تھا۔ بڑی بڑی قدر آور ثقہ شخصیتیں۔ جوش اگر تھے تو جگر بھی موجود تھے۔ ماہر القادری کے ساتھ نیاز فتح پوری بھی تھے۔ بابائے اردو' بابا ذہین شاہ تاجی' رئیس امروہی' جون ایلیا' صہبا اختر' تاج کمپنی والے سراج الدین ظفر' حفیظ جالندھری' مجید لاہوری' ذوالفقار علی بخاری' شاہد احمد دہلوی' حمایت علی شاعر' جمیل الدین عالی' آرزو لکھنوی' فیض' فضل کریم فضلی اور بہت سے دوسرے گہرِ تابدار اپنی اپنی جلوہ آفرینیاں دِکھا رہے تھے۔ ہر شام سخن پرور اور ہر شب سخن نواز تھی۔ محفلیں' مجلسیں' مذاکرے' مشاعرے--- پاشا صاحب نوکری کے چکر میں چمن سخن سے دُور اس سنگلاخ وادی اور پتھر لوگوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ نہ کوئی ہم زباں' نہ کوئی ہم نفس۔ خوش لباس اور خوش خوراک تھے مگر یہاں یہ بھی میسّر و مقدور نہ تھا۔ جو مِلا' پہن لیا۔ جو سامنے آیا زہر مار کر لیا' لے دے کر ریڈیو' ٹیپ ریکارڈر' کتب بنی یا شطرنج رہ گئی تھی۔ کسی غیر ملکی کو گھیر گھار کر پالی جمالیتے یا کلب جا کر برج یا بلیرڈ کھیل لیتے۔ میرے روپ میں انہیں ایک ندیم میسّر آتا دکھائی دیا تو میرے ٹیسٹ لینے کے درپے تھے' میری تیار کی ہوئی کافی اور فرنچ ٹوسٹ کے ذائقے سے تو آشنا ہو چکے تھے' سخن فہمی اور سُر تال سے بھی واقف ہو چکے تھے۔ لہجے کی شرینی اور گفتگو کی شین کاف بھی ملاحظے میں آ چکی تھی اور میرے پیچھے نماز بھی پڑھ چکے تھے' شاید اسی وجہ سے مجھے مولانا کہہ کر مخاطب ہوئے تھے اور گویا میں ان کی نظر میں آ چکا تھا--- بڑی محبت سے پوچھنے لگے۔

"بھئی' مولانا! غالباً" مدنی خان نے آپ کے بارے میں مجھ سے ذکر کیا تھا۔ یقیناً آپ یہاں نوکری کی تلاش میں آئے ہوں گے' سمجھئے کہ آپ کو نوکری مل گئی۔ آپ میرے پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے میرے پاس کام شروع کر دیں۔ قیام و طعام میرے ساتھ' تنخواہ جو آپ مناسب سمجھیں--- خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔"

مَیں سوچ میں پڑ گیا کہ کہوں' کیا نہ کہوں؟--- چند لمحوں بعد بڑے ادب سے عرض کی۔

"پاشا صاحب! مَیں یہاں اپنے چند دوستوں کے اصرار پہ ان سے ملنے آیا تھا جنہوں نے مجھے سیّد بنا کر مدنی خان سے متعارف کرایا ہوا تھا۔ اس شریف انسان نے سیّدوں سے

اپنی اندھی عقیدت کے پیشِ نظر مجھ مجہول اور مجموعۂ خرابات کو پیشِ امام بنا دیا اور میری چکنی چپڑی باتوں سے متاثر ہو کر اپنا بھائی بنا بیٹھا ہے۔ اس کا اور دوستوں کا یہی اصرار ہے کہ میں یہاں ہی رہوں جبکہ میں اس وقت کھاریاں میں جی ای سی کے پاس ملازمت کر رہا ہوں--- دراصل میں آپ کے پاس کسی نوکری کے لئے حاضر نہیں ہوا تھا' قدم بوسی کا مقصد آپ کی زیارت اور یہ عرض کرنا تھا کہ آپ مجھے جاب دینے سے انکار کر دیں تاکہ میں واپس جانے کا جواز حاصل کر سکوں۔ دراصل میں والدین سے دُور نہیں رہنا چاہتا لیکن---"

میں ان کی جانب ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر سر ہلاتے ہوئے چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ پائپ کے گہرے کش لیتے ہوئے گول گول آنکھوں سے مجھے غور سے دیکھ رہے تھے۔

"مولانا! لیکن کے آگے بھی کچھ ہے؟"

"جی' جی--- اس کے آگے میری ایک غلطی ہے جو جذبات میں آ کر مجھ سے سرزد ہو گئی۔"

"ارشاد---"

"جی' رات مدنی خان نے مجھے اپنی زندگی کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ یہ تو وہی جانتا ہے کہ اس نے مجھ میں ایسی کون سی بات یا خوبی دیکھی کہ اپنا سینہ میرے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ مجھے وہ ایک معصوم سا بچہ دکھائی دیا جسے جذباتی تحفظ کی بے حد ضرورت ہے۔ اسے محبت اور رہنمائی کی تلاش ہے۔ وہ ایک اچھا انسان بننا چاہتا ہے' فلاح و راستی کی راہ پہ چلنا چاہتا ہے۔ اس کے دل میں دین اور علم حاصل کرنے کی خواہش ہے۔ اس کی نظر میں سیّد کوئی مافوق البشر ہیں اور یہ جاننے کے باوجود کہ میں سیّد نہیں' پھر بھی وہ مجھے شاہ جی کہنے پہ مصر ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اسے سنبھالا دے سکتا ہوں' اچھا بنا سکتا ہوں یا اس معاملے میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ وہ شدت سے یہ چاہتا ہے کہ میں یہاں نوکری کروں' یہیں رہوں۔ اسی لئے اس نے آپ سے میرے بارے میں بات کی تھی---- بس' یہی مجھ سے غلطی سرزد ہوئی کہ میں اس سے یہاں رکنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔"

"مولانا! میں ذاتی طور پہ مدنی خان سے خوب واقف ہوں۔ وہ باہر سے بڑا خونخوار

بدمعاش لیکن اندر سے بڑا اچھا اور معصوم انسان ہے' صرف اس کی وجہ سے یہاں باہر کے لوگ اور خاص طور پہ پنجابی برسرِ روزگار ہیں۔ وہ ہر طور باہر سے انے والے لوگوں کی مدد کرتا ہے' میں خود بھی کئی معاملات میں اسی کا احسان مند ہوں---" پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے بڑے سنجیدہ لہجے میں فرمانے لگے۔ "مولانا! یہ بڑے ثواب کا کام ہے۔ آپ سے وہ متاثر ہے' آپ کی مانے گا بھی' پھر آپ نے وعدہ بھی کیا ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ ان دونوں بگڑے ہوئے ناآسودہ وقت خرابوں کے کام آئیں---"

"جی' دونوں سے کیا مراد---؟" میں نے اظہارِ حیرت کیا۔

"بھئی' ایک وہ اور ایک میں--- ایک رنجیدہ ذات' ایک کبیدہ اوقات---"

مَیں سرنیہوڑائے شرمندگی کی کھائی میں گر پڑا۔

شیلف میں کیسا خزانہ بھرا پڑا تھا۔ رومی' سعدی' خیام' عرفی۔ ادھر ہاتھ بڑھائیں تو میر ہے۔ ذوق' مصحفی ہے۔ ناظم اور حسرت ہیں۔ آتش اور سودا ہیں۔ ظفر کے ساتھ نظیر ہیں۔ جرات ہیں تو مومن کے قریب درد ہیں۔ انشاء اور غالب' فیض' اقبال۔ جگر' جوش' حفیظ' عدم' اختر شیرانی' دانش' منیر نیازی۔ ایک جہانِ علم و ادب' دنیا بھر سے چیدہ چیدہ انتخاب۔ عربی' فارسی' ہندی' بنگالی' انگریزی' ٹیگور کے مرصع مصور دیوان' مرقعے' شعرائے رام پور' بجنور' لکھنؤ' امروہہ' دہلی کے قلمی نسخے--- گو میری خواہش پہ انہوں نے استفادے کی اجازت مرحمت فرما دی تھی پھر بھی میں ایک آدھ دن تک صرف دُور سے دیکھنے یا احتیاط سے صرف چھُونے کی حد تک ہی رہا۔ بزعم خود اونٹ پہاڑ کے نیچے آ گیا تھا۔ اپنے جہل اور علمی بے بساطی کا شدت سے احساس ہوا۔ الٰہی! علم و حکمت کے بحر کا تو کوئی کنارہ ہی نہیں۔ مَیں گندی موری کا کیڑا تعفن سڑاند غلاظت کا پروردہ اور کہاں یہ بحر ذخار اور یہ علم شناور لوگ۔ ان کے ہاں ظرف بھی سمندر کی مانند شانت ہوتا ہے۔ کپاس کی سنڈی کو تحسین و تبار کے خوشرنگ پر لگا کر تتلی بنا دیتے ہیں--- سوچ لیا کہ اب پاشا صاحب کے رُوبرو چونچ نہیں کھولوں گا۔ گھر اور کھاریاں خط لکھ کر اطلاع دے دی گئی تھی' طبیعت ایسی نچنت ہوئی کہ شب و روز خوش رنگ تتلیوں کی مانند اڑنے لگے جیسے کوئی تھکا ماندہ پیاسا مسافر کسی میٹھے کنویں کی منڈیر پہ آ بیٹھا ہو۔ کوہستانی' سرگشت' مزاج بدلتی ہوئی تند خو ہوائیں' شوریدہ تنک مزاج دریا' جھاگ اڑاتا پتھروں کو گدگداتا ہوا ٹھنڈا پانی' اُچھلتی

پھلانگتی ہوئی چمکیلی سنہری مچھلیاں' اُجلی صُبحیں' مخمور شامیں اور بھیگی ہوئی آسودہ سرد راتیں بڑے مزے سے گزرنے لگیں۔ صبح دَم دریا کنارے چہل قدمی' شفاف چکنے تربتر پتھروں پہ بیٹھ کر ٹھنڈے پانی سے وضو غسل' پھر نماز فجر سے فارغ ہو کر ناشتے کا اہتمام' پاشا صاحب شاداں و فرحاں دفتر چلے جاتے' مَیں اکیلا گھر بیٹھا کتابوں اور میوزک سے دل بہلاتا۔ دوپہر سے پہلے دریا کی دوسری جانب مدنی خان کے پاس ہوٹل پہنچ جاتا۔ اسے یسرنا القرآن شروع کرا دیا تھا۔ وہ بڑی دلچسپی سے پڑھ رہا تھا' نماز اور کلمے بھی درست کر رہا تھا۔ دوپہر کھانے کے وقفے میں اپنے دوستوں سے بھی ملاقات رہتی۔ اکٹھے کھانا کھاتے' گپ شپ ہوتی۔ عصر پڑھ کر واپسی ہوتی۔ شام کی چائے پہ پاشا صاحب پہنچ جاتے۔ نہا دھو' فریش ہو کر شطرنج بچھا کر بیٹھ جاتے۔ کبھی ہار کبھی جیت۔ شعر و شاعری بھی چلتی اور ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی۔ کھانے کے بعد ہم دونوں مدنی خان کے ہاں پہنچ جاتے۔ قہوہ اور کباب ہوتے اور مدنی خان کی دلچسپ باتیں۔ عشاء کے بعد واپسی ہوتی۔ ڈیک پہ اختری بائی' اللہ لایاں جان' مختار بیگم اور طلعت محمود' سہگل سُنے جاتے۔ قریب قریب مہینہ بھر اسی شغل میلے میں بیت گیا۔ پاشا صاحب کی مسحور کن شخصیت اور مدنی خان کی محبت اور خلوص نے ایسا جکڑ لیا تھا کہ گھر والوں کو قریب قریب بھول ہی گیا تھا' نہ ہی ان کی جانب سے کوئی جواب آیا تھا۔ کچھ دنوں سے طبیعت میں عجیب سا اضمحلال اترا ہوا تھا' رہ رہ کر گھر کی یاد آ رہی تھی' اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں--- ڈیک پہ طلعت محمود تھے ۔

"اے غم دل کیا کروں' اے وحشت دل کیا کروں"

باہر کوئی زور زور سے اطلاعی بیل دبا رہا تھا۔ ہڑبڑا کر باہر آیا۔ مدنی خان کھڑا تھا۔ خونبار آنکھیں' وحشت میں دکھائی دے رہا تھا سلام نہ دعا' مسلسل گھورے جا رہا تھا---

"خان' خیریت ہے؟" مَیں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"شاہ جی! تم اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے' ہم کو معلوم نہیں تھا۔ اُدھر وہ اور اِدھر تم ظالم گانا سن رہا ہے۔"

میری تو سٹی گم تھی' ہکلاتے ہوئے پھر پوچھا۔ "خان! بولو' کیا بات ہے--- تم پریشان کیوں ہو؟"

وہ میرا بازو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہنے لگا "ہمارے ساتھ چلو' اُدھر چل کر بتاتا ہے۔"

"مَیں جوتے پہن لوں---"

بازو چھڑا کر اندر آ گیا۔ پاشا صاحب کو ٹیلی فون پہ بتایا کہ مَیں مدنی خان کے ساتھ ہوٹل جا رہا ہوں' وہ بڑا پریشان دکھائی دے رہا ہے۔ آپ فوراً وہاں پہنچیں--- سارا راستہ اس نے میرا بازو نہیں چھوڑا جیسے چور کو پکڑ کر لوگ تھانے لے جاتے ہیں۔ ایک آدھ بار پھر پوچھنے کی کوشش کی مگر ادھر وہی چُپ' وہی انداز ہیں ظالم کے زمانے والے--- اپنے نامہ اعمال پہ نظرِ ثانی کی کہ جانے انجانے وہ کون سا گناہ سرزد ہوا ہے جس کی پاداش میں یہ مہربان آج پیٹھے پہ ہاتھ دھرنے نہیں دیتا؟--- بڑی عجلت اور اذیّت میں پُل پار کیا۔ آتے جاتے لوگ عجیب سی نظروں سے میری گرفت کو دیکھ رہے تھے' نظریں چراتے ہوئے' سر جھکائے مَیں ایک بھگوڑے کی مانند اس کے ساتھ گھِسٹ رہا تھا۔ ایسی عزت' ایسی سبکی' دل چاہا کہ بازو چھڑا کر دریا میں کُود جاؤں۔ ہوٹل کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم مسجد کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مجھے کھٹکا ہوا کہ یہ ظالم مجھے مسجد میں لے جا کر فائر ٹھونک دے گا۔ مَیں زیرِ لب وِرد کرنے لگا--- مسجد میں میرا ابّا اور اَماں جی بیٹھے ہوئے تھے۔ چائے اور کھانا ان کے سامنے ویسے کا ویسا ہی دھرا پڑا تھا۔ میرا بازو آزاد کرتے ہوئے وہ میری اماں جی سے مخاطب ہوا۔

"ماں جی! یہ آپ کا بیٹا ہے' خدا کے لئے آپ اپنے آنسو پونچھ ڈالیں۔" پھر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "ماں جی! شاہ صاحب بے قصور ہے' ان کو مَیں نے ہی مجبور کر کے یہاں رُوکا تھا۔ معلوم نہ تھا کہ یہ آپ کا ایک ہی بیٹا ہے۔ آپ اسے فوراً اپنے ساتھ لے جائیں' میرا گناہ معاف کر دیں۔"

پاشا صاحب بھی ہانپتے کانپتے پہنچ چکے تھے۔ انہیں جب ساری بات کا پتا چلا تو وہ بھی اباجی سے معذرت کرنے لگے۔ نماز کا وقت ہوا تو مدنی خان نے مجھے اذان دینے کا حکم دیا۔ اباجی نے امامت کی۔ کھانے کا انتظام مدنی خان نے کیا ہوا تھا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو پاشاصاحب نے ہم سب کو اپنے ہاں شب بسری کی دعوت دی۔ ظاہر ہے' رات کو سفر نہیں کیا جا سکتا تھا' اماں جی تو تھکاوٹ کی وجہ سے سو گئیں لیکن اباجی اور پاشا صاحب تو جیسے اس ملاقات کا انتظار کر رہے تھے۔ آدھی رات تک سلسلہ گفتگو جاری رہا۔ نئے پرانے زمانے

کی باتیں' شعر و شاعری' سیاست' مذہب' ایک آدھ بازی شطرنج کی بھی جمی۔ مَیں اندر باہر چائے' پان بنانے میں مصروف رہا۔

علی الصبح مدنی خان آ گیا تھا' ایک ادھیڑ عمر عورت بھی ساتھ تھی۔ وہ گھر میں اماں کے پاس ٹھہری' ہم چاروں نماز کے لئے مسجد کی جانب چل دیئے۔ ہلکی پھلکی سیر ہوئی' دریا کے کنارے کنارے چلتے ہوئے ہم اپنی مخصوص جگہ وضو وغیرہ سے فارغ ہوئے۔ اذان میرے حصے اور امامت پھر اباجی کے سپرد ہوئی۔ ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد ہم واپس ہوئے' مدنی خان نے ایک جیپ کا انتظام کیا ہوا تھا۔ پاشا صاحب نے بھی پشاور تک ساتھ چلنا چاہا مگر اباجی نے انہیں شکریہ کے ساتھ منع کر دیا۔ رخصت کے وقت پاشا صاحب نے ایک بند لفافہ زبردستی میری جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

"مولانا! مَیں آپ کے حالات سے واقف نہ تھا--- بہر حال' اب کبھی والدین سے دُور نہ رہنا اور یہ لفافہ گھر پہنچ کر کھولنا--- وعدہ!"

پشاور اسٹیشن پہ پہنچتے ہی مدنی خان کہیں غائب ہو گیا۔ قریب آدھے گھنٹے بعد واپس آیا۔ بہت سا خشک و تر پھل' کپڑوں کا ایک بھاری سا گٹھر اور سیالکوٹ تک تین ٹکٹ دیتے ہوئے التجا کرنے لگا۔

"شاہ جی! اپنی ماں جی کو کبھی اکیلا نہ چھوڑنا۔ مجھ سے پوچھو' ماں کی قربت کیسی جنت ہوتی ہے۔ تم جنت چھوڑ کر ادھر جہنم میں پڑا تھا--- جاؤ' اب ماں کے قدموں سے کبھی دور مت ہونا۔ میں نے تم کو بھائی بنایا ہے۔ انشاء اللہ' تم ہمیشہ ہمارا بھائی ہی رہے گا۔ میں خود تم کو ملنے آیا کروں گا۔"

گاڑی کے روانہ ہونے تک وہ مجھے نصیحتیں کرتا رہا۔ گاڑی سرکی تو بچوں کی مانند سسکیاں بھر کر رونے لگا' باوجود ضبط کے میرے بھی بند کھل گئے۔ پلیٹ فارم ختم ہونے تک گاڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا رہا' مڑ کر دیکھا تو وہ پلیٹ فارم کی ڈھلوان پہ گھٹنوں میں مُنہ دیئے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ وہ لائنیں بدلتی ہوئی گاڑی کو جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا جو اس کے شاہ جی کو اس سے دُور لے جا رہی تھی۔

بعض لوگوں کے بختوں میں آوارگی اور جہاں نوردی کی خواری لکھی ہوتی ہے۔ رازق نے ان کا دانہ پانی کرۂ ارض پہ مٹھیاں بھر بھر اچھال کر پھینکا ہوتا ہے۔ صبح کہیں' شام

کہیں اور رات کہیں۔ ایسا بھی ہوا کہ صبح کی چائے چین میں پی تو دوپہر کا کھانا دوبئی میں کھایا۔ شام کا طعام' شام میں شامل حال رہا تو عشائیہ یار کشاہر میں نونگا۔ ایسا اکثر ہوا کہ علی الصبح پابہ رکاب ہوئے تو آدھی دنیا پاٹ کر بھی دن کے اُجالے ساتھ رہے اور کہیں مغرب مشرق کے درمیان شب کی تاریکی نہ چھٹ سکی۔ بہت سوچا اور چاہا کہ کہیں سکوت ملے۔ چند شب و روز تو کہیں جم کر' ٹک کر تصورِ جاناں کئے ہوئے بیٹھیں' حسرت ہی رہی لیکن ایسے اکثر نہ ہوا۔ کبھی کوئی راہ نکلی بھی تو اندر چھپی ہوئی آوارگی نے پھر کوئی راستہ نکال لیا۔ پھر وہی ٹھوکریں' جگ رَتے' گھاٹ گھاٹ کا پانی' دَر دَر کے دانے' بھانت بھانت کے لوگ' ان دیکھے راستے' صحراو سراب' کوہ وکرب' شہرو شور' پیادہ و پرواز' زیرِ آب' آب سوار' نگر نگر' ڈگر ڈگر' گاتا جائے بنجارا لے کر دل کا ایک تارا!۔۔۔۔ اجنبی راہوں پہ اجنبیوں ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ اچھے بھی' بُرے بھی۔ ایسے بھی لوگ جنہوں نے دل پہ انسان دوستی اور مہرو محبت کے گہرے نقوش چھوڑے اور کچھ یوں بھی جنہوں نے دغاو دَرشتگی کے داغ دیئے۔ زندگی کے بوسیدہ کپڑے پہ پڑے پرانے نقش و داغ گو اَب دُھندلا چکے ہیں لیکن ایسے بھی نہیں کہ یہ بھی یاد نہ ہو کہ یہ کہاں اور کیسے نصیب ہوئے تھے۔ اب خمیدہ کمر' نیم بجھی آنکھیں' مضمحل لرزیدہ اعصاب' حافظے کا اللہ حافظ' مزاج میں مرچیں' برداشت خانہ بَرانداز' دانت دَریدہ' بال بَریدہ' چال میں جھول' بول پھٹا ڈھول۔ اب شاید میری آوارگی کو بھی عارضہ پیری نے آلیا یا وقت اور زمانے کا چلن بدل گیا ہے۔ نہ وہ مسافر رہے' نہ وہ مسافر نواز۔ دور دراز لمبے لمبے طویل راستے رہے' نہ وہ مہربان چھتنار پیڑ جو کڑی دوپہر میں شاخوں کے سر اٹھا اٹھا کر تھکے ہارے ماندے مسافروں کی راہ تکا کرتے تھے۔ وہ ٹھنڈے میٹھے کنویں' شیریں چشمے' ثمربار شجر' ملائم خوش رنگ حجر' خوش رنگ اور شیریں مقال طیور' کنولوں بھرے مصفا تالاب' کشادہ پر آسائش حجرے' وہ کشادہ دامن و دل مسافر نواز۔ شاید وقت کی تیز رفتار اور زمانے کے بدلتے تیوروں نے یہ سب کچھ اپنی کروٹ تلے تہہ و بالا کر دیا۔ اب تو کوئی بھولا بھٹکا کسی سے راستہ یا وقت پوچھ لے تو بتانے کی کوئی زحمت نہیں کرتا۔ سلام کا جواب دینے میں تامل ہوتا ہے' مجھ ایسے بڈھوں کو دھرتی کا بوجھ اور سڑیل سمجھا جاتا ہے۔

★★

بات اس بدمعاش سے چلی تھی جو میرے گھر کے سامنے کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ دو ٹکے کا لفنگا' کیا جانے کہ مَیں نے کیسے کیسے بدمعاش دیکھے اور سمجھے ہیں۔۔۔ قطب سے بات کر کے مَیں قدرے مطمئن ہو گیا تھا کہ یہ خود ہی اس سے نمٹ لے گا' مجھے بھی وہ اس کے بعد کہیں دکھائی نہ دیا۔

عید قربان پہ حسبِ معمول گائے کی قربانی دی۔ گھر کے باہر بکرے اور گائے ذبح ہو رہے تھے۔ قصاب مصروفِ قصابی تھے۔ بھک منگوں کے علاوہ پاس پڑوس کے بچے بھی جمع تھے' مَیں بڈھوں کی عادت قبیحہ کے تحت پائنچے اُڑسے پاس ہدایات دینے اور نگرانی کے لئے کھڑا تھا کہ وہ کم بخت کسی چھلاوے کی طرح وہیں کھمبے کے نیچے نظر آیا جبکہ دو منٹ پہلے میں وہاں گائے کی خون آلودہ رسی پھینک کر آیا تھا۔ میرے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ' مَیں نے قصاب کی لمبی سی چھری ہاتھ میں پکڑلی۔ یہی سوچ کر کہ چلو' آج لگے ہاتھوں اس بدمعاش کی بھی قربانی ہو جائے۔ وہ ناہنجار شاید میرے تیور بھانپ چکا تھا' میرے قدم اٹھاتے ہی وہ ریما کی کوٹھی کی جانب لپک گیا۔ سید نور کی کوٹھی کے پاس پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مَیں نے چھری والا ہاتھ لہراتے ہوئے منہ بھر کر ایک وزن دار جو پھینکی تو اسے بھاگتے ہی بنی۔۔۔ کم بخت نے عید کا سارا مزہ کرکرا کر دیا تھا۔ سارا دن مَیں بھرے بارود کی طرح پھنکتا رہا۔ ویسے بھی عید قربان پہ قربانی دینے والا خونخوار بنا ہوا ہوتا ہے۔ صبح سویرے ہی ان کا واسطہ قصائیوں' چھری ٹوکوں' جانور کے ساتھ کشتی اور پھر خونباری سے پڑتا ہے۔ رہی سہی کسر سری پائے رانیں اور کھال مانگنے والے نکال دیتے ہیں اور پھر اِدھر اُدھر کے گوشت مانگنے والے! جانور ابھی صحیح سلامت کھونٹے پہ بندھا تُشلا کھا رہا ہوتا ہے کہ یہ گوشت مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ سال بھر جن کی صورت دیکھنے کو ترسا کریں وہ اچانک بڑی سی "سلاما لیکم" اور خبیث سی مسکراہٹ سجائے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ٹیلی فون والے' پوسٹ مین' پلمبر' فلموں کے فائٹر ریڑھے والے' سبزی' قلفی بیچنے والے اس محبت اور احترام سے ملتے ہیں کہ جی چاہتا ہے' پورا جانور بمع قصائی ان کے حوالے کر دیں۔ ہمارا دماغ پہلے ہی ان لوگوں کی وجہ سے خراب تھا' اوپر سے اس بدمعاش نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ چھری ہمارے ہاتھ ہی میں تھی' باچھوں سے کف اور منہ سے خرافات۔۔۔ بالکل سلطان راہی کی فلم "بشیرا" کا منظر تھا۔ فرق صرف ہماری عمر' خون

آلودہ لباس' وِگ' مونچھوں اور گٹ اَپ کا تھا۔ گوشت کے انتظار میں بیٹھے ہوئے بھیک منگوں کے بچے' عورتیں' بوڑھے' ہمیں خون آشام دیکھ کر کھِسک گئے۔ قطب کو بھی اطلاع کر دی کہ باباجی' سلطان راہی بنے ہوئے ہیں۔ ہاتھ میں خون آلود چھُری اور آنکھوں میں خون اُترا ہوا ہے۔ وہ عید کے روز بھی سَویا ہوا تھا اور وہ سوتا بھی پیتل کے لباس میں ہے' یعنی الف ننگا۔ اس کی توجیہہ وہ یہ پیش کرتا ہے کہ خواب میں کوئی چڑیل' پری یا فلم ایکٹریس نہیں آتی۔۔۔ خیر' وہ ناخلف جوگنگ سوٹ کا الٹا پائجامہ پہنے بھاگا آیا۔ ہم نے اسے دیکھتے ہی للکارا۔

"جہاں ہو' وہیں کھڑے رہو۔ ہمارے قریب مت آنا۔ تمہارے سمیت میں سارے بدمعاش کو دیکھ لوں گا۔ یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ تم تو گھر کے بدمعاش ہو' اس لئے کسی حد تک قابلِ برداشت ہو لیکن یہ باہر کے بدمعاش ناقابل معافی اور دُور از برداشت ہیں۔ ایک لفظ منہ سے نہ نکالنا' مَیں اس وقت تمہاری کوئی بھی بکواس سننے کے مُوڈ میں نہیں ہوں۔"

دوَر دوَر کھڑے سہمے ہوئے بچے' راہ گیر' ہاتھ روکے ہوئے قصاب حضرات۔ ہماری کانپتی ٹانگیں' رعشہ زدہ ہاتھ میں لہراتی ہوئی چھری' سینے میں پھدکتا ہوا کمزور دل' عجیب سی صورت حال تھی۔ کوئی بھی ہمارے قریب آنے کی جرات نہیں کرپا رہا تھا۔ اچانک مجاہد فورس والوں کی گاڑی آتی دکھائی دی۔ پولیس والوں کی گاڑی تو اندھوں کو بھی دکھائی دے جاتی ہے' ہم تو پھر بھی ایسے کور نظر نہیں تھے۔ پولیس آتے ہی صورت حال یکسر بدل گئی۔

"یار! جلدی کرو' سورج سر پہ آگیا ہے اور تمہاری ابھی چھُریاں تیز نہیں ہوئیں۔"

ہم قصائیوں سے مخاطب تھے۔ ہم سڑک سے ہٹ کر قصائیوں کی طرف آ گئے' پولیس گاڑی بھی رُک گئی تھی۔ بکھرے ہوئے بچے اور دیگر لوگ بھی اب قریب آ گئے۔ گاڑی سے پولیس والے نے پوچھا۔

"حاجی صاحب! خیریت ہے' آپ بڑے گھبرائے ہوئے ہیں؟" وہ کٹی ہوئے گائے کی رانیں دیکھ رہا تھا۔

ہم نے پہلے سلام کیا' پھر مسکراتے ہوئے کہا۔ "الحمدللہ' خیریت ہے' بس یہ قصائیوں کی مصیبت ہے۔ دو گھنٹے سے لگے ہوئے ہیں' ابھی تک کھال نہیں اُتری۔۔۔ آپ واپسی پہ گوشت لے جائیے گا۔"

گاڑی گئی تو ہم نے مُنڈی ڈال دی' بڑی شرمندگی ہوئی۔ کہاں ہم آمادۂ قتل' کہاں اب ہماری یہ بکری سی صورت حال۔۔۔ واقعی' انسان کو اپنی حد و اوقات میں رہ کر بات کرنا چاہئے ورنہ بڑا بول بول کر انسان کو بڑی چھوٹی سطح پہ شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔۔۔ کم بخت' قطب ہمیں بڑی دُزیدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"باباجی! بس' قیں ہو گئی بدمعاشی۔ پولیس کو دیکھ کر ساری اکڑ فوں نکل گئی؟ بدمعاشی' شریف اور خاص کر بوڑھے آدمی کے بس کا روگ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر شریف آدمی بدمعاش ہوتا۔ بدمعاش تو کبھی شریف بن سکتا ہے' شریف آدمی اول تا آخر شرافت ہی اوڑھے رکھتا ہے۔"

وہ میرے قریب آیا' بڑی جرات سے مسکراتے ہوئے چھُری میرے ہاتھ سے لی اور اس کی دھار پہ انگوٹھا پھیرتے ہوئے کہنے لگا۔ "باباجی! چھُری تیز ہو یا کند' چھُری ہوتی ہے۔ ہر دو صورت میں یہ چھری ہی رہتی ہے اور اس کا کام کاٹنا ہے' گاجر ہو یا گلا۔۔۔" میری سامنے والی جیب سے قلم اتار کر میرے ہاتھ پکڑاتے ہوئے بولا۔ "آپ کے ان اچھے ہاتھوں میں یہ اچھا لگتا ہے یا پھر تسبیح۔۔۔ ہوا کیا' آپ کے مزاج کیوں برہم ہیں؟"

میں نے خجل خجل سارا ماجرا کہہ سنایا۔

"وہ اُلّو کا پٹھا ہے۔ جب دکھائی دے' آپ فوراً مجھے خبر کریں۔۔۔ ابھی بھی تو مجھے پتہ چل گیا ہے' اگر ذرا پہلے مجھے خبر کر دیتے تو میں سیدھا اسے فائر ٹھوک دیتا۔" وہ حسبِ عادت اپنا نیفہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "بس' آپ یہ عید کے دو چار دن کسی نہ کسی طرح گزار لیں۔ اس کے بعد اس الو کے پٹھے کی آپ کے سامنے اسی جگہ قربانی کروں گا۔" وہ اپنے ہاتھ سے میرے شانے پہ بوجھ ڈالتے ہوئے بتانے لگا۔ "مَیں نے اپنے آدمی اس کے پیچھے ڈال دیئے ہوئے ہیں' بس چوہا' میرے تلوؤں تلے آنے ہی والا ہے۔"

قطب نے عید کے دو چار روز نکالنے کو کہا تھا جبکہ مَیں جانتا تھا کہ بڑی عید دو چار روز تک نہیں ہوتی۔ یہ تو گوشت اور قوت معدہ کی بحالی تک ہوتی ہے۔ مسکین کے لئے جب تک گوشت پیٹ میں رہے' غریب کی جب تک ہانڈی چڑھی رہے اور امیر کا جب تک فریزر کام کرے اور مولوی کی جب تک کھالوں سے بال نہ اتر جائیں۔ یہ مجھے دنوں کا چکر دے رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ کسی کے ہاں دعوت پہ مدعو تھا۔ قورے کی قاب کی جانب ہاتھ

بدھایا' بوٹیاں کچھ نیلی نیلی دکھائی پڑیں' جی خوش ہو گیا کہ خوش قسمتی سے آج نیل گائے چکھنے کو ملی۔ پوچھ بیٹھا کہ یہ نایاب گائے کا گوشت کہاں سے دستیاب ہوا؟ — خاتون خانہ مسکرائیں' بولیں۔

"باباجان! یہ نیل گائے کا گوشت نہیں' نیلی بار کی گائے کا گوشت ہے — یاد کریں' آپ کو پچھلی عید پہ اس کی ران کا گوشت بھیجا تھا۔ یہ اسی گائے کی دوسری ران کا گوشت ہے۔ جو آپ ابھی نوش جان فرما رہے ہیں' بس فریزر میں پڑی پڑی ذرا نیلاہٹ پکڑ گئی ہے۔"

یہ بھی بتا دوں کہ یہ دعوتِ طعام عید الفطر کے مبارک موقع پہ تھی۔ اس سگھڑ خاتون سے یہ غلطی ہوئی کہ اس شاہی ران پہ حنوط کرنے والے مسالے اور اوپر دو پٹے کی پٹیاں نہیں لپیٹیں۔ اسی پھوہڑ پنے اور بے ہنری کی وجہ سے اس خاتون کے بچے اسے ممی نہیں امی کہتے ہیں — خیر' دو چار دن گزر گئے۔ قاعدے کے مطابق ہمارا ہی کیا' پورے محلے کا معدہ خراب تھا۔ سیون اپ' کسوریلی' کلا نمک اجوائین' کھار مولی کی بہاریں اُترتی ہوئی تھیں۔ سلام کے جواب میں ڈکار موصول ہوتے تھے۔ چار آدمی' چار منٹ اکٹھے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ پیٹوں کی زبانیں کھل گئی تھیں' بڑے بڑے بول برآمد ہو رہے تھے۔ اندر بھی تعفن' باہر بھی سڑاند' بلکہ باہر نکلنا دوبھر ہو گیا۔ اوجڑیاں اور آنتیں غباروں کی مانند پھولی پڑی تھیں۔ بدبو کے بھبکے' ناک اٹھائی نہیں جا رہی تھی۔ میرے سمیت دو چار نکموں نے یہ غلاظت ٹھکانے لگانے کی ٹھانی۔ منہ ناک پہ ڈھاٹے باندھے' ایک خالی پلاٹ کو "کالا" شیطان جیسی آنتوں اور جڑیوں کو گھسیٹا۔ پاس ہی ٹیلی فون والوں کا قبر نما' زمین دوز پختہ بکر تھا جس کے دہانے کا آہنی ڈھکنا کسی ضرورت مند کے کام آ چکا تھا۔ اندر نگاہ کی تو یہ بھی اوجڑیوں سے پٹا پڑا تھا۔ گنجائش دیکھنے کے لئے جھک کر دیکھا تو دیکھتا ہی چلا گیا۔ وہ مُردار بد معاش' وہی ازلی لچا' میرا دشمن' دانت نکوسے اکڑا ہوا واصل جہنم تھا۔ خون خون' ایک آنکھ تو پہلے ہی بجھی ہوئی تھی' دوسری بھی غائب۔ چہرے پہ گہرے زخموں کے نشان۔ میری بد دعا لگی تھی' دو نمبر بد معاشوں کا یہی انجام ہونا چاہئے۔ میں نے کسی کو بتائے بغیر بڑی ہی اوجڑی گھسیٹ کر اس کو غلاظت کے پہاڑ تلے دفن کر دیا۔ خس کم جہاں پاک!

قطب! اس کی ایسی کی تیسی۔ کھوڑیا اور باتوں کی بتیاں بٹنے والا' دو نمبری جھوٹا

بدمعاش' شکر ہے کہ اس کمینے کا احسان نہ ہوا۔ اس قبیل کے بدمعاش سے کوئی کام کروا لو تو ساری زندگی بلیک میل ہوتے رہو۔ کبھی گاڑی مانگنے آدھمکیں گے' کبھی شام کے وعدے پہ روپے قرض مانگیں گے۔ کبھی ضمانت' کبھی تھانہ' گواہی' کچہری۔ اللہ نے صفا صفا بچا لیا تھا مگر اس کا کیا علاج کہ انسان جہاں محتاط ہوتا ہے وہیں زک پہنچتی ہے۔ جہاں چوٹ ہوتی ہے' وہی حصہ پھر زد میں آ جاتا ہے۔ جس بچے کی تربیت میں جان مارو وہی نکما نکلتا ہے — دشمن کی صورت پہ گھوڑے بیچ کر سویا ہوا تھا کہ گھنٹی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ وقت دیکھا' رات کے دس بجے تھے۔ ناچار اُٹھا' نیچے نگاہ کی تو وہی کمبخت قطب' ساتھ دو چار لفنگے مسکراتے ہوئے مجھے نیچے آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ اس کی منحوس صورت اور لفنگوں کی ٹولی دیکھ کر سارا مزہ کرکرا ہو گیا۔

"کیا ہے —؟" میں نے بڑی رُکھائی اور بے دلی سے پوچھا۔

"باباجی' نیچے تو آیئے —"

"یار! یہ کوئی وقت ہے۔ میں سو رہا تھا اور تم —"

وہ ایک مردود کو جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ "یہ کتا بڑی مشکلوں سے پکڑا ہے۔ میں اسے فائر ٹھوک رہا ہوں' آپ ذرا نیچے آ کر اسے چیک کریں اور اس کی آخری خواہش پوچھیں۔"

میری تو ٹانگیں لرزنے لگیں — خدایا! یہ کس اُلّو کے پٹھے کو اٹھا لایا ہے۔ میرا دشمن تو واصل جہنم ہو چکا ہے — کپڑے پہن کر نیچے اترا' ہلکی سی روشنی میں اسے ملاحظہ کیا۔ ایک آنکھ سے کانا' چہرے پہ بے شمار بد نما داغ' چیچک زدہ بیٹھی ہوئی ناک' اٹھا ہوا ماتھا۔ شکل سے ہی کوئی اچکا اور اٹھائی گیرا دکھائی پڑا۔ قطب ایک دھول اسے رسید کرتے ہوئے بولا۔

"باباجی! یہ مان ہی نہیں رہا' قسمیں کھاتا ہے کہ میں ادھر کبھی آیا ہی نہیں۔"

"یار قطب! اگر یہ قسمیں کھاتا ہے تو ہمیں ہی یقین کر لینا چاہئے' آخر مسلمانی بھی تو کوئی چیز ہے۔" میں نے کہا۔

شہ ملنے پہ وہ بے چارہ گھگھیایا۔ "حاجی صاحب! مجھ کو مدینے کی قسم' میں واقعی اس علاقے میں پہلی بار آیا ہوں۔ نہ میں آپ کو جانتا ہوں' نہ کبھی آپ کو دیکھا ہے۔ یہ پہلوان

خوامخواہ مجھے چوبرجی سے گھسیٹ لائے ہیں۔ میں مالیشیا ہوں' وہاں جا کر آپ کسی سے بھی میرے بارے میں دریافت کر لیں۔ میرا نام گلا مالیشیا ہے' چک جھمرے کا رہنے والا ہوں۔"

قطب نے واقعی اپنا زنگ آلودہ دیسی موزر نکال کر اس کی پسلی پہ رکھ دیا۔

"کمینے! بلباجی اور مجھے جھوٹا بناتا ہے--- بلباجی نے جو جو نشانیاں بتائیں وہ ساری تجھ میں موجود ہیں پُتر! میں نے تو سارا لاہور کھنگال دیا ہے۔ سچ بول' ورنہ مرنے کے لئے تیار ہو جا---"

معاملہ بگڑتا دیکھ کر مَیں پریشان ہو گیا' قطب کا بازو پکڑ کر مَیں پرے ہوا۔

"قطب جی! آپ غلط آدمی کو پکڑ لائے ہیں۔ وہ تو ٹھگنا سا ہے' اس کا رنگ بھی صاف ہے۔ وہ تو کلا شاہ کلا ہے--- مَیں اس کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔"

"بلباجی! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟--- اچھی طرح دیکھیں۔ مَیں جانتا ہوں' آپ کو ہلکا سا "اندھراتا" بھی ہے۔ رات کا وقت ہے' آپ اسے غور سے دیکھیں۔ یہ وہی بدمعاش ہے ممکن ہے' اس نے ہمیں دھوکا دینے کے لئے پوڈر کریم سے رنگ سفید کر لیا ہو اور قد کا کیا ہے' اونچا نیچا جوتا پہننے سے آدمی دھوکا دے جاتا ہے۔"

مَیں نے اس کا موزر تھامتے ہوئے کہا۔ "میاں! کوئی غلطی مت کر بیٹھنا' تمہارا ریکارڈ پہلے ہی بہت خراب ہے--- اس کو چھوڑ دو' یہ اپنا مطلوبہ بندہ نہیں ہے۔"

"بلباجی! اگر یہ نہیں بھی ہے تو بھی اسے فائر ٹھوکنا پڑے گا' بڑا خرچ خرچا ہوا ہے--- آپ یہ بندے دیکھ رہے ہیں' خرچے پانی کے بغیر تو کوئی کام نہیں کرتا۔ دو مہینے ہو گئے مجھے جاسوسی کرتے ہوئے' آپ ہمارے کئے کرائے پہ جھاڑو پھیر رہے ہیں۔"

"خرچہ پانی میں دیتا ہوں' تم اسے جانے دو۔"

میں اسے گھسیٹتا ہوا واپس آیا۔ سو روپے کا نوٹ مالیشے کو دے کر اسے رخصت کیا۔ وہ دُعائیں دیتا ہوا رخصت ہوا تو یہ سارے آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ آخر پانچ سو روپے انہیں تھما کر گلو خلاصی کرائی' بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے مالیشے سے بھی سو روپے لئے تھے اور پھر پکڑنے کی دھمکی بھی دی تھی۔

صاحبو! عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ ہر ہفتے عشرے بعد قطب اور اس کے

ساتھی کسی اندھے کانے کو پکڑ لاتے ہیں۔ اس بے گناہ غریب کی جان چھڑانے کی خاطر مجھے ان دو نمبر بدمعاشوں کو خرچہ پانی دینا پڑتا ہے۔ میں نے جو قطب سے مذاق کیا تھا' مجھے اس کی کافی سزا مل چکی ہے۔ آج میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اسے ساری حقیقت بتا دوں اور اوجڑیاں ہٹا کر اس بدمعاش کی سڑی لاش بھی دکھا دوں جو ایک بِلّا ہے--- جی ہاں' کلا سیاہ بِلّا--- ویسے مجھے یقین ہے کہ وہ میری سچ بیانی پہ یقین نہیں کرے گا۔ خرچے پانی کا معاملہ ہے نا---!

✿✿✿

دیسی صابن سے دُھلے ہوئے بے استری کپڑوں پہ نکھار تو کیا آتا البتہ سرسوں کے مشینی تیل' مُردار چربی اور سوڈا کاسٹک کی مِلی جُلی تیز بساند ضرور آتی تھی۔۔۔ صبح ہی صبح پہلی اذان کے آگے پیچھے ڈیرے پہ پہنچتے ہی وہ پہلا کام یہی کرتا کہ کپڑے اتار کر' دھوتی باندھ لیتا' تیل پسینے کی ملی جلی سڑن میں رچے بسے شلوار قمیض' چھوٹی سی پَرنا نما چادر دستی پمپ کے نیچے پھینک دیتا' مٹی رنگے کھردرے بدبودار دیسی صابن سے خوب رگڑ رگڑا کر' دھوپٹک' صاف کر کے دیوار پر پھیلا دیتا۔ شام قریب پانچ بجے نہا دھو کر انہیں پہنتا تو یہ پہلے سے بھی زیادہ گندے دکھائی پڑتے۔ اکڑی ہوئی خارش زدہ گدھے کی پوست کی طرح' جابجا تیل کے دَھبّے جیسے بَرص' چڑیوں' چیلوں' کوّوں کی خشک غلاظت کے نشان تو کسی پرنٹڈ ڈیزائن کی طرح سدا بہار ہو چکے تھے۔ پہلے سے تیار بھرا ہوا چُرمر سگریٹ سلگا کر وہ کپڑوں کی سلوٹوں کو ہاتھ سے استری کرنے کی ناکام کوشش کرتا اور پھر لمبے لمبے بھرپور کش کھینچ کر' کنٹر سے تیل کی بوتل نکال کر صاف کرتا اور اسی پَرنے سے چپل صاف کر کے باہر نکل آتا۔ کواڑ کے اوپر سے ہاتھ لمبا کر کے اندر کا کنڈا لگاتا' پھر باہر کنڈی چڑھا کر بے چابی کا تالا چڑھا دیتا جو محض دبانے اور کھینچنے ہی سے بند اور کھُل جاتا تھا۔ پھر گلی کے موڑ پہ چراغ دین کریانے والے سے تیل بھروا کر چائے کی دوکان پہ آ بیٹھتا۔ چائے کا آرڈر دے کر' دھندلے سے ٹیلی ویژن پہ پروگرام دیکھتا اور ایک آدھ سلوا سگریٹ پھونکنے کے بعد تیل کے کنٹر کو پرنے میں لپیٹ کر یادگار کا رخ کرتا۔

پچھلے کئی برسوں سے اس کا یہی معمول تھا' بھاٹی' دربار' ٹبی' یادگار کے علاقے اس کی

عملداری میں تھے۔ کسی مالشئے' بھڑوے' کوٹھے والی یا پولیس ملازم سے اس کے بارے میں پوچھ لو' پوری ہسٹری مل جائے گی۔۔۔ اصلی نام تو قربان علی تھا' چیتے ایسی بلوری آنکھیں' شہابی رنگت' کھڑی ناک' مضبوط جبڑا' تہہ دار ابھرے ابھرے ہونٹ' فراخ چمکتا ہوا ماتھا' سنہری غبار سے اَٹے ہوئے بال' دونوں کانوں میں چاندی کی تار میں پرَوئے ہوئے عقیق کے تراشیدہ شہابی والے۔۔۔ شاید اسی ناک نقشے اور خصوصیات کی وجہ سے لوگ اسے شہزادہ مُندراں والا کہتے تھے۔ اس قسم کے شہزادے اکثر جیب و جناب سے خالی ہوتے ہیں کہ کمایا' کھایا پیا' اور اللہ' اللہ۔۔۔ اسی قبیل کے کچھ اور لوگوں کی طرح' کہتے ہیں کہ ماشیا' بھڑوے اور جیب تراش کی کمائی بھی آئی چلائی ہوتی ہے۔ خوراک' نشہ پانی' تاش پتہ' رشوت جُوا میں ہی برابر ہو جاتی ہے۔ بھانت بھانت کے بھَلے بُرے لوگوں سے دن رات واسطہ رہتا ہے اس لئے یہ "فنکار لوگ" بڑے شاطر' چرب زبان اور ہتھیلی پہ سرسوں جمانے والے بھی ہوتے ہیں' چال چہرہ دیکھ کر اپنی آسامی کو تاڑ لیتے ہیں۔ ان کی کھوجتی ہوئی آنکھیں ایکسرے کی طرح ہوتی ہیں جو دل' دماغ اور جیب کا فوراً ایکسرے لے لیتی ہیں۔ اَن پڑھ' جاہل اور اُجڈ ہونے کے باوجود انسانی نفسیات' جبلّت' قیافہ اور چہرہ شناسی میں یہ بڑی دسترس رکھتے ہیں۔ اپنے مطلب کی آسامی کو سینکڑوں میں پہلی نظر میں پہچان لیتے ہیں اور شکار کو دیکھتے ہی مالشئے کا تیل والا کنستر بجنے لگتا ہے' بھڑوے کی آنکھوں کا پانی مُنہ میں آ جاتا ہے اور جیب تراش کی خمیدہ انگلیوں میں زور سے اینٹھن ہونے لگتی ہے جبکہ بعض شکار تو کسی معمول کی مانند خود ہی کچے دھاگے سے بندھے چلے آتے ہیں۔

اس روز بھی وہ کسی ویگن کی طرح اپنے لگے بندھے روٹ پہ اپنے مخصوص انداز اور مخصوص رِدھم میں کنستر بجاتا خراماں خراماں چلا آ رہا تھا۔ ٹبی تھانے سے آگے چوک کے کونے پہ اپنی پسندیدہ پان کی دوکان سے تین ڈبل پیلی پتی قوام والے پانی بندھوا کر وہ علی پارک کی جانب بڑھ گیا۔ بازار میں حسب معمول چہل پہل تو تھی لیکن وہ رونق اور چہ چہکار نہیں تھی جو اس وقت ہونی چاہئے' شاید اس کی وجہ وہ ہلکی سی بارش تھی جو شام سے پہلے یہاں چھڑکاؤ کر گئی تھی اور خنکی کے ساتھ اِک بے نام سی اداسی بھی بکھیر گئی تھی۔ کھڑکیاں' دریچے' بالکونیاں ابھی مُومی چہروں کے چراغوں سے فروَزاں نہیں ہوئے تھے۔ سر نیہوڑے وہ مجے سری پائے والے کی دوکان تک آ پہنچا اور اِک نظر اندر باہر ڈال کر علی

پارک کے کونے والے بیت الخلاء چلا آیا۔ فراغت کے بعد پچھلی دیوار کے ساتھ پارک میں داخل ہو گیا۔ یہ پارک ... مالیشیوں' سازندوں' بھڑوؤں' موسیقی سکھانے والے استادوں' کوٹھے والیوں کے ادھیڑ عمر خوش فکر سرپرستوں' ہمہ وقت مخمور نشے بازوں' ملنگوں' تماش بینوں اور بازار والیوں کے بیٹوں' بھائیوں اور نام نہاد شوہروں کی جائے پناہ ہے۔ ورزش گاہ کے پاس درخت کے نیچے چند ایک مالشئے بیٹھے گپیں ہانک رہے تھے۔

"آ بھئی' شہزادے۔۔۔!" مِلے مالشئے نے اس کے لئے جگہ بناتے ہوئے کہا۔ "بارش کی وجہ سے آج دھندا بھی ذرا کم ہی ہوگا۔۔۔"

وہاں بھرے ہوئے سگریٹ کے دو کش کھینچ کر وہ مسجد کی جانب کھِسک آیا اور معمول کے مطابق علامہ اقبالؒ کے مزار کے باہر کھڑا ہو کر فاتحہ پڑھنے لگا۔۔۔ خدا جانے علامہؒ سے اس کی یہ عقیدت کس نسبت سے تھی؟ شعر و شاعری کا تو اسے شعور نہ تھا' شاید سیالکوٹی ہونے کے ناتے وہ ہر روز یہاں سے گزرتے ہوئے اُلٹی سیدھی فاتحہ ضرور پڑھتا۔ پھر مسجد کے میناروں' تبرکات کی ڈیوڑھی پہ نظر ڈالتے ہوئے وہ سیڑھیوں کے سامنے سے بارہ دری اُتر آیا۔ یہاں بھی بہت سے فارغ خوش فکرے اپنے اپنے مشغلوں میں لگے ہوئے تھے' رنجیت سنگھ کی مڑھی کی جانب بائیں کونے میں دس بیس پرانے لاہوریے' داستان سن رہے تھے۔ موٹے موٹے شیشوں والی دھندلی سی عینک لگائے' ایک ادھیڑ عمر شخص پرانی سی کتاب کھولے' غازی صلاح الدین ایوبی کی فتوحات' تھیٹریکل انداز میں ایکٹنگ کے ساتھ سنا رہا تھا' کسی مشکل سے لفظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی اس کے اَن فِٹ مصنوعی دانتوں کا بیڑہ بھی باہر کھِسک آتا جسے واپس جمانے کی کوشش میں بھاری شیشوں والی بوسیدہ عینک بھی جھُول مار دیتی اور نتیجہ یہ برآمد ہوتا کہ سوئے جاگے' نشے اور بڑھاپے کی پینک میں مدہوش سامعین' میدان جنگ سے اگلے لمحے شیردل رچرڈ کی بہن کی خواب گاہ میں پہنچ جاتے' سطروں کی سطریں وہ پھلانگ جاتا' سامعین کی سماعت کے پردے پہ چلتی ہوئی فلم کے کئی کئی سین کٹ جاتے مگر خوش فکر سامعین بھی کمال کشادہ سماعتی سے کام لیتے ہوئے خاموشی سے سننے میں مگن رہتے۔۔۔ شہزادہ بھی مزہ لینے کی خاطر ایک طرف بیٹھ گیا۔ اب داستان گو شاید کئی صفحے ایک ساتھ پلٹ گیا تھا۔ رچرڈ کی خوبصورت بہن کی حشر سامانیاں' فتنہ طرازیاں اور عشوہ اندازیاں بیان کرتے کرتے یک دم شیردل رچرڈ کے خیمے میں گھُس آیا

جہاں وہ کسی خوفناک بیماری سے کراہتے ہوئے آہ و فریاد کر رہا تھا۔۔۔ شہزادہ خاموشی سے وہاں سے کھسک لیا۔ آگے گوردوارے کے پاس پیلی پگڑیوں' تنگ مُوری دار پاجاموں' چُست اونچے کُرتوں اور ننھی ننھی کرپانوں کی بسنت بہار لگی ہوئی تھی' داڑھیل سِکھ' دھان پان سکلوں جوڑوں والی سِکھنیاں' گوردوارے اور قلعے کی دیواروں تلے دوکانداروں سے خریداری کر رہی تھیں۔ گنّے کا رَس' دہی بھلے' فروٹ چاٹ' نان کباب' حلیم اور دو نمبر کے ریڈیو' کیمرے' دُوربینیں بیچنے والے ان یاتریوں کو اپنی چرب زبانی کی کرپانوں سے خوب کاٹ رہے تھے۔۔۔ سڑک پار کر کے وہ یادگار کے پارک میں گھُس گیا۔ ہلکی بارش کی وجہ سے گھاس کی بجائے لوگ بنچوں پہ قبضہ جمائے بیٹھے تھے' چہل پہل کی یہاں بھی ابھی کمی تھی۔ ابوالاثر حفیظ جالندھری مرحوم کے مرقد کی جانب کچھ لڑکے پتنگیں اڑا رہے تھے' پاس ہی ایک ٹولی اپنے اپنے لمبے بالوں والے استاد کے ساتھ جمناسٹک کی ٹریننگ لے رہی تھی' ہواخور اور سیرسپاٹے کے شوقین تیز تیز قدموں سے آ جا رہے تھے۔ اِک بے نام سی اُداسی یہاں بھی اس کے ساتھ تھی۔۔۔ اصل دھندے کا وقت تو اندھیرا چھا جانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔۔۔ کسلمندی محسوس کرتے ہوئے وہ نسبتاً خشک جگہ پہ بیٹھ گیا۔ پھر چادر سے کنٹرلپیٹ کر مُنہ ڈھانپے نم آلود گھاس پہ نیم دراز ہو گیا۔

"تیل مالش" اور کنٹر چھنکنے کی آواز غیرمانوس تو نہیں تھی لیکن ان اداس لمحوں میں بڑی بُری لگی' سلطانا گوجرانوالیہ رَونڈ لگاتے ہوئے اس کے سر پہ بھی آ پہنچا تھا۔ اگر وہ جان لیتا کہ چادر کے نیچے کوئی شہزادہ ہے تو وہ کورنش بجالاتا لیکن وہ تو اسے کوئی تھکاہارا مسافر جان کر ادھر آیا تھا۔۔۔ دوبارہ اپنا ہانکا اور ساز بجا کر وہ سامنے سنگی بنچ کی جانب ہو لیا جس پہ ایک پرانا ھِنگر' توند نکالے' پھُولے پھُولے گالوں سے ہپ ہپ کی آوازیں نکالتا ہوا ہانپ رہا تھا۔ اس قسم کی نادرِ روزگار اور عجیب الخلقت چیزیں صرف لاہور اور گوجرانوالہ میں پائی جاتی ہیں۔ یہ حاجی' شیخ' ملک' پہلوان یا بٹ صاحب جیسے اُدھیڑ عمرے' گوہندا گاہندی یعنی مالش کروانے کے بڑے شوقین ہوتے ہیں۔ ان کے ڈھیر کے ڈھیر آپ کو دہلی دروازے' موچی دروازے' لوہاری' بھاٹی' بارہ دری' مقبرے' راوی' یادگار اور شہر کے بازاروں' چوکوں' تھڑوں' گلیوں اور پارکوں کے بنچوں' مُوہڑوں یا بڑے بڑے پایوں والی جہازی چارپائیوں پہ دھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ بڑے یار باش اور ہنسوڑے ہوتے ہیں۔

سیاست' مذہب' مسلک کے معاملات میں مُنہ مارنے کے علاوہ لڑائیاں کروانا اور عید میلادالنبیؐ' عرس' قوالیاں' جلسے جلوسوں کی سرپرستی کرنا' پہلوانی' نعت خوانی کی مجالس میں صدارت یا خلافت سنبھالنا' پتنگوں' مُرغوں' بٹیروں اور بھیڑوں کے مقابلے کروانا' کتوں' گھوڑوں اور تانگوں کی دَوڑیں لگوانا' چوسر' گنجفہ' شطرنج اور تاش کھیلنا ان کے روزمرّہ کے مشاغل میں شامل ہوتا ہے۔ کوئی کام کاج نہ کرنے اور ہروقت دھرے پڑے رہنے کی وجہ سے بڑے کاہل الوجود' سُست' بھاری بھرکم اور بے ڈھنگے حلیے حال کے مالک ہوتے ہیں۔ اکثر گنٹھیا' دمے' ذیابیطس' دل اور پیشاب کی مکروہ بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں' گھر والے انہیں علیحدہ بیٹھکوں یا اُوپر کوٹھے پہ سُلاتے ہیں پھر بھی ان کے جگرپھاڑ خراٹوں سے کم از کم آس پڑوس کے بچے جاگتے رہتے ہیں۔ لمبے لمبے کھابے کھا کر' فلک شگاف ڈکاروں سے انڈیا کو ڈراتے رہتے ہیں۔ ان کے فراغت خانے بھی کھُلی ہوا میں علیحدہ ہوتے ہیں۔ گھر' محلے داروں' تانگے رکشے والوں کی طرح مالشئے بھی ان سے بڑا رَکتے ہیں اور مندے کے علاوہ عام حالات میں ان کے قریب تک نہیں پھٹکتے۔ یہ مارتے کم ہیں' گھسیٹتے زیادہ ہیں یعنی پیسے کم دیتے ہیں اور مالشئے کی توبہ کروا دیتے ہیں۔ خود کو سالم مالشئے کے آگے ڈال کر خود خراٹے بھرنے لگتے ہیں اور ماشیا بے چارا اُسترے سے مُنڈھے ہوئے بے ہنگم' دریائی گھوڑے کی مانند پلپلے' لجلجے' بے طاقتے گوشت کے پہاڑ کو جھنجھوڑنے کی دہاڑی میں لگ جاتا ہے۔

شہزادے نے ہلکی سی چادر ہٹا کر سلطانے گوجرانوالیہ کو پہلوان کی جانب بڑھتے دیکھا۔ پولیس کی طرح تک مُکا کے بعد نام کا سلطان اس کے پاؤں میں بیٹھ کر نیلی نیلی ابھری ہوئی نسوں سے بھری ہوئی پنڈلیوں سے اپنا رزق نچوڑنے لگا۔۔۔ شہزادے کو آج پہلی بار اس کام سے گھِن سی محسوس ہوئی۔ ایک انسان' دوسرے انسان کے پاؤں میں بیٹھا کتنا بے بس اور چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔۔۔ اس نے تلخی سے مُنہ ادھر کر لیا' اور سیدھا چت لیٹ گیا۔۔۔ کھُلا آسمان اندھیرے کی چادر میں مُنہ لُکانے کی تیاریاں کر رہا تھا' اتھلے اتھلے بادلوں کے ٹکڑوں روئی کے گالوں کی طرح دھکے دھکے سے ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے' شفق کی سرخی نے یادگار کے مینار کی چوٹی کو سرخ بانات سے سجا دیا تھا' میٹھی سی خنکی محسوس ہوتے ہی اس نے چادر اوپر ناک تک کھینچ لی تو اپنے ہی سانس کی گرمی' میٹھی میٹھی تمازت کی طرح

اس کے رگ و پے میں اُترنے لگی۔۔۔ اکھیوں کے جھروکے تو کھُلے ہوئے تھے' ماضی کے مَدھم مَدھم منظر جیسے خود ہی کھُلتے گئے۔

★★

دریا کنارے چھوٹا سا سرسبز گاؤں' ہرے بھرے کھیت' باغ' گھنے ذخیرے' کھیل کبڈی کا میدان اور چند کھیت آگے ہندوستان کا علاقہ۔ کھلی کھلی صاف ستھری فضا' کچے پکے گھر' یار بیلی' ماں باپ' بہن بھائی۔۔۔ کھلے آسمان پہ جیسے اس کے ماضی کی فلم کے ٹوٹے چلنے شروع ہو گئے۔ مسجد کا ایک سین آیا۔ وہ ننگے پاؤں' ننگے سر' سپارہ پڑھنے جا رہا ہے۔ پھر اسکول نظر آیا۔ برگد کا بوڑھا درخت' نیچے تین پاؤں اور پانچ اینٹوں والی کرسی اور ماسٹر علم دین' جو ذات کا جولاہا تھا۔ زمین پہ پھٹا ہوا ٹاٹ' تختی دوات' لڑائیاں' غلیلیں' آدھی چھٹی' مرغا بننا۔۔۔ پھر بڑا اسکول نظر آیا۔ ہیڈ ماسٹر' ٹلی بجانے والا بابا بگھا جو اسکول کا مالی بھی تھا۔ کلاس روم' بلیک بورڈ' کاپیاں' سلیٹ' ڈرائنگ بک' پی ٹی ماسٹر تایا کرم داد فوجی' رسہ کشی' دوڑ مقابلے' پھر آٹھویں جماعت کا امتحان۔۔۔ اسی دوران اس کی مسیں بھیگی تھیں اور ہڈ' ہڈیوں پہ سرخ سرخ گوشت چمکنے لگا تھا۔ چھاتی کے ابھاروں میں خوبانی کا بیج سا پڑ گیا تھا' صاف ملائم حصوں پہ نرم نرم روئیں کی روئیدگی شروع ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں اور چہرے کی چاندی میں شنگرف شامل ہو گیا تھا' شاہ بلوط سی اُٹھان' تانبے رنگے بالوں کی چھاؤں میں آنکھوں کے چمکتے جگنو' رعنائی اور زیبائی کی ایسی دِلاویز تصویر جسے ہر کوئی دیکھا کرے۔ ماسٹر صاحبان بڑے مہربان تھے اور ہیڈ ماسٹر جی تو بات بات پہ اسی کو طلب کرتے۔ ایک ہم جماعت چودھری کا لڑکا جو قد کاٹ میں اس سے بھی آدھا ہاتھ اوپر تھا' اکثر اس کو چھیڑتا رہتا تھا' شکایت اور سمجھانے کے باوجود باز نہ آتا تھا۔ چونکہ اس کا باپ چودھری تھا اس لئے وہ بھی اپنے آپ کو کسی بدمعاش سے کم نہ سمجھتا۔ سارا اسکول اسٹاف اس کی حرکتوں سے نالاں اور بیزار تھا۔ کلاس میں وہ اس سے پیچھے والے بنچ پہ بیٹھتا تھا۔ خالی پیریڈ میں اس نے نیچے سے ہاتھ بڑھا کر اس سے ایک نازیبا حرکت کی تو اس نے بڑے آرام سے اسے سمجھایا۔ اصل میں وہ کوئی پنگا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا' اس کی ماں سخت بیمار تھی مگر ریاضی کے پیریڈ میں بھی وہ باز نہ آیا۔ شکایت کرنے پر استاد نے چودھری کو اگلے بنچ پہ بٹھا دیا تو وہاں بھی اس نے اپنی خباثت جاری رکھی' کاپی پہ گندی گندی اشکال بنا کر اسے دکھانے

لگا' اس نے اس چودھری کے لڑکے سے عارضتاً" پنسل طلب کی' چودھری نے بڑی خوشی خوشی پنسل تراش کر اس کے حوالے کر دی۔ پڑھائی کے دوران وہ لڑکا کسی سوال کا جواب دینے کے لئے کھڑا ہوا پھر بے دھیانا اپنے بوجھ سے بیٹھا تو ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ اچھل کر اگلے بنچ پہ جا گرا' پنسل سرے پہ لگی ہوئی ربڑ تک اس کی پشت میں غائب ہو چکی تھی۔۔۔ اس سے پیشتر کہ وہ کسی عتاب کی زد میں آتا'۔۔۔ وہ گھر' گاؤں اور علاقے سے ہی غائب ہو چکا تھا۔ اس کے غم میں تیسرے روز اس کی قریب المرگ ماں بھی صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئی تھی۔

اللہ کی زمین بہت بڑی ہے' محنت کرنے اور رزق تلاش کرنے والوں کے لئے روزی کی کمی نہیں ہوتی۔۔۔ شکر گڑھ سے نارووال' وہاں سے شاہدرہ پھر باداہی باغ وہ اتر گیا۔ شکر گڑھیوں کی تو کہیں بھی کمی نہیں تھی مگر وہ احتیاطاً" اپنے کسی گلؤں والے یا جان پہچان والے کی نظر میں نہیں آنا چاہتا تھا' وہ اس لڑکے کے باپ کے ہاتھ پاؤں اور اثر و رسوخ سے واقف تھا' جو یقیناً اسے تلاش کر رہا ہو گا اور شاید پولیس کیس بھی بن گیا ہو' اسی احتیاط کی خاطر وہ چھپتا چھپاتا' پرانے سانڈے میں اپنے ایک اعتکو والے رشتہ دار کے پاس پہنچ گیا جو ایک فرنیچر بنانے والے کارخانے میں پالشیا تھا' فرنیچر کی رگڑائی بھرائی پہ وہ بھی یہیں ٹک گیا۔ سارا دن وہ لکڑی کو ریگ مار سے رگڑتا رہتا۔ ناک' منہ مٹی دھول سے اٹ جاتے۔ انگلیاں بھی گھس گئیں' ناخن پھٹ گئے۔ پھر کہیں اور بھاگنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ کراچی سے وہ سیٹھ آگیا جو ان سے آرڈر پہ فرنیچر بنواتا تھا۔ چنیوٹ کا رہنے والا' جس کا کراچی صدر میں ایک بہت بڑا شو روم تھا' اس سونے کی لٹھ کو مٹی میں رُلتے دیکھا تو ریشہ خطمی ہو گیا' اپنی حیثیت کے مدِ نظر وہ اس سے کھُل کر بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک دن اس نے اسے گاڑی کی صفائی پہ لگا دیا اور کسی بہانے گاڑی میں بیٹھ کر' اس سے بات چیت کا موقع پیدا کر لیا۔

"شہزادے! تم یہ کس گندے کام پہ زندگی خراب کر رہے ہو۔۔۔ کیا تنخواہ ملتی ہے یہاں؟"

شہزادے نے جواب دیا۔ "جی ابھی تو کام سیکھ رہا ہوں۔ روٹی' ناشتہ اور رہنے کو جگہ۔۔۔ بس!"

وہ مکمل عیاری سے پانسہ پھینکتے ہوئے بولا۔ "اگر تم کراچی میں ہوتے تو روٹی' کپڑے' رہائش کے ساتھ پانچ سو روپے بھی تمہیں دیتا۔ جو مزہ کراچی میں ہے وہ یہاں لاہور میں کہاں؟--- میرا بہت بڑا شو رُوم ہے' مجھے تم جیسے اعتباری لڑکے کی ضرورت بھی ہے---"

یہ پہلا شخص تھا جس نے اسے شہزادے کے القاب سے نوازا تھا۔ چودھری کے خوف سے وہ تو پہلے ہی یہاں سے کہیں دُور بھاگنے کی سوچ رہا تھا' کھانے پینے کے ساتھ پانچ سو روپے اور پھر کراچی' جسے دیکھنے کی اسے حسرت تھی۔ اس نے فوراً رضامندی ظاہر کر دی۔ وہ بھی تو یہی چاہتا تھا' اس نے اسے سمجھایا کہ اگر تم اس طرح آج ہی یہاں سے چلے گئے تو خوامخواہ یہ لوگ شک کریں کہ مَیں تمہیں یہاں سے توڑ کر لے گیا ہوں--- بہتر ہے کہ تم دو روز اور انتظار کرو۔ مَیں تو آج ہی یہاں سے روزانہ ہو جاؤں گا' مجھے لاہور اور بھی کچھ کام ہے۔ پھر وہ اسے پانچ سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے بولا کہ پرسوں صبح دس بجے مجھے لاہور ہوٹل کے باہر ملو۔ پھر پوچھنے لگا کہ تم کبھی جہاز پر چڑھے ہو؟

"نہیں جی--- ہم غریب لوگ' جہاز اڑتا ہوا تو دیکھ سکتے ہیں' سفر کرنے کے متعلق تو سوچ بھی نہیں سکتے---"

"میں تمہیں خوشخبری سناتا ہوں--- تم پرسوں ہوائی جہاز پہ میرے ساتھ کراچی جاؤ گے لیکن ایک بات یاد رکھو کہ تم کسی سے بھی میرا یا کراچی جانے کا ذکر نہیں کرو گے--- سمجھتے ہو نا! میری پوزیشن خراب ہو گی۔ میرا ان سے کاروباری تعلق ہے' مَیں نہیں چاہتا کہ میری یہ نیکی اور ہمدردی میرے اور تمہارے لئے بُرائی بن جائے--- ہاں' ایک نیا جوڑا اور جوتا کل ہی خرید لینا---"

وہ نوٹ شلوار کے نیفے میں اُڑستے ہوئے بڑا سا سرہلاتا رہا اور پھر بولا۔

"جی' آپ بے فکر رہیں--- مَیں بچہ نہیں جو کسی سے ذکر کروں گا---"

تیسرے روز شہزادہ صاف ستھرے کپڑے پہنے واقعی شہزادہ بنا اُڑن کھٹولے میں کراچی جا رہا تھا۔

کراچی شہرِ نگاراں' رَوشنیوں اور رعنائیوں کا شہر--- شہزادے کی تو آنکھیں پھیل گئیں۔ اتنی تیز رفتار زندگی' ہر شخص جیسے بھاگا جا رہا ہو۔ لمبی چوڑی' سڑکیں چمکتی ہوئی

قیمتی کاریں' بڑی بڑی بسیں' اونچی اونچی شیشوں سے بنی ہوئی بلڈنگیں' پلازے' ہوٹل' سمندر' کلفٹن' بحری جہاز جو اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ وہ یہاں آ کر جیسے جنت میں آ گیا ہو--- سیٹھ نے اپنے شو روم میں فرنیچر کی صفائی ستھرائی اور دفتر کے اوپر کے کام اس کے سپرد کر دیئے' رہنے کے لئے اپنی کوٹھی میں سرونٹ کوارٹر خالی کروا دیا۔ سیٹھ اس پہ مہربان تو تھا ہی مگر سیٹھ کی بیوی بھی اس کا بہت خیال رکھتی۔ یوں زندگی بڑے عیش و آرام سے گزرنے لگی۔ چند دنوں کے بعد سیٹھ اسے پاؤں دبوانے کے لئے اپنے کمرے میں بھی بلانے لگا اور جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ اس سیٹھ کی نیّت ٹھیک نہیں' وہ ہر وقت اس کی خوبصورتی کی تعریفیں کرتا رہتا' روپے پیسے کا لالچ دیتا رہتا مگر شہزادہ ٹال مٹول سے وقت گزارتا رہا۔ پھر قیامت تو اس دن ٹوٹی جب سیٹھ کی جواں سال بیٹی جو تعلیم کے سلسلے میں کسی ہوسٹل میں رہتی تھی' چھٹیوں میں گھر آئی۔ وہ باپ سے بھی دو ہاتھ آگے نکلی اور کھُلم کھُلا اس سے بے تکلفی برتنے لگی' ٹیلی فون کر کے بہانے بہانے اسے شو روم سے گھر بلاتی رہتی' شاپنگ پہ ساتھ لے جاتی۔ ایک دن وہ اسے لے کر سیدھی کلفٹن کے ساحل پہ پہنچی اور بھیڑبھاڑ سے دُور ایک ویران جگہ پہ بیہودگی کا اظہار کرنے لگی۔ کسی نہ کسی طرح وہ اس دن بھی اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب ہو گیا لیکن اسے احساس ہو گیا کہ اس آشیانے پہ بھی دن تھوڑے ہی ہیں' جلد یہاں سے بھی اُڑنا پڑے گا۔ اب وہ کسی مناسب سی گھڑی کا انتظار کرنے لگا۔ مہینے کے بعد سیٹھ نے اسے دو جوڑے نئے کپڑے اور ہزار روپے دیئے۔ اسی دن ان کی بیٹی نے پانچ سو روپے کا نوٹ دے کر بازار بھیجا ڈرائی کلین کی دوکان سے کپڑے لانے کو کہا اور شاید اسی سہانی گھڑی کا وہ منتظر تھا--- پرندہ اُڑ چکا تھا۔ آزاد اور کھُلی فضاؤں میں وہ سوچ رہا تھا کہ پنجاب واپس چلا جاؤں تو بہتر ہے' یہاں رہا تو پھر کسی دن سیٹھ کے ہتھے چڑھ جاؤں گا--- پھر یہ سوچ کر کہ جانا تو ہے ہی' کراچی کی سیر تو جی بھر کے کر لوں۔ جیب میں پیسے تھے' وقت کی کوئی پابندی نہ تھی اور کراچی تو دلچسپیوں سے بھرا پڑا ہے۔ وہ سارا دن کھاتا پیتا سیرسپاٹے کرتا' دو دو تین تین فلموں کے شو دیکھتا' انگریزی فلمیں بھی پہلی بار یہیں دیکھیں۔ پھر گئی رات کینٹ اسٹیشن کے قریب سرائے نما ایک عوامی ہوٹل میں چارپائی بسترلے کر پڑ جاتا۔ پانچویں روز جب سو کر اٹھا تو کوئی ضرورت مند اس کی جیب خالی اور پاؤں ننگے کر گیا تھا۔ اس صبح وہ بغیر ناشتے ننگے پاؤں

صدر کی جانب چل دیا۔ تھوڑی دور ایک پٹھان بوٹ پالش والے کی نظر حسبِ عادت اس کے ننگے پاؤں پہ پڑی' اس نیک آدمی نے اسے پلاسٹک کی پرانی سی قینچی چپل دی جو دو نمبر چھوٹی تھی۔ اسے پہن کر وہ خالی پیٹ صدر آ گیا اور بھوک اور خالی جیب ہو جانے کے احساس سے سخت تھکا ہارا مایوسی کے عالم میں ایمپریس مارکیٹ کے عقب میں گھسیٹے خان حلیم والے کی دوکان کے پاس پارک میں آ کر لیٹ گیا۔ پیٹ' جیب خالی ہو تو دماغ بھی کام نہیں کرتا۔ اس غریب الوطنی میں اسے پہلی بار رونا سا آ گیا--- سوچا کہ چلو' سیٹھ کے پاس واپس چل کر معافی مانگ لیتے ہیں مگر جب اس کی اور اس کی بیٹی کی حرکتوں کا خیال آیا تو یہ پروگرام بھی کینسل کر دیا--- سوچتے سوچتے اس کی آنکھ لگ گئی جب جاگا تو اس کے پاس عجیب منظر تھا۔ دو داڑھیوں والے دائیں طرف علیحدہ علیحدہ بیٹھے اس پہ نظریں جمائے ہوئے بیٹھے تھے۔ ایک مکروہ صورت پاؤں کی جانب بیٹھا خلال کرتے ہوئے اسے گھور رہا تھا' سامنے قریب دیوار سے ٹیک لگائے ایک بھیانک شکل گٹھا سا آدمی گولڈلیف کی ڈبیا دکھاتے ہوئے باہر چلنے کا سگنل دے رہا تھا اور بائیں جانب فوارے کے پاس ایک زنخا سا بار بار ہونٹوں پہ زبان پھیر کر آنکھوں کے اشارے سے اسے متوجہ کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ کئی بھوکے گدھوں کے درمیان ایک نیم مردہ لاشہ سا پڑا ہے۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا' بھوک اور پریشانی کافور ہو چکی تھی' وہ اس نئی افتاد سے نکلنے کی ترکیبیں سوچنے لگا--- ایک سیٹھ کے چنگل سے تو بچ نکلا تھا مگر یہاں تو جنگل کا جنگل ہی ہرا تھا۔ یہاں اسے کون بتاتا کہ وہ کس بوچڑخانے میں بیٹھا ہوا ہے جہاں کراچی بھر کے بدفطرتے قصائی اپنے حربوں کے بُغدے بغل میں دبائے بکروں کی تلاش میں مَنڈلاتے رہتے ہیں' آس پاس کے بعض ہوٹل اور چائے خانے بھی اسی قبیل کی قباحتوں سے آلودہ رہتے ہیں--- وہ بچہ نہیں تھا۔ گھُورتی' اشارے کرتی دُزدیدہ' دعوت اور سلام دیتی ہوئی سب نگاہوں کے مطلب سمجھ رہا تھا۔ اس نے اس صورتِ حال کی بَدمزگی کو دُور کرنے کی خاطر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔ پرے کے پرے' ٹولیاں' اِکے دُکے' بے شمار لوگ سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھے' لیٹے مختلف مشغلوں میں مصروف تھے۔ ایک خان صاحب شلوار سے جوئیں تلاش کر رہے تھے' کچھ لوگ شائد جھگڑ رہے تھے اور کچھ قیلولہ فرما رہے تھے۔ ایک چھوکرا سامنے کتابیں رکھے شاید کسی حساب کتاب میں مصروف تھا' ایک صاحب کپڑے

پھیلائے سکھا رہے تھے' فوارے کے پاس کچھ بیمار سے لوگ آفتابی غسل کر رہے تھے۔ پھر ایک بے تاب سے بدفطرت نے کھنکارتے ہوئے اسے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا تو وہ اپنی تماش بینی چھوڑ کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ سو سو کے نوٹ دکھا دکھا کر گننے لگا' اسی اثنا میں ایک صاحب جو شاید مایوس ہو گئے تھے' ٹھنڈی سانس بھر کے حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے مسجد کی دیوار کی جانب چل دیئے اور ہمت صبر والے ابھی تک دیدار بازی میں مصروف تھے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اُٹھے اور ان کی دُھلائی کر دے' غصّے اور ضبط کی انتہا سے اس کی کنپٹیاں تڑخنے لگیں' دورانِ خون ٹھاٹھیں مار رہا تھا اور تلخ سی کڑواہٹ سے اس کا منہُ بھر گیا تھا--- پھر وہ سوچنے لگا کہ اس کی ذات کے اندر وہ کون سا نافہ ہے جس کی خوشبو سے سارے ہی جانور اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور جو دیکھتا ہے' دیکھتا ہی رہ جاتا ہے--- کیا میں اتنا ہی خوبصورت ہوں کہ مرد کیا' عورت کیا' مجھے اپنانے کے لئے بے چین ہو جاتے ہیں یا پھر میرے چہرے پہ حرام مُہر ٹھکی ہوئی ہے کہ جو بھی دیکھتا ہے بد نظری سے دیکھتا ہے۔

ایک اور حضرت جگہ خالی کر گئے۔ وہ بھی جاتے جاتے جنّ کی طرح نشانی دے گئے' ٹوپی درست کرتے ہوئے باہر آنے کا اشارہ کر گئے۔ اسی وقت ایک اور مچھیل جس کے چہرے پہ اس کی پوری ہسٹری لکھی ہوئی تھی' نسوار کی چُرلی تھوکتے ہوئے سامنے امیدواروں میں بیٹھ گئے تو اس کی برداشت جواب دے گئی--- تنگ آمد بجنگ آمد' دیکھا جائے گا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا گیٹ سے باہر آ کر مسجد نظر آئی' نماز کا تو کوئی وقت نہیں تھا پھر بھی اندر داخل ہو گیا اور یونہی وضو کرنے لگا۔ یہاں بھی ایک اللہ کا بندہ پاس بیٹھ کر بظاہر وضو کرنے لگا' اسے وہ پارک میں دیکھ چکا تھا۔ وہ خاموشی سے وضو کر کے بغیر کسی نیّت' وقت' نماز کے لئے کھڑا ہو گیا تو وہ شخص بھی پاس ہی نماز میں مشغول ہو گیا۔ دونوں نمازی' اللہ کا گھر' مگر اس کا دھیان اِدھر' اس کا دھیان اُدھر--- یہ قعدے' وہ قعدے' یہ رکوع وہ رکوع' وہ سجدے میں ہی تھا کہ شہزادہ اُٹھ بھاگا اور باہر نکل کر بندر روڈ کی جانب تیز تیز قدموں سے چلنے لگا' پیچھے دیکھنے کی ہمت نہ پڑی' سینما کے سامنے سے سڑک پار کرتے ہوئے جونہی اس نے پیچھے دیکھا تو وہ شخص بھی اس کے پیچھے پیچھے سڑک پار کر رہا تھا' چند قدم پیچھے نسوار والے مچھیل بھی چلے آ رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی سینما کے اندر گھس گیا

اور فلم کے فوٹوسیٹ دیکھنے لگا، ظاہر ہے دِھیان تو ان حضرات کی جانب تھا، پاس آکر اس شخص نے بڑے پیار سے سگریٹ دکھاتے ہوئے ماچس طلب کی وہ تو بارود سے بھرا پڑا تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ، کلو بھر کا وزن ہاتھ اس کے تھوبڑے پہ جما دیا اور اس کے نیچے گرتے ہی اس کے سینے پہ بیٹھ گیا۔

"شکرگڑھ میں ایک حرامزادے نے ایسی ہی حرکت کی تھی، مَیں نے اس کے اندر باہر پندرہ ٹانکے لگوا دیئے تھے--- ماچس اگر میرے پاس ہوتی تو مَیں تجھے پندرہ جگہ آگ لگا دیتا۔"

وہ مچھیل تو وہیں سے کہیں کھسک گیا اور یہ دوسرا نیچے پڑا ہوا گھگھیا رہا تھا، کوئی بات منہ سے کیسے نکلتی؟ بھاری ہاتھ کی بھرپور ضرب نے اس کا جبڑا ہلا کر رکھ دیا تھا، آنکھ سرخ بوٹی ہو کر پھوٹنے کو آ رہی تھی لوگ مختلف چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ کوئی کہتا کہ پاکٹ کاٹی ہے، مارو سالے کو اور کوئی کچھ، کوئی کچھ--- بڑی مشکل سے لوگوں نے اسے نیچے سے نکالا، سینما کا منیجر آگیا۔ دونوں کو پکڑ کر اپنے دفتر لے گیا۔ وہ کوئی اکھڑ سا مکرانی تھا۔ کہنے لگا، اس سے پیشتر کہ مَیں پولیس کو بلاؤں اور وہ تم دونوں کو تھانے لے جائے تم ساری بات سچ سچ مجھے بتاؤ، ہو سکتا ہے یہیں تمہارا فیصلہ ہو جائے۔ یہ واقعہ میرے سینما کے اندر ہوا ہے، میرے سینما کی بدنامی ہو سکتی ہے--- شہزادہ بولا۔

"سر! آپ اسی سے پوچھیں کہ اس نے کیا حرکت کی ہے؟--- یہ اپنی زبان سے ہی بتائے تو اچھا ہے۔"

وہ تو تھوبڑے کو تھامے کراہ رہا تھا، پاؤں کا کچا تھا بھلا وہ اپنی زبان سے کیا بتاتا کہ وہ کون ہے اور اس نے کیا حرکت کی ہے؟ اِک چپ میں ہی عافیت سمجھتے ہوئے وہ خاموش تھا۔ ایک گیٹ کیپر بولا۔

"سر! یہ جیب تراش ہے، اس بچے کے اس نے پیسے نکالے ہیں---"

منیجر نے اس سے پوچھا۔ "اوئے تم پاکٹ مار ہے--- بولو، اس جوان کا پیسہ نکالا ہے۔"

اس نے جان بچتے دیکھ کر اقرار کرلیا، تلاشی لی تو سات سو روپے برآمد ہوئے۔ منیجر نے شہزادے سے پوچھا کہ یہ تمہارے پیسے ہیں تو اس نے فوراً اپنی جیبیں اُلٹ دیں۔

"میری تلاشی لے لیں، میرا سب کچھ اس نے نکال لیا ہے--- مَیں تو یہاں پکچر دیکھنے آیا تھا۔"

منیجر نے سات سو روپے شہزادے کے حوالے کر دیئے اور ٹیلی فون اٹھا کر پولیس بلانے لگا۔ وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"بس مجھے معاف کر دیں، غلطی ہو گئی۔ مجھے سزا مل گئی ہے۔"

گیٹ کیپر اور شہزادے نے بھی سفارش کی اور پھر دھکے دے کر اسے باہر نکال دیا گیا۔ شہزادہ پیسے جیب میں ڈال کر باہر نکل آیا۔ باہر ایک کسرتی جسم، درمیانے قد کا جوان سا آدمی اس کا منتظر تھا۔

"یار! تم شکرگڑھ کے ہو---؟" اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"ہاں--- مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ مَیں شکرگڑھ کا ہوں---؟"

وہ اسے ایک جانب کرتے ہوئے بولا۔ "یار! تم نے اس جیب کترے کو پھینٹی لگاتے ہوئے خود ہی کہا تھا کہ میں شکرگڑھیا ہوں---"

"میرا خیال ہے، تم بھی وہیں کے ہو---"

اس نے جب اپنا تعارف کرایا تو یہ پاس کے ایک گاؤں کا نکلا، بزرگوں کی واقفیت بھی نکل آئی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کونے والے ایرانی کے ہوٹل میں بیٹھے کھانے پینے میں مشغول تھے۔ پھر ساری رام کہانی سننے سنانے کے بعد--- قادرے مالشیئے نے اسے مشورہ دیا کہ ان حالات میں پنجاب واپس جانا ٹھیک نہیں، چودہری تمہاری تلاش میں ہو گا لہٰذا بہتر ہے کہ تم یہیں کوئی چھوٹی موٹی نوکری کر لو۔

"یہاں بھی تو سیٹھ کا ڈر ہے---" شہزادہ بولا۔

"سیٹھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، وہ تو خود تم سے ڈر رہا ہو گا--- پھر کراچی بہت بڑا شہر ہے، تم بڑے اطمینان سے یہاں رہ سکتے ہو۔ یہاں کے ماحول سے کچھ نہ کچھ واقف ہو ہی چکے ہو اور کچھ تجربہ بھی ہو گیا ہے۔ اگر تم اچھے بُرے کی پہچان رکھو گے تو کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی--- ویسے تم جوان سمجھدار ہو، اپنی حفاظت کر سکتے ہو۔" پھر وہ کچھ تذبذب سے کہنے لگا۔ "اگر تم پسند کرو تو میرے ساتھ ہی مالش کا کام شروع کر دو، آزادی کی آزادی اور سیر کی سیر--- نہ کسی کی مِنت نہ محتاجی، صرفہ نہ کوئی خرچہ، آرام

سے سو پچاس روز جیب میں ڈال لو--- سوچ لو' کام میں سکھلا دوں گا---"

"ٹھیک ہے' میں ذرا سوچ کر جواب دوں گا---"

پھر کھانے پینے سے فارغ ہو کر وہ دونوں انگلش فلم دیکھنے کے لئے سینما چلے گئے۔

قادرا مالشیا دو برس قبل دھکے دھور کھاتا ہوا کراچی وارد ہوا تھا' سیدھا سادا محنتی نوجوان تھا۔ پانچ وقت نمازی' عیب نہ کوئی میل' بہاولپور کے ایک استاد مالشیئے سے کام سیکھ کر محنت مزدوری کرنے لگا' ہر مہینے پیسے بچا کر پیچھے گھر والوں کو بھیج دیتا اور عید کی عید گھر پھیرا ڈال لیتا۔ شہزادے کا ڈیل ڈول اور مردانہ وجاہت اپنی جگہ' لیکن وہ اس کی جرأت اور خیالات کی پاکیزگی سے بھی بڑا متاثر ہوا تھا۔ اپنے گاؤں' علاقے کا بھی تھا۔ کراچی کینٹ اسٹیشن کے پیچھے لوکو ورکشاپ کے قریب ایک چھوٹی سی جھگی میں اسے بھی اپنے ساتھ چارپائی ڈال دی' نیا کنستر خرید کر اس کے حوالے کیا اور سر کی مالش کے دو چار ہاتھ سکھا کر اسے بھی اپنے ساتھ لئے رونڈ پہ نکلنا شروع کر دیا۔

پہلے روز اس نے چالیس پینتالیس روپے بنائے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا' یہ کام اسے بڑا دلچسپ اور آسان لگا۔ استاد قادرے نے ابھی تک صرف سر کی مالش کے ہی دو چار ہاتھ سکھائے تھے اس لئے آمدن بھی محدود تھی۔ پھر آہستہ آہستہ قادرا اسے پورے جسم کے مساج' مالش' دبائی' گھنائی کے طور طریقے اور گر' گریں بتانے لگا۔ یہ کتابی فن تو ہے نہیں کہ اسے کتاب تھما دیتا۔ یہ تو سینہ بہ سینہ' ہاتھ بہ ہاتھ منتقل ہونے والا فن ہے۔ اس کے بڑے بڑے نامی استاد گزرے ہیں اور ابھی تک موجود بھی ہیں لیکن اس فن کو ہمیشہ بازاری اور سوقیانہ ہی سمجھا گیا' کسی بھی دور میں اس کی آبرومندانہ پذیرائی نہ ہوئی۔ شرفاء' سفید پوش' نفیس اور سلیم الطبع لوگ اسے ہلکت سمجھتے رہے۔ مالش مساج' چاپی یا دابنے سہلانے کے عمل کا تعلق چونکہ انسانی جسم کے عضلات مثلاً پٹھے' نسیں' وریدیں' جوڑ' نازک و نرم حساس جصے جن میں خاص طور پر کنپٹیاں' گردن کا پچھلا حصہ' ریڑھ کا جوڑ اور جڑ' تلو' تلوے' شانے کا جوڑ اور بازو پنڈلیوں کی مچھلیوں سے ہے اس لئے دوران عمل جہاں سکون و راحت کا احساس ہوتا ہے وہیں اکثر شہوانی جذبات میں برانگیختگی بھی سر اٹھانے لگتی ہے اور انسان باوجود کوشش و ضبط' قابو پانے سے عاجز رہتا ہے۔ سکون و سرور' کیف و راحت میں سرمست' بے بس ہو جاتا ہے۔ اس سرمستی کے عالم میں طرفین

سے اکثر کوئی نہ کوئی بے راہروی کی حرکت سرزد ہو جاتی ہے اور اس کا اکثر فائدہ بدراہ قسم کے مالشئے زائد معاوضے کی صورت میں حاصل کر لیتے ہیں۔ انہی مکروہات کی بنا پہ یہ پیشہ مکروہ ہی نہیں' بدنام بھی ہے۔ اسی حیوانی تلذذ کے چسکورے ایک دوسرے کی تلاش میں پارکوں' باغوں اور اسی نوع کی دوسری عوامی تفریح گاہوں میں ہر آنے جانے والے کا ایکسرے لیتے رہتے ہیں' انہی مالشیوں میں ایسے ماہرین بھی پائے جاتے ہیں۔ جو محض دو انگلیوں کے دباؤ سے اچھے بھلے تندرست و توانا انسان کو دو لمحوں میں بے ہوش کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی ایسا واقعہ سامنے آ جاتا ہے کہ مالش کروانے والا جو ہوش میں آیا تو مالشئے کے ساتھ جیب اور جوتے بھی غائب ہوتے ہیں--- قادر نے اس کا شوق اور محنت دیکھتے ہوئے مزید گر بتانے شروع کیئے۔

"شہزادے! یہ کام طاقت کا نہیں' حکمت اور محبت کا ہے--- حکمت یہ کہ گاہک کو پہچانو' اس کے بارے میں صحیح اندازہ لگاؤ پھر ویسے ہی اس کے ساتھ برتاؤ کرو اور محبت یہ کہ جس گاہک کے قدموں میں بیٹھ جاؤ یا جس کے سر پہ کھڑے ہو جاؤ' بڑا ہو تو اس کو باپ سمجھ کر پیش آؤ' برابر ہو تو بھائی اور چھوٹا ہو تو بیٹا سمجھ کر محبت سے پیش آؤ--- آٹھ انگلیاں اور دو انگوٹھے! سب جادو ان کے اندر اور باہر پوروں میں ہوتا ہے۔ جس نے حکمت' محبت اور انگلیوں کا صحیح استعمال سیکھ لیا وہ مالشیا ہے' باقی سارے تیلی ہیں اور ان تیلیوں نے ہی یہ پیشہ بدنام کیا ہوا ہے--- گاہک کو ہمیشہ سلام کرو۔ چاچا' بابا جی' بھائی جی کہہ کر مخاطب کرو' اللہ رسول کی بات چیت شروع کر دو اور چائے پانی کا پوچھو' یہ جاننا تمہارا کام ہے کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ تھکا ہوا ہی' بیمار یا پریشان ہے' وقت گزاری یا محض تفریح شغل کے لئے مالش کروا رہا ہے۔ پھر ویسے ہی اس کے ساتھ پیش آؤ' کبھی کسی کے ساتھ گھر مت جاؤ۔ تنہائی یا اندھیرے میں نہ بیٹھو' پولیس ملازموں' پارک کے چوکیداروں سے بنا کر رکھو' ان سے کبھی پیسے مت لو۔ اگر کوئی بدفطرتا گلے پڑ جائے تو اس سے دین کی باتیں کرتے رہو۔ الحمدللہ' سبحان اللہ پڑھتے رہو تو وہ خود ہی جان چھڑا کر بھاگ جائے گا--- کبھی کسی کو اپنا اصلی نام' شہر یا پتا نہ بتاؤ۔ چرس' چائے اور چوبارے سے ہمیشہ دور رہو' گرمی دور کرنے کے لئے کچی چھاچھ اور دہی کا اُدھ رڑکا اور مہندی استعمال کرو---"

قادر کے مشورے پہ عمل کرتے ہوئے اس نے بال کٹوا دیئے' بھاری مونچھیں رکھ

لیں۔ کان اس نے اپنی مرضی سے چھدوایا۔ چاندی کا مندرا پہننے کے بعد اس کی شخصیت
ہی بدل گئی۔ اپنے استاد کی نصیحتیں پلے باندھ کر وہ پوری تندہی سے کام میں جُت گیا۔
برنس روڈ' بولٹن مارکیٹ' چارپائی مارکیٹ' نیپئر روڈ کی پہلی مسجد تک رَاونڈ لگانے لگا اور بعد
میں صدر آ گیا کہ یہاں کام زیادہ تھا۔ پھر ہلکی سی خنکی شروع ہوئی تو صدر میں گلف ہوٹل
اور سلاطین کے آس پاس اڈا جما کر بیٹھ گیا' مختلف قسم کے تیلی یہاں پہلے ہی موجود تھے
لیکن اس کے پاس سب سے زیادہ کام ہوتا' ہوٹلوں سے بھی گاہک آتے' موٹروں اور موٹر
سائیکلوں پہ بھی اور کئی گاہک مستقل آنے لگے تھے۔ پانچ چھ ماہ میں اس نے کافی رقم پس
انداز کر لی تھی۔ بے فکری' آسودگی اور آزادی تھی جو جسم جان کے لئے دیسی گھی ثابت
ہوئی' گٹھے ہوئے جسم پہ نظر نہیں ٹھہرتی تھی اور نگاہ پڑتی تو ہٹانی مشکل ہو جاتی--- کافی
عرصے سے ایک بارعب سا آدمی جو شاید کسی سرکاری محکمے میں کوئی افسر تھا' اس کے پاس
ہفتے میں چار یا پانچ بار تو ضرور آتا تھا۔ بظاہر بڑا شریف اور ہمدرد' ہمیشہ اُجرت سے زیادہ
پیسے دیتا۔ وہ کئی بار دَبے دَبے انداز میں ساتھ چلنے کے لئے کہہ چکا تھا مگر شہزادہ ہمیشہ بڑے
مناسب الفاظ میں معذرت کر لیتا۔ ایک روز وہ بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ مالش سے فارغ
ہونے کے بعد اسے سو روپے دیتے ہوئے کہنے لگا۔

"یار! آج تو تم ضرور میرے ساتھ گھر چلو--- گھر والے حیدر آباد گئے ہوئے ہیں'
مَیں اکیلا ہوں اور کھانے پینے کا پورا انتظام کر کے آیا ہوں۔ وی سی آر پہ انڈین اور
انگریزی فلمیں بھی دیکھیں گے' اُجرت بھی ڈبل ملے گی--- آج انکار نہ کرنا ورنہ میرا دل
ٹوٹ جائے گا---"

شہزادہ معذرت بھرے انداز میں کہنے لگا۔ "سر! آج تو جمعرات ہے' مَیں اپنے معمول
کے مطابق جلدی جلدی کام نبٹا کر سیدھا کلفٹن حضرت عبداللہ شاہ غازی کے مزار پہ سلام
کرنے جاؤں گا--- ساری رات وہاں رہتا ہوں' قوالیاں سنتا ہوں اور کچھ کام دھندا بھی
وہاں ہو جاتا ہے۔ ویسے بھی میں کسی کے گھر یا ہوٹل میں نہیں جاتا' یہ میرا اُصول ہے اور
استاد کی نصیحت بھی---"

اس نے ایک دو لالچ اور بھی دیئے مگر اس کے مسلسل انکار پہ وہ بڑے بُرے موڈ سے
وہاں سے رخصت ہو گیا--- جہاں جہاں بھی اللہ کے پیارے بندے آسودہ خاک ہیں' دن

رات وہاں رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہوتا رہتا ہے۔ یہ مقدس مقامات مرجع خلائق ہوتے
ہیں۔ عقیدت مند' دن رات پروانہ وار آتے جاتے رہتے ہیں اور یہاں پر برستی ہوئی نور
کی پھواروں سے شاد کام ہوتے ہیں' اپنی اپنی مرادیں پاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ شاہ غازی
رحمتہ اللہ علیہ کے مزار مبارک پر بھی ہر وقت عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا ہے' خصوصاً
جمعرات کو بڑی رونق ہوتی ہے۔ بسوں' ویگنوں' کاروں اور گدھا گاڑیوں پہ لوگ دور دور
سے آتے ہیں اور خصوصاً ڈرائیور اور کلینر حضرات تو بڑے اہتمام اور ذوق شوق سے یہاں
حاضری دیتے ہیں۔ پوری رات قوالیاں ہوتی رہتی ہیں سمندر کے کنارے وسیع و عریض
ساحل پہ دور دور تک لوگ مختلف ٹولیوں میں بٹے بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ چلتے پھرتے
پشاوری قہوہ خانے' کھانے پینے کی دوکانیں' پھل فروٹ اور تعویذ بیچنے والے' نگینے
انگوٹھیوں والے' پھول پتی شیرینی والے' ویٹ لفٹر' سینڈو' شعبدے باز و تماشہ گیر' مالشیئے'
منشیات فروش' جیب کترے' آوارہ' اُچکّے--- صبح کی اذان تک میلے سا سماں رہتا ہے۔
ایسی مقدّس جگہوں پہ ایسے مواقع پہ کچھ مکروہات اور قباحتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو کسی
طرح سے بھی پسندیدہ نہیں ہوتیں بلکہ ایسی مقدس جگہوں کے تقدس کو بُری طرح مجروح
کرتی ہیں۔ خصوصاً جمعرات کو عقیدت مندوں کے روپ میں منشیات کے عادی بھی یہاں
کثیر تعداد میں اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ ناعاقبت اندیش ساری رات وہاں "علی' کر بھلی" کے
فلک شگاف نعروں کے ساتھ غلیظ متعفن دُھویں کے بادل پھیلاتے رہتے ہیں اور عام آدمی
وہاں سانس تک نہیں لے سکتا۔ کوئی قانون' کوئی گرفت وہاں پہ نہیں ہوتی۔ منوں کے
حساب سے چرس' افیون' گانجا اور دیگر غیر قانونی منشیات کھلے عام استعمال کی جاتی ہیں اور
فروخت ہوتی ہیں مگر اس روز نام نہاد قانون کے محافظ سفید کپڑوں میں' کسی عقاب کی
نظروں سے ایک معصوم صفت کبوتر کو کھوج رہے تھے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد انہوں
نے کبوتر کو دبوچ لیا--- آدھے پون گھنٹے بعد وہ کھارادر کے قریب ایک پرانی سی عمارت
کے ایک تنگ سے کمرے میں اُدھڑا ہوا پڑا تھا۔ پھر گھنٹے بھر کے بعد دروازہ کھلا۔ وہی
سرکاری افسر بڑی رعونت سے اندر داخل ہوا۔

"کہو' کیا حال ہے؟--- سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے تو ٹیڑھی سے نکالنا پڑتا
ہے---" اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا پیکٹ تھا' اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ

چرس کہاں سے لاتے ہو؟"

وہ حیرانی سے پیکٹ کو گھورتے ہوئے بولا۔ "یہ کیا ہے سر؟"

"یہ چرس ہے' جو تم بیچتے ہو---"

"میں چرس بیچتا ہوں؟--- سر! میں تو سگریٹ تک نہیں پیتا۔ چرس---"

اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "چرس بیچنے کے لئے سگریٹ پینا ضروری نہیں--- سیدھی طرح بتاؤ کہ تم یہ کہاں سے لیتے ہو اور تمہارے گروہ کے دوسرے لوگ کون کون ہیں؟"

"سر---!" وہ ہکلاتے ہوئے کہنے کی کوشش کرنے لگا۔ "میں مالش کر کے روزی کماتا ہوں' آپ بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہیں' کبھی آپ نے مجھے کوئی ایسی ویسی حرکت کرتے ہوئے دیکھا ہے---؟"

"یہی دیکھنے اور رنگے ہاتھوں پکڑنے کے لئے تو میں تمہارے پاس جاتا تھا--- بچے! آج تم رنگے ہاتھوں قابو آئے ہو' یہ پیکٹ تمہاری تلاشی سے برآمد ہوا ہے۔ جن لوگوں کو تم نے چرس بیچی ہے' ہم انہیں بھی پکڑ لائے ہیں---" اس نے باہر کسی کو آواز دی۔ چار آدمی اور ایک پولیس والا جنہیں اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا' سامنے آ گئے۔ "یہ لوگ گواہ ہیں کہ تم یہ دھندا کرتے ہو--- کیوں اوئے' آج تمہیں چرس کس نے دی---؟"

"مائی باپ' یہی شہزادہ ہے جس سے ہم چرس خریدتے ہیں۔" وہ بیک آواز بولے۔

"دیکھو' تمہارے خلاف سب گواہیاں اور موقع پہ برآمد کی ہوئی چرس ہمارے پاس موجود ہے۔ آج رات تو یہیں سڑو' صبح تمہارے استاد اور دوسرے ساتھیوں کو بھی پکڑیں گے---"

یہ کہتا ہوا وہ آدمیوں کو دھکیلتا ہوا باہر نکل گیا' دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا مگر اس کے اپنے اندر کے سب دروازے کھل چکے تھے۔ وہ جان چکا تھا کہ اصل بات' اصل جرم تو اس کا انکار ہے۔ اگر وہ اس افسر کے ساتھ گھر جانے والی بات مان لیتا تو آج زبردستی یہاں نہ لایا جاتا--- اسے اپنی بے بسی پہ رونا آ گیا اور سر گھٹنوں میں دیئے' وہ جانے کب تک روتا رہا--- دروازہ ایک بار پھر کھلا۔ وہ بدستور بے حس سا' اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا۔ اس حالت میں اسے آنے والے کے صرف پاؤں ہی نظر آئے' ننگے پاؤں

آہستہ سے کوئی قریب آیا' سر اٹھا کر دیکھا تو ایک باریش بھلا سا آدمی اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"دیکھ بچے! میں بڑی مشکل سے موقع پا کر یہاں آیا ہوں۔ مختصر بات کروں گا--- میں بھی ایک سرکاری ملازم ہوں' جانتا ہوں کہ تم بے قصور ہو مگر تمہارا سب سے بڑا قصور تمہارا خوبصورت اور جوان ہونا ہے۔ تم انسپکٹر کو پسند آ گئے ہو۔ وہ آج تمہیں خراب کرنے والا ہے اور اس وقت کچن میں بیٹھا شراب پی رہا ہے' اس کے بعد وہ یہاں آئے گا۔ خدا کے خوف سے ڈرتے ہوئے میں تمہیں اس کی خباثت سے بچانا چاہتا ہوں اور اگر تم بھی بچنا چاہتے ہو تو اس کی صرف ایک ترکیب ہے۔ وہ جب یہاں آئے تو کسی نہ کسی طرح صرف پندرہ یا بیس منٹ کے لئے اسے باتوں میں مصروف رکھو' اس کے بعد وہ بے ہوش ہو جائے گا۔ میں نے اس کی شراب کی بوتل میں بے ہوشی کی گولیاں شامل کر دی ہیں۔ یہ کوئی پولیس تھانہ نہیں ہے' میرا فلیٹ ہے۔ وہ میرا افسر ہے' میں اس کے آگے بول نہیں سکتا۔ جو لوگ جھوٹے گواہ بن کر آئے تھے وہ ملازم لوگ تھے' واپس چلے گئے ہیں--- جب یہ بے ہوش ہو جائے تو اٹھ کر خاموشی سے نیچے چلے جانا---" وہ پچاس روپے دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "نیچے سے رکشا ٹیکسی پکڑ کر جہاں جانا چاہو' چلے جانا--- ایک مشورہ اور ہے کہ ہو سکے تو کراچی چھوڑ کر پنجاب یا کہیں اور چلے جاؤ' اللہ تمہاری حفاظت کرے۔" وہ واپس دروازہ بند کر کے چلا گیا مگر الٹے پاؤں پھر اندر آیا۔ "جب یہاں سے باہر نکل جاؤ تو میرے حق میں ایمان کی سلامتی اور رزق حلال کی دعا ضرور کرنا---"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکل گیا۔

یا اللہ! تیرے کیسے کیسے بندے اس دنیا میں موجود ہیں' بروں میں اچھے' اچھوں میں برے--- پولیس میں بھی ایسے نیک انسان شامل ہیں جو ایمان کی سلامتی اور رزق حلال کے لئے دعائیں کراتے ہیں' مظلوموں اور بے گناہوں کی مدد کرتے ہیں' پلّے سے پچاس روپے دے کر "ٹک' ٹکا" کرتے ہیں' واقعی یہ دنیا ابھی بھلے انسانوں سے خالی نہیں ہوئی--- معاً اسے خیال آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ ایسے حالات میں اس کی مدد کی ہے' اسے ثابت قدم رہنے کی توفیق دی ہے۔ گاؤں کے اسکول میں چودھری کے لڑکے کا انجام' سیٹھ اور اس کی بے حیا لڑکی--- اس کی آنکھوں کے سامنے کئی منظر ابھرے اور ڈوبے'

پھر وہ وہیں اسی حالت میں سجدے میں گر گیا--- اچانک کھٹ سے دروازہ کھلا۔ انسپکٹر جھومتا ہوا کسی مست ہاتھی کی مانند دونوں بازو چوکھٹ پہ پھیلائے اسے سجدے میں گرے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ چہرے پہ شیطنت کے شعلوں کا عکس لرزاں تھا' آنکھوں میں خباثت کے سُرخ ڈورے ابھر آئے تھے۔ لرزیدہ قدموں سے چوکھٹ پار کرنے کی کوشش میں جو ٹھوکر کھائی تو جڑ سے اکھڑے کسی چھتنار درخت کی مانند دھڑم سے فرش بوس ہو گیا۔ شہزادہ جیسے اس کمرے میں موجود ہی نہیں تھا' اس نے سجدے سے سر اٹھایا تو انسپکٹر فرش کی مٹی چاٹ رہا تھا' ماتھے سے خون رِس رہا تھا۔ گرنے کی آواز سن کر وہ نیک انسان بھی بھاگا بھاگا آیا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی انسپکٹر نے ایک لمبی سے قے اگل دی' بدبُو سے کمرے میں کھڑا ہونا مشکل ہو گیا۔ دونوں نے مل کر اسے اٹھانے کی کوشش کی تو شلوار پیشاب سے جل تھل تھی۔ بڑی مشکل سے کتے کی طرح گھسیٹ کھینچ کر باہر غسل خانے میں لٹا دیا۔ اس نیک انسان نے اسے سیڑھیاں اتر جانے کا اشارہ دیا اور اس وقت شہزادے کے دل سے خود بخود دعا نکلی--- "اللہ اس کو ایمان کی سلامتی اور رزقِ حلال کمانے کی توفیق عطا فرما۔"

اس کے پکڑے جانے کی خبر قادر استاد تک پہنچ چکی تھی اور وہ انتہائی بے چینی اور بے بسی کی حالت میں چند دوسرے ہم پیشہ ساتھیوں کے ساتھ اپنی جُھگی کے باہر پریشان کھڑا تھا' ایسے میں شہزادہ رکشے سے اُترا۔ لپکتے ہی اس نے خیر خیریت دریافت کی' شہزادے نے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں تھی' محض شبہ میں لے گئے تھے مگر قادر استاد کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ لوگوں کے جاتے ہی وہ اسے پکڑ کر بیٹھ گیا اور تفصیلات پوچھنے لگا۔ شہزادے نے واقعات کی پٹاری کھول کر اس کے سامنے دھر دی۔ کافی دیر تک قادر استاد سر جھکائے ہوئے سوچتا رہا' پھر بولا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ تم کسی بڑی مصیبت میں نہیں پھنسے ورنہ ان لوگوں کے چُنگل میں پھنسا ہوا انسان بڑا ذلیل و خوار ہوتا ہے--- خیر' جو ہوا سو ہوا' سب کچھ بھول جاؤ۔ انسان کے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے' یہی تجربے بندے کو پکا کرتے ہیں۔ پردیس کاٹنے کے لئے بڑے حوصلے اور صبر کی ضرورت ہوتی ہے---"

"کچھ بھی ہے استاد! لیکن مَیں نے واپسی جانے کا فیصلہ کر لیا ہے--- آج تو شاید ماں

کی دُعا سے بچ گیا ہوں لیکن اگر میں یہاں رہا تو پھر کسی مصیبت میں پھنس جاؤں گا--- سیٹھ اور انسپکٹر جیسے لوگوں سے میں کب تک بچتا اور چھپتا رہوں گا؟" وہ بولا۔

"پُتر! ایسے لوگ تو تمہیں ہر جگہ ملیں گے۔ اللہ کا کرَم اور اپنی سوچ درست ہونی چاہئے' بددل اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں--- ویسے تمہارا چہرہ مُہرہ ہی ایسا ہے کہ فرشتہ سیرت آدمی بھی ایک لمحے کے لئے پھِسل جاتا ہے--- خیر' اگر تم نے واپس جانے کا فیصلہ ہی کر لیا ہے تو روکوں گا نہیں' بلکہ بہتر یہی ہے کہ تم یہ کام بھی چھوڑ دو---"

"نہیں استاد! یہ کام نہیں چھوڑوں گا۔" وہ کنٹر پہ گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولا۔ "کروں گا یہی کام لیکن اب اپنا انداز بدلوں گا--- تمہاری نصیحتیں اپنی جگہ لیکن اس دَور میں یہ بیکار ہیں۔ سلام' سلامتی والے لوگوں کے لئے ہوتا ہے اور عام لوگ اسے اگلے کی کمزوری اور سادگی سمجھتے ہیں۔ دین اور اسلام کی باتیں کون سنتا ہے' عزت محبت جیسے جذبے اس دَور کے لوگوں کے سروں سے بہت اُوپر گزر جاتے ہیں۔ جس کے ساتھ نہ جاؤ وہ ڈنڈا ڈولی کر کے لے جاتا ہے۔ گالی' سگریٹ' چرس لڑائی' پنگے سے پرہیز کرو تو لوگ ہیجڑا سمجھتے ہیں--- مَیں یہ سب کچھ کروں گا' دنیا میں جو ہوتا ہے اور جو لوگ کرتے ہیں اب مَیں بھی وہی کچھ کروں گا۔ ایسے لوگوں سے انہی کے انداز اور طور طریقوں سے نبٹوں گا ورنہ مجھے تو کوئی ریوڑی کی طرح کڑکڑ کرتے کھا جائے گا۔" وہ اٹھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کرنے لگا۔ "استاد! تمہاری یہ نشانی' کنٹر ساتھ لے جا رہا ہوں۔ میرے لئے دُعا کرنا' تمہاری ہمدردی اور نصیحتیں مَیں ہمیشہ یاد رکھوں گا--- رَبّ راکھا۔"

لاہور سٹی کی بجائے وہ کینٹ اسٹیشن پر ہی اُتر گیا تھا۔ ایک آدھ روز صدر میں ہی گھُوم پھر کر کام کرتا رہا پھر گڑھی شاہو سینما کے باہر صف بچھا کر بیٹھ گیا۔ وہاں مستقل بیٹھنے والے ایک لائلپوریئے مالشیئے سے پھڈا کرنے کے بعد گلبرگ لبرٹی مارکیٹ کے پارک میں اٹھ آیا' وہاں سے جی بھرا تو اِچھرے موڑ پہ گول باغ میں آ کر بیٹھ گیا اور یہیں اسے نعمتا ماشکی مالشیا مِلا' پہلی بار بھرے ہوئے سگریٹ کے دو کش اسی کی دین تھے' سگریٹ بھرنے کے طریقے بھی اسی نے سکھلائے۔ لیکن صرف دو چار روز میں اسے اس نشے سے نفرت ہو گئی۔ پنچائت میں بڑے حُقے کی گردش کرتی ہوئی نَے کی طرح سُلگتا ہوا سگریٹ بھی کئی لبوں کی زینت بنتا تھا' یہ عمل اسے بڑا مکروہ سا لگا اور ویسے بھی تمباکو نوشی سے اسے نفرت

تھی، طبعاً" وہ جان بنانے والا جوان تھا پھر بھی وہ چارپاری میں کبھی کبھی اوپر اکش لگا لیتا۔

وگے کے سری پائیوں کی کسی نے تعریف کی تو ایک شام شاہی محلے چلا آیا۔ یہاں پہنچ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسی رونق' گہما گہمی اور رنگینیاں اور بھلا کہاں ہوں گی؟ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ کھانے پینے کے جتنے لوازمات اور انداز' یہاں جس کثرت سے ہوتے ہیں پورے ہندو پاکستان میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ منوں کھولتا ہوا بالائی سے لبالب دودھ' دہی کے کونڈے' رنگا رنگ مٹھائیوں سے بھری ہوئی دوکانیں' فالودے' کھیر' ربڑی اور حلوؤں کے جل تھل تھالوں پہ نقرئی رُو پہلی ورقوں کے چکاچوند' موسمی پھلوں کی بہاریں' سرخ گلابوں اور موتیے چنبیلی کی مہکاریں' پان سگریٹ کے ٹھیلوں پہ زعفرانی قوام کی خوشبو' بڑے بڑے جہازی توؤں پہ گردے کپورے کلیجی چانپوں کی تکا تک' نہاری حلیم ہریسے کے دہلی دربار' لذت کام و دہن کے سب سالن' کڑاہی گوشت' تلی ہوئی مچھلی' دم چھلے سمیت لٹکے ہوئے دیسی بکرے' پوست پیئے اونگھتے ہوئے مرغ بٹیرے' چڑے' رنگ و نکہت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر' بالکونیوں' دروازوں' دریچوں سے پڑی ہوئی گنگا جمنی چلمنیں' چاندی جیسی چاندنیوں پہ مسکراتی ہوئی مرمر کی مورتیاں' گھنگھروؤں کی چھن چھن' سارنگی کے سرسراتے ہوئے لہریئے' تن پورے کی تن طراریاں' طبلے کے توڑے' شاہد نظربازوں' تماش بینوں' شہدوں فقرہ بازوں کی یلغاریں' کثافت و ثقافت' بیہودگی اور شائستگی کا ایسا رچاؤ اور بساؤ کہاں نظر آئے گا؟---- وہ منہ اٹھائے ہوئے ہونقوں کی طرح گھومتے گھماتے فضل دین عرف وگے کی دوکان میں داخل ہو گیا کھایا' ڈکارتے ہوئے وہ سامنے مٹھائی کی دوکان پہ آ گیا اور پھر قلاقند کا دونا تھامے پارک کی رونق دیکھنے اندر چلا آیا۔

لاہور میں اسے شہزادہ کہنے والی خود بھی تو ایک شہزادی ہی تھی' کسی شاہی محل سرائے میں ہوتی تو اپنے جھلسا دینے والے روپ سے در و دیوار کے پسینے نکال دیتی مگر بدقسمتی سے یہ اسی شاہی محلے کے ایک کوٹھے کی شہزادی تھی' بڑی تاجی ملتان والی کی نوچی!

تاجی بھی اپنے سنہرے دنوں میں کئی دلوں پہ ملکہ بن کر راج کرتی تھی۔ حیدر آباد' نواب شاہ' سانگھڑ' سکھر اور بہاولپور کے بڑے بڑے وڈیرے رئیس اس کا دم بھرتے تھے' ایک ڈھ کے ہاں کچھ عرصہ ٹکی بھی مگر پھر اپنی ڈگر پہ واپس آ گئی۔ ماہ و سال کے آنگن میں روپ چھلیا جو ذرا گہری پڑی تو مظفر گڑھ کے نواح میں ایک گدی نشین کے جواں سال

خوبرو صاحبزادے کو اپنے جال میں پھانس لیا۔ سال ڈیڑھ سال کی ہم نشینی کے نتیجے میں وہ ایک گول مٹول ننھی سی جیتی جاگتی گڑیا تھمے اور ترکے میں دے کر "تارک الدنیا" یعنی ایک حادثے میں اس دنیا سے مراجعت کر گیا۔ تاجی تو اسے اپنے آنے والے دنوں کا ساتھ بنانے کی فکر میں تھی' جاتے چور کی لنگوٹی سمجھ کر وہ شہزادی کی تربیت کرنے لگی۔ کنجروں کے ہاں لڑکیاں اور آرزوئیں بہت جلد جوان ہو جاتی ہیں۔ ڈال پہ پکنا کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے ورنہ سب پال کا پکا ہوا مال ہوتی ہیں اور کچے پکے سوہٹھا' ان کے ہاں نہیں ہوتا۔ مخصوص طریقوں سے انگیخت کر کے ان کچی کلیوں کو پھول بنا دیا جاتا ہے---- کہتے ہیں طوائف پہ جوانی جواں عمری میں نہیں' ادھیڑ عمری میں قیامت توڑتی ہے۔ اس ادھیڑ عمر میں بھی تاجی نے بڑے بڑے معرکے مارے تھے۔ ڈال ڈال پہ چہچہائی' ہر راگ میں گنگنائی اور آگے کا زادِ راہ شہزادی' کو لے کر لاہور آ گئی۔ جمع پونجی جھاڑ کر گلبرگ میں ایک یک منزلہ کوٹھی خریدلی اور شہزادی کو سکول کالج اور گانے ناچنے کی تعلیم پہ لگا دیا۔

وقت گزرتا گیا اور آخر جب اس کی جوانی کی شام' رات کے اندھیرے میں ڈوب رہی تھی تو شہزادی کے شباب کی صبح کا اُجالا ہر سو پھیل چکا تھا' تاجی کے اچھے دنوں کی طرح شہزادی کے حسن جمال سوز اور سُریلی تانیں اور زمزموں کا شہرہ دور دور تک پھیل چکا تھا۔ حسن و جمال کے پارکھ اور فن و ہنر کے قدردان بڑی فراخ دلی سے اسے سراہتے' دیدہ و دل فرش راہ کرتے۔ تعلیم یافتہ تو تھی ہی' اپنے اخلاق' شہزادیوں جیسے رکھ رکھاؤ کی وجہ سے یہاں بازارِ حسن میں اپنی الگ پہچان رکھتی تھی۔ رات کے پہلے پہر جب اس کی چھچھاتی ہوئی گہری مرون کرولا بازار میں داخل ہوتی تو اس سرے سے اس سرے تک دوکانداروں' تماش بینوں اور رہ گزروں کے دلوں کی حرکت رک سی جاتی۔ بالاخانوں کی بالکونیوں پہ بنی سنوری طوائفیں' گانے ناچنے والیاں' حسد' رشک اور حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے ٹھنڈی آہیں بھرتیں۔ بننے سنورنے اور ملبوسات کے انتخاب' رنگ' تراش اور ڈیزائنوں پہ پہروں تنقید یا تقلید کا سوچتی رہتیں۔ اس کی کار کیا گزرتی' پورا بازار اس کے ملکوتی حسن و جمال کی چاندنی سے دھل اٹھتا۔ پھر بالاخانے کے نیچے جب کار رُکتی تو ایک بارعب اسلحہ بردار مونچھوں والا کھٹاک سے سلام کرتا ہوا آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا۔ مہکتی ہوئی چنبیلی اور گلِ شبنم کی خوشبو کی مصاحبت میں شہزادی بڑے طمطراق اور وقار سے

اترتی۔ تاجی بھی مہارانی جھانسی جیسے تن و توش‘ مٹکنے سے اٹھلاتی ہوئی پیچھے پیچھے صاف شفاف چمکتی ہوئی سیڑھیوں کی جانب بڑھ جاتی۔ جدید آرائش و زیبائش سے آراستہ اس بلڈنگ کی پہلی منزل پہ وسیع و عریض شاندار کمرے میں نشاط و جمال اور نغمہ و رقص و سُرود کی محفل آرائیاں رات بھیگے تک تشنگانِ عیش و طرب اور واقفانِ نظرو قلب کی توجّہ کا مرکز بنی رہتیں‘ دیواروں پہ سلیقے قرینے سے سجے ہوئے عمر خیام کے مرقع مرصع مصوّر نادر نمونے‘ چغتائی آرٹ کی دلاویز پینٹنگ‘ چاندی اور چوب کے آرائشی نمائشی آلاتِ موسیقی‘ کرسٹل کے قیمتی شمعدان‘ نگینے جڑے کانسی کے بخوردان جن میں خالص عُود سلگتا رہتا۔ سفید براق چاندنیوں پہ بے داغ شنیل کے نرم نرم گاؤ تکئے‘ بغلی دیوار پہ ملتانی آئینہ گری کا نفیس کام و کمال‘ کہ سامنے طاق پہ لرزاں کافوری شمع سے ماحول میں ہزاروں چمکتے لرزتے جگنوؤں کا سا خواب آگیں منظر پیدا ہو جاتا۔ سازکاروں میں رعنائی و وجاہت‘ ہنرو کمال‘ سلیقے اور حفظِ مراتب سے آشنا ایسے ایسے دانے پَرو رکھے تھے کہ آنے والا دانہ دانہ بھی ان کے فن و شعار کی تعریف کرتا رہے۔ روائتی کوٹھوں جیسا چھچھورپن‘ ندیدگی‘ کراہت‘ لوٹ کھسوٹ‘ چھوٹے بازاری ہلڑباز‘ بے توفیقے بے ذوقے تماش بین‘ ہار‘ عطر اور دامن پکڑنے والوں بازاری پیشہ وروں کا یہاں کوئی تصوّر تک نہ تھا۔ سانڈ سا مچھیل اسلحہ بردار گارڈ ہر آنے جانے والے پہ کڑی نظر رکھتا۔ شہزادی کے اس شبستان کی ہر چیز‘ ہر انداز اس کے حسن و ذوق اور مزاج و طبع کا آئینہ دار تھا‘ یہی وجہ تھی کہ یہاں سیڑھیاں چڑھنے والے بھی کوئی معمولی اور بازاری لوگ نہ ہوتے‘ بڑے بڑے لکھ لُٹے‘ نو دَولتیے‘ صاف ستھرا ذوق‘ شعرو سخن کی سمجھ اور داد و دَم کے مالک ہی آتے‘ سُرخ نوٹ سے نیچے کسی اور رنگ کے نوٹ کو دَرخورِ اعتنا سمجھا نہیں جاتا تھا۔ دوکان بڑھا کر جب تاجی نیچے اترتی تو اس کا بڑا چرمی بیگ جس پہ دانت کچکچاتے ہوئے چیتے کے چہرے کی شبیہ تھی‘ نوٹوں سے بھرا ٹھسا ہوا ہوتا۔ اسلحہ بردار‘ ڈرائیور کے برابر بیٹھ جاتا اور شہزادی گل رُخ کی کار کا رُخ گلبرگ کی طرف ہوتا۔

اس روز محفل پہ خوب رنگ چڑھا ہوا تھا‘ باہر دروازے پہ داخلے کے لئے معذرت کی لٹکتی ہوئی تختی کے پاس مچھیل اسلحہ بردار مستعد کھڑا تھا۔ کامونکی والے شیخ صاحب اپنے مخصوص مہمان دوستوں کے ساتھ تشریف لائے ہوئے تھے‘ نوٹ بھی وہ شاید اپنے

چاول صاف کرنے والے کارخانے کی کسی بوری میں بھر کے لائے تھے۔ سبز سرخ نوٹوں کے برگ و گلُ سے سفید چاندنی کسی قیمتی ایرانی قالین پہ نقیشیں منظر بہار پیش کر رہی تھی‘ سازکاروں کی پُرکار انگلیاں سازوں کو بے دَم کئے ہوئے تھیں۔ ساز و آہنگ کا ترنگ‘ اعضاء کی نظرافروز شاعری‘ ماحول کی سحرانگیزی‘ بخورات کی بل کھاتی صندلی‘ عودی‘ بھینی بھینی‘ مسحور کن لہریں جیسے دھنک کے سارے رنگ آج یہیں اتر آئے تھے‘ محفل شباب پہ تھی۔

پیاس بھڑکی ہے سرِشام سے‘ جلتا ہے بدن

فلم ”رضیہ سلطانہ“ کا آگ لگا دینے والا گیت جس کا تعلق آنکھ‘ کان‘ دل اور محسوسات سے ہے‘ شہزادی کا پسندیدہ گیت تھا جسے وہ مخصوص محفل میں اپنے اچھوتے‘ روح میں اتر جانے والے انداز میں پیش کیا کرتی تھی‘ وہ نرت کر رہی تھی‘ ستار کے جھالے پہ توڑا توڑتے ہوئے وزنی گھنگھروؤں کی ڈوری جو ڈھیلی پڑی تو کئی گھنگھرو پاؤں پڑ گئے‘ ایک گستاخ گھنگھرو پھول سے پاؤں کے ریشمی تلوے کو چُوم بیٹھا۔ اپنے ہی بہاؤ میں پاؤں رپٹا‘ وہیں پھولوں کی ڈھیری بنی بیٹھ گئی۔ کسی کا دل بیٹھا‘ کسی کی نبض چھوٹی‘ ٹخنہ مسک گیا تھا اور ایسا اکثر ظہور پذیر ہو جاتا ہے۔ محفل برخاست ہو گئی‘ صوفی عنایت کی ڈھونڈیا پڑی۔ وہ اپنی دوکان بڑھا کر جا چکا تھا۔ ہارمونیم ماسٹر اللہ وسایا نے پاؤں کا معائنہ کرتے ہوئے بتایا کہ محض معمولی سی داب ہے‘ میٹھے تیل کی مالش کر کے کس کے پٹی باندھنے اور سینک سکائی سے آرام آ جائے گا۔ تاجی نے حمیدے طبلچی کو کسی تجربہ کار مالشئے کو لانے کا حکم دیا حمیدا اٹھ کر باہر نکلنے لگا تو شہزادی نے اسے کہا۔

”حمید صاحب! ذرا دیکھ بھال لیجئے گا--- کسی عیبی نکھٹے کو نہ پکڑ لایئے گا؟“

مالشیا اور عیبی نکما اور گندا نہ ہو--- وہ مسکرا کر ”اچھا جی“ اچھالتے ہوئے نیچے اتر آیا۔ سراج ہوٹل والے سے سلام دعا کرتے ہوئے‘ ادھر ادھر دیکھ کر چوک کی جانب بڑھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مالشیئوں میں کوئی شہزادہ وہ کہاں سے تلاش کرے؟ جنہیں وہ جانتا تھا وہ تو سارے حرفوں اور عیبوں کے بنے ہوئے تھے‘ کوئی بھنگ پیتا ہے تو کوئی چرس‘ چہرے مکروہ‘ بدبو اور گندگی کی پوٹمیں--- چھوٹی عدالتوں کے اکثر وکیل یوں ہی دکھائی دیتے ہیں جیسے ابھی ابھی تانگہ باہر کھڑا کر کے اندر آئے ہوں‘ یقین نہیں آتا کہ اس تیل اور میل

سے چمکتے ہوئے بے استری' ان فٹ' کالے کوٹ اور نیچے میلی چیکٹ ڈھیلی پتلون پہننے والا' افلاس مارا' یتیم صورت ڈھانچہ بی اے ایل ایل بی وکیل بھی ہو سکتا ہے۔ اسی رعایت سے کیا عجب کہ اسے مالشیوں میں کوئی شہزادہ مل جائے--- پھر واقعی ایک شہزادہ مل گیا۔ یقین تو نہ آیا' زبانی ایک آدھ ٹیسٹ لیا۔ تیل کنستر کی موجودگی میں وہ مالشیا ہی نکلا۔ شہزادہ بھی آخری شو دیکھ کر نکلا تھا' سوچ رہا تھا کہ کچھ دیر اور موج میلہ دیکھ کر واپس اچھرے کا رخ کرے گا کہ ایسے میں ہی حمید طبلچی کے ہتھے چڑھ گیا۔ پہلے تو وہ اسے نظروں سے تولنے لگا پھر پوچھنے لگا۔

"تم واقعی مالشیئے ہو یا مذاق کر رہے ہو---؟"

"بھائی جی! میں مالشیا ہوں--- یہ تیل کا کنستر نظر نہیں آتا؟"

"کنستر سے تو مالشیئے لگتے ہو مگر شکل و صورت اور ڈیل ڈول' لباس---"

"او بھائی! تم نے مالش کروانی ہے یا مجھ سے نکاح پڑھوانا ہے؟--- سیدھی بات کر۔" وہ بھی سلطان راہی کی فلم دیکھ کر نکلا تھا' اسی انداز سے پوچھنے لگا۔

"ناراض نہ ہو یار! اپنی تسلی کر رہا ہوں--- سبحان اللہ' تو عین میڈم کے ذوق کے مطابق ہے--- آ میرے ساتھ؟"

وہ اندر داخل ہوا' جیسے کسی شہزادی کے حرم ناز میں داخل ہو گیا ہو۔ سج دھج اور شان و شوکت دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے' شہزادی تکیے سے سر ٹکائے نیم دراز تھی' تھکاوٹ اور کچھ پاؤں کے آزار کی وجہ سے آنکھیں موندھے ہوئے حسن نیم خوابیدہ کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی' دراز کاکلوں کا ابریشمی ڈھیر تکیہ پہ پڑا تھا۔ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پہ چہرے کا کھلا ہوا کنول' شبنمی لرزیدہ لبوں پہ جل ترنگ سا ارتعاش' ہلکی سی معصوم سی کھلی ہوئی مسکان جیسے خواب میں کوہ قاف پہ پریوں کے ساتھ لکن میٹی کھیل رہی ہو--- پہلی نظر دیکھنے کا گناہ ہوا' پھر تاب نہ لا کر نظریں جھکائے دروازے پہ ہی کھڑا رہ گیا۔

"حمید صاحب! یہ کسے پکڑ لائے؟--- آپ کو تو کوئی مالش والا لانے کے لئے بھیجا تھا۔"

"بی بی! یہ مالش والا ہی ہے---"

تاجی' شہزادے کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولی۔ "شاید کوئی نیا مالشیا ہے' پہلے تو کہیں

دکھائی نہیں دیا--- کہاں کے رہنے والے ہو؟" وہ اسے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"بی بی! میں مالشیا ہوں--- حکم کریں کہ کیا خدمت کروں' باقی باتیں چھوڑیں--- ویسے میں کراچی سے نیا نیا یہاں آیا ہوں۔ یہاں مجھے کی دوکان پہ سری پائے کھانے آیا تھا' اب فلم دیکھ کر واپس ڈیرے جانے کی سوچ رہا تھا کہ آپ کا یہ آدمی پکڑ لایا ہے۔" وہ دروازے کی جانب گھوم کر پھر کہنے لگا۔ "میں کھلی فضا میں کام کرنے کا عادی ہوں' بند کمروں میں نہیں---"

دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دودھ بھری چاندی کی کٹوری میں مصری کی ڈلی گھلی۔

"رکو---" وقت کئی نوری سال رکا رہا' بازگشت کے آہنگ سے کائنات کا وجود تھرا اٹھا۔ "اِدھر آؤ' ہمارے پاس---"

وہ مُڑا اور دیوی کے چرنوں میں کسی داس کی طرح بیٹھ گیا۔

"ہمارے پاؤں میں موچ آ گئی ہے' ہلکا سا تیل لگا کر نرم نرم ہاتھوں سے مالش کر دو۔"

کسی سانچے میں ڈھلا ہوا گلابی موم کا پاؤں' آبگینے کی مانند نازک چھوٹا سا ٹخنہ' خوبصورت ننھی منی انگلیاں--- پاؤں سامنے تھا' وہ دیکھتا ہی رہ گیا۔

"اجازت دیں تو ہاتھ دھو لوں---؟" وہ نظریں جھکائے ہوئے ہی بولا۔

"ہاں ہاں--- ادھر اندر غسل خانے چلے جاؤ۔" تاجی اسے عجیب سی نظروں سے تولتی ہوئی بولی۔

غسل خانہ تو آئینہ خانہ تھا۔ شیشے ہی شیشے' اندر پہنچتے ہی وہ سینکڑوں کی بھیڑ میں گھر گیا۔ صاف شفاف ظروف' مختلف خوشبوئیں' عطر' ولائتی صابن' چھوٹے بڑے تولیے' وہ کسی اور ہی جہاں میں پہنچ گیا--- وہاں ایک شہزادے کو کئی شہزادے گھور رہے تھے۔ دائیں بائیں مختلف زاویوں سے اس کے اپنے کئی انداز و انگ پہلی بار اس کی نظروں کے سامنے آئے--- کیا وہ واقعی کوئی شہزادہ ہے؟--- سامنے شیشے میں خود سے نظریں ملائے وہ دیر تک اپنے آپ میں خود کو تلاش کرتا رہا---'بدھا کو برگد تلے اور شہزادے کو شیشے

کے سامنے آخر گیان مل ہی گیا' اسی اپنی ذات کا عرفان ہو چکا تھا--- اگر وہ شہزادہ ہے تو کیوں نہ فائدہ اٹھائے؟--- گرم پانی کی ٹونٹی کھلی ہوئی تھی' بھاپ سے سامنے کا شیشہ دھندلاتے ہی شہزادہ معدوم ہو گیا۔ اسے جلد ہی اپنی اوقات کا احساس ہو گیا تو وہ باہر نکل آیا۔

ڈرتے ڈرتے اس نے پاؤں کو چھوا' اِک سنسنی سی رگ و پے میں بجلی کے ہلکے سے جھٹکے کی طرح دوڑ گئی تھی--- ہلکا سا تیل مل کر نرم نرم دباؤ سے وہ مالش کرنے لگا۔ ٹخنے کی گولائی کے گرد انگوٹھا گھماتے ہوئے اِک دھندلا سا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا--- پیلا سا کمزور پاؤں' ابھری ہوئی نیلی نیلی وَریدیں' کڑوا تیل' پرانے لحاف کی روئی اور کپڑے کی پٹیاں' گرم اینٹ کی سینکائی--- بے دھیانی سے انگوٹھے کا دباؤ بڑھا تو ہلکی سی' سی کی سسکاری شہزادی کے منہ سے نکلی۔

"ذرا خیال سے شہزادیا---!"

شہزادی کی ماں نے اسے تنبیہہ کرتے ہوئے احتیاط کرنے کے لئے کہا۔ شہزادہ فوراً خیالات کی نیلی نیلی دُھندلاہٹ سے باہر نکل آیا--- "شہزادہ' شہزادہ' شہزادہ---" پھر آہنگ گونجنے لگا تھا۔

"آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟" وہ تاجی کی جانب دیکھے بغیر پوچھ بیٹھا۔

"اچھا' تو تیرا نام شہزادہ ہے---"

"جی--- میرا نام شہزادہ مُندراں والا ہے۔"

شہزادی اسے دُزدیدہ نظروں سے دُھواں دُھواں دیکھ رہی تھی--- شہزادہ مُندراں والا--- مَن مندر میں کہیں گھنٹی سی بجی' اس نے دوسرا پاؤں بھی پسار دیا جیسے تھکا ہوا نڈھال مسافر کسی گھنے درخت کے سائے تلے آنکھیں مُوند کر' بے سُدھ لیٹ کر سکون محسوس کرتا ہے۔ بھاری پپوٹے' کیف سکون اور میٹھے میٹھے درد کے خُمار سے خود بخود بند ہو گئے--- پُر پیچ راستے' ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں' گھنا جنگل خاردار جھاڑیوں اور خونخوار دَرندوں سے بھرا ہوا--- تھکی ماندی' زخموں چوٹوں سے چور' ہانپتی ہوئی' گرتی پڑتی وہ کہاں سے کہاں نکل آئی تھی؟ میٹھی میٹھی سوئی ہوئی خوشبو' یہ ٹھنڈی ٹھنڈی مَست خرام پُروائی' دلفریب منظر--- بال بال موتی پروئے' قوس و قزح کا پیرہن پہنے' سولہ سنگار کیئے مور

پنکھوں کی چھاؤں تلے' لاجورد کے تخت پہ اپسرا بنی بیٹھی ہے' داسیوں کے جھرمٹ میں چندراوتی--- گھڑیال' سنکھ' کھڑتالیں' شہنائیاں' بنسری کی مدھر تانیں' یہ کون آیا ہے مَن مَندر دوارے؟--- بنجارہ ہے' جوگی ہے یا بھیس بدلے ہوئے کوئی شہزادہ ہے جس کے آنے سے پہلے ہی گھنگرو بِک چھوڑ گئے' جس نے آتے ہی پاؤں پکڑ لئے--- نہ' نا--- یہ کانسی کے کاس کے لئے نہیں' چندرما کی چاندنی کے لئے ہیں۔ تھرکنے کے لئے نہیں' کسی کے دل کے تھال پہ دھرنے کے لئے ہیں۔ نینوں کے امرت جل کے چھینٹوں سے جیسے وہ انہیں پوتّر کر رہا تھا--- موم سا پاؤں جیسے چنگاری پڑنے سے پگھل سا گیا ہو' شہزادی نے چونک کر دیکھا تو وہ سر جھکائے' دین و دنیا سے بے خبر' کسی تپسوی کی مانند وہ اپنی تپسیا میں مگن تھا۔ ایک اور گرم گرم چنگاری جو گری تو شہزادی نے پاؤں کھینچ لیا--- جیسے کسی بالک سے کھلونا چھین لیا جاتا ہے۔ جھکا ہوا سر اور جھک گیا' ہاتھ یوں کھلے کے کھلے رہ گئے جیسے شہزادے سلیم کے ہاتھ کبوتر اڑنے کے بعد رہ گئے تھے--- بڑی بی بی تاجی' سگریٹ کے دُھویں کے چھلّوں میں شاید اپنے ماضی کے خوشنما منظر تلاش کر رہی تھی' سازکار اپنے اپنے سازوں کو لپیٹ رہے تھے اور حمید ارد گرد بکھرے ہوئے نوٹوں کو سمیٹ رہا تھا--- ہائیں! یہ تو رو رہا ہے' کیوں؟--- وہ من ہی من میں سوچنے لگی کہ اسے کیا ہوا؟--- ادھر ادھر دیکھ کر شہزادی اٹھ بیٹھی اور شہزادے سے بولی۔

"جاؤ' غسل خانے میں ہاتھ دھولو---" ایک ہاتھ جلتے ہوئے پاؤں اور دوسرا ہاتھ دھڑکتے ہوئے دل پہ رکھتے ہوئے کہنے لگی۔ "ممی! بڑا سکون ملا ہے' اس کے ہاتھوں میں تو مسیحائی ہے۔ اس نے میرا دَرد یوں چُوس لیا ہے جیسے کوئی مہان ماندری سانپ کا زہر چوس لیتا ہے۔"

سر جھکائے خجل خجل سا وہ یوں باہر آیا جیسے سزائے موت سن کر کوئی بے گناہ کمرا عدالت سے باہر نکلتا ہے' تاجی کا دیا ہوا سو کا نوٹ اس کی جیب میں ٹھنسا ہوا تھا۔ سیڑھیوں سے نیچے آکر وہ نوٹ اس نے مچھیل اسلحہ بردار گارڈ کی جیب میں ڈال دیا' مچھیل حیرت میں گم--- نوٹ کو دیکھ رہا تھا' چوک پہ بائیں جانب مڑنے تک وہ اس ماڑے شہزادے کو دیکھتا رہا پھر مونچھوں کے نیچے موٹے ہونٹوں سے بے اختیار نکل گیا۔

"شہزادہ ایں بھئی' شہزادہ---!"

آنکھیں تر لیکن زبان اور حلق خشک تھے' حلق سے نیچے بڑی آنت میں جیسے کسی نے تنور کا ڈنڈا پھیر دیا ہو۔ موڑ مڑتے ہی دودھ مٹھائی والی دوکان پہ وہ رُک گیا۔ ٹھنڈے میٹھے خوشبودار دودھ کے بھرپور گلاس سے اسے بڑی تسکین اور فرحت محسوس ہوئی' پَرنے سے آنکھیں اور مُنہ مونچھیں صاف کرتے ہوئے علی پارک کے اندر آکر ایک تنہا سے گوشے میں لیٹ گیا--- کھُلا آسمان' ٹم ٹم کرتے ہوئے تارے' وہ ٹکٹکی باندھے آخری دنوں کے پیلے پیلے ادھورے چاند کو دیکھ رہا تھا۔ چہرے کی دونوں جانب' آنکھوں کے کونوں سے کانوں کی کنوتیوں تک آنسوؤں کی پتلی سی لکیر جیسے جم سی گئی تھی--- چاند میں چرخہ تھا نہ بڑھیا لیکن وہ گڑیا یاد آ رہی تھی کہ متعدی بخار سے جس کی ٹانگیں' پاؤں سوکھ کر کیکر کی گیڈیوں کی مانند ہو گئے تھے۔ وہ مہینوں' سالوں مالش اور ٹہل سیوا کرتا رہا مگر کوئی خاص افاقہ نہ ہوا۔ بیماری آزاری اپنی جگہ' ماہ و سال کی مسافت تو ہر حال میں جاری و ساری رہتی ہے' گڑیا شادی کی عمر کو آ لگی اور آخر ایک دن ماموں نے انتہائی مجبوری اور شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے منگنی توڑ دی۔ ٹھیک پندرہ روز بعد اس گڑیا نے اپنی معذوری اور اپنوں کی مجبوری کے پیش نظر کلائی کی چند چوڑیاں توڑ' کچل کر رات کے کسی بے رحم پہر نگل لیں اور پھر مُنہ بھر بھر خون کے لوتھڑے اُگلتے اُگلتے اگلے سفر پر روانہ ہو گئی تھی۔ وہ گڑیا جو اسے باؤ کہا کرتی تھی' آخری ہچکیوں کے درمیان اس کے ہاتھ چُومنے لگی' کہنے لگی کہ میرے باؤ بھائی! مَیں صرف تیرے ان ہاتھوں کی قرضدار ہو کر مَر رہی ہوں۔ میری قبر بھی ان ہاتھوں سے کھودنا' ان ہاتھوں سے ہی قبر میں لٹانا اور پھر انہی ہاتھوں کو چُومتے چُومتے گردن ڈال دی۔ اس کے ہاتھ جوانمرگ' مظلوم' معذور' بہن کے سرخ خون سے لتھڑ گئے--- اور آج--- آج یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ گرم خون' برَص کی طرح اس کے ہاتھوں پہ نکل آیا ہو۔ وہ سفید سوکھے سوکھے' ابھری ہوئی نیلی نیلی رَگوں والے پیر قبر سے باہر نکل آئے ہوں--- پہلی نظر کے بعد وہ دوبارہ شہزادی کو دیکھنے کی جرأت ہی نہ کر سکا تھا' اس کے تو پیروں نے ہی اسے جکڑ لیا تھا وہ اس کا چہرہ کیا تکتا اور جو پاؤں ہی سے پالے' اسے پھر چہرے سے کیا چاہئے؟

پیلے چاند کا چہرہ کچھ زیادہ ہی زرد ہو گیا تھا شاید اس لئے کہ اس نے بھی آج عجیب تماشا دیکھا تھا' وہی تماشا جو شہزادے کے ساتھ پیش آیا تھا۔ شہزادی بھی اپنی کوٹھی کی پہلی

منزل کی چھت پہ کھُلے آسمان کے نیچے بید مجنون کے جھُولے پہ پاؤں پسارے' گم سُم سی نیم دراز تھی۔ رات کی رانی کی مسحور کن مہک' گملوں میں کھلے آدھ کھِلے گلاب' موتیے اور موم تارے کی معصوم ملول سی خوشبو' سہاگن جھُومر بیل پہ کھِلے ہوئے شگوفے' پس منظر میں لبرٹی مارکیٹ کی جلتی بجھتی رنگین نیون سائن کی روشنی کا طلسماتی رقص' سحر آگیں ماحول کی گرفت میں مدہوش سی' مغموم سے چاند پہ نظریں جمائے اپنے آپ میں گم تھی۔ انسانی چاہتیں' مَن کی کلپنائیں' کامنائیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ محرومیں' ناآسودگیوں' خواہشوں کے جذبے انسان کو کیسے کیسے اَن دیکھے جزیروں کی تلاش میں سرگرداں کر دیتے ہیں۔ وہ بھی شاید چاند میں کسی جزیرے کی تلاش کر رہی تھی--- اِک چھناکے سے اس کے ذہن میں شہزادے کا سراپا اُبھرا۔ وہ غور کرنے لگی کہ رَو کیوں رہا تھا؟ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا' نہ کوئی بات کی اور پھر سو روپے بھی واپس کر دیئے۔ وہ کون تھا؟ کیا وہ واقعی مالشیا ہے۔ شکل صورت' طور طریقے تو ایسے نہیں۔ وہ تو خوابوں کے کوہ قاف کا کوئی شہزادہ لگتا ہے۔ اس کی شفا بخش انگلیوں کے لمس میں کیسی مسیحائی اور کیف تھا--- انجانے میں وہ اپنا پاؤں سہلانے لگی۔ چاند کا سفر--- جذبوں کا سفر--- رات آہستہ آہستہ بھیگنے اور سرکنے لگی تھی--- موت' نیند اور یاد یہ تینوں انجانے میں وار کرتے ہیں۔ انسان کو اس وقت معلوم ہوتا ہے جب وہ جکڑا جا چکا ہوتا ہے--- وہ دونوں ہی نیند کی آغوش میں آسودہ تھے۔ ایک زمین پہ اور دوسری اپنے حریم ناز میں---!

شاید اسی کیفیت کو شاعر نے اس طرح محسوس کیا ۔

رات دوہاں دی گزر گئی امام دینا
کے دی دارے کے اندر کے دی چوبارے اندر

اس واقعے کو کئی روز گزر چکے تھے--- چاہئے تو یہی تھا کہ وہ آہستہ آہستہ سب کچھ بھول جاتا مگر شاید جس واقعے سے آنکھ یا اندر بھیگ جائیں' اسے انسان بھولنا بھی چاہے تو بھول نہیں پاتا۔ اس کے اندر بھی کوئی ننھا سا سوراخ ہو گیا تھا' اندر ہی اندر قطرہ قطرہ کسک کشید ہو رہی تھی۔ دھیمی دھیمی ٹھنڈی ٹھنڈی آگ اس کے رگ و پے میں ہلکے سے بخار کی طرح کسلمندی کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ کوٹھے والی اس کے دل کی کوٹھڑی میں اپنی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔ ایسی معصوم' خوبصورت' بااخلاق لڑکی اس نے پہلے تو

کبھی نہ دیکھی تھی وہ کسی طور وہ نہ تھی' جو نظر آ رہی تھی--- وہ کون ہے' اسے اِک نظر دیکھ کر' اس کے پاؤں سہلاتے ہوئے گڑیا کیوں یاد آ گئی۔ آنسو کیوں آ گئے' دل کبوتر کی طرح کیوں پھڑپھڑانے لگا؟--- گڑیا! تو چھوٹی بہن تھی اور یہ کوٹھے پہ بیٹھنے ناچنے والی' ایک دوسرے کی ضد لیکن احساسات اور دل کی کیفیات ایک سی کیوں؟--- سوچتے سوچتے اس کا سر دُکھنے لگا۔ بھرے ہوئے سگریٹ کے بھرپور کش وقتی طور پر سہارا تو دیتے مگر مداوا تو نہ تھے' اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی خاطر وہ دُور دُور نکل جاتا۔

ان دنوں سیلاب آیا ہوا تھا' راوی نے اپنا پاٹ پھیلا دیا ہوا تھا۔ متاثرہ گاؤں اور بستیاں خالی ہو رہی تھیں' راوی روڈ اور نیا پرانا سانده متاثرین سے اٹا پڑا تھا' بند روڈ پہ گائیوں بھینسوں کے باڑے' گاڑیوں بسوں کی ورکشاپیں' کار خانے' کچے پکے مکان خالی ہو رہے تھے۔ تباہ حال لوگ بچے کھچے سامان کے ساتھ سڑک کی دونوں اطراف ڈیرے ڈالے ہوئے پڑے تھے۔ شہزادہ ان کی حالت زار پہ کڑھتا ہوا پل تک جا پہنچا' یہاں بھی تماشا دیکھنے والوں کا ہجوم تھا' جل تھل سیلاب اپنی آخری حد تک پہنچا ہوا تھا۔ چھابڑی والے' قیمے بیسن کے گرما گرم نان فروخت کرنے والے' شوقیہ چھلانگیں لگانے والے' بہتے ہوئے بڑے بڑے کدو اور سامان پکڑنے والے--- پُل سے ذرا پہلے بائیں جانب کشتیوں کے گھاٹ کی طرف اترنے والی سیڑھیوں کے پاس پولیس والوں نے ناکہ لگایا ہوا تھا۔ اسلحہ بردار پولیس والے خاص طور پر کاروں پہ اپنی کار کردگی دکھا رہے تھے۔ اس قسم کی کاروائیاں چونکہ روز مرہ کا معمول ہیں۔ وہ اِدھر اِک غلط سی نگاہ ڈال کر' واپس مڑنے ہی والا تھا کہ ایک دبنگ سی آواز نے اسے رُکنے پر مجبور کر دیا۔ سرکنڈوں کے بنے ہوئے موہڑے میں دھنسا ہوا ایک بیل نما پولیس انسپکٹر اسے بید کی چھڑی سے پاس آنے کا اشارہ کر رہا تھا--- بڑے پھنسے--- تیل کے کنستر کو دیکھتے ہوئے' دل ہی دل میں اس پہ لعنت بھیجتے ہوئے وہ انسپکٹر کے پاس چلا آیا۔

"اوئے' ذرا میری ٹانگیں دباؤ---"

کیکر کے تنے سی ٹانگ آگے بڑھاتے ہوئے اس نے نادر شاہی انداز میں حکم دیا۔ حکمِ حاکم--- پاؤں پہ اکڑوں بیٹھ کر مٹھی چاپی کرنے لگا--- چوہے دان ایسی جگہ فٹ تھا کہ کسی چوہے چوہیا کے بچ نکلنے کا سوال ہی نہیں تھا' دُور سے یہ پنجرہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ پُل

پہ چڑھ کر واپسی ناممکن تھی' قریب آتے ہی پاؤں بریک پر' تیرے زبان پہ اور ہاتھ جیب پہ آ جاتے' شکار پارٹی اپنی صوابدید پہ خود ہی ٹمک ٹکا کر کے فرض منصبی سرانجام دے رہی تھی' میر پارٹی اپنی ٹانگوں کے پارٹ سروس کروا رہا تھا کہ ایک شترمرغ سا ملازم اپنی ڈھیلی پتلون سنبھالتے ہوئے آیا۔

"سر جی! لو' ایک اور دو نمبر میاں بیوی آئے ہیں--- کاغذات بھی نہیں ہیں۔" پھر استہزائیہ انداز میں آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "صاحب نے گھٹ بھی لگایا ہوا ہے---"

"اچھا---!"

انسپکٹر نے "اچھا" کو اتنا لمبا کھینچا جیسے وہ "اچھے" کو ہی نہیں بلکہ بھولو' اکی اور گوگے کو بھی ایک ساتھ ہی بُلا رہا ہو۔ پھر وہ شترمرغ' گینڈے کے قریب آ کر آہستہ سے کہنے لگا۔

"سر جی! میرا ناک بتا رہا ہے کہ صاحب کے اندر پانی بھی ولایتی ہے اور آنکھ بتا رہی ہے کہ گاڑی کے اندر شہزادی ہیرامنڈی کی ہے---"

"اچھا ذرا اس شہزادے اور شہزادی کو میرے پاس تو لاؤ۔" پھر وہ دُور ان کی نکور گاڑی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "اور گاڑی کی اچھی طرح تلاشی بھی لو۔"

لاہوریوں کی روز مرہ کی زبان میں ایسی ویسی لڑکیوں عورتوں کے لئے شہزادی اور ایسے ویسے نکموں' آوارہ گرد لڑکوں کے لئے شہزادے کی اصطلاح عام طور پہ استعمال کی جاتی ہے لیکن یہاں پاؤں داب‌تے ہوئے اس شہزادے کے ہاتھ شہزادی کے نام پہ رُک گئے۔ پھر مڑ کے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا--- گاڑی سے اترنے والی واقعی شہزادی تھی' زرق برق قیمتی لباس میں وہ یوں ٹہلتی ہوئی آ رہی تھی جیسے کسی شاہی سواری سے اُتر کر کسی محل سرائے میں جا رہی ہو۔ دریا کنارے ٹھنڈی ٹھنڈی مست خرام ہَوا میں اس کی لمبی لمبی سنہری زلفیں خوبصورت سپنولیوں کی مانند لہرا رہی تھیں۔ بہکتے قدموں پہ نیم گنجا ادھیڑ عمر مرد جو چہرے مہرے اور لباس سے کوئی عیاش امیر آدمی دکھائی دیتا تھا' شترمرغ سے الجھتا ہوا اس طرف آ رہا تھا--- شہزادے کو یاد آ گیا۔ اسے اس نے پہلے روز شہزادی کے کوٹھے پہ دیکھا تھا' یہ کاموکی کے شیخ صاحب تھے۔ شہزادی کو دیکھ کر انسپکٹر کے چہرے پہ رونق سی آ گئی'

آنکھوں میں شیطنت کے شعلے رقص کرنے لگے۔ پاس آکر شیخ صاحب نے کمال رعب و وقار سے شتر مرغ کی بدتمیزی کی شکایت کی کہ شریف شہریوں کو خوامخواہ پریشان کیا جاتا ہے۔ انسپکٹر صاحب کی اس وقت صرف آنکھیں کھلی کی کھلی تھیں' کانوں نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ شیخ صاحب اپنی ترنگ میں ہانک رہے تھے اور شہزادہ مندراں والا سرنیہوڑے' زندہ دفن ہونے کے لئے آس پاس کوئی دراز' سوراخ تلاش کر رہا تھا۔ شہزادی اپنے رنگ میں مگن' اجڑے ہوئے گھاٹ کی جانب دیکھ رہی تھی۔ جہاں سرکنڈوں کے درمیان ایک بوسیدہ سی ٹوٹی ہوئی کشتی آدھی ڈوبی' باقی باہر' تند رو طوفانی سیلاب کا مقابلہ کر رہی تھی۔ یہ چند لمحے شہزادے پہ کئی صدیاں بن کر گزر گئے۔ شہزادی کیا جانتی کہ چند قدم آگے اس کی جانب پشت کئے' سر جھکائے کون بیٹھا ہے اور اس پہ کیا قیامت ٹوٹی ہوئی ہے۔ اچانک شہزادے کا بھاری ہاتھ ذرا ٹیکھا پڑا تو انسپکٹر کوے کی کیفیت سے باہر نکل آیا۔

"اچھا---" اس نے پہلی بار غور سے شیخ صاحب کو سر سے پاؤں تک بغور دیکھا۔

"سر! آپ کے پاس گاڑی موجود ہیں---؟"

شیخ صاحب لہرا سا لے کر بولے۔ "انسپکٹر صاحب! یہ میری اپنی ذاتی کار ہے لیکن کاغذات تو اس وقت میرے پاس موجود نہیں---"

"آپ کے پاس چسکی لگانے کا پرمٹ تو ہوگا---؟" انسپکٹر نے ہاتھ سے پینے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں جی!--- نہیں جی!"

شیخ صاحب وائیٹ ہارس پر سوار' نفی اثبات کے جھمیلوں سے آزاد دریا کی لطیف ہوا میں موسم کا مزہ لے رہے تھے۔ انسپکٹر نے خشمگیں نگاہوں سے انہیں گھورتے ہوئے ایک اور فائر کیا۔

"یہ آپ کی کون ہیں---؟"

"یہ میری--- یہ میری جان ہے جی--- انسپکٹر! آپ مجھے نہیں جانتے کہ میں کون ہوں---؟"

"میں نے آپ کے بارے میں ابھی نہیں پوچھا--- جو پوچھا ہے' اس کا جواب دیں۔"

شیخ صاحب سگریٹ جلانے کی ناکام کوشش کرتے بولے۔ "کہہ دیا ہے جی' یہ میری جان ہے۔ میرا سب کچھ ہے' مَیں اس سے شادی کرنے والا ہوں--- بائی دی وے' انسپکٹر صاحب! آپ کا نام کیا ہے؟"

اس سے پیشتر کہ انسپکٹر اپنا نام بتاتا یا کوئی کام دکھاتا' شہزادی بڑی شائستگی سے بولی۔

"انسپکٹر صاحب! یہ اس وقت ہوش میں نہیں ہیں--- مہربانی ہوگی اگر آپ علیحدگی میں میری ایک گذارش سُن لیں۔"

"مَیں کنجریوں سے علیحدگی میں بات نہیں کیا کرتا---"

پنڈلی پہ جیسے کسی نے لوہے کا شکنجہ کَس دیا ہو' ہڈی تک تڑخنے لگی تھی۔ انسپکٹر نے دوسری لات شہزادے کے سینے پہ دے ماری' شہزادے نے لات کھا کر بھی لات نہ چھوڑی' گھسیٹ کر نیچے دھر لیا اور سیدھی ماتھے پہ کھوپڑی شکن ٹکر نکا کر' تین من گند کے توبڑے کو بڑی اوجڑی کی طرح اٹھا کر پارک کی جانب گہری کھائی میں پھینک دیا۔ یہ سب کچھ چشمِ زدن میں ہو گیا تھا' اتنا اچانک کہ انسان سوچ بھی نہیں سکتا۔ اسی دھینگا مشتی میں شہزادی نے شہزادے کو دیکھ لیا' اور اس کی سمجھ میں سب کچھ سمجھ میں آگیا تھا۔ دیگر ملازموں کی شکار پارٹی تو اب تک بے خبر اپنے مک مکا میں مگن تھی' شتر مرغ پاس تھا' کئی لمحے وہ مبہوت بت بنا کھڑا رہا اور جب کچھ صورت حال کو سمجھنے کے قابل ہوا تو شور مچاتا ہوا دوسرے پولیس والوں کو بلانے لگا۔ اسی مہربان سے وقفے میں شہزادے نے شہزادی کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر چھوا اور کسی چھلاوے کی مانند الٹ بازی لگا کر سڑک سے کھائی کے پار' پارک میں اُتر گیا۔ اس کا رُخ گھنے جھنڈ کی طرف تھا' وہ کسی چیتے کی مانند بھاگتا ہوا دریا کے بند پہ چڑھ گیا۔ پولیس والے اسلحہ لے کر پیچھے بھاگے' ایک دو ملازم پُل پہ بھی جا پہنچے' دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔ پولیس والوں کے جاتے ہی شیخ صاحب شہزادی کو لے کر کار میں ہَوا ہو گئے تھے۔ ٹول ٹیکس کے دروازوں سے ذرا پہلے شہزادی نے زبردستی کار رکوائی' نیچے اتر کر پل کی ریلنگ سے لگ کر دوسرے کنارے دیکھنے لگی--- آگے آگے شہزادہ تھا' پیچھے پولیس والے فائرنگ کر رہے تھے۔ ایک گولی جھلتی ہوئی کلن کے پاس سے گزری' زیگ زیگ بھاگتے بھاگتے' جُھکائی لے کر وہ کنارے--- کنارے سرکنڈوں میں پھلانگ گیا' سانس کی دھونکنی نے بے دَم کر دیا تھا' رینگتا رینگتا

آگے بڑھنے لگا۔ پولیس والے قریب آ پہنچے تھے' سیلابی پانی نے جابجا دلدل سی بنا دی ہوئی تھی' جائے پناہ نہ پاکر پھر بند پہ چڑھ آیا۔ چند قدم ہی آگے بھاگا تھا کہ آگ کا ایک دہکتا ہوا انگارہ اس ران میں گھس گیا اور پھر اس کے گرتے ہی پولیس والے سر پہ آ پہنچے۔ ادھر شیخ صاحب بھی لڑکھڑاتے ہوئے شہزادی کے پاس آ گئے۔

"آؤ جانِ من! گولی مارو ان کو' موڈ خراب نہ کرو---"

دوسرے دن اخباروں میں راوی پل پہ پولیس مقابلے کی خبر نمایاں تھی۔ منشیات فروشوں کا سرغنہ پولیس کاروائی کے دوران بُری طرح زخمی حالت میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ منشیات کی اسمگلنگ' مداخلت بے جا' پولیس پہ حملہ' اسی نوع کے بہت سے الزام تھوپے گئے تھے۔ پولیس کی اعلیٰ کارکردگی کا ذکر' موقع پہ اسلحہ اور منشیات کی برآمدگی کا ذکر بھی تھا۔ اس کیس کے ڈانڈے بین الصوبائی سمگلنگ کے سلسلوں سے ملا دیئے گئے اور شام تک شہزادہ مندراں والا مالشیا خاص طور پر پورے لاہور میں مشہور ہو چکا تھا۔

ہڈی بچ گئی تھی لیکن قریب سے فائر کی گئی گولی نے ران اُدھیڑ کر رکھ دی تھی۔ ہسپتال میں سخت پہرہ بٹھا دیا گیا--- انسپکٹر باجوہ بھی سخت زخمی حالت میں ہسپتال میں ہذیان بک رہا تھا' ٹکر سے کھوپڑی دو جگہ سے چٹخ گئی تھی اور ابتدائی رپورٹ کے مطابق اندر دماغ بھی ہل گیا تھا۔ اس کی تصدیق ہذیان بکنے سے ہو رہی تھی' جبکہ دونوں ہی بیان دینے کے قابل نہیں تھے۔

اس واقعے کے بعد شہزادی جیسے فقیرنی ہو گئی تھی۔ گانا' ناچنا ایک طرف' وہ تو اس دن کے بعد گھر سے باہر ہی نہیں گئی تھی' کھانا پینا' پہننا بھی موقوف ہو گیا تھا۔ کسلمندی اور بخار کی حالت میں اَدھ موئی سی پڑی تھی۔ تاجی کو بڑی فکر لگی۔ گو تیمارداری' دوا دارو' صدقے واری کا ہر سامان مہیا تھا۔ دل داری' ہمدردی کے لئے شیخ صاحب بھی اپنی نوازشات کے ساتھ بنفس نفیس موجود تھے مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ جسمانی عارضہ یا تکلیف ہوتی تو افاقہ ہو جاتا مگر یہ چوٹ تو دل کے جلترنگ پہ لگی تھی' احساسات کی نازک مدھم سُروں کا ارتعاش اس کی مضطرب رُوح کو جھنجھوڑ رہا تھا' وہ یقین کی پوری سچائیوں سے جانتی تھی کہ شہزادے نے یہ انتہائی قدم صرف اس کی خاطر اٹھایا ہے' وہ اس کی توہین برداشت نہیں کر سکا تھا مگر کیوں؟--- کیا وہ اسے چاہتا ہے' محبت کرتا ہے؟--- نہیں--- اس کا اندر بول

رہا تھا' اور تجربہ بتا رہا تھا کہ وہ اس راہ کا مسافر نہیں--- وہ کون ہے' وہ رو کیوں رہا تھا' اس نے ایسے کیوں کیا؟--- مختلف سوالات کیچوؤں کی مانند اس کے دماغ میں کُلبلا رہے تھے۔

پُل پہ ہونے والی کاروائی کا ذکر اس نے دانستہ ماں سے نہیں کیا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے اور اس کی خاطر ہوا ہے۔ اس نے شیخ صاحب کو بھی احتیاطاً" منع کر دیا تھا کہ ماں سے پولیس والی کاروائی کا ذکر نہ کریں ورنہ باہر جانے پہ پابندی لگ جائے گی۔ شہزادے والا تجسس' میٹھا میٹھا درد' ہلکی ہلکی سی چبھن وہ صرف اپنی ذات تک ہی محدود رکھنا چاہتی تھی جیسے کوئی بچہ اپنا پسندیدہ کھلونا اپنی ماں سے بھی چھپا کر رکھتا ہے اور اس معاملے میں ممتا پہ بھی بھروسا نہیں کرتا۔ شہزادے والے کیس پہ تاجی کا ردِ عمل بھی کوئی خاص نہ تھا' اس قسم کے نقلی اصلی پولیس مقابلے آئے دن اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں' دہشت ناک کٹی پھٹی لاشوں کی تصویریں اور خون آشام کاروائیاں چھپتی رہتی ہیں۔ اس قسم کی خبروں کے مقابلے میں یہ تو ایک چھوٹی سی "پولیس مقابلی" تھی جس میں زیبِ داستان کے لئے بھی کوئی ہلاک نہ ہوا تھا۔ وہ اس خبر پہ محض شہزادے کی وجہ سے ہلکا پھلکا سا تبصرہ کر کے بات آئی گئی کر گئی' اسے کیا خبر کہ جس شہزادے کی بات کو وہ آئی گئی کر گئی ہے وہ شہزادی کے کوٹھے سے تو چلا گیا تھا مگر اس کے دل کی کوٹھڑی سے نہیں گیا تھا بلکہ کوٹھڑی والی نے تو اسے بھگوان بنا کر مَن مندر میں بٹھا لیا ہے۔

دن گزرتے گئے--- پولیس کیس تیار کر رہی تھی۔ شہزادہ کچھ عرصہ ہسپتال میں رہ کر پولیس کی تحویل میں واپس آ چکا تھا۔ جہاں اب ریمانڈ پہ ریمانڈ چل رہا تھا۔ ادھر انسپکٹر باجوہ ابھی بیان دینے کے قابل نہ تھا' بیان کیا دیتا کہ اسے تو اپنا نام تک یاد نہیں رہا تھا' کھوپڑی کی کوئی باریک ٹوٹی ہوئی ہڈی اس کے دماغ میں گھس گئی تھی' ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے وہ ہڈی نکال تو دی لیکن دماغ ٹھکانے نہ آ سکا۔ ڈاکٹروں نے اس کی دماغی صحت کے بارے میں ہمیشہ کے لئے اپنی مایوسی کا اظہار کر دیا۔ جبکہ انسپکٹر باجوہ اس کیس کا اہم فریق تھا' سارا دارومدار ہی اسی کے بیانوں پہ تھا یا پھر شُترمُرغ--- جو تمام کاروائی کا چشم دیدہ گواہ تھا۔ شہزادی اور شیخ صاحب تو اصلی سٹوری سے ہی نکل گئے تھے' دوسری بے شمار کاروں اور لوگوں میں وہ بھی شامل تھے' ایسی ٹک مکا کاروائیوں میں نہ تو نام ہوتے ہیں نہ نمبر'

صرف نوٹ ہوتے ہیں۔ انسپکٹر باجوہ سے مایوس ہو کر پولیس نے شترمرغ اور چند دوسرے دو نمبر گواہوں کے کاندھے پہ کھڑے ہو کر الٹا سیدھا کیس تیار کر کے شہزادے کو عدالت میں ڈال دیا۔

شہزادے کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ پولیس کی تحویل میں اس کے پاس آنے والا نوجوان شہزادی کا خاص طور پر منتخب کیا شہر کا قابل ترین وکیل ہے۔ مقدمہ پیش ہوا' پولیس نے اسے منشیات کی اسمگلنگ' پولیس پر حملہ وغیرہ کے الزامات میں ماخوذ کیا تھا۔ برآمدہ منشیات' اسلحہ' موقع کے گواہ' سب کچھ پیش کیا مگر شہزادی کے قابل وکیل نے جرح کے دوران استغاثے کے جھوٹے گواہوں اور من گھڑت الزامات کے تار پود بکھیر کر رکھ دیئے تھے۔ شہزادے کے بیان کے مطابق وہ سیلاب دیکھنے راوی پہ گیا تھا انسپکٹر نے اسے پکڑ کر پاؤں وابنے کی بیگار پہ لگا دیا' پھر میری کسی سستی پہ اس نے مجھے کنجر کہہ کر زور سے ٹھوکر ماری۔ مَیں مزدور آدمی ہوں' عزت غیرت والا ہوں' اس کی یہ جسمانی اور اخلاقی زیادتی برداشت نہ کر سکا۔ مَیں نے بھی حالتِ غضب میں اسے جواب دیا' اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں--- وکیل نے ثابت کر دیا کہ یہ پیشہ ور محنتی مالشیا ہے' نہ تو منشیات کا عادی ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق کسی گروہ سے ہے' نہ ہی اس کے پاس اسلحہ تھا اور نہ کبھی رہا۔ شترمرغ بھی اپنی بدحواسی اور حماقت میں کچھ بیان ایسا دے گیا جو شہزادے کے حق میں جاتا تھا۔ انسپکٹر کا ٹھوکر مارنا اور کنجر کا لفظ استعمال کرنا بھی ثابت ہو گیا مگر اس وضاحت کے ساتھ کہ کنجری ایک عورت کو کہا گیا تھا شہزادے کو نہیں--- پولیس جھنجلاتی رہ گئی۔ وکیل نے ثابت کر دیا کہ پولیس نے اپنی بربریت اور زیادتی کو چھپانے کی خاطر بے قصور' غریب مزدور' محنت کش کو قربانی کا بکرا بنایا ہے۔ جہاں بات زیادہ بگڑ گئی' وہاں جعلی پولیس مقابلہ ڈال کر اس کو ختم کر دینا چاہا' محنت مشقت سے رزق حلال کمانے والے ہاتھ کو اسلحہ اٹھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ شہزادے کے ہاتھ دکھاتا ہوا بولا۔

"جج صاحب! ان ہاتھوں کو دیکھئے' سونگھئے' انہیں ہاتھوں میں لے کر محسوس کیجئے۔ کئی ہفتے گزر جانے کے بعد بھی آپ کو ان میں سرسوں کے تیل کی باس آئے گی' بارود کی نہیں---"

فاضل عدالت نے پولیس کے بنائے ہوئے کیس کو انتہائی مضحکہ خیز اور کمزور قرار

دیتے ہوئے شہزادے کو قابل ذکر تمام الزامات سے بَری قرار دے دیا' انسپکٹر پہ جوابی حملہ اس نے خود قبول کیا تھا۔ اس جرم میں دو سال قید بامشقت سنا کر جیل بھیج دیا گیا۔

اُڑتی چڑیا کے پَر گننے والی تاجی کو کسی نہ کسی طرح یہ سُن گُن لگ گئی کہ شہزادی نے کسی وکیل کے ذریعے شہزادے کو قانونی مدد بہم پہنچائی ہے۔ شاید یہ پہلا موقع تھا کہ ماں کے علم میں لائے بغیر اس نے کوئی ایسی نوعیت کا قدم اٹھایا تھا۔ تاجی کو ہلکا سا شک تو پہلے ہی تھا کیونکہ شہزادے کے کیس کے بعد وہ کام دھندے میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی' نہ ہی طبیعت میں وہ پہلی سی شگفتگی باقی تھی۔ ہر وقت بجھی بجھی' اکتائی اکتائی بیزار سی رہتی تھی۔ بوڑھی طوائف اور بوڑھے طوطے میں وقت کے ساتھ ساتھ ایک ساتویں حِس بھی پیدا ہو جاتی ہے اسی لئے بوڑھی آؤٹ آف ڈیٹ طوائفوں کے ہاں آپ کو اکثر بوڑھے گنجے پَر چھنڈے طوطے مُنڈی ڈالے ہوئے اُونگھتے ہوئے ملیں گے' ان دونوں میں یہی ساتویں حِس والی قدر مشترک ہوتی ہے' یہ دہلیز کے باہر پڑنے والے قدم اور آنے والے بُرے وقت کی دَھمک کو بہت پہلے ہی محسوس کر لیتے ہیں اور تاجی یہ دھمک محسوس کر چکی تھی۔

"کیا بات ہے چندا! کام دھندے میں تم کچھ دلچسپی نہیں دکھا رہی ہو---؟" ایک دن اس نے شہزادی کو دھر ہی لیا۔

"ہاں ممی!--- بس موڈ نہیں بن رہا' طبیعت بُوجھل بُوجھل سی رہتی ہے۔" شہزادی نے جواب دیا۔

"یہ تو غلط ہے بیٹا! طبیعت ٹھیک نہیں تو کسی اچھے سے ڈاکٹر کو دکھاؤ' یہاں گھر پہ ہاتھ پاؤں توڑے پڑے رہنے سے تو کام نہیں چلے گا کہ یوں تو بھرے کنویں بھی خالی ہو جاتے ہیں--- بیٹا! ہم پیشہ ور لوگ ہیں۔ موڈ طبیعت خراب کریں گے تو کھائیں گے کہاں سے؟--- کئی روز سے چودھری سراج بھی نہیں آئے' شیخ صاحب بھی کم آنے لگے ہیں' شوکت صاحب کئی دنوں سے غائب ہیں--- مٹی کی چھتری پہ کوئی طرحدار کبوتری نہ ہو تو قیمتی کبوتر نہیں اُترتے۔"

"ممی! بس کرو--- ہم بھی انسان ہیں' ہمارے ہاں بھی دُکھ سُکھ' بیماری' موڈ جذبات---"

"بس ' بس بیٹی! یہ سب کچھ اگر ہمارے ہاں ہے بھی تو سمجھو کہ نہیں ہے ان نزاکتوں نخروں کی ہمارے پیشے میں کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔"

"گویا ہم پتھر ہیں ' مشین ہیں جن کا مُوڈ نہیں ہوتا ' طبیعت خراب نہیں ہوتی ' احساسات اور جذبات نہیں ہوتے--- ممی! کچھ تو انسانوں اور پتھروں ' مشینوں میں فرق رَوا رہنے دو۔" وہ ردہانسو سی ہو کر بالکونی میں لٹکے ہوئے پنجرے میں بند مینا کو تکنے لگی جسے کئی دنوں سے چُپ سی لگی ہوئی تھی۔

تاجی اس کے قریب سَرک آئی ' بڑی محبت سے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "شہزادی! تم صحیح کہتی ہو۔ ہم بھی انسان ہیں ' جذبات اور احساسات ہمارے ہاں بھی موجود ہیں--- بیٹا! پھر وہی بات کہ ہم فنکار لوگ ہیں ' فن کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنے دکھ ' احساسات ' جذبات ' ٹیسیں ' چوٹیں ' داغ دھبے دوسروں سے چھپا کر رکھیں۔ ہمارے ہاں آنے والے لوگ انہی چیزوں سے فرار ہو کر آتے ہیں۔ اگر ہم بھی انہیں وہی کچھ دیں جن سے جان چھڑا کر وہ یہاں آتے ہیں تو پھر یہ چوبارے ویران ' گلیاں بازار سنسان اور یہاں کے باسی فاقوں سے مرجائیں گے۔ ہم فنکار لوگ ہیں ہمارا پیشہ دُکھی ' پریشان حال لوگوں کو بہلانا اور خوش رکھنا ہے بیٹا! روٹی تو سب کے گھروں میں پکتی ہے پھر باہر لوگ کیوں کھاتے ہیں ' بیویاں بھی ہوتی ہیں مگر یہاں کیوں آتے ہیں؟ اس لئے کہ جو چسکا باہر ہوٹلوں کے کھانوں میں اور جو لگاوٹ لبھاؤ ' رَجھاؤ محبوبیت ' دِلداری اور دِلبری کوٹھوں پہ ملتی ہے وہ گھروں میں دستیاب نہیں ہوتی--- بیوی کو دس روپے نہیں مگر ہوٹلوں اور کوٹھوں پہ سینکڑوں ہزاروں اُڑا دیتے ہیں ' اس لئے بیٹا! کہ اس پیشے میں ہم لوگ چھلنی کلیجے اور پھٹے ہوئے پتے کے باوجود بھی ہنسنے لبھانے رِجھانے اور ناچنے گانے کے لئے حاضر ہوتے ہیں---"

"کاش! ہم لوگ فنکار نہیں ' معمولی انسان ہوتے---" شہزادی نے ماں کے کندھے پہ سر ٹکا کر کہا۔

"ہاں--- تم صرف ایسا سوچ اور کہہ سکتی ہو ' عملاً" معمولی انسان بننا بڑا ذلت آمیز ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ٹھوکروں میں رہنے سے ' ٹھوکروں میں رکھنا زیادہ بہتر ہوتا ہے---"

"ممی---!" وہ چونک کر بولی۔ "مگر ایک بظاہر معمولی شخص نے آپ کا یہ فلسفہ الٹ

کر دکھایا ہے---"

"کھُل کر بات کرو ' مَیں کچھ سمجھی نہیں---"

"ممی! ٹھوکر میں بیٹھے ہوئے ایک شخص نے تمہاری بیٹی کو کنجری کہنے والے شخص کی کھوپڑی توڑ کر رکھ دی--- اور وہ معمولی شخص شہزادہ مُندراں والا ہے ' وہی معمولی مالشیا جو میرے پاؤں دابتے ہوئے رَو رہا تھا ' جو ہمارے دِیئے ہوئے سو روپے ہمارے چوکیدار کی جیب میں ڈال گیا۔ جس نے آنکھ اٹھا کر مجھے دیکھا تک نہیں اور جو اس دن کے بعد اس بازار میں ہی نہیں آیا--- ممی! بتاؤ کہ مَیں اس کی کیا لگتی ہوں ' وہ کون سا جذبہ اور احساس ہے جس سے مجبور ہو کر اس نے یہ قدم اٹھایا اور آج وہ صرف میری وجہ سے ہی سلاخوں کے پیچھے پہنچ گیا ہے---" شہزادی نے نہ چاہتے ہوئے بھی ساری تفصیل سنادی۔

"مگر تم نے پہلے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی--- اور مجھے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ تم نے اس کی قانونی مدد بھی کی ہے---؟"

"بات نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی ' میں یہ سوچ کر چپُ تھی کہ آپ اس کا کوئی غلط مطلب نہ نکال لیں--- باقی رہی قانونی امداد تو میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ خدا نے اس کی مدد کی ہے۔ وہ بے گناہ معصوم ' ہمدرد سا انسان جو سرِعام میری توہین برداشت نہ کر سکا ' نتائج کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ایک فرعون سے ٹکرا گیا تو کیا اس کے لئے اتنا بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اسے ہم معمولی سا قانونی تحفظ ہی بہم پہنچا سکیں جس کا وہ حق دار بھی ہے---"

"دراصل وہ مالشیا تم پہ لٹو ہو گیا ہے ' محض اپنے نمبر بنانے کے لئے اس نے ایسی حرکت کی--- اگر اسے یہ معلوم ہوتا کہ اس کی یہ حرکت کتنی سنجیدہ صورت اختیار کر لے گی تو یقیناً وہ ایسا نہ کرتا--- ماشاء اللہ شیخ صاحب جیسا صاحب حیثیت آدمی تمہارے ساتھ تھا تو تمہیں کس چیز کا خطرہ ہو سکتا تھا ' وہ خود ہی صورتِ حال کو سنبھال لیتے--- بیٹا! یہ چھوٹے لوگ کیڑوں مکوڑوں کی طرح ہوتے ہیں۔ یہ گندی موری میں ہی رہیں تو اچھے لگتے ہیں ' انہیں زیادہ منہ نہیں لگانا چاہئے---"

"شیخ صاحب خود کو تو سنبھال نہیں سکے تھے ' صورت حال کو کیا سنبھالتے--- شکر کریں کہ مجھے بیوی ظاہر کیا ' کہیں بہن بیٹی نہیں کہہ بیٹھے تھے اور جسے آپ گندی نالی کا کیڑا

کہہ رہے ہیں' انسپکٹر کو پھینکنے کے بعد اس نے میرے پاؤں کو چھُوا تھا--- ممّی! جو ہم بازار والیوں پہ لَٹّو ہو جاتے ہیں' وہ پاؤں نہیں چھُوتے--- پیاری ممّی! ہمیں اس کی مدد کرنی چاہئے' اسے ملنا چاہئے یا کم از کم اس کی کوئی حاجت ضرورت ہی پوچھ لیں؟"

تاجی سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر بولی۔ "چلو' تم کہتی ہو تو ٹھیک ہے--- حمید کو بھیج کر اس کی کوئی ضرورت معلوم کر لو لیکن بہتر ہے کہ ہزار پانچ سو وہیں بھیج دو۔ ہمارا وہاں جیل جانا دُرست نہیں---"

"نہیں ممّی! یہ تو اس کے احساس کو قتل کرنے والی بات ہے' کم از کم ہمیں خود وہاں جا کر اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہئے---"

جیل تو جیل ہی ہوتی ہے' جنگل کی طرح اس کے بھی اپنے اصُول' طریقے اور قانون ہوتے ہیں۔ اُونچی اُونچی بے حِس سنگلاخ دیواروں کے پیچھے ایک اور ہی جہاں آباد ہوتا ہے۔ انسان کی حفاظت عزت کے لئے بنایا ہوا قانون' اخلاقی انسانی تقاضے' سب کچھ گیٹ کے باہر ہی رہ جاتے ہیں۔ صاحبِ حیثیت مجرم' سفارش پیسے والے یا غنڈے بدمعاش قاتل' شاید من مانیاں کر لیتے ہوں مگر غریب' شریف بے حیثیتے بے ننگ و نام لوگ کیڑے مکوڑوں کی مانند ذلّت آمیز زندگی بسر کرنے پہ مجبور کر دیئے جاتے ہیں' ان کو عزتِ نفس سے یکسر محروم کر دیا جاتا ہے۔ بَدقماش پیشہ ور مجرم اکثر یہاں آرام کرنے کے لئے یا چھٹیاں گزارنے کے لئے آتے ہیں جیسے آسودہ حال لوگ' مری یا کاغان سوات وغیرہ نکل جاتے ہیں مگر عام شریف آدمی جو کسی کردہ یا ناکردہ جُرم کی پاداش میں یہاں پہلی بار آتا ہے' اس کے لئے جیل جہنم سے زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ آدھا خون تو پہلے گیٹ پہ ہی خشک ہو جاتا ہے اور باقی بچا کھچا دفتر' دھمکیوں' اندراج' جمع وصولی اور ہدایات سے نکال دیا جاتا ہے' رہی سہی ہمت وسکت اندر کے پرانے پاپی ختم کر دیتے ہیں۔

شہزادہ بھی اس پنجرے میں نیا پنچھی آیا تھا مگر اس کی شہرت تو کئی دن پہلے یہاں پہنچ چکی تھی' پولیس مقابلہ اور انسپکٹر باجوہ کو بیکار کر دینا بہت بڑے کارنامے تھے۔ جیل کے جلاد اس پہ دانت تیز کئے انتظار میں تھے' استقبال کی خاص تیاریاں تھیں۔ اس کے آتے ہی بڑے اہتمام انتظام سے اس کی دُھلائی ستھرائی کر کے ایک کوٹھڑی میں ڈال دیا آدھا دن اور پوری رات گزرنے کے بعد جب اس کے حواس قدرے بحال ہوئے تو گرد و پیش کی ہر چیز

اسے لہو رنگ اور دُھندلی دُھندلی سی دکھائی دے رہی تھی' کبوتر کے خون جیسی متوّرم آنکھیں' ایک نیم وا دوسری مکمل بند اور بند بند اُدھڑا ہوا' انگ انگ میں انگارے بھرے ہوئے تھے۔ سانس کھینچنے سے پسلیوں میں درد کی ٹیسیں اُٹھنے لگتیں۔ پاؤں کے تلوے جیسے انگاروں پہ رکھے تھے۔ پہلو بدلنے کی کوشش میں اس کے منہ سے کراہ سی نکل گئی' حواس قدرے مزید بحال ہوئے تو سامنے دو ہٹے کٹے ہیولے سے اسے گھُور رہے تھے' ہوش میں آتے دیکھ کر ایک قریب آیا' المونیم کے ایک ٹیڑھے میڑھے پیالے میں اسے پانی دیتے ہوئے بولا۔

"ہوش کر بھئی شہزادے' ہمت کر--- لے' پانی پی۔"

یہ بابرا برف والا تھا جس نے ایک اکڑ باز کے پیٹ میں برف کا سُوا برابر کر دیا تھا۔ دوسرا جو اسے بڑی خشمگیں نظروں سے تول رہا تھا نورا گجر عرف نوری نت تھا' بستہ ب کا بدمعاش' ڈکیتی اور اغواء برائے تاوان میں بند تھا۔ وہ بولا۔

"شہزادے! سنا ہے تم نے انسپکٹر باجوے کو خوب ٹھوکا ہے۔ جو کام میں کرنے والا تھا' وہ تو تم نے کر دیا--- سنا ہے' پاگل ہو گیا ہے۔ اسے کچھ یاد ہی نہیں' اپنا نام تک بھول گیا ہے۔ سُور دا پتر---"

شہزادہ سنی' ان سنی کرتا ہوا خاموشی سے نیم دراز سا' گھونٹ گھونٹ پانی پی رہا تھا۔ سوجا ہوا ہونٹ اور ہلا ہوا دانت' درد کی وجہ سے وہ ویسے بھی جواب دینے کی حالت میں نہ تھا۔ شلوار سے سگریٹ نکال کر سلگاتے ہوئے نوری نت پھر بولا۔

"بڑی جرأت کی ہے تو نے شہزادے---!"

وہ اسے سگریٹ دیتے ہوئے شاباش دینے لگا۔ گھٹیا اور کڑوے سگریٹ کے کش سے وہ کھانسنے لگا' بند بند سے درد کے دروازے کھُل گئے۔ وہ بے حال ہو کر پھر لیٹ گیا۔

"آج صبح تیری ملاقات بھی آئی تھی لیکن نیازی صاحب نے اجازت نہیں دی--- اجازت مل جائے گی' مَیں سارا بندوبست کر دوں گا لیکن یہ بتا کہ شہزادی سے تیرا کیا معاملہ ہے؟--- وہ اور اس کی ماں دونوں صبح آئی تھیں۔"

شہزادی کا نام سنتے ہی شہزادہ چیتے کی مانند اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پھر بولا۔

"بڑا زبردست معشوق ہے--- پَر تو اس کا عاشق ہے' مالشیا یا دلال؟"

پانی کا پیالا کسی خلائی طشتری کی طرح اُڑتا ہوا اس کے ماتھے سے ٹکرایا' پھر ٹکروں کی ٹھاہ ٹھاہ اور گالیوں کی گولیوں سے ماحول تھرا اٹھا۔ آس پاس کی کوٹھڑیوں کے قیدی ہڑبڑا کر سلاخوں سے آ لگے۔ ملازم لوگ بھی ڈنڈے سنبھالے بھاگے سروں پہ پہنچ چکے تھے---
اس رات وہ دونوں جیل کے ہسپتال میں بے سُدھ پڑے تھے۔ بُرا حال' منہ ماتھا' ناک' برابر--- بستہ ب کے بدمعاش نوری نت کی ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ آنکھوں پہ نیل--- پورا چہرہ کسی فٹ بال کی مانند سوجا ہوا' سر پہ بڑے بڑے گومڑوں کے جزیرے اُبھر آئے تھے' اوپر کے اگلے دانتوں کی باڑھ بھی ہل چکی تھی۔ شہزادے کا حال پہلے ہی کون سا اچھا تھا' نئی پرانی چوٹوں کا کچھ حساب ہی نہیں تھا--- دو ہفتے دونوں سخت نگرانی میں ہسپتال میں سڑتے رہے' ذرا ہلنے جلنے کے اہل ہوئے تو سخت وارننگ کے ساتھ دونوں علیحدہ علیحدہ کوٹھریوں میں بند کر دیئے گئے' سزا میں اضافے کے ساتھ مشقت بھی دگنی کر دی گئی۔ شہزادے کی جی داری کی شہرت چیچک کی مانند پھیل چکی تھی۔ نوری نت بھی اپنی جگہ پہ بڑے ٹھکے اور شہرت کا مالک تھا اور مدت سے آرزو بھی تھی کہ سیدھا کرے کوئی--- اب اس کو بھی سوا سیر مل گیا' لیکن عمر اور بدمعاشی کے لحاظ سے اپنی ٹانگ برابر لونڈے کے ہاتھوں ایسی تذلیل سے وہ بڑی سبکی محسوس کر رہا تھا' کسی زخمی سانپ کی مانند وہ اندر ہی اندر بس گھول رہا تھا' اپنے ذرائع سے اس نے شہزادے کو پیغام بھجوایا کہ بچو! اب تیری لاش کو کتے ہی کھائیں گے۔ شہزادے نے کوئی جواب دینے کی بجائے پیامبر کے منہ پہ نفرت سے تھوک دیا تھا۔

پندرہ بیس روز بعد سختی ذرا کم ہوئی' حالات معمول پہ آئے تو ان کی کوٹھڑیاں بھی تبدیل کر دی گئیں۔ ایک روز مشقت کے دوران اچانک دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ چیتے کی مانند شہزادہ اُچھل کر نوری نت کے روبرو آ کھڑا ہوا اور جھکائی دے کر ایک بھرپور ٹکر ماتھے پہ ٹکائی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"تو بستہ ب کا بدمعاش ہے--- مَیں تیرے جیسے بدمعاشوں کو اس وقت سے ٹھیک کرتا آیا ہوں جب میں بستہ لے کر سکول میں الف پڑھنے جاتا تھا--- مجھے دھمکیاں دیتا ہے---؟"

اس سے پیشتر کہ دوسری ٹکر سے اس کی نوری نت کھنے کھول دیتا' ملازم نے اسے

قابو کر لیا--- کچے زخم پھر کھُل گئے تھے۔ اب نوری نت ہسپتال میں اور شہزادہ سپرنٹنڈنٹ کی پیشی میں تھا۔ شہزادہ مارنے والوں کی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ نیازی صاحب نے تنگ آ کر بید کی چھڑی اس کے منہ میں حلقوم تک داخل کر دی۔

"دیکھ شہزادے! تو نے اگر اب بکواس کی تو یہ چھڑی تیرے پیٹ میں ناف تک داخل کر دوں گا--- تجھے وارننگ دی گئی تھی اس کے باوجود تو نے وہی حرکت کی۔ یہ جیل ہے' یہاں کسی کی بدمعاشی نہیں چلتی--- باہر سے تیرے لئے سفارشیں آ رہی ہیں' ملاقاتیں آ رہی ہیں اور تو یہاں اپنی حرامزدگیوں سے باز نہیں آتا--- بچّے! آج تو میں تجھے ڈنڈا بیڑی کر کے پھانسی والی کوٹھڑی میں بند کر دوں گا۔"

چھڑی کے منہ سے نکلتے ہی شہزادے نے کہا۔ "سر! مجھے آپ پھانسی پہ لٹکا دیں تو اچھا ہے' آپ سے بھی اگر انصاف نہ ملے تو مَر جانا ہی بہتر ہے--- مَیں کوئی بدمعاش نہیں' دس انگلیوں سے حلال کی کھانے والا مالشیا ہوں' اس کے ساتھ ایک انسان بھی ہوں۔ میری کوئی بے عزتی کرے یا ناحق ذلیل کرے تو مجھے بھی حق پہنچتا ہے کہ مَیں بھی جوابی کاروائی کروں--- کسی کی زبان چلتی ہے تو کسی کا ہاتھ نوری نت نے میرے ساتھ زیادتی کی اور دونوں مرتبہ پہل اس کی جانب سے ہوئی۔ آپ کیسے افسر ہیں جو ہاتھ کا زخم تو دیکھتے ہیں' زبان کا نہیں۔ میرے ساتھ جو زیادتی کرے گا اس کا حشر ایسا ہی ہو گا' آگے آپ حاکم ہیں۔ جو چاہیں کریں--- ویسے میری جانب سے کبھی پہل نہیں ہو گی' یہ میرا آپ سے وعدہ ہے---"

"مَیں اس حرامزادے کو بھی دیکھ لوں گا--- یاد رکھو' مَیں آخری بار تم کو سمجھا رہا ہوں' آئندہ کوئی ایسی حرکت نہیں ہونی چاہیے۔"

اب شہزادے کا ٹہکہ پوری جیل میں تھا۔ قیدی تو قیدی' چھوٹے موٹے افسر' ملازم سب اس سے رُکتے تھے۔ کھانا پینا بھی ٹھیک ٹھاک ملنے لگا' مشقت بھی اپنی مرضی سے کرتا۔ اندر باہر رابطہ کروانے والے گماشتے بھی پیش پیش رہتے۔ مولوی صاحب سے اب باقاعدہ قرآن شریف بھی پڑھنے لگا' نماز بھی شروع ہو گئی۔ کچھ ہفتے اور گزرے تو داڑھی بھی بڑھالی نوری نت اپنی شرمندگی اور خجالت کی کچھار میں دُم لپیٹے دبکا دبکا پڑا رہتا' موقع کی تلاش میں تھا کہ کسی روز اس سے صلح کی بات چیت کرے۔ ادھر شہزادی بھی مسلسل

کوشش کر رہی تھی کہ ملاقات مل جائے لیکن جیل کی انتظامیہ حالات کے پیش نظر ملاقات نہیں دے رہی تھی۔ آخر وکیل صاحب کی کوششوں سے ملاقات ملی تو شہزادے نے انکار کر دیا کہ مَیں کسی سے ملنا نہیں چاہتا۔ اندر باہر کا رابطہ کروانے والا ماشکی ایک صبح تعویذ کی طرح لپٹا ہوا ایک خط اسے تھما گیا اور جاتے وقت کہہ گیا کہ جواب شام تک تیار رکھنا۔ شہزادہ خط دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ شہزادی کا کوئی پیغام ہے۔ شام سے ذرا پہلے وہی شخص جواب لینے آیا تو شہزادے نے اسے وہی خط واپس دیتے ہوئے کہا۔

"چاچا! مَیں تیری عزت کرتا ہوں' آئندہ کبھی کوئی خط یا پیغام میرے لئے مت لانا--- یہ خط وہیں واپس لے جاؤ' اسے مَیں نے پڑھا بھی نہیں ہے اور جو بات میں نے کہی ہے اس پہ غور اور عمل کرنا--- یہی میرا جواب ہے۔"

شہزادی بڑی بے تابی سے جواب کی منتظر تھی مگر اپنا ہی خط واپس اس کے پاس پہنچ چکا تھا اور ساتھ وہ پیغام بھی مل چکا تھا جو شہزادے نے دیا تھا۔ خط ویسے ہی بند' دو نشان شاید آنسوؤں کے تھے--- وہ تڑپ سی گئی اس کی بے رُخی نے اسے دیوانہ سا کر دیا۔ بِن پانی کی مچھلی کی مانند وہ تڑپ رہی تھی' کام دھندے میں وہ پہلے کون سی دلچسپی لے رہی تھی' رہی سہی بات بھی ختم ہو گئی--- اب تاجی کے لئے یہ صورت حال بڑی پریشان کُن تھی۔ وہ زمانہ دِیدن' چشیدن تھی' خطرے کی بُو سُونگھ کر کسی اور نہج پہ غور کر رہی تھی۔ یہی تو ان لوگوں کا کمال ہے کہ پھٹے دودھ کے بھی دُگنے دام وصول کرنا جانتے ہیں' وہ بھی اس پھٹے دودھ کی رَس ملائی بنانے کا سوچ رہی تھی۔

نوری نت کو آخر وہ موقع مل ہی گیا۔ ۱۴ اگست کے موقع پر بہت سے قیدیوں کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔ خصوصی کھانے' مٹھائیاں تقسیم ہوئیں' مختلف تفریحی ثقافتی پروگرام ترتیب دیئے گئے' جیل میں دن رات خوب ہلا گلا رہا۔ اسی موقع پہ کچھ لوگوں نے انہیں بھی گلے ملوا دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ایسے شِیر شکر ہوئے کہ جیل والے بھی ان کی دوستی پہ رشک کرنے لگے۔

ایک دن ایک اور رابطے سے اس تک ایک اور خط پہنچا۔ پیشتر اس کے کہ شہزادہ کوئی جواب دیتا نوری نت نے یہ خط اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور خط لانے والے کو شام تک جواب دینے کا کہہ دیا۔

"چنَن شہزادے! میں نے آج تک تمہارے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیا' نہ تم نے کبھی کوئی بات بتائی مگر ایک بات میں ہی نہیں' سارا جیل جانتا ہے کہ تم نے آج تک کسی سے ملاقات نہیں کی اور نہ کسی خط کا جواب دیا---" وہ خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہنے لگا۔ "مَیں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن میرا اندازہ ہے کہ یہ خط شہزادی کا ہے۔ تمہارا اس سے کیا ناتا ہے' مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر مَیں پوری ایمانداری سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم خود پہ ہی نہیں' کسی اور پہ بھی ظلم کر رہے ہو--- کچھ بھی ہے' تمہیں کم از کم خط تو پڑھنا چاہئے۔ جواب دو یا نہ دو' یہ تمہاری مرضی---"

شہزادہ سوچ میں پڑ گیا' سلاخوں سے باہر کھلے آسمان پہ اڑتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑوں کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"نوری! کچھ بادل برسنے کے لئے ہوتے ہیں اور کچھ محض اڑنے اور دیکھنے کے لئے--- مَیں بھی جانتا ہوں کہ یہ خط شہزادی کا ہے اور اس کے اندر کیا لکھا ہے' وہ بھی جانتا ہوں--- شہزادی بھی ایک اڑُنے اور دیکھنے والا بادل ہے۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "شاید تم سمجھتے ہو کہ مَیں شہزادی کا عاشق ہوں--- نہیں' مَیں شہزادی کا عاشق نہیں۔ مجھے تو اس کے روپ میں ایک ایسی ہستی نظر آئی ہے جو اس دنیا میں موجود نہیں' مر چکی ہے--- ایک گڑیا! جس کا مَیں باؤ تھا--- شہزادی کے من میں کیا ہے' مَیں ٹھیک سے نہیں جانتا۔ وہ جو ہے' جس ماحول میں ہے وہ سب میرے تصوّرات اور سوچوں کی نفی ہے اور پھر مجھے اپنی حیثیت اور اپنے وسائل کا اندازہ ہے' یہاں جیل میں جب مَیں اپنی ہی اچھائی برائی سوچنے کا اہل نہیں تو اس کے بارے میں کیوں سوچوں؟--- یہ ضرور ہے کہ مَیں اس کی برائی نہیں سُن سکتا---" پھر وہ آہستہ سے کہنے لگا۔ "--- اور نہ اسے اس ماحول میں دیکھنا چاہتا ہوں جس میں وہ ہے۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ مَیں یہاں اسی کی وجہ سے ہوں' اس ذلیل باجوے نے میرے سامنے اس کی توہین کی تھی' مَیں خود پہ قابو نہ رکھ سکا۔ پھر جو ہوا' تم اس سے اچھی طرح واقف ہو۔ میرے اس جذبے کو تم کچھ بھی کہہ لو' مَیں نے سب کچھ تمہیں بتا دیا ہے---"

نوری نت نے ایک لمبی سی "ہوُں" کی' کچھ دیر سَر کھجُانے کے بعد بولا۔

"اگر تم مناسب سمجھو تو یہ خط پڑھ لو' پھر میرے خیال میں پڑھنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔"

شہزادے نے خط کھولا۔

"شہزادے! جاننا تو میں بہت کچھ چاہتی ہوں مگر فی الحال یہ بتادو کہ میرے پاؤں دباتے وقت تم رو کیوں رہے تھے' تمہارے ہاتھ لرز کیوں رہے تھے--- پھر میری ہی وجہ سے جو دوسرا واقعہ ہوا (میرا اشارہ تم سمجھ گئے ہو گے) اور جو پریشانی اور مصیبت تم نے اپنے سر لی اس کے پیچھے کون ساجذبہ تھا--- اس کے بعد جیل میں تم نے جو ہنگامے وغیرہ کئے (یہ نہ پوچھو کہ مجھے کیسے معلوم ہوا) وہ کیوں کئے' میرا تم سے کیا ناتا ہے' تم کیا چاہتے ہو؟--- مَیں جو کچھ ہوں' دنیا بھی جانتی ہے اور تم بھی' تم بظاہر ایک مالشیئے ہو' یہ سب جانتے ہیں مگر اس کے علاوہ بھی تم کچھ ہو جو فی الحال مَیں نہیں جانتی۔ پہلے دن سے آج تک مَیں عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کسی پل چین نہیں' کئی بار تم سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی اور تم نے میرے کسی خط کا جواب دینا بھی مناسب نہ سمجھا اور نہ ہی کوئی پیش رفت کی۔ تمہاری یہ دانستہ بے رُخی اور بے نیازی میری سمجھ سے بالا تر ہے۔ ادھر یہ حال کہ کام دھندا بند اور من مرگیا ہے' جن پاؤں پہ تمہارے آنسو گرے وہ گھنگھروؤں کے بوجھ سے آزاد ہو گئے۔ بازار کے ماحول سے بیزار' ماں کی سختیوں اور دھمکیوں کا نشانہ' دماغ ڈل اور صحت برباد ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ صرف تم ہو تو تم میرے کیا ہو' کون ہو؟--- اگر اس خط کا جواب نہ ملا تو یہ میرا آخری خط سمجھنا۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہو' اس پہ میرا اختیار نہ ہو گا۔ میں ذہنی اور جسمانی طور پہ ایک مُردے سے بھی زیادہ بدتر ہو چکی ہوں۔ میری ماں مجھے راہ راست پہ لانے کی ہر ممکن کوشش کر چکی ہے مگر اب شاید اسے اپنی ناکامی کا احساس ہو چکا ہے--- مَیں تو کسی مسیحا کی منتظر تھی جو مجھے اس آلودگی سے نجات دلاتا' کسی خضر کی متلاشی تھی جو کم از کم سیدھی راہ دکھلاتا۔ تمہاری صورت میں مجھے یہ سب کچھ ملتا ہوا نظر آیا' مجھے اپنی دعائیں مستجاب ہوتی ہوئی دکھائی دیں مگر اب تمہاری پُراسرار خاموشی اور بے تعلقی کو کیا نام دوں؟--- ایک طرف تو تم میری ہلکی سی توہین برداشت نہیں کر سکتے اور دوسری جانب میرا مُردہ خراب ہو رہا ہے تو تمہارے کانوں پہ جوں نہیں رینگتی--- ان حالات کے پیش نظر ماں نے مجھے شیخ صاحب کے ہاں

فروخت کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے' وہی شیخ صاحب جنہیں تم میرے ساتھ دیکھ چکے ہو' جن کی بیوی بقید حیات ہے۔ دو جوان بیٹیاں اور ایک بیٹا موجود ہے۔ چاول صاف کرنے کے تین کار خانے ہیں' بیس مربعہ زمین کا مالک کچھ عرصہ بعد میری زندگی کا بھی مالک ہو جائے گا' میرے باپ سے بڑی عمر کا یہ شخص میری ماں کا گرویدہ بھی رہ چکا ہے۔ اب مَیں اپنی ماں کو کیا کہوں کہ ماں تو ماں ہی ہوتی ہے' چاہے وہ میری ماں جیسی ماں ہی کیوں نہ ہو--- مَیں اپنے باپ کو بھی جانتی ہوں جو اب زندہ نہیں ہیں' خوش قسمت تھے جو ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے ورنہ شاید انہیں زندہ رہ کر بھی کئی بار مرنا پڑتا مگر میرے دادا ابھی زندہ ہیں۔ بڑے نام' عزت و وقار والے--- مگر میرے وجود اور ناتے سے بے خبر ہیں۔ میرے پاس اپنے مرحوم والد کی تصویریں' خط اور چند کپڑے بھی موجود ہیں۔ چند ثبوت بھی کہ مَیں ان کی بیٹی ہوں مگر اپنی زبان سے مجھے بیٹی کہنے والا باپ موجود نہیں۔ وہ مجھے میری ماں کی کوکھ میں رکھ کر خود قبر کی کوکھ میں اُتر گیا۔ مَیں اگر اس کی منکوحہ بیوی کے ہاں پیدا ہوتی تو سیدزادی کہلاتی مگر ایک غیر منکوحہ طوائف کے ہاں پیدا ہوئی تو حرامزادی کہلائی اور اس میں میرا کیا قصور؟--- میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون میرے لئے بہت بڑا عذاب ہے' شاید اسی وجہ سے مَیں آج تک اس ماحول سے مانوس نہ ہو سکی۔ اس گندگی اور غلاظت میں رہنے کے باوجود کوئی نادیدہ طاقت میری حفاظت کرتی رہی۔ میری ماں نے مجھے لاکھ آلودہ کرنا چاہا مگر میرے خدا نے مجھے ہربار بچایا' میرا دامن عفت پاک صاف رہا۔ میرا ظاہر تو سب نے دیکھا' باطن کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ مَیں کواڑ مضبوطی سے بند رکھے اور پہلی دستک تمہارے آنسوؤں نے دی' آپ ہی کواڑ کُھل گئے۔ اب اگر تم ہی غائب اور بے خبر ہو جاؤ گے تو میری ماں والی داستان پھر دہرائی جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ پھر ایک حرامزادی سے کئی حرامزادیاں جنم لیں۔ اس سے پیشتر کہ یہ سلسلہ دراز ہو' اسے حلال زادی بننے میں مدد دو--- ستم ظریفی یہ کہ سب مجھے شہزادی کہتے ہیں مگر مَیں خود کو شاہ زادی کہتی ہوں۔ ایک سیّد کی بیٹی' ایک شاہ صاحب کی بیٹی! دادا کا نام پتہ لکھ رہی ہوں لیکن وہ شاید کسی مجبوری کی وجہ سے مجھے قبول نہ کریں' ہو سکتا ہے وہ اپنے مرحوم بیٹے کی اس حرکت سے بے خبر ہوں۔ اگر مناسب سمجھو تو ان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرو' شاید کوئی بہتری کی صورت نکل آئے--- آنے والے چند دنوں میں اگر

کچھ کر سکتے ہو تو کر لو' بعد میں شائد اس کی ضرورت پیش نہ آئے۔

تمہارے جواب کی شدت سے منتظر "شلہ زادی"

شہزادے نے خاموشی سے خط نوری نت کی جانب بڑھا دیا' خط پڑھنے کے بعد نوری نت دیر تک خلاؤں میں گھورتا رہا۔

"شہزادے یار! مجھے معاف کر دے' مَیں تجھے غلط سمجھتا رہا---" وہ اپنی گیلی آنکھیں آستین سے پونچھتا ہوا اس کے قریب آگیا۔ "بول' اس کا کیا جواب دے گا؟--- دیکھ شہزادے! مَیں نے بڑی دنیا دیکھی ہے' خاص کر ان بازار والیوں سے خوب واقف ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہ لڑکی سچی ہے' اس کی رگوں میں شریف خون دوڑ رہا ہے' اس کے خیالات بڑے پاکیزہ ہیں۔ اس خط کا ایک ایک لفظ اس کی پاک دامنی اور شرافت کی گواہی دے رہا ہے اور تمہارے روپ میں اس کو ایک نجات دہندہ دکھائی دیا ہے--- ایک ایسا انسان جس نے اس کے ظاہر کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا' اس کے باطن میں اُتر گیا' اس کی عزتِ نفس کی خاطر جان کی بازی لگا دی--- شہزادے! کٹی پتنگ کو لُوٹنے والے بہت ہوتے ہیں' قدرت نے اگر اس کٹی پتنگ کی ڈوری تمہارے ہاتھ میں تھما دی ہے تو اسے لُوٹنے کھسُوٹنے والوں سے بچالو---"

شہزادہ جذبات سے عاری پتھر سا چہرہ ہتھیلی پہ ٹکائے سلاخوں سے باہر سنگلاخ تنگ و تاریک کوٹھڑیوں کو دیکھ رہا تھا' اِک لمبی سی "ہُوں" کر کے بولا۔

"نوری یار! بعض جذبے اور خواہشیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی رُخ نہیں ہوتا' منزل نہیں ہوتی' نام نہیں ہوتا۔ انہیں انسان صرف اپنے وجود میں محسوس کر سکتا ہے' چاہے بھی تو بیان نہیں کر سکتا ہے۔ یہ معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے--- شہزادی جو بھی ہے' جیسی بھی ہے' کیسی بھی ہے' مجھے اس سے کوئی واسطہ نہیں لیکن ایک بات ضرور ہے کہ مَیں اس کی توہین برداشت نہیں کر سکتا' اس کو دُکھی اور پریشان نہیں دیکھ سکتا--- تم بتاؤ' ان حالات میں' مَیں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"بتاؤ' ہم کس طرح اس کی مدد کر سکتے ہیں---؟" شہزادے نے اپنا سوال دہرایا۔

"شہزادے! کئی طریقے ہیں--- کہو تو یہیں بیٹھے بیٹھے اس شیخ کے بچے کا کام کر دیں۔ اس کا بیٹا' بیٹی اغوا کروا دیں یا پھر شہزادی کو کسی محفوظ ٹھکانے پہ پہنچوا دیں---"

"نہیں یار! حماقت کی باتیں مت کرو' کوئی شریفانہ اور محفوظ طریقہ ڈھونڈو--- میرا خیال ہے کہ اس کے دادا کو خبر کرنی چاہئے۔ وہ اثر و رسوخ والے بندے ہیں' خود ہی کوئی مناسب کارروائی کر لیں گے---"

"بات تو ٹھیک معلوم ہوتی ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ وہ اسے قبول ہی نہ کریں یا اپنی بدنامی کے خوف سے کوئی پیش رفت ہی نہ کریں--- نوری نت نے خدشہ ظاہر کیا۔

"ویسے کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ پھر بھی اگر کوئی راستہ نہ نکلا تو پھر ہم اپنی کارروائی کریں گے۔"

شام سے ذرا پہلے وہی ملازم آگیا۔ شہزادے نے اسے ٹٹولا کہ یہ خط کس طرح تمہیں ملا؟ وہ تو پیشہ ور مخبر تھا' نہایت ڈھٹائی سے بولا۔

"سرکار! ہم تو تابعدار قسم کے آدمی ہیں' پیسہ لے کر کام کرتے ہیں لیکن ایمانداری سے--- ذرائع بتانا میرے پیشے کے خلاف بات ہے۔ کام صرف خط پہنچانا اور جواب لے کر جانا ہے۔ آپ جواب دیں' محفوظ طریقے سے وہاں پہنچ جائے گا' یہ گارنٹی ہے۔"

شہزادے نے پیغام لکھا--- پیغام پہنچ گیا لکھا تھا مناسب یہی ہے' کسی طریقے سے شیخ صاحب والے معاملے کو ٹالو لیکن کسی کو محسوس نہ ہو۔ ہم آپ کے دادا صاحب سے رابطہ کر رہے ہیں۔ اپنے آپ کو سنبھالو' اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا' انشاء اللہ چند دنوں تک کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا' اللہ اور ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمارے پیغام کی منتظر رہو--- پھر اسی مخبر کے ہاتھوں ایک پیغام شاہ صاحب کو بھی پہنچا دیا۔ دوسرے روز وہ اپنی بیٹھک میں پیغام پڑھ رہے تھے۔ چھوٹے صاحبزادے اپنے بزرگ والد کے چہرے پہ بدلتے رنگ دیکھ رہے تھے' پیر صاحب نے رعشہ زدہ ہاتھوں سے بھاری فریم کو عینک اتار کر تپائی پہ رکھی اور خط بیٹے کی جانب بڑھا دیا۔

"جناب پیر صاحب! السلام علیکم۔

میں ایک قیدی ہوں' پیشے کے لحاظ سے ماشیا--- اور آپ کا ہمدرد اور خیر خواہ ہوں--- شاید آپ کے علم میں نہ ہو کہ آپ کے مرحوم بیٹے کی ایک بیٹی جس کا نام شہزادی ہے' تاجی ملتانی نام کی ایک طوائف کی تحویل میں ناچ گانے کا دھندا کرتی ہے۔ یہ عورت سولہ اٹھارہ برس پہلے آپ کے بیٹے کی محبوبہ رہ چکی ہے۔ شہزادی پڑھی لکھی'

باخلاق' باعصمت اور باشعور لڑکی ہے۔ اپنے مرحوم باپ اور آپ کے متعلق پوری طرح با
خبر ہے اور ثبوت کے طور پہ اس کے پاس اپنے باپ کی تصویریں' کپڑے' خط اور بہت سی
چیزیں موجود ہیں۔ آپ اگر اِک نظر اس کو دیکھ لیں تو خود ہی گواہی دیں گے کہ یہ آپ کا
خون ہے' ہُو بہُو اپنے باپ کا ناک نقشہ رکھتی ہے--- شہزادی بُری طرح اپنی ماں کی
گرفت میں پھنسی ہوئی ہے۔ تاجی نے اسے اپنے بڑھاپے کا سہارا بنا رکھا ہے مگر شہزادی
اس ماحول سے متنفر ہے۔ اب وہ باشعور ہے' اپنے بھلے بُرے کی تمیز رکھتی ہے اور اس
گندے ماحول سے نکلنا چاہتی ہے--- آپ جاننا چاہیں گے کہ اس نے پہلے خود ہی آپ
سے رابطہ کیوں نہ کیا تو اس کا جواب وہ خود ہی بہتر طور پر دے سکتی ہے' میرے خیال میں
وہ آپ کی عزت کی خاطر ایسا کرنے سے گریز کرتی رہی--- مَیں کوئی نیک یا اچھا انسان
نہیں' بڑا معمولی سا آدمی ہوں لیکن اسے اپنی بہن کی طرح سمجھتا ہوں' تفصیل لکھنے یا اپنے
متعلق کچھ زیادہ لکھنے کا وقت نہیں۔ اب بھی شاید آپ کو زحمت نہ دی جاتی لیکن حالات
ایسے ہو گئے ہیں کہ آپ کو باخبر کرنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ تاجی اپنی بیٹی کا بدلتا ہوا رویہ دیکھ کر
اسے ایک عیاش مگر مالدار بیوی بچوں والے صنعت کار کے ہاتھ بیچ رہی ہے۔ ایسے میں
شہزادی نے بصد مجبوری مجھ سے مدد چاہی ہے اور مجھے آپ کے متعلق تمام ضروری
معلومات فراہم کی ہیں۔ مَیں جیل میں بند ہوں' بے وسیلہ اور بے حیثیت آدمی ہوں۔
میری یہ قید بھی شہزادی کی عزتِ نفس بچانے کی وجہ سے ہے۔ مَیں نے ان حالات میں
ضروری سمجھا کہ حالات کی سنگینی سے آپ کو مطلع کرو' میرے ساتھ میرا ایک ساتھی نوری
بھی اس کارِ خیر میں شامل ہے--- چونکہ وقت بہت کم ہے اور ادھر تاجی تمام معاملات طے
کر چکی ہے اس لئے آپ اگر چاہیں تو اپنے خون کے تقدس کو مزید خراب ہونے سے بچ
سکتے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہیں تو جیل میں ملاقات کر سکتے ہیں--- حالات کی سنگینی او
وقت کی کمی کا خیال فرمایئے گا۔

آپ کا خیر خواہ' شہزادہ مندراں والا

دوسرے روز اس کی ملاقات آ گئی مگر یہ ملاقات وی آئی پی ٹائپ کی تھی۔ پیر صاحب
بڑے اثر و رسوخ اور دینی دنیاوی حیثیت کے مالک تھے' یہاں جیل کے عملے میں بھی ا
کے کئی ایک مرید اور عقیدت مند تھے۔ پیرانہ سالی کے باوجود وہ اپنے بیٹے اور ایک

ملازموں کے ساتھ آئے تھے۔ ملاقات کا انتظام دفتر کے ایک علیحدہ کمرے میں کیا گیا'
افسران بچھے جا رہے تھے' خورد و نوش کا انتظام تھا لیکن ایک بات سب ہی محسوس کر رہے
تھے کہ شہزادے اور نوری نت جیسے بے حیثیت قیدیوں سے ملاقات کے لئے بہ نفس نفیس پیر
صاحب کا تشریف لانا کیا معنی رکھتا ہے مگر پوچھنے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ شہزادہ اور
نوری آئے تو دروازہ بند کر دیا گیا' بغیر کسی تمہید کے وہ فرمانے لگے۔

"برخوردار! تم بڑے عظیم انسان ہو' تمہارے متعلق مَیں نے تمام معلومات حاصل کر
لی ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کارِ خیر کے لئے جزائے خیر عطا فرمائے--- تم نے جو معلومات
ہمیں بہم پہنچائی ہیں' ہم آپ دونوں کے بے حد مشکور ہیں اور ہمیشہ دُعاگو رہیں گے۔
ہمارے مرحوم بیٹے سے جو نادانیاں سرزد ہوئیں وہ کسی لحاظ سے بھی قابلِ تحسین نہ تھیں
مگر چونکہ انسان خطا کا پتلا ہے اور ہم میں کوئی بھی فرشتہ نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ سے
دُعا اور التجا ہے کہ ہمارے سب کے گناہ معاف کرے اور ہمیں صراطِ مستقیم پہ چلنے کی توفیق
عطا فرمائے اور خاص طور پہ ہمارے مرحوم بیٹے کی اس لغزش کو معاف فرمائے جس کی وجہ
سے ہم آج بہت شرمسار ہیں۔ اس بچی کے بارے میں جو ہم سے کوتاہی ہوئی' اس پہ
شرمندہ ہیں لیکن اگر یہ سب کچھ پہلے ہمارے علم میں آ جاتا تو شاید آج یہ نوبت نہ
آتی--- بہرحال' جو ہونا تھا ہو گیا' شاید اس میں بھی اللہ کی طرف سے کوئی آزمائش ہو۔
وقت کی کمی کے پیش نظر مَیں اب اصل معاملے کی جانب آتا ہوں--- ہم ہر قیمت پہ اپنی
بچی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور چونکہ ہم ان لوگوں کے طور طریقوں اور ٹھور ٹھکانوں سے
واقف نہیں ہیں اس لئے آپ ہی ہمیں کوئی مشورہ دیں۔ ہم سامنے بھی نہیں آنا چاہتے'
نہ ہی اس کی والدہ کے علم میں یہ بات لانا مناسب سمجھتے ہیں کہ یہ بچی ہم حاصل کرنا چاہتے
ہیں۔ بچی کے باعزت مستقبل کی خاطر ہم کوئی ایسا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جس میں ہم
سب کی عزت بھی محفوظ رہے اور کسی غیر شرعی' غیر قانونی کارروائی کی ضرورت بھی پیش
نہ آئے' ایسے طریقہ کار کے لئے اگر روپے پیسے سے بھی کام نکل سکتا ہو' تو اس کے لئے
بھی ہم حاضر ہیں---"

نوری بولا۔ "سرکار! میرے خیال میں یہ کیس پولیس کے ذریعے حل کیا جا سکتا ہے
لیکن اس میں آپ بھی سامنے آ جائیں گے---"

صاحبزادے بولے۔ "ہم کوئی بھی ایسا طریقہ استعمال نہیں کریں گے--- آپ یہ بتائیں کہ لڑکی سے ملاقات ہو سکتی ہے علیحدگی اور تنہائی میں---؟"

شہزادہ سر اٹھا کر بولا۔ "پیغام بھیجا جا سکتا ہے--- مجھے یقین ہے کہ ایسا ممکن ہے۔"

پھر وہ پیر صاحب سے مخاطب ہو کر بولا۔ "پیر صاحب! آپ نے روپے پیسے کی بات کی ہے--- سرکار! آپ کو ایک دھیلا بھی خرچ کرنا نہیں پڑے گا۔ اللہ کی مہربانی اور آپ کے قدموں کی برکت سے یہ کام بخیرو خوبی ہو جائے گا۔ آپ ایک دو دن ہمیں مہلت دے دیں' میں آج ہی فوراً" پیغام بھیجتا ہوں۔"

پیر صاحب نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور لاہور میں ہی اپنے ایک مرید کے ہاں قیام کا بندوبست کر لیا' جیل میں شہزادے سے دن رات رابطے کا انتظام بھی کر دیا۔

شہزادی کا شام سے پہلے پہلے ہی مختصر سا جواب آ گیا کہ کل صبح دس بجے وہ جیل کے باہر سامنے میڈیکل اسٹور کے پاس کالے برقعے میں منتظر رہے گی' ہاتھ میں سبز رنگ کی پلاسٹک کی ٹوکری ہو گی۔ پیر صاحب کو اسی وقت مطلع کر دیا گیا--- دوسرے روز دس بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ اندھے شیشوں والی پجارو میڈیکل اسٹور کے پاس آ کر رکی۔ شہزادی اسٹور سے ہٹ کر بس سٹاپ کے قریب کھڑی تھی۔

صاحبزادہ صاحب نے دروازہ کھولا۔

"شہزادی بیٹی! اندر آ جاؤ---"

اندر داخل ہوتے ہی وہ اپنے دادا کے گلے لگ کر رونے لگی۔ آدھا فرلانگ دور شہزادہ اور نوری سجدے میں پڑے ہوئے تھے' جائے نماز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

☆☆

مالشیا' پہلوان کو فارغ کر کے پھر اس کے سر پر کنستر بجا رہا تھا۔ شہزادہ منہ لپیٹے آنسو بہا رہا تھا--- کہتے ہیں کہ تاجی' شہزادی کے جانے کے بعد نیم پاگل سی ہو گئی' حالت زیادہ بگڑی تو پاگل خانے پہنچا دی گئی۔ شیخ صاحب آج کل تاجی کے برابر والے بالا خانے پہ آتے جاتے ہیں--- نوری نت پچھلے سال حج کر آیا ہے' محلے کی نماز کمیٹی کا کرتا دھرتا ہے' مولود شریف اور نعت خوانی کا انتظام کرتا ہے۔ ماتھے پہ محراب اور چہرے پہ ریش مبارک کی بہار ہے۔ کئی بار شہزادے سے کہہ چکا ہے کہ مالش کا دھندا چھوڑ کر کوئی اور معقول سا کام کر لو

مگر وہ ہر بار جواب دیتا ہے کہ اسی دھندے کی مہربانی سے مجھے میری گڑیا ملی ہے تو اسے کیسے چھوڑ دوں؟--- شاہ صاحب کا انتقال ہو چکا ہے' صاحبزادہ صاحب اب ان کی گدی پہ ہیں۔ شہزادی اپنے شوہر کے ساتھ سعودی عربیہ میں ہے' اس کا شوہر وہاں مدینہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہے مگر افسوس! کہ شہزادہ اپنے استاد کی کسی نصیحت پہ عمل نہ کر سکا۔ سگریٹ چرس سب کچھ پیتا ہے۔ شادی کے نام سے بدکتا ہے' مست ملنگ سا کرائے کی کوٹھڑی میں پڑا رہتا ہے--- صحت' تندرستی' رعنائی کا وہی عالم ہے' بازار سے گزرتا ہے تو کئی شہزادیاں سانس روکے اسے تکتی ہیں کہ کس دن یہ کنستر بجاتا سیڑھیاں چڑھتا ہے اور وہ نیچے اترتی ہیں۔

✿✿✿

صبح صبح مَیں فیض قندھاری والوں کی دوکان پر لسی پینے جا رہا تھا کہ ان کی دوکان کے پاس ہی سٹاپ پہ نو نمبر ویگن کا کنڈیکٹر "ٹیسن ٹیسن" کی آوازیں لگا رہا تھا۔ صبح سویرے سواریوں کی کمی ہوتی ہے۔ کنڈیکٹر سواریوں کی کھوج میں آس پاس کی گلیوں پہ دُور دُور تک نظریں رکھتے ہیں اور ہر دکھائی دینے والا انہیں "سواری" ہی دکھائی دیتا ہے۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ وہیں سے جلدی جلدی قدم اٹھانے کے اشارے کرنے لگا۔ سڑک پہ پہنچ کر مَیں رک گیا۔ ٹریفک اور کیچڑ' دونوں سے بچ بچا کر مجھے سڑک پار کرنی تھی۔ شلوار کے پائنچے اوپر چڑھا کر قدم بڑھایا ہی تھا کہ وہ مہربان کنڈیکٹر لپک کر میرے پاس آ گیا' میرا بازو تھامتے ہوئے اس نے سڑک پار کرا دی۔ صبح دَم طبیعت بڑی خوش ہوئی کہ ہر طبقے اور ہر جگہ اللہ کے نیک خُو بندے موجود ہیں اور کون کہتا ہے کہ انسانیت ختم ہو گئی یا چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں رہا۔۔۔ مَیں اسے "جزاک اللہ" کہنے ہی والا تھا کہ اس نے دوسرے بازو سے دباؤ ڈالتے ہوئے مجھے ویگن پہ چڑھا دیا۔ جبکہ مَیں تو پاس والی دوکان پہ لسی پینے آیا تھا اور یہ بھلا انسان مجھے ویگن پہ لاد رہا ہے۔ سانس الٹ پلٹ تھی' بات کرنے کا بھی یارا نہ تھا' بس مَیں اُترنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ ڈرائیور نے ویگن بڑھا دی۔ ویگن خالی' مَیں اکیلا۔ خالی خالی نظروں سے کنڈیکٹر کو دیکھ رہا تھا جو باہر لٹکا ہوا "ٹیسن ٹیسن" کے آوازے لگا رہا تھا۔۔۔ اگلے سٹاپ شاہ نور پہ اُترنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ ڈرائیور صاحب نے ڈیک کا بٹن دبا دیا۔۔۔ اپنی میڈم کسی آموں کے باغ میں کچے پکے آم' اَمبیاں کھانے کے شوق میں تشریف لے جاتی ہیں۔ ابھی دو چار آم ہی چوسے ہوں گے کہ اُوپر سے جوان گھبرو

سار کھوالا آ جاتا ہے یا وہ بدمعاش جان بوجھ کر کہیں ادھر ادھر چھپا بیٹھا ہوتا ہے کہ کوئی آم چوسنے والی آئے تو وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑے۔ بہرحال' بقول میڈم وہ آم مسروقہ سمیت بڑے ہاتھوں پکڑی جاتی ہیں۔ اب وہ دہائی رَولا ڈال کر دوسروں کے باغوں میں چوری کے آم چوسنے والیوں کو بتا رہی ہیں کہ اس بے شرم رکھوالے نے ان کے ساتھ کیسا ناروا سلوک کیا۔۔۔ اسی ٹائپ کا ایک اور گیت بھی بعد میں سنایا گیا جس میں ان کا محبوب بڑی آہستگی اور شرافت سے ان کا نام لیتا ہے اور یہ مارے شرم اور حیا اسی لمحے بلکہ اسی جگہ پہ فوت ہو جاتی ہیں۔ ایک اور اسی قبیل کا گانا بھی۔۔۔ جس میں کسی راشی پٹواری کا لوفر بدتمیز لونڈا' بڑی بے شرمی سے انہیں آنکھیں مارتا ہے جو انہیں بے حد ناگوار گزرتا ہے' ایک اور بھی جس میں ویل کی قمیض کا ذکر ہے' جس کا کپڑا انتہائی ناقص اور سڑا ہوا ہے اور ذرا سی انگڑائی لیتے ہی مسک مسک جاتا ہے۔

مَیں آموں والے گانے کے انتروں کا اردو ترجمہ کرنے میں ایسا مصروف تھا' کہ اترنا بھول ہی گیا۔ جب شاہ نور سے چند سواریاں بیٹھیں تو مجھے اور ذرا پرے کھسکنا پڑا' سکیم موڑ سے بیٹھنے والوں نے مجھے مزید پیچھے دھکیل دیا تھا۔ اب سوچا کہ یتیم خانے اتر جاؤں گا' اسی بہانے باباجی قبلہ کی صبح صبح زیارت بھی ہو جائے گی اور دن بھر تقویت رہے گی۔ یتیم خانے سے پٹھان بمع اپنے بیچنے والے سامان کے حملہ آور ہو گئے۔ اترنے والا کوئی نہ تھا' چڑھنے والوں نے چڑھائی کر کے مجھے بالکل آخری کونے میں کھڈے لائین لگا دیا۔ بیٹھنا کھڑے ہونا تو درکنار' سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ گانا بھی بند کر دیا گیا' شاید گانا لگانے کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اب کنڈیکٹر کرایہ جمع کرنے لگا' میں آخری کونے میں پیک ہوا دبکا پڑا تھا۔ مجھ تک اس کی رسائی نہ تھی' نہ ہی وہ مجھے دیکھ سکتا تھا۔ مجھ سے اگلی سیٹ والے نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔

"باباجی' کلینڈر کرایہ مانگ رہا ہے۔"

"ٹیسن" یعنی سٹیشن پہ پہنچے تو چوک میں ویگن خالی ہو گئی۔ مَیں وہیں کونے میں آرام سے بیٹھا تھا۔ کنڈیکٹر بولا۔

"باباجی' ٹیسن آگیا جے۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے پُتر کہ اسٹیشن پہنچ گئے ہیں۔" مَیں نے بڑی رسان سے جواب دیا۔

"اترو' بزرگو! جلدی کرو۔ ویگن واپس سَیدپور جائے گی۔"

"پُتر' مجھے بھی واپس سَیدپور ہی جانا ہے۔" مَیں نے اسے کرایہ دیتے ہوئے کہا۔

ڈرائیور ویگن آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "وَڈیو' سویرے سویرے ٹیسن دن سیر کرن لئی نکلے او؟"

"بیٹا! مَیں تو فیض قندھاری کی دوکان پر اَچھے پہلوان سے پتلی نمکین لسی پینے نکلا تھا۔ اس نیک بچے نے سڑک پار کرائی' بڑے خلوص سے ویگن میں بٹھایا تو مَیں نے بھی اس کے خلوص کو ٹھکرانا مناسب نہ سمجھا' صبح صبح آپ کی بوہنی کا ٹائم تھا۔ سوچا کہ چلو' اسٹیشن تک سیر ہی سہی۔ آپ بچوں کا دل بھی خوش ہو جائے۔"

وہ دونوں مجھے بِٹ بِٹ تکنے لگے۔ پھر ڈرائیور کنڈیکٹر سے کہنے لگا۔

"اوئے بگے! بزرگوں کا کرایہ واپس کراوئے۔۔۔ کھوتیا! سواری سے پوچھ لیا کر کہ لسی پینے جا رہے ہو یا ٹیسن جانا ہے۔"

بیس منٹ بعد مَیں فیض قندھاری کی دوکان پر نمکین پتلی لسی پی رہا تھا۔

اس دن صبح ہی صبح مجھے اس آم والے گانے میں آم نے اٹرکٹ کیا تھا۔ گدھوں کے علاوہ آم سب ہی پسند کرتے ہیں۔ آج کل تو سیاست بھی آموں کے حوالے سے چل رہی ہے اور سیاست ہی پر کیا موقوف' یہ رسیلے اور میٹھے آم تو تصوّف' اَدب اور ہر قابلِ ذکر شعبۂ حیات میں اپنی لذت آفرینیاں اور خوشبوئیں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ ہر کوئی ان کی تعریف میں رطب اللسان دکھائی دیتا ہے۔ غریب' امیر' فقیر' بادشاہ' صوفی' فلسفی' مفکر' ادیب' شاعر' محب محبوب' لڑکیاں بالیاں' طوطے' کوئلیں' شامائیں' گلہریاں۔ آم کا درخت' تنے' پتے' بور' پھول' پھل سب کو من بھاتے ہیں۔ عجیب امرت دھارا قسم کا پھل ہے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام' غذا کی غذا' دوا کی دوا۔ حکماء کہتے ہیں کہ آم خونِ صالح پیدا کرتا ہے' قوت بخش اور مفرح قلب و دماغ ہے اور چہرے بشرے پہ شادابی لاتا ہے۔ اس کے درخت کی گھنی چھاؤں بڑی فرحت بخش اور سکون آور ہوتی ہے۔ پرندے اس کی شاداب شاخوں پہ خوش ہو کر نغمہ ریز ہوتے ہیں' گھونسلے بنا کر خوب انڈے بچے دیتے ہیں۔ کوئل' کوکو کا ریاض کرتی ہے تو طوطے' طوطیوں کے ساتھ خوش فعلیوں میں مصروف رہتے ہیں۔ بور اور شگوفوں کے دِنوں میں نکہت و نگہت کا ایک سیلاب امڈا ہوتا ہے جو قلب

وجود میں ترنگ پیدا کرتا ہے۔ پرندوں کی مستیاں دیکھنے والی ہوتی ہیں' ڈالیوں پہ جھولے پڑتے ہیں' سکھیاں آپس میں چہلیں کرتی ہیں' چھیڑخانیاں ہوتی ہیں۔ ساون ملن کے گیت' ڈھولے' ٹپّے' ماہیے۔ 'لکن میٹیاں' چھُواچھوائی--- کوکلا شپاکو جمعرات آئی اے' جہڑا اگے پیچھے تکے اوہدی شامت آئی اے--- چاہت بھری منتظر نظریں' چاہے جانے کی خواہش۔ کسی بے وفا کا انتظار' امنگیں' اداسیاں' بے قراریاں--- ؎

امبوا کی ڈاریوں پہ جھولنا جھولا جا
اب کے ساون تو بلم گھر آ جا

آموں کے درخت اور امریاں کیسی کیسی کیفیتوں' جذبوں اور قدروں کی امین ہوتی ہیں۔ بور کے بعد کیریاں پڑتی ہیں کچی کچی' کھٹی کھٹی' جن کو پروں اور پراندوں والی طوطیاں کیسے کچر کچر کھاتی ہیں۔ کچھ طوطے بھی ہوتے ہیں جو کھاتے ہیں۔ ایک رکشے کے پیچھے شعر لکھا تھا ؎

ابھی طفلِ مکتب ہو' سنبھالو اپنے جوبن کو
کہ طوطے کچے پھلوں کا بڑا نقصان کرتے ہیں

آم پیڑیا ہو' پالکے یا ٹپکے کا' اول آخر آم ہی ہوتا ہے۔ ویسے بھی آم کھانے سے مطلب ہونا چاہئے' پیڑ گننے سے نہیں کہ پیڑ گننے سے وقت اور آم دونوں ضائع ہوتے ہیں۔ آم خرید کر کھائے جائیں تو ترش یا لجلجے نکلتے ہیں' چوری یا ہمسائے کے درخت سے پھر پھندے کے آم بڑے میٹھے' سڈول اور تر و تازہ ہوتے ہیں۔ خصوصاً سفید داڑھیوں والے' داڑھی پہ نیپکن باندھ کر کھاتے ہیں بلکہ صرف چوستے ہیں جبکہ پنجابی بابے چوپتے ہیں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں داڑھی ہلدی کے خضاب میں مفت میں رنگی جاتی ہے۔ ایک آدھ آم کھانا' بدذوقی ہی نہیں بلکہ حد درجہ کی کنجوسی بھی ہے' کیلے کی طرح اسے بھول کر بھی کبھی اِکا دُکا نہیں کھانا چاہئے۔ اللہ کہیں سے بھیجے یا کوئی مہمان لے کر آئے تو خوب آزاربند ڈھیلا کر کے ان سے لطف اندوز ہونا چاہئے۔ شاید اسی بات پہ غالب نے کہا تھا کہ آم ہوں تو بہت سارے ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا ؎

مجھ سے پوچھو' تمہیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے

غالب چچا کے تین چار ہی تو شغل تھے۔ وقت بے وقت شعر کہنا' جب بھی موقع ملے تو ڈومینوں' بھنگنوں' بہشتنوں' بھٹیارنوں سے عشق جھاڑنا۔ ہمہ وقت مہاجنوں' دوستوں سے قرض مانگتے رہنا اور ادھار کی شراب پینا۔ آم رَب پہ مسلسل آم چوسنا' بلکہ وہ تو پیڑوں کے کچے آموں ہی پہ اسداللہ خان کی مہر لگا دیا کرتے تھے۔ چونکہ اپنے عبدالحمید عدم کی طرح ان کا مزاج بھی بلغمی تھا' شرینی کی بجائے تلخی ہی راس تھی لہٰذا اس مجبوری سے وہ ٹپکے کے آموں کا رس مٹکے کے ٹھرّے میں ٹپکا کر اس کی شیرینی مار لیا کرتے تھے۔ گٹھلیاں اکٹھی کر کے اُبلنے رکھوا دیتے' شیرہ دو تار ہونے پہ سائے میں خشک کر کے اَمرس اور چھلکوں کے ریشوں سے اَچور بناتے۔ اس طرح بنئے کا حساب برابر ہوتا۔ دُھلی دُھلائی گٹھلیاں اٹھا کر باہر گلی میں گدھوں کے لئے پھنکوا دیتے--- بتایئے' بھلا گدھے آموں کو کیوں کر پسند کریں---؟

بہادر شاہ ظفر کی تصویر میں' ان کا چہرہ دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ عالم پناہ کو طوطا پری آموں سے بے پناہ رغبت ہوگی' شاہی باغات میں ہزاروں درخت تھے اور طوطوں کی فوج ظفر موج بھی--- اپنے جان عالم واجد علی شاہ کو بھی آم پسند تھے' خاص طور پر ٹھنڈے کے شاہ رُخ آموں سے بڑا شغف رکھتے تھے' تھاتھیا کے بعد نوش فرماتے تو توڑ مشقت سے کھوئی ہوئی توانائی بحال ہو جاتی۔ مغل اعظم اکبر کو بیربل نے آموں کی جانب لگایا تھا کہ یہ پھل' پھلوں کا مغل اعظم ہے۔ ایک ہندو مورخ نے ابھی حال میں ہی انکشاف کیا ہے کہ مہابلی کے سیدھے ہاتھ میں گلاب کا پھول اور الٹے ہاتھ میں گلابِ خاص آم ہوتا تھا جسے وہ جودھابائی کے کہنے پہ چھپا کر رکھتا تھا کہ یہ بُری بات ہے' اچھے بادشاہ ایسی "آمیانہ" حرکتیں نہیں کرتے۔

ایک مرتبہ ہدایت کار لقمان نے ایک آم پارٹی کے دوران میری موجودگی میں انکشاف کیا کہ مغل اعظم کے ہدایتکار' کے آصف نے دلیپ کمار کو آموں پہ لگایا--- مَیں نے بیساختہ پوچھا۔

"کے آصف کو کس نے لگایا تھا؟"

انہوں نے بھی اسی ڈھنگ سے جواب دیا۔ "اس کی بیوی' دلیپ کمار کی ہمشیرہ نے---"

"اور اسے ---؟" میں نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"احسن خان' دلیپ کمار کے بھائی نے ---"

"احسن خان کو کس نے لگایا ---؟"

"ناصر خان' اس کے بھائی نے ---؟"

"ناصر خان کو اس جھنجھٹ میں کس نے ڈالا ---؟"

"میں نے ---" وہ بولے۔ "لو' ذرا یہ آم چکھو ---"

میرا منہ آم کی طرح لٹک گیا۔

مَیں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ بچوں کا پہلا قاعدہ یقیناً کسی آم خور نے ترتیب دیا ہوگا۔ الف' آم کے علاوہ اسے کچھ اور سوجھا ہی نہیں۔ مان لیا کہ وہ ستم ظریف پھلوں کی افادیت پہ یقین رکھتا ہوگا لیکن نہیں --- یقیناً اس کا آموں کا کاروبار ہوگا' بڑے بڑے فارم ہوں گے ورنہ وہ الف سے آڑو' آلو بخارہ' آلوچہ' آملہ' آلو' آملیٹ بھی ترتیب دے سکتا تھا۔ لیکن وجہ ہے کہ اس نے ابتدا ہی میں سارا زور آم پہ رکھا' ننھے ننھے ذہنوں میں شروع ہی آم ڈال دیا۔ ایسے ہونہار بچے بڑے ہو کر آم نہ چوسیں گے تو کیا چٹنی سے دل بہلائیں گے --- قاعدہ ترتیب دینے والے کاروباری کے باغوں میں انور راٹول نہیں ہوگا ورنہ اسے الف انور راٹول لکھنے سے کون روک سکتا تھا۔ بنارسی اور بہشتی میوہ بھی نہ ہوگا ورنہ بکری کی جگہ یہ بھی لے سکتے تھے۔

میرے ناقص خیال میں یہ قاعدہ شاہی مسجد کی امام مولانا آزاد صاحب کو ترتیب دینا چاہئے تھا۔ الف سے آزاد بھلے لکھ دیتے' آم سے تو جان چھوٹتی --- میرے اُلو باٹا قسم کے دوست سے میری اس موضوع پہ بات ہوئی۔ اس نے اپنا جاہلوں جیسا حلوا کدو برابر سر ادھر ادھر ہلا کر میرے اس خیال کی نفی کرتے ہوئے کہا۔

"قطعی نہیں' وہ الف آزاد کبھی نہ لکھتے --- بلکہ ڈ سے ڈیانا لکھتے۔"

میرا دل چاہا ایک جھانپڑ دوں لیکن یاری کے ناتے صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا۔

"ابے' اُلو باٹے! مَیں الف کی بات کر رہا ہوں اور تم "ڈ" کا ڈول ڈال رہے ہو۔ الف کی جگہ "ڈ" کیسے لے سکتا ہے؟ یہ تو حروف ہجی کا پہلا حرف ہے۔"

"مَیں بھی جانتا ہوں' اور مولانا بھی جانتے ہیں مگر اس میں قباحت کیا ہے؟--- بس

ذرا سیٹ کی تبدیلی کا تکلف ہے۔ قلم کی چٹکی سے الف اٹھائیے' "ڈ" کی جگہ پہ جمائیے اور "ڈ" کو ڈنڈا ڈولی کر کے الف کی جگہ پہ رکھ دیجئے --- باباجی! مولانا لوگوں کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں' ہزاروں توجیہیں نکل آتی ہیں۔" وہ باقاعدہ لیکچر پلانے لگا۔ "مثلاً ڈیانا میں ایک بجائے دو الف ہیں' ایک سے دو بھلے --- ڈیانا بچوں میں بڑی مقبول ہے۔ خوبصورت تھی' فوت ہو گئی --- اور آپ جانتے ہیں ہم مردہ پرست بلکہ پرلے درجے کے زن پرست ہیں۔ یہ ساری خوبیاں صرف اور صرف ڈیانا میں ہیں۔ الف آم کہتے ہوئے بھی بچے کا منہ امبی کی طرح کھٹا ہو جاتا ہے۔ اس کا دل آم کھانے کو چاہتا ہے جو کتب میں میسر نہیں ہوتا اور اس کے نتیجے میں وہ قوم کا "مستقبل" احساس محرومی کا شکار ہو جاتا ہے جو بڑے نقصان کی بات ہے۔ آپ ذرا تصور میں لائیں۔ بچے پڑھ رہے ہیں' ڈ' ڈیانا --- ڈ' ڈیانا --- مولوی صاحب بیٹھے سرمستی میں جھوم رہے ہیں۔ نہ چھڑی قریب' نہ گھُرکی' نہ ڈانٹ ڈپٹ۔ کان نہ مُرغا۔ بچے خوش اور مولوی صاحب بھی خوش۔ پھر آنجہانی ڈیانا کی روح بھی خوش ---" وہ تھوڑی خاموش رہ کر پھر لب کشا ہوا۔ "--- اور ہاں' ایک اور بات --- یہ ویسے اجتہاد کا دور ہے۔ سوچ' فکر اور اعمال میں بڑی خاطر خواہ تبدیلیاں ظہور پذیر ہو رہی ہیں۔ آپ ذرا اس موضوع پہ قلم تو اٹھائیں ---"

مَیں واقعی اٹھ کھڑا ہوا کہ اسے ایک زور کی لات جماؤں۔ وہ مجھے آمادہ پیکار دیکھتے ہوئے بولا۔

"ناراض نہ ہوں' آپ ڈ' ڈیانا کے بعد "ب" بے نظیر بھی لکھ سکتے ہیں اور "پ" سے دفع شر کے لئے پیر پگاڑا یا پاکستان بھی لکھ سکتے ہیں --- پاکستان لکھنا ہے تو نیو پاکستان چلے گا' پرانا تو پی آئی اے کے جہازوں اور اپنے زمینی جہازوں فوکروں جیسا ناکارہ ہو چکا ہے۔"

مَیں اپنی سوئی ہوئی ٹانگ کو سہلاتا ہوا واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا اور سنجیدگی سے مَیں نے آخری وار کیا۔

"کیا "الف" سے اللہ' "ب" سے بڑا' "پ" سے پاک نہیں لکھا جا سکتا ---؟"

"بالکل ہو سکتا ہے لیکن اس کا کیا بنے گا ---؟"

"کس کا ---؟" مَیں نے استفسار کیا۔

"خالی جی! "الف" سے اسلحہ، "ب" سے بم، اور "پ" سے پمپ ایکشن---"
میرے اُلّو باٹا یار نے تُرکی بہ تُرکی جواب دیا۔

"الف سے اُلّو، بے سے بیوقوف، پی سے پاگل! مَیں تمہاری یہ اسلحے والی بات نہیں سمجھا---" مَیں نے اسی لہجے میں کہا۔

وہ میرے خطابات سے مزہ لیتے ہوئے کہنے لگا۔ "آپ یہ الف اللہ والے قاعدہ چھپوا کر رائے ونڈ، بھیرہ، ڈیرہ اسماعیل، کراچی، لاہور وغیرہ بھجوا دیں، چلیں گے۔ یہ خالص دینی ادارے ہیں، قبول کرلیں گے مگر باقی ملک کا کیا کریں گے۔ اسکولوں میں مسلمانوں کے بچوں کے علاوہ عیسائی، ہندو، پارسی اور سکھوں کے بچے بھی ہیں، وہ اسے قبول نہیں کریں گے۔ آم، بکری، پنکھا، تختی، گدھا، گھوڑا سب کے سانجھے ہیں لیکن دین دھرم اپنا اپنا--- اسلام ٹھونسا ٹھانسی والا مذہب نہیں۔ آپ مذہبی تنظیموں اور جماعتوں کو دیکھ رہے ہیں، آپ ہی فرمائیں کہ یہ الف، اللہ والے قاعدے چلیں گے، ان کے بچے پڑھیں گے؟ یہ مانتے اور جانتے ہیں کہ اللہ بڑا ہے، پاک ہے۔ پڑھے کو آپ کیا پڑھائیں گے--- جو اسلحہ، بم اور پمپ ایکشن استعمال کرتا ہے وہ بھی جانتا ہے اور جو ان کے ہاتھوں مرتے ہیں، وہ بھی جانتے ہیں۔ جب دونوں مانتے، جانتے ہیں کہ الف سے اللہ ہے تو پھر الف سے اسلحے پہ ان کا ایمان کیوں پختہ ہو گیا ہے۔ مسجدوں، مدرسوں کے میناروں، دروازوں پہ یہ باریش اسلحہ بردار کیوں نمازیں قضا کرتے ہیں۔ کیا ان کے دشمن یہودی ہیں، کافر ہیں؟--- نہیں، وہ بھی ان جیسے نمازی، پرہیزگار دین دار ہیں۔ پھر جھگڑا کیا ہے؟--- جھگڑا صرف عینک کا ہے۔ ایک کا نمبر اور، دوسرے کا اور--- گولی برسانے والے کی دُور کی نظر کمزور ہے اور گولی کھانے والے کی نزدیک کی--- جس کو صاف دکھائی دیتا ہے وہ دوسرے کو صرف اس لئے کافر کہتا ہے کہ حریف کو اس جیسا صاف دکھائی کیوں نہیں دیتا--- بھائی! اس کی نظر کی عینک کا نمبر درست نہیں، درست نمبر والی عینک پہنے گا تو وہ بھی دوسرے کی طرح صاف واضح دیکھنے لگے گا، اب اتنی سی کوتاہی کی اتنی بڑی سزا تو نہ دو--- رسولؐ سب کا ایک، دین ایک۔ مل جل کر رہو، کیوں ایک دوسرے کے گلے کاٹتے ہو۔ جیسے بھی دیکھتے ہو، دیکھتے رہو۔ منظر ایک ہے، ہر ایک کی اپنی اپنی استطاعتِ بینائی ہے۔ کسی کو عید کا چاند نظر آ جاتا ہے، کوئی اچھی نظر والے کی رہنمائی سے دیکھ لیتا ہے اور کوئی بالکل ہی نہیں دیکھ پاتا۔

دوسرے، تیسرے روز کا دیکھ لیتا ہے اور کوئی چودھویں کا بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ اس نے چاند نہیں دیکھا لہٰذا اس کا وجود ہی نہیں تو یہ کس قدر احمقانہ بات ہوگی---"

بات یہاں ختم ہوئی کہ "الف" آم ہی ٹھیک ہے، اس سے کسی کا کوئی جھگڑا نہیں--- ویسے جھگڑے کا کیا ہے۔ کہیں بھی، کبھی بھی، کسی سے بھی ڈالا کیا جا سکتا ہے۔ "الف" سے "آداب عرض" بھی ہے، قبلہ خالد صاحب اگر قاعدہ مرتب کریں تو بھی "الف" سے "آداب عرض" نہ رکھیں کیونکہ دیگر "عرض والوں" کی طرف سے جوابی کارروائی کے طور پہ ڈیانا کے "ڈ" کی طرح "الف" کی جگہ لانے کا جھگڑا کھڑا ہو سکتا ہے۔ صد شکر کہ خالد صاحب "آمیٔے" نہیں ورنہ "آم عرض" زد پہ غور کرتے--- میرا بس چلے تو مَیں "الف" سے اقبال کر دوں--- پاکستان، حکیمُ الاُمّت اور آموں کے حوالے سے یہی بہترین نام ہے۔ جاوید اقبال بھی خوش اور اقبال بانو بھی خوش اور کراچی کے نادرِ روزگار مُصوّر اقبال مہدی بھی راضی۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔

علامہ اقبالؒ کی آموں سے رغبت اور نیّت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ منہ چوستے چوستے تھک جاتا، انگلیاں آم پوپلا پوپلا کرتے دُکھنے لگتیں۔ چہرہ شیرے سے لبڑا ہوتا۔ گلے کی بنیان لتھڑ جاتی، تہبند تولیہ بن جاتا۔ پیٹ جواب دے جاتا مگر نظریں مزید آموں کا سوال کرتی رہتیں اور نیّت صرف آموں پہ ہی خراب ہوتی، صرف آموں پہ اس معاملے میں وہ ٹھیٹ سیالکوٹئے تھے--- ایک دفعہ اپنے بارودخانے والے مشہور و معروف ناول نگار ایم اسلم سے فرمایا۔

"میاں! مَیں آموں کے معاملے میں بڑا ندیدہ اور بدنیّت واقع ہوا ہوں۔ یہ سامنے دھرے ہوں تو میرا سارا فلسفہ، شاعری اور خودی ودی سب کہیں غائب ہو جاتے ہیں۔ آموں کے سامنے اقبال نہیں "بالا سیالکوٹی" بیٹھا ہوتا ہے۔"

میرا اپنا تجربہ ہے کہ آم، سری پائے،..... جوتے، گالیاں اور محبت۔ ان چیزوں میں سلیقے کا کوئی دخل نہیں، نہ کوئی اصول ہے اور نہ ہی کوئی مہذبانہ وضع کردہ طریقہ۔ ذرا بھی کہیں راہ و رسمِ دُنیا کا خیال کیا، سارا لُطف غارت ہو گیا۔ یہ جھنجھوڑنے، بھنبھوڑنے، ٹھکورنے کے علاوہ جھپٹنے، پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے۔ سہلانے، چلانے، ہاتھ جوڑنے، معافی

مانگنے' رونے' مسکرانے کے مقامات ہیں۔ ان کٹھن مقامات سے وہی سرخرو گزر سکتا ہے جس نے اپنا بچپنا اور اپنے اندر کا حیوان ناخن کاٹ' منہ پہ چھکا چڑھائے اپنے ذات کی چاردیواری میں کھُلا چھوڑ دیا ہو تاکہ وہ بھی اپنے ہاتھ پاؤں سیدھے اور اپنی فطرت و جبلت کے تقاضے پورے کرلے کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی بے ضرر بے ایمانیاں' معصوم سی کمینگیاں' بھولی بھالی بے وفائیاں' خفیف سی بدعہدیاں' پیاری پیاری بے خطر لڑائیاں' عید شب برات پہ میٹھا پان' کسی کے پیکٹ سے چُرائے ہوئے سگریٹ کا کش' بھنگ کا پاپڑ' کسی دوست کی شادی پہ الٹی سیدھی لڈی' شاہی مسجد کے بہانے اس بازار سے گزرنا--- یہ سب کیا ہے؟ یہی اندر کے جکڑے ہوئے حیوان کو ذرا ہوا لگاتا ہے ورنہ یہ حبس دَم حیوان بپھر کر انسان کو اُدھیڑ کے رکھ دیتا ہے ہے' ایسا انتقام لیتا ہے کہ جاننے والے کہہ اٹھتے ہیں۔

"بندہ تے بڑا شریف سی' یقین نہیں آوندا---"

بات کہاں سے کہاں جا نکلی۔ قِصَہ آم' سری پائے' جوتے' گالیاں اور محبت کا تھا--- آم!--- آموں سے سیر حاصل لطف اَندوز ہونے کے لئے جیسا کہ مَیں نے پہلے عرض کیا' آم خور یا آم نوش کو بڑا کھُلا ڈُلا' آداب طعام و نوش سے بے نیاز' ہتھ چھُٹ' ندیڈہ' تھوڑا سا بدلحاظ' خودغرض اور جبڑوں' جیب معدے کا مضبوط ہونا چاہئے' ورنہ آم تو کیا' وہ عام سا آم بھی نہیں کھا سکتا۔ دوسرے کھا جائیں گے اور وہ ہاتھوں' منہ' کپڑوں کو بچاتا ہوا شرمندہ سا رہ جائے گا--- کچھ لوگ آم کو چھری چاقو سے کاٹ کر کھاتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ خربوزہ یا تربوز کھالیں۔ سردا' گرما یا کھیرے ککڑی پہ چاقو آزمائی کرلیں۔ یہ ڈائنگ ٹیبل پہ بیٹھ کر کھانے کی بھی نعمت نہیں۔ یہ تو نہر یا حوض کنارے پالی جما کر کھانے میں مزہ دیتے ہیں۔ اس کی گٹھلی پھینکنے کی نہیں' ایک دوسرے کو رسید کرنے کی چیز ہے۔ کچی لسی کا مشروب اس کا مصلح ہے' اس کی حِدت کم کرتا ہے۔ مفت کے کچے آم' گرم بھوبھل میں دبا کر' اس کے رَس میں نمک مرچ شامل کرلیں تو یہ مزیدار چٹنی بن جاتی ہے۔ غریب بطور سالن' امیر بطور ٹیسٹ اور بالڑ لڑکیاں سی سی کرنے کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ یہ چٹنی گرمیوں میں بطور ٹھنڈائی بھی استعمال ہوتی ہے' اس کی خشک گٹھلیوں کو اَچور بنتا ہے جو سالن' خاص طور پہ کریلے گوشت' گُت کریلے' اَروی پات' پکوڑے اور سموسوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ گلی کوچوں' اسکولوں کے باہر' ٹھیلوں وانڈلے پڑیوں میں چھوٹے چھوٹے

بچوں سے پیسے بٹور کر مفت تقسیم کرتے ہیں۔ آمرس' دیسی کٹھل آموں کے شیرے سے بنتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بچیاں اور اکثر بڑی بڑی بھی منگنی کے بعد' مزے لے لے کر کھاتی چاٹتی ہیں۔ آم گچ مٹی کے بھی ہوتے ہیں۔ خوبصورت' خوش رنگ۔ لیکن کوشش اور دستیاب ہونے کے باوجود بھی انہیں کھلایا نہیں جا سکتا اس لئے کہ یہ ملک شیک کی دوکانوں پہ ہاتھی کے دکھانے کے درشنی دانتوں کی طرح لٹکے ہوتے ہیں۔ عقل کے اندھے مٹی کے آم دیکھ کر بھی سڑے' کئی دنوں کے باسی آموں کے گودے کا مینگو شیک پیتے ہیں۔ دوکاندار اس کی سڑن اور بدذائقی کو مارنے کے لئے اس میں آم کی مصنوعی خوشبو' چٹکی بھر ہلدی' آدھ کلو گندے نالے کے برف خانے کی برف کا چُورا ڈالتے ہیں' مٹھاس کے لئے چھٹانک بھر چینی ڈال کر خوب مینٹیاں دے کر جھاگ نکالتے ہیں۔ ایک نائی نے بتایا کہ یہ ملغوبہ بطور شیمپو بھی بڑے اچھے نتائج کا حامل ہے' یعنی آپ اسے پی کر بھی وہی نتیجہ حاصل کرسکتے ہیں۔ وہی بات کہ آم کے آم گٹھلیوں کے دام' پیاس بھی بجھاؤ اور بال بھی بچاؤ۔ میں نے آج تک کسی مینگو شیک پینے والے کو گنجا ہوتے نہیں دیکھا--- تعجب ہے---"

آم کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اسے کھانے یا چُوسنے کے لئے اصل یا نقلی دانتوں کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ بے دانت کے بچوں سے لے کر بے بیڑھ کے بوڑھوں تک اسے بلاخطر و تردد استعمال کرسکتے ہیں البتہ بیڑھ یعنی مصنوعی دانتوں والے بوڑھوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آم پلپلا کرنے سے پہلے اپنی بتیسی جبڑے سے الگ کرکے سنبھال کر کسی محفوظ جگہ پہ رکھ دیں۔ ایسی جگہ جو بِلی کی پنجہ درازی سے دُور ہو' خاص طور پر وہ بِلی جو چِھلّے میں چھاج بھر بلونگڑوں کے ساتھ پڑی ہو۔ گھر میں بِلی نہ بھی ہو تو پھر بھی کوؤں' چوہوں اور چیل کی جھپٹ سے احتیاط ضروری ہے ورنہ وہی حال ہو سکتا ہے جو ہمارے دیرینہ ملازم بابا تاجے کا ہوتا تھا۔ پوپلے منہ سے باتیں کرتا ہوا اچھا لگتا۔ خدا جانے وہ کھانا چباتا کیسے تھا یا چباتا ہی نہیں تھا' یونہی نگل جاتا تھا۔ بہرحال' جو بھی نرم سخت دیتے' کھا جاتا۔ یہ ہمارے لئے بھی سہولت کی بات تھی۔ ہم بھی خوش' وہ بھی راضی۔ تھوڑی بہت دِقت اگر پیش آتی تھی تو اسی وقت جب بات کرتا یا کہیں خوش ہو کر ہنستا۔ بات کرنے سے پیشتر وہ ہونٹوں کو سکیڑتا پھر ہونٹوں کو سیٹی بجانے کی پوزیشن میں لاتا اور پھر بات کرنے

کی کوشش کرتا جسے ہم سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ اس دوران ہم ڈری ڈری نظروں سے اسے دیکھتے رہتے' وہ پتلے پتلے ہونٹ کھولتا تو اندر اس کی چھوٹی سی خشک زبان ہلتی دکھائی پڑتی۔ جانے کیوں ہمیں بچپن میں دیکھا ہوا ایک چوہیا کا بل یاد آ جاتا جس کے اندر اس کے ننھے ننھے بچے تھے۔ ہم چوہیا کے بچے دیکھنے کے شوق میں پہروں بل کے سامنے بیٹھے رہتے' جھاڑو کا لمبا سا تنکا ہمارے ہاتھ میں ہوتا۔ وقفے وقفے سے ہم تنکے کو سوراخ میں داخل کر کے چوہیا کے بچوں کو تنگ کرتے کہ باہر نکلو' ہم تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ماں کے ہاتھوں اسی جھاڑو سے جب تک ہماری پٹائی نہ ہوتی' ہم وہیں جمے بیٹھے رہتے--- بابے تاجے کی تھکلی زبان دیکھ کر ہمیں وہی چوہیا کا بل اور جھانکتے ہوئے بچے یاد آ جاتے۔ دوسری قباحت اس کی ہنسی تھی۔ ہنستے ہوئے اس کی تھوڑی ناک سے لگ جاتی اور ہمیں ہندوستان کا پرانا مزاحیہ اداکار بڈھو ایڈوانی یاد آ جاتا۔ بس' ان دو لاحقوں کے ساتھ وہ بڑا بیبا ملازم تھا۔ والد صاحب کسی کام سے کراچی گئے تو اسے بھی ساتھ لے گئے۔ جب پلٹا تو اس کی شکل ہی بدل چکی تھی۔ پہچانا ہی نہ گیا' یعنی اس کے چہرے کا سارا جغرافیہ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ اب بات کرتے' ہنستے ہوئے بھی معقول لگتا۔ ہم سارے گھر والے بڑے خوش تھے کہ چلو' اس کا بھلا ہوا۔ والد صاحب نے کسی چینی دندان ساز سے اس کا بیڑہ بنوا دیا تھا--- آپ نے مصنوعی دانت تو دیکھے ہوں گے' یقیناً خالی بیٹ دیکھے ہوں گے۔ ان دانتوں کو دیکھ کر پیٹ کی آنتیں اُلٹ جاتی ہیں۔ گلابی پلاسٹک مسالے کے مسوڑوں پہ پھریا پلاسٹک کے دانت ٹھونکے ہوئے عجیب کریہہ سے دکھائی دیتے ہیں۔ چلئے' مجبوری سے لگوائے جاتے ہیں' کھانے پینے کی سہولت رہتی ہے لیکن ان کی صفائی اور حفاظت سے غفلت نہیں برتی جاتی۔ صبح و شام ایک خاص برش اور محلول سے صفائی ہوتی ہے۔ رات کسی شیشے کے گلاس میں پانی اور لوشن میں بھگو کر سرہانے کے قریب رکھے جاتے ہیں کیونکہ بوڑھوں کو آدھی رات یا خواب میں کھانے کی عادت ہوتی ہے اور اگر ان کی صفائی سے غفلت برتی جائے تو یہ بہت جلد خراب ہو جاتے ہیں۔ دانتوں کے درمیانی حصوں میں سبز کائی سی جم جاتی ہے' رنگت پیلی اور بدبو بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس شکل میں تو انہیں دیکھا تک نہیں جا سکتا بلکہ ڈر اور خوف آنے لگتا ہے کہ جیسے کسی مُردے نے اپنی پہلی برسی پہ لواحقین' صابرین کو اپنے دانت بطور یادگار بھجوائے ہوں۔ بابا تاجا تو ازلی

تاجدارِ جہولت و کہولت تھا' اس کی جانے جوتی کہ یہ نادر چینی دانت کس طرح صاف کئے جاتے ہیں' ان کی حفاظت کیسے کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک مہینے میں ہی یہ دانت میانی صاحب سے ارسال شدہ دکھائی دینے لگے۔ بتیسی لگنے کے بعد موقع بے موقع' ہنسنے کی علت بھی پڑ چکی تھی۔ اب یہ حالت کہ گھر والے آنکھیں اور ناک بند کر کے اس سے مخاطب ہوتے۔ صورتِ حال جب حد سے زیادہ بگڑی تو والد صاحب نے اسے سمجھایا۔

"بابا! دانت صاف بھی کر لیا کرو' اس طرح سے یہ بالکل بیکار ہو جائیں گے۔"

"جی' خان صاحب! مَیں ہر روز کوئلے سے صاف کرتا ہوں---" وہ دانتوں کی نمائش کر کے دکھانے لگا۔

"بھلے مانس! کوئلے سے نہیں' ان کی پالش ختم ہو جائے گی۔ ان کو ہر رات سونے سے پہلے منہ سے نکالا کرو۔ برش سے اچھی طرح صاف کر کے پانی میں ڈبو کر رکھا کرو۔"

اسی دن معلوم ہوا کہ اس نے انہیں کبھی نکالا ہی نہیں تھا۔ اگلی صبح وہ بے دانت' پہلا والا بابا تاجا ہمارے سامنے کھڑا تھا۔ ہم نے اسے پہچان لیا' ہماری ہنسی چھوٹ گئی۔

"تمہارے دانت کہاں ہیں---؟"

"جی' بڑے خان صاحب نے حکم دیا تھا رات کو اتار دیا کرو--- رات اتار کر ٹرنک پہ رکھے تھے' صبح اُٹھ کر دیکھا تو غائب--- میں اسی وجہ سے آج باہر بھی نہیں نکلا۔"

میری پھر ہنسی چھوٹ گئی--- دوپہر کو وہ دانت' چوہیا کے بل کے باہر پڑے تھے' ننھے ننھے چوہے خوب کھیل رہے تھے۔ ولیسی صابن سے دھو صاف کر کے وہ پھر بابے تاجے کے منہ میں پہنچ گئے۔ اب خدا جانے ہمسایوں کی بلی کو کیسے خبر ہو گئی' جو سلسلہ چل نکلا۔ کبھی بلی کے بلونگڑے کھیل رہے ہیں۔ کبھی مٹی کے اوپر دھرے ہیں' کبھی باہر گندی موری میں پھنسے ملے۔ بابے نے تنگ آکر انہیں نکالنا اور صاف کرنا ہی چھوڑ دیا۔ اگلے دو دانت' پچھلی ایک داڑھ نکل گئی تھی' باقی کے بھی مخدوش تھے--- ایک صبح پھر پرانا بابا ہمارے سامنے کھڑا تھا۔

"اب کیا ہوا---؟"

"جی' دانت پھر غائب ہو گئے ہیں؟"

"---کہاں رکھے تھے۔" مَیں بیزار سا پوچھنے لگا۔

"خان صاحب! میں نے تو اب اتارنا ہی چھوڑ دیئے تھے۔"

"پھر کہاں گئے--- یاد کرو، شاید کہیں اتار کر رکھ دیئے ہوں؟"

"اللہ قسمے، خان صاحب! میرے منہ میں تھے۔"

میں نے اس کے منہ کی طرف بحالت مجبوری دیکھا، باچھوں کے پاس ایک لکیر سی تھی جیسے کسی بلی کے ناخن سے پڑی ہو۔ چھ سات روز بعد میں ممٹی پہ ریڈیو کا ایریل درست کر رہا تھا، بنیرے سے ہمسایوں کے کوٹھے پہ نظر پڑی تو بلی کے بلونگڑے بابے تاجے کے دانہ دانہ بکھرے بیڑھ کا تیاپانچا کر رہے تھے۔ باجے کا جی بھی دانتوں سے اُچٹ گیا تھا، اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ دانت منہ سے کیسے غائب ہوئے اور نہ اس خراش کے متعلق کچھ علم تھا کہ یہ چہرے پہ کیسے آئی۔ جوان آدمی سویا، مرا برابر ہوتا ہے۔ بوڑھوں کا تو اللہ ہی وارث ہوتا ہے۔ یہ نہ سوتے ہوتے ہیں اور نہ جاگتے--- کہتے ہیں، سوئے ہوئے انسان کی روح باہر سیر سپاٹے کے لئے نکل جاتی ہے اور جاگتے ہی فوراً واپس پلٹ آتی ہے۔ سویا ہوا انسان ایک اُترے ہوئے لباس کی مانند ہوتا ہے، جسم سے خالی۔ بوڑھوں کی بوڑھی روحیں بھی ذرا ٹانگیں کھولنے کی غرض سے باہر نکل جاتی ہوں گی، کہیں راستے میں کوئی اور بوڑھی روح مل گئی تو وہیں عالم برزخ بن گیا، میرا یہ بھی خیال ہے کہ جو بوڑھے سوتے سوتے ہی میں سو جاتے ہیں ان کی روح کسی اور بوڑھے روح کے ساتھ لمبی باتوں میں لگ جاتی ہے یا دونوں ٹہلتی ٹہلتی دُور نکل جاتی ہیں، واپس کا راستہ ہی یاد نہیں رہتا--- ہمارے بابے تاجے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ملتا جلتا معاملہ ہوا ہوگا۔ اس کی روح بھی کہیں دور نکل گئی ہوگی۔ بلی آئی تو ہاتھ پاؤں سوئے ہوں گے، حرکت برکت نہ پاکر منہ سے منہ لگایا ہوگا۔ چوہوں کی سی بُو--- ہلکا سا ناخن پنجے سے باہر نکال کر منہ کا ڈھیلا ڈھکنا کھولا ہوگا، بیڑھ نکال کر چلی گئی ہوگی--- بابا تاجا اب بھی خوش۔ گو دانتوں سے کھانے کی عادت پڑ گئی تھی لیکن جلدی ہی واپس اپنی پرانی ڈگر پہ آگیا۔ آموں کا موسم بھی آگیا۔ خوب آم خوری ہو رہی تھی۔ دیگر بابوں کی طرح اسے بھی آم بہت پسند تھے اور وہ بھی دیسی، دیسی بابے دیسی چیزیں ہی پسند کرتے ہیں۔ ممی ڈیڈی ٹائپ بابے قلمی آموں کو اپنے اسٹیٹس کے مطابق سمجھتے ہیں۔ آموں کی بہار میں جب دیکھو، وہ خمیری نرم روٹی آم کے ساتھ چابتا دکھائی دے گا۔ ایک دوپہر وہ میرے سامنے چارپائی پہ اکڑوں بیٹھا دیسی آم سے روٹی کھا رہا

تھا۔ ایک لقمہ روٹی، ایک چوسا آم کا--- کھانا کھا چکا تو ہماری چھوٹی بہن نے ایک چھوٹا سا آم اسے لا کر دیا۔ پہلے تو وہ اسے گدگداتا رہا، خوب گداز کرنے کے بعد وہ اسے چوسنے یا چابنے لگا۔ اللہ جانے گٹھلی کی پشت پہ دباؤ زیادہ پڑا، یا اس نے کہیں چوستے وقت لمبا سانس کھینچ لیا۔ اچانک اس کی آنکھیں اُبل آئیں، چہرے پہ سرخی دَر آئی۔ میں سامنے بیٹھا اخبار دھیانے لگا ہوا تھا۔ "غوں، غوں" کی آوازیں آئیں جو یقیناً اس کی ناک سے خارج ہو رہی تھیں۔ آم کی گٹھلی اس کے حلق میں اُتر چکی تھی، وہ ہاتھوں سے اپنا سینہ کوٹ رہا تھا۔ میں فوراً" اٹھا، بابے کو پیٹ تک چارپائی سے باہر جھکایا، ایک دو زور سے جھٹکے دیئے۔ دو چار مُکے بابے کی گردن کے پیچھے رسید کئے تو چھوٹی سے گٹھلی باہر نکل آئی، اور بھی سب کچھ جو بابے نے کھایا پیا تھا۔ لہٰذا میرا تمام دیسی بڈھوں کو مشورہ ہے کہ آم چوسنے سے پیشتر بتیسی احتیاط سے اتار کر، بلی کی پہنچ سے دُور کسی محفوظ جگہ پہ رکھیں۔ آم نارمل سائز کا لیں، چھوٹا نہ بڑا۔ نرم نرم پوروں سے خوب اسے پلپلائیں۔ پھر اس کا ڈھکن اتار کر دُور پھینکیں، ذرا سا دبا کر دو چار قطرے باہر گرا دیں اور چھنگلی سے سوراخ بڑا کر لیں۔ یہ سوراخ گٹھلی سے بہرصورت چھوٹا ہونا چاہئے تاکہ گٹھلی کو باہر پھسلنے کا موقع نہ ملے۔ (بابے تاجے والی واردات ذہن میں رکھیں) دائیں ہاتھ کی انگلیوں پہ جمائیں۔ سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹوں کو آم کے لبوں پہ رکھیں، آرام سے آم کی پشت کو پُش کریں۔ یاد رہے کہ دائیں ہاتھ کی الگ انگلیاں اور انگوٹھا آم کی گردن کے پاس رکھیں تاکہ گٹھلی کے حرکت سے آگاہی رہے۔ آپ محسوس کریں گے کہ آم کا شیریں امرت لحہ بہ لحہ آپ کے دہن مبارک میں حلاوتیں گھول رہا ہے۔ یہی عمل آم کے خالی ہونے تک دہراتے رہیں۔ ممی ڈیڈی ٹائپ کے بوڑھے جیسے چاہیں، کھا چوس سکتے ہیں۔ یہ انشورڈ ہوتے ہیں۔

بابے چاہیں جتنے بھی آم چوس لیں، انہیں دودھ والی کچی لسی پینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ لسی بلغم پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے۔ لسی ویسے بھی گرمی دور کرنے کے لئے پی جاتی ہے اور گرمی ان کے مزاج میں تو ہوتی ہے، جسم یا معدے میں نہیں۔ حقہ سو سال پرانا ہی کیوں نہ ہو، چلم گرم ہی رہتی ہے۔ آم چوسانے کے فوراً" بعد بابوں کو چت لٹا دینا بہتر ہوتا ہے، گلی کوچوں میں آم ہضم کرنے کے لئے نکلنا نہیں چاہئے، خوامخواہ لوگوں کی باتیں سننے کا کیا فائدہ؟

آم، پھلوں میں واحد پھل ہے جسے آگ کی بھوبھل میں بھسم کر کے بھی کھایا جاتا ہے اور برف میں دبا کر یخ بستہ کر کے بھی لطف اندوز ہوا جاتا ہے، اسے پوڈر اور برادے کی صورت بھی استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا مشروب بھی بنتا ہے۔ اس کا بچپن بھی چٹ پٹا، جوانی بھی رَس بھری اور بڑھاپا تو خیر اس پہ آتا ہی نہیں۔ یہ بھرا میلہ چھوڑ کر ہی چند ماہ کی رخصت پہ چلا جاتا ہے مگر اپنی باقیات چٹنی جام، آئس کریم، اچار اور مربّوں کی صورت میں چھوڑ جاتا ہے--- حیران ہوں کہ اس کے اچار کو اچار کیوں کہا جاتا ہے، آمچار کہنا چاہئے۔ مربّہ بھی "آمربہ" ہونا چاہئے جیسے اَمرس یا امچور ہوتا ہے۔ اچار اور مربّے میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ نمک مرچ کے اضافے سے مربّہ بھی اچار جیسا ہو جاتا ہے۔ مربّہ مکھیاں، چیونٹے علیحدہ کر کے ایلمونیم کے وَرقوں کے ساتھ نہار منہ، عطّار کی دوکان پہ کھڑے ہو کر کھایا جاتا ہے، اَلول جلول طبیعت والوں کو تقویت بخشتا ہے۔ اچار غریب اور دیہاتی بناتے ہیں اور پھر پورا سال کھاتے ہیں۔ دوپہر کی روٹی جو کسانوں کو کھیتوں میں بھجوائی جاتی ہے، اس میں قورمے کی جگہ اچار ہی ہوتا ہے، اچار ایسا سالن ہے جو پلیٹ رکابی کی بجائے براہ راست روٹی پہ ہی رکھا جاتا ہے۔ اس سے چار پانچ فائدے یا آسانیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔ ایک تو سالن کے لئے برتن ڈھونڈنا اور دھونا نہیں پڑتا۔ دوسری آسانی یہ ہے کہ لقمہ توڑ کر اچار تک کا فاصلہ طے نہیں کرنا پڑتا کیونکہ لقمہ پہلے ہی اچار سے ہمچار ہوا ہوتا ہے۔ تیسری بچت گھی کی ہوتی ہے، روٹی مصالحے اور مہک آور تیل سے پراٹھا بنی ہوتی ہے۔ چوتھا فائدہ یہ ہے کہ سارا دن سانسوں، ہاتھوں اور کپڑوں سے "اچارلی پرفیوم" کی بھینی بھینی مہک بیلوں اور بیبیوں کو متوجہ رکھتی ہے۔ پانچواں بڑا فائدہ یہ ہے کہ کسان بیچارہ سال کے گیارہ مہینے کچے کھٹے آم، سونف، سوئے، سرسوں کی کچی گھانی کا تیل، کلونجی کے بیج والا اچار کھا کھا کر ایک وقت خود برہمچاری، بلکہ اچھا خاصا اچاریہ جی ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے دیہاتی بچوں کے چہرے کسی نہ کسی طور آموں سے مشابہت ضرور رکھتے ہیں---

شہروں میں بھی اچار کھایا، بنایا اور بیچا جاتا ہے بلکہ اندرون لاہور کی پرانی دوکانوں اور داتا صاحب کے بازاروں میں یہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا اور ناک پہ رومال رکھ کر سونگھا بھی جاتا ہے۔ پوش علاقوں کے ممی ڈیڈی قسم کے گھرانوں میں یہ شفاف شیشی میں ٹماٹر کیچپ، چلی سوس، چائنیز سوس اور سلاد کریم کے ساتھ دھرا ہوتا ہے۔ بچی کھچی پرانی مائیاں شوق سے

بھوئیں ضرورت کے تحت کھاتی ہیں، صرف تیل اور مصالحہ رہ جانے کی صورت میں کپڑے دھونے والی مائی کو بخش دیا جاتا ہے۔ شہروں میں دوکانوں کے علاوہ یہ دیہاتی عورتوں کے سامنے دھرے المونیم کے چمکتے ہوئے دیگچوں میں بھی بکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہوم میڈ اچار ہوتا ہے۔ جھک کر دیکھیں تو سرخ شفاف تیل، نازک نازک آم کی پھانکیں، گلابی گلابی گاجریں، لُس لُس کرتے لسوڑے۔ یوں لگتا ہے جیسے اچار کا قورمہ، گرم گرم چولہے سے اتار کر لایا گیا ہے۔ یہ نمونے کے طور پر چکھاتی بھی ہیں، مَیں بھی اکثر چکھتا رہتا ہوں۔ چونکہ بیچنے والی عورتیں ہی ہوتی ہیں اس لئے از راہ ہمدردی زیادہ تر ان سے مرد ہی خریدتے ہیں لیکن خریدنے سے پہلے نظروں اور زبان سے لاچار اور اچار کو چکھتے ضرور ہیں۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ کسی روٹھے ہوئے کو منانے کے لئے آم سے زیادہ کار آمد اور کوئی تحفہ نہیں مگر شرط یہ ہے کہ روٹھنے والا شیریں دہن، بندۂ لُطف و لذّت، صاحبِ مال اور خوش جمال ہو۔ ذرا غور فرمایئے، کسی روٹھے ہوئے کو آپ گلاب یا چنبیلی کے پھولوں کا گلدستہ بھیجتے ہیں تو وہ انہیں لے کر کیا کرے گا، گُل قند بنائے گا یا چنبیلی کے پھولوں سے تیل نکالے گا؟ یہ تو اسے اور چڑانے والی حرکت ہوگی، گویا آپ اسے یہ کہنے کی کوشش فرما رہے ہیں کہ تمہارے دماغ میں گندے بخارات چڑھ گئے ہیں جن کی وجہ سے تمہارے دماغ میں میرے بارے میں فتور آگیا ہے لہٰذا یہ دو طرح کے پھول حاضر ہیں۔ گل قند قبض کا اور چنبیلی بیرونی طور پہ دماغ کا شافی علاج ہے--- میرا ایک دوست جو مذکورہ بالا صفاتِ جمیلہ کا حامل ہے، ایک غلط فہمی کی بناء پر ناراض ہو گیا۔ سوچا کہ چلو، روٹین کی ناراضی ہے۔ دو چار دن میں واپس پٹڑی پہ آ جائے گا مگر پورا ہفتہ گزر گیا، وہ میری راہ سے نہ گزرا--- چلیے، چند روز اور صبر سہی۔ مصروف ہو گا--- عشرے بعد مَیں نے اسے دفتر میں جا پکڑا، وہ کسی نہ کسی طرح مجھے طرح دے کر نکل گیا۔ بڑا غصّہ آیا۔ پھر وقت، بے وقت ٹیلی فون بھی کھڑکائے--- ہیلو کے بعد لائین کٹ--- کُٹی دو چار دن چلتی ہے، زیادہ سخت قسم کُٹی ہو تو دس بارہ روز اور بڑھا لو مگر یہاں تو بات بہت آگے بڑھی ہوئی دکھائی دے رہی تھی سوچا کہ ایک جذباتی سا خط لکھتے ہیں۔ ایک ناول سامنے دھرا، اس میں سے ایک خط نقل کیا جو کسی معتوب نے اپنے روٹھے ہوئے محبوب کو خودکشی سے پہلے لکھا تھا۔

مِن و عَن نقل کر کے بعد میں کاغذ پہ دو چار بوندیں پانی کی گرائیں تاکہ اسے ہماری اشکباری کا بھی احساس رہے۔ کاغذ کو تہہ کر کے اس میں ایک نرگس کا پھول بھی رکھا کہ اس کے سامنے ہماری سوگوار، منتظر آنکھوں کو تصوّر بھی اُبھر آئے۔ باہر لفافے پہ "بشرفِ نظر، جناب محترم" جیسے دُم چھلے بھی باندھے۔ تیسرے روز وہ خط مع خشک پھول، اسی منحوس ناول کے صفحے کے فوٹو اسٹیٹ کاپی کے ساتھ ہمیں واپس مل گیا دو سطری تحریر گئی۔

"نقل کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے--- یہ خط سلمان نے سلمٰی کو لکھا تھا، کم از کم خط میں سلمٰی بی بی کا نام تو بدل دیا ہوتا--- مہربانی ہوگی، میری کتاب اور دو روز کے وعدے پہ لئے ہوئے پانچ سو روپے جنہیں میری جیب سے نکلے ہوئے پانچ مہینے ہو گئے ہیں، واپس کریں---"

دراصل اس ناول کی دو جلدیں ان کے ایک مصنف دوست نے ان کی نذر کی تھیں جن میں سے ایک جلد میں پڑھنے کے لئے لے آیا تھا، پانچ سو ادھار والی بات بھی درست تھی۔ میری تو محبت میں مَت ماری گئی تھی ورنہ مَیں ایسی حرکت کیوں کرتا۔ اپنے تئیں خوب شرمندہ رہا، رہی سہی "عزت سادات" بھی دوست کی نظر میں دو کوڑی کی رہ گئی۔ خود ہی خاموش ہو کر بیٹھ گیا مگر دوست روٹھا ہو یا پاؤں میں کانٹے کی ٹوٹی ہوئی نوک رہ گئی ہو۔ درد نہ سہی، میٹھی میٹھی چبھن سی ضرور محسوس ہوتی رہتی ہے۔ جب تک کانٹے کی چبھن اور دوست کی جدائی کی جلن دُور نہ ہو، چین نہیں پڑتا۔ اسے رام راضی کرنے کے بڑے بڑے منصوبے ذہن میں آئے لیکن ہمت نہ پڑی کہ پھر کہیں کوئی حماقت نہ کر بیٹھیں۔ اللہ بھلا کرے ان آموں کا! ملتان سے ہمارا ایک دُور کا رشتے دار یہاں کچہری میں تاریخ بھگتنے آیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہاں دو چار روز قیام بھی لازمی تھا۔ آدمی کاروباری تھا، سوچا ہوگا کہ ہوٹل کا خرچہ، کھانا پینا ٹیلی فون، وغیرہ۔ اسٹیمیٹ لگا کر اس کی ہوا سرک گئی ہوگی۔ کاروباری تو کاروباری ہوتا ہے۔ وہ تو شادی بیاہ، مرگ موت پہ بھی اخراجات و آمدنی میں نفع و نقصان کا خیال اور حساب رکھتے ہیں۔ وہ دو عدد پیٹیاں ملتان سے دَھر لایا، بڑے رسیلے آم تھے، بڑی گرم جوشی اور محبت سے ملا۔"

"بس جی، آپ کی زیارت کے لئے حاضر ہوا ہوں--- فصلی آم تھے، آپ کی نذر کرنے آیا ہوں---"

یہ تو دوسرے روز معلوم ہوا کہ اصل میں وہ تاریخ پیشی پہ لاہور آیا ہے۔ ہمارے آم قبول کرنے کے بعد تو اس کا حق بنتا تھا کہ وہ دو چار دن ہمارے ہاں قیام و طعام اور ٹیلی فون کی سہولتیں حاصل کرے۔ دو پیٹیاں، کم و بیش بتیس کلو آم--- ہمارے دماغ میں کھٹ سے ایک ترکیب آئی--- پیٹی خوبصورت رنگین روغنی کاغذ میں لپیٹی، اوپر سرخ رنگ کی ربن باندھی۔ سنہری کاغذ کا پھول لگایا، ایک چھوٹا رقعہ بھی ساتھ نتھی کیا۔ فی البدیہہ شعر لکھا--- ۔

"ان آموں کی شیرنی میں میرے پیار کی حلاوت ہے
خطا معاف کر دینا بہت بڑی شرافت ہے

ضروری نوٹ۔ شرافت کو میں نے لمبا کر دیا ہے کہ نیچے والا مصرعہ چھوٹا پڑ گیا تھا، ویسے شاید وزن پورا ہے۔

فقط، آپ کا خطاکار---؟"

آم اس کے گھر بھجوا کر مَیں مطمئن ہو گیا کہ پیٹی میں بند ملتانی گرنیڈ اس کے غصّے کے پہاڑ کو پاش پاش کر دیں گے، اگر کچھ کسر رہ گئی تو ہمارا شعر اس کی کو پورا کر دے گا۔ سارا دن ہاتھ پہ ہاتھ دھرے انتظار کرتے رہے۔ ٹیلی فون، نہ وہ خود۔ دوسرا دن بھی آ لگا مگر وہ جانِ بہار نہ آیا۔ یہ سوچ کر دماغ، تلملا اٹھا کہ پھول اور خط واپس بھیج دیا تھا، آم رکھ لئے۔ مزے مزے سے چوس رہا ہوگا اور مَیں اِدھر انگاروں پہ بُھن رہا ہوں۔ میرا دماغ الٹ گیا، مَیں دس منٹ بعد اس کے گھر کے باہر تہیہ طوفان کئے کھڑا تھا۔ گھنٹی بجانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کیونکہ عالمِ غیض میں ٹانگوں کے ساتھ ساتھ ہاتھوں میں رعشہ سا طاری تھا۔ بیٹھک سے ہلکی ہلکی موسیقی اُبھر رہی تھی، دروازے سے کان لگائے تو وہی میرے دوست کی پسندیدہ غزل "رنجش ہی سہی، دل ہی دُکھانے کے لئے آ"--- مَیں سمجھ گیا، اندر وہی جانِ بہار بیٹھا ہے۔ ہمت کی، گھنٹی کی بجائے آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا تو اسی نے دروازہ کھولا، مجھے دیکھتے ہی چہرہ آم کی طرح لٹک گیا۔ مُنہ، مونچھیں پیلے پیلے رَس سے بھری ہوئی، ہاتھ میں آم۔ اندر میز پہ پلاسٹک کے برتن میں برف اور آموں کا پہاڑ، ایک برتن میں گٹھلیاں اور چھلکے--- میری تو جان جل گئی۔ مَیں ادھر اپنی جان سے کھیل رہا ہوں، یہ ستم ظریف ادھر آم کھا رہا ہے۔ مَیں اسے کسی بھوکے شیر کی مانند گھور رہا تھا، آم پھینک کر

ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

"مَیں، بس یہ ایک آدھ آم کھا کر تمہاری ہی طرف آنے والا تھا---"

مَیں نے ڈھیر ساری گٹھلیوں اور چھلکوں پہ اِک نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "یہ سب تم نے ہی کھائے ہیں---؟"

"ہاں، مَیں نے ہی ہی کھائے ہیں۔ مَیں زیادہ آم تو نہیں کھاتا، بس---"

"بس، کیا---؟"

"تیری جدائی کے غم میں کھا گیا---"

اگلے لمحے وہ میرے سینے سے لگا ہچکیاں لے رہا تھا--- دیکھا، آموں کا کمال؟

موسمی آموں کی ڈالی، یعنی ٹوکری کا تحفہ بھیجنا ہمارے وضعدار بزرگوں کی روایات کا حصہ رہا ہے۔ رسیلے، خوشبو دار خوش رنگ آم دوستیوں، تعلقات اور چاہت و یگانگت کے سلسلوں میں استحکام اور مٹھاس پیدا کرنے میں بڑے ممد ثابت ہوتے ہیں، آم دینے لینے والے آپس میں کیسے بھی دشمن کیوں نہ ہوں، دل میں لاکھ کدورتیں ہوں، آم دیکھتے اور کھاتے ہی ان کے دلوں میں نرم گوشے پیدا ہو جاتے ہیں۔ خاص طور پر گھاگ قسم کے سیاستدان آموں کے وسیلے سے بڑی بڑی وفاداریاں مستحکم کر لیتے ہیں۔ دشمنیاں، دوستیوں میں بدل جاتی ہیں بلکہ رشتہ داریاں بھی قائم ہو جاتی ہیں۔

پرانے وقتوں کے ایک وضعدار بزرگ تھے، رکھ رکھاؤ اور دِید لحاظ والے۔ ان کا کبھی آموں کا کاروبار تھا۔ دُور پار کے ایک رئیس دوست کو وہ ہر فصل پہ آموں کی ڈالی بھیجا کرتے تھے۔ وقت اور حالات جو بدلے تو وہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے لیکن وہ نامساعد حالات میں بھی اپنا آم بھیجنے کا وظیفہ جاری رکھے ہوئے تھے۔ ایک وقت آیا کہ وہ بڑھاپے کے ہاتھوں، ہاتھ پاؤں چھوڑ کر کھاٹ پہ پڑ گئے، اپنے اکلوتے بیٹے کو وصیّت کی کہ میرے بعد تم بھی میرے دوست کو آموں کی فصل پہ آم بھیجنا مت بھولنا۔ ان کے مرنے کے بعد ان کا غریب بیٹا بھی باپ کی وصیّت کے مطابق آم بھیجنے لگا۔ وقت گزرا تو وہی رئیس زادہ کہیں کسی کام سے ادھر آنکلا، اپنے دیرینہ دوست سے ملاقات کی نیّت سے اس کے ٹھکانے پہ پہنچا تو دیکھا کہ وہاں تو سب کچھ بدل گیا ہوا تھا، وہ حویلی اور نہ وہ لوگ--- پوچھ پتا کرتا ہوا ایک چھوٹی سی دوکان پہ پہنچا۔ ایک مفلوک الحال نوجوان کپڑے سِی رہا تھا جو اسی

دوست کا بیٹا تھا۔ یہ رئیس زادہ اجنبی بن کر پاس آ کھڑا ہوا۔ دیکھا کہ ایک آموں کی ٹوکری پاس دھری پڑی تھی، اس پہ اس کا نام پتا لکھا ہوا تھا۔ باتوں باتوں میں اجنبی نے اس ٹوکری کے بارے میں دریافت کیا تو اس نوجوان نے بتایا کہ یہ آم میرے مرحوم باپ کے ایک دوست کے لئے ہیں، شام کو مزدوری ملے گی تو اسٹیشن پہ جا کر بلٹی کرا دوں گا--- اجنبی نے مزید کُریدا تو بتانے لگا کہ میرا باپ اپنے اس دوست کو فصل پہ آم بھیجا کرتا تھا، وہ مر گیا تو اس کی وصیّت کے مطابق مَیں یہ کام کرتا ہوں اور اس کام کو سرانجام دینے کے لئے مجھے بیوی بچوں سمیت کئی روز فاقہ کرنا پڑتا ہے۔ اس رئیس زادے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے جیب سے ایک بھاری رقم اسے دیتے ہوئے کہا۔

"برخوردار! مَیں تمہارے باپ کا مقروض ہوں۔ کسی زمانے میں تمہارا باپ مجھے آم سپلائی کیا کرتا تھا۔ ایک وقت آیا کہ کاروبار میں مجھے خاصا نقصان ہوا، اس طرح مَیں تمہارے مرحوم باپ کے واجبات ادا نہ کر سکا اور نہ ہی اس نے بھی کبھی مجھ سے تقاضا کیا تھا۔ اب مَیں اسی کاروبار میں لاکھوں میں کھیل رہا ہوں اور آج مَیں اپنا قرضہ واپس لوٹانے آیا ہوں--- یہ رقم رکھو اور کوئی معقول سا کاروبار کر لو---"

قسمت نے ہاتھ پکڑا تو اسی رقم کی بدولت کچھ ہی عرصے بعد لڑکا بھی لاکھوں میں کھیلنے لگا--- دیکھا، آموں کی مٹھاس کا کمال---؟

اپنے لاہور والے مہاراجہ میں یوں تو بے شمار خوبیاں تھیں لیکن ساتھ ساتھ اس میں بہت سی مضحکہ خیز عادتیں اور اس کے چند دلچسپ مشاغل بھی تھے۔ جہاں اس کے دربار میں طرح طرح کے اہلِ حکمت و بصیرت اور یکتائے روزگار فنکار و ہنرمند موجود تھے۔ وہیں ڈُوم مَراثی، پھکڑباز بھانڈ بھی اس کی ناک کے بال تھے جن کی صحبت و مجلس سے وہ بڑا محظوظ ہوتا اور ان کو بھی اس کے مزاج میں ایسا دخل تھا کہ بسا اوقات بھرے دربار میں اس کی بھَد کر دیا کرتے تھے اور وہ بھی لطف لے کر انعام و اکرام سے نوازتا۔ خوش خوراکی اور تن زیبی کے معاملے میں وہ بس گزارہ تھا البتہ ہیرے جواہرات، گھوڑے گھوڑیاں، آلاتِ حرب و ضرب، شرابیں، کھیل تماشے، رقص و موسیقی اور ایک خاص قسم کی عورتوں سے اسے بے حد دلچسپی تھی۔ دیسی شراب، دیسی عورت، دیسی گھوڑے گھوڑیاں، ٹھیٹ دیسی جگت اور دیسی آم اس کی کمزوریاں تھیں۔ ان حوالوں سے کوئی بھی اس کے ہاں مقام و مصاحبت

حاصل کر سکتا تھا۔ اس کے مزاج میں موسموں کو بھی بڑا دخل رہا ہے۔ موسم کی مناسبت سے شراب' لباس' عورت' رنگ' خوشبو اور جواہرات پسند کرتا۔ بسنت میں نہال رہتا' اس کی سکھ ستیاں عروج پہ ہوتیں۔ بسنتی لباس' بسنتی مشروب' اسی طرح کے پکوان' پھل پھولوں میں بھی یہی رنگ۔ بڑے اہتمام سے یہ تہوار منایا جاتا۔ اسی طرح ساون بھادوں' گرمیاں سردیاں گزرتیں۔ آموں کے موسم میں بڑی چہل پہل ہوتی۔ شاہی باغات میں آموں کے درختوں کی ڈالوں پہ بانات کے جھولے پڑتے۔ سنگی حوضوں تالابوں میں آم یخ بست کئے جاتے' ہر طرف آم ہی آم' خوشبوئیں' مہکاریں۔ سدھائی ہوئی پالتو کوئلوں کی نغمہ ریزیاں' بھنگ اور زعفرانی سروائیاں' شربت' مہوے کی کچی شراب' بیسنی پھلکیاں' ڈھول تاشے' ڈوگری میراثنیں بطور خاص جموں سے بلوائی جاتیں جو ڈوگر بھاشا میں آموں کے بارے میں گیت گاتیں' مہاراجہ ترنگ میں آکر امبرسا پلانے کا حکم دیتا' یہ خاص شراب آموں کے رس سے تیار کی جاتی تھی ایک خوبصورت سنگ مرمر کا حوض اس شراب سے بھر دیا جاتا' آم اور اس کے کومل پتے اس پہ تیرتے ہوئے بڑے بھلے دکھائی دیتے۔ ان خوبصورت نوخیز میراثنوں کے نیم برہنہ سراپوں پہ گدرے آموں سے شیریں رس کی پچکاریاں چلائی جاتیں' انہیں گھیر گھار کر حوض کنارے پھسلن پہ دھکیلا جاتا' وہ نشے کی ترنگ میں چکنے کناروں سے پھسلتی ہوئی حوض میں گر جاتیں' جل پریوں کی مانند وہ ادھر ادھر اچھل چھل سی لپکتی جھپکتی رہتیں۔ انہیں پکڑنے' قابو کرنے کے کھیل میں کئی کھلاڑی بھی پھسل کر حوض میں جاگرتے اور جو نہ گرنا چاہتے' انہیں مہاراجہ کے اشارے سے حوض بُرد کر دیا جاتا' آخرش مہاراجہ اس جل بھے میں خود بھی اُتر جاتا۔ مصاحب جل پریوں کو سر برابر اٹھا کر چھپ سے پھینک دیتے' شراب کے چھپاکے دُور دُور تک اُڑتے۔ شراب میں شراب' شباب ہی شباب۔ جس کا جی چاہا' وہیں ڈبکی لی' چند گھونٹ پیئے' کسی جل مچھلی کو چٹکی بھی بھری۔

بکو میراثی' مہاراجہ کا منہ چڑھا انتہائی منہ پھٹ' بلا کا ذہین فطین اور حاضر جواب تھا۔ وہ مہاراجہ سے ہر وہ بات کر سکتا تھا جو قابلِ گردن زدنی ہو۔ مہاراجہ نے تو کئی بار اس بکو کے بارے میں کہا تھا کہ اس بکواسی بکو کی موت میری ذاتی تلوار سے ظہور پذیر ہوگی' حیرت ہے کہ مہاراجہ کی یہ پیش گوئی کبھی پوری نہ ہوئی اور اس کا سر کاٹنے کے لئے اس کا ہاتھ

کبھی بھی پیش قبض تک نہ پہنچا بلکہ مہاراجہ خود ہی اس بکو میراثی کے سدابہار فن کے قبضے میں تھا۔ بکو' مہاراجہ کا ندیم خاص تھا' اس کی ساری کمزوریوں سے واقف' اندرونِ خانہ' رانیوں اور رکھیلوں' لونڈیوں کنیزوں کے خفیہ معاملات اور مشکلات میں اس کا مُشکل کشا مشیر' بلکہ پیر--- اس کی شکل اور حرکات ہی کچھ ایسی تھیں کہ دیکھنے والے کی ہنسی چھوٹ جاتی۔ مہاراجہ خود اس سے بدکتا تھا۔ دربار میں اسی رُوسیاہ کو ادھر کھڑا کر دیا جاتا جدھر مہاراجہ بوجوہ دیکھ ہی نہیں سکتا تاکہ وہ اس کے شر اور شرارتوں سے محفوظ اپنی ذاتی سنجیدگی برقرار رکھ سکے--- بات اس جل پریوں والے حوض کی ہو رہی تھی۔ اسی ایک کھیل میں جس میں مہاراجہ بھی شامل تھا' بکو نے اپنا کام دکھا دیا' دوران ڈبکی یہ ستم ظریف مہاراجہ کے ساتھ کسی "فنکارانہ" حرکت کا ارتکاب کر بیٹھا۔ مہاراجہ لاکھ نشے میں ہی سہی لیکن یہ حرکت بڑی سوقیانہ تھی۔ مہاراجہ تڑپ کر باہر نکل آیا' فوراً" تلوار طلب کی۔ حوض خالی کروا کر سب کو حاضر لائن کر دیا بڑے قہر و غضب سے بایاں ہاتھ پشت پہ رکھتے ہوئے بولا۔

"یہ حرکت کس نے کی ہے---؟"

سب ایک دوسرے کے منہ تکنے لگے--- مہاراجہ پھر دہاڑا۔

"جس کسی نے بھی یہ حرکت کی ہے' وہ ایک قدم آگے آجائے---"

وہی خاموشی' سب سرجھکائے کھڑے تھے۔ نشے ہرن ہو چکے تھے' ننگی لہراتی تلوار دیکھ کر سب ہی لرزاں تھے لیکن کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہوا کیا ہے؟--- بڑی ہمت اور کانپتی ہوئی آواز میں منگل سنگھ نے جان کی امان طلب کرتے ہوئے پوچھا۔

"مہاراج! ہمارے سر حاضر ہیں' کاٹ کر اپنے قدموں میں ڈال لیں لیکن ہماری خطا بتا دیں۔ ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا کہ کس نابکار سے کیا خطا سرزد ہوئی ہے---"

ذلیل بکو میراثی بھی سر جھکائے کھڑا تھا۔ اتنی گھٹیا حرکت کہ مہاراجہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اب مہاراجہ کیا بتائے کہ اس کے ساتھ کیا ہو گزرا ہے وہ تو اصلی مہاراجہ تھا' ایسی حرکت اگر کسی بغلیں مُونڈھنے والے نقلی راجے کے ساتھ بھی ہو جائے تو وہ اسی استرے کے ساتھ شرارت کی جڑ ہی کاٹ دے۔ ننگی لہراتی ہوئی تلوار کی اگر کوئی زبان ہوتی تو شاید اشارے کنائیے میں ہی کچھ واضح کر دیتی' مہاراجہ تو کچھ کہنے سے رہا بس یہی بار بار کہتا رہا

کہ یہ حرکت کس نے کی ہے۔ کیا حرکت کی ہے' یہ نہیں بتا رہے۔ آخر تنگ پڑ کر بکو میراثی بھاگ کر پاس چبوترے پہ چڑھ گیا' جان بخشوا کر عرض کرنے لگا۔

"یہ حرکت مَیں نے جان بوجھ کر نہیں کی --- اندر' باہر شراب ہی شراب۔ ایسے میں تو دل دماغ ہاتھ سے نکل جاتے ہیں --- مَیں انگلی سے پوچھ کر بتاتا ہوں کہ کیا حرکت ہوئی ہے جس سے میرے مہاراجہ کو تکلیف پہنچی ---"

وہ عیّار' مکّار انگلی کو کان کے پاس لے گیا' چہرے اور سر کی حرکات سے یوں ظاہر کرنے لگا جیسے وہ انگلی کی بات سن رہا ہو --- چند لمحوں بعد وہ انگلی کو چباتے ہوئے بلند آواز میں کہنے لگا۔

"مَیں تجھے نہیں چھوڑوں گا' تجھے کچا چبا جاؤں گا۔ ذلیل' کمینی!"

مہاراجہ کی ہنسی چھوٹ گئی' مصاحب بھی ہنسنے لگے۔

"مہاراج! میں بتاتا ہوں کہ اس انگلی نے ---"

مہاراجہ نے وہیں سے جواب دیا۔ "بکو' مَیں تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتا --- نیچے اتر آؤ۔"

تلوار نیام میں واپس چلی گئی --- مہاراجہ میں یہ بھی ایک خوبی تھی کہ وہ فراخ دل اور کشادہ نظر بھی تھا۔ بڑی بڑی خطائیں معاف کر دیتا' معمولی معمولی باتوں پہ خوش ہو کر انعام و اکرام سے نوازتا۔ وفاداروں' ہنرمندوں' عالموں' بہادروں کی قدر کرتا۔ لیکن عیّاری' مکّاری اور میدان سیاست میں بھی اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بکو نے یہاں اسے ٹکے ٹوکری بیچ دیا تھا' اندر ہی اندر وہ بل کھا رہا تھا۔ ٹھیک ہے' جان بخشی کی تھی مگر بکو کو تو شاید اپنی جان کی پرواہ نہ تھی۔ بعد بھی کہیں آمنا سامنا ہوتا' تو اس انگلی کو منہ میں ڈال کر کاٹنے لگتا۔ مہاراجہ بھی جیسے اندر سے کٹ جاتا' اس نے تہیہ کر لیا کہ اس میراثی کو زندہ نہیں چھوڑے گا --- آموں کا موسم لَد چکا تھا' اب تو کہیں گٹھلیاں بھی پڑی دکھائی نہ دیتی تھیں۔ مہاراجہ کو ایک ترکیب سوجھی' ایسی ترکیب جو صرف اسی کے ذہن میں آ سکتی تھی --- اس نے بکو کو طلب کیا' حکم دیا کہ آٹھ پہر کے اندر اندر لچھمن لڈو آم پیش کرد ورنہ ناکامی کی صورت میں تمہارا سر قلم کر دیا جائے گا۔ وہ تو موروثی میراثی تھا' فٹ سمجھ گیا کہ مہاراجہ اپنی بے عزّتی کا بدلہ چکانا چاہتے ہیں مگر وہ میراثی ہی کیا جو کسی مسئلے کا اپائے

کرنا نہ جانتا ہو' کسی وار کا توڑ یا کسی بات کا جواب بڑھ کر نہ دے سکتا ہو۔ اسی وقت کمر باندھ کر نکل گیا۔ دوسرے روز چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے وہ ایک بڑی سی ٹوکری اٹھائے' مہاراجہ کے روبرو حاضر تھا۔ مہاراجہ حیران پریشان کہ لچھمن لڈو آم تو ہندوستان کے کسی حصّے میں دستیاب نہیں' صرف بنارس کے ایک باغ میں چند درخت ہیں اور ان کی فصل شروع شروع میں چند ہفتے رہتی ہے' بعد میں ان کی گٹھل تک نہیں ملتی یہ کہاں سے لے آیا؟ --- بکو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا' جان کی امان چاہی اور عرض گزاری۔

"مہاراج! اس رس بھرے ٹوکرے کو خلوت میں کھولیں۔ اگر آم پسند نہ آئے تو گردن اتارنے کی ضرورت نہیں پڑے گی' مَیں خود ہی اتار کر قدموں میں رکھ دوں گا --- غلام باہر دروازے پہ سر جھکائے ہوئے ملے گا۔"

ٹوکرا اٹھا کر خلوت گاہ میں پہنچا دیا گیا' مہاراجہ اندر چلا گیا --- ایک پہر' دوپہر' سہ پہر' شام ہو گئی۔ پھر رات کے پہلے پہر کا گجر بجا تو مہاراجہ نے بکو کو طلب فرمایا' تبسّم فرما کر گلے کی بیش قیمت مالا اتار کر عطا فرمائی۔

"بکو! واقعی' یہ امبال بڑی رسیلی ہے ---"

بکو نے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ "مہاراج! آپ کا غلام ہوں' اپنے مالک کو خوش رکھنا ہی میرا کام ہے۔" یہ کہہ کر وہ الٹے پاؤں باہر نکل گیا۔

مہاراجے کے دربار کا یہ بکو میراثی اس رسیلی نشیلی' کٹیلی امبال کو راتوں رات جموں توی سے لایا تھا۔ یہ کشمیرن ڈومنی تھی۔ چودہ پندرہ کا بِن' بالکل کچے پکے آم کی طرح کھٹی میٹھی' رسیلی' سڈول۔ قاشوں کی طرح پتلے پتلے ہونٹ' گال جیسے آم کا کٹ دار ابھار' آدھ پھانکوں کی مانند کٹیلے نین' آواز اور لہجے میں آم کی شیرینی آمیز تنک' وہی باس وہی خوشبو --- امبال نام کسی نے سوچ کر ہی رکھا تھا۔ مہاراجہ ایسا دیوانہ ہوا کہ دن رات امبال کی حلاوتوں سے لطف لیتا رہتا۔ جنداں اور موراں اور دیگر رانیاں کنیزیں' پرچھتی پر جا پڑیں' کئی ایک ہیرا چاٹنے کا جتن کرنے لگیں مگر مہاراجہ کی یہ وارفتگی جلد ہی ختم ہو گئی' امبال ملیریئے میں چند روز مبتلا رہنے کے بعد مر گئی۔ مہاراجہ نے بڑے اہتمام سے اسے قلعے کے اندر ہی نذر آتش کر دیا اور یادگار کے طور پہ آموں کے چند پودے لگوا دیئے --- آپ نے آموں کا کمال ملاحظہ فرمایا؟

آم کی ایک ہی آنکھ ہوتی ہے' انگور کے علاوہ بقیہ سب لٹکنے والے پھلوں کی دو آنکھیں ہوتی ہیں۔ ایک اوپر' ایک نیچے۔ جو خوبصورتی' مٹھاس' ذائقہ' خوشبو اور رنگ آم کو نصیب ہیں' کسی اور پھل کو ان کا عشر عشیر بھی نہیں ملا۔ جیسے ہرے' پیلے اودے' بنفشی' سرخ گلابی' رنگوں کی اک قوس قزح اتری ہو۔ جڑ پتے چھال' لکڑی' پھول' پھل' چھلکے' بور' سب ہی کار آمد اور پھر یہ واحد پھل ہے جو ملوہ پیدا ہوتا ہے' طوطے اسے طوطی سمجھ کر پیار کرنے لگتے ہیں۔ کیری' امبی کے بعد اگر طوطوں اور بچوں سے بچ جائے تو پھر آم کہلاتا ہے۔

اپنے سعادت حسن منٹوں کی حیثیت بھی ادیبوں میں آم کی مانند تھی۔ کھلا چمکتا ہوا شفاف ماتھا' خوبصورت بال' مسکراتی ہوئی بڑی بڑی شرارتی آنکھیں' تیکھا لہجہ' گفتگو میں بلا کے دلائل اور منافقت جہالت کو دولخت کر دینے والی کاٹ۔ ابہام بھی تھا لیکن تجربے' مشاہدے اور علم و ذکاء کے متانت اور گہرائی سے ہم کنار۔ بلانوش مگر باہوش۔ آموں کے معاملے میں وہ بھی بڑے ندیدے تھے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق سے ان کی ایک نہیں بنتی تھی اور انہیں پہ کیا موقوف' کسی بھی داڑھی پوش سے مزاج اور طبیعت لگا نہیں کھاتی تھی۔ ساری عمروہ خرقہ پوشوں اور داڑھی بدوشوں سے بدکتے رہے۔ کہیں کراچی جانا ہوا تو نہ جانے کیا جی میں آئی' بابائے اردو سے ملنے چلے گئے۔ اتفاق سے وہ اکیلے ہی لان میں بیٹھے' میٹھے میٹھے آموں کو اردو سکھا رہے تھے' سفید داڑھی اور براق پوشاک آموں کے پیلے پیلے رس سے لتھڑی ہوئی تھی۔ اس شرارتی کی ہنسی چھوٹ گئی اور ان کے ہاتھ سے چھری لے کر سلام عرض کرنے بعد کہنے لگے۔

"مولوی صاحب! آم کاٹ کر نہیں' پلپلا کر کے کھانے کا پھل ہے ـــــ"

مولوی صاحب کے ماتھے پہ تیوری چڑھی مگر اپنی فطری شرافت سے کام لیتے ہوئے بڑی نرمی سے فرمانے لگے۔ "منٹو میاں! پلپلا کر کے نہیں' گدگدا کر کہو ـــــ"

یہ ازلی شیطان اور جواب چھٹ' جھٹ بولا۔

"حضرت! میری لغت میں آم کو پلپلا کرنا اور عورت کو گدگدانا لکھا ہے۔"

سلام کر کے کھسک آئے اور مولوی صاحب انہیں جاتے دیکھتے ہوئے بے دھیانی میں ہاتھ کا آم پلپلا کر رہے تھے۔

منٹو کی ابتدائی زندگی میں بھی ایک امبی آئی تھی۔ یہ امرتسر کا ذکر ہے' منٹو نے دو چار بے قاعدہ معاشقوں کے بعد باقاعدہ عشق کی مشق اسی سے شروع کی تھی ـــ مال روڈ کی کمرشل بلڈنگ میں واقع فلمی رسالے "ڈائریکٹر" کا دفتر اس زمانے میں بڑے بڑے ادیبوں' شاعروں' دانشوروں اور قلمی لوگوں کی آما جگاہ تھا۔ چوہدری فضل حق بڑے یارباش' ادب نواز' کشادہ دسترخوان اور رکھ رکھاؤ والے مخلص انسان تھے۔ ہمہ وقت محفلیں جمی رہتیں' ہر قسم کے لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا۔ چونکہ دسترخوان وسیع تھا اس لئے جس کا کہیں سینگ نہ سماتا' ادھر دھرا ملتا۔ منٹو' شوکت تھانوی' شباب کیرانوی' بھایا حمید' سلطان کھوسٹ' شاد امرتسری' موسیقار چشتی' رقاص عاشق حسین سمراٹ' اسماعیل' غلام محمد' ریاض شاہد' بابا ظہیر کاشمیری' ساغر صدیقی اور بے شمار جن کے نام ذہن سے اتر گئے۔ ہمارا بھی یہاں آنا جانا لگا رہتا۔ ایک روز جو پہنچے تو آم پارٹی جاری تھی۔ سستا وقت تھا' روپے کے تین چار پکے سیر آم مل جایا کرتے تھے۔ بڑے بڑے برتن آموں سے بھرے ہوئے' ہاتھ منہ' آستین آموں کے رس سے لتھڑے ہوئے۔ منٹو ہوں تو لڑائی بھڑائی' بدگوئی' بدکلامی' بحث تکرار اور ذکر عورت نہ ہو' یہ تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اگر یہ سب کچھ نہیں ہے تو سمجھو کہ منٹو وہاں موجود نہیں۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی منٹو چہک رہے تھے' ذکر کسی پری وش کا تھا منٹو کہہ رہے تھے۔

"چونی جیب میں تھی اور بھوک جوبن پہ ـــ سوچا' کچھ کھا پی لوں۔ میرے دماغ میں فتور جاگا' بھوجن کی بھوک بھول گئی اور بھوگ کی بھوک جاگ پڑی۔ پکا نہ سہی' کچا ہی سہی۔ میں اس گلی کی جانب چل پڑا۔ کٹڑہ مہان سنگھ کی نکڑ پہ ایک ٹھیلے والا آم بیچ رہا تھا۔ کچے پکے آم' نیچے سے سبز' اوپر سے سرخ ـــ ذرا پرے ہو کر گزرنے کی ٹھانی کہ یہ کمبخت کہیں میری نیت کھوٹی نہ کر دیں مگر وہ آم ہی کیا جو نگاہ نیت کو نہ کھینچے' اس کی خوشبو تو ناک سے پکڑ کر کھینچ لاتی ہے۔ کوشش کے باوجود میں ان آموں سے نہ بچ سکا۔ ٹھیلے والے سے دونی کے آم خریدے' باقی بچی دونی سنبھالتے ہوئے میں اس بازار تک آ گیا جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ امرتسر کے اس بازار کا مال بڑا کھرا ہوتا تھا۔ بڑی بڑی ریاستوں' راجواڑوں' فلموں' تھیٹروں میں یہیں سے سپلائی ہوتا تھا بلکہ آج کے کئی مشہور فنکار' ایک دو نسلیں پیچھے اسی بازار سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں رسیلے آم چوستا ہوا

ایک تنگ سی گلی میں گھس گیا۔ یہاں پس ماندہ علاقوں سے برآمد کی ہوئی لڑکیاں' عورتیں بڑی گھٹن اور کسمپرسی سے بسر اوقات کرتی تھیں۔ ایک خستہ حال کھولی کے دروازے میں کھڑی ایک بوٹے سے قدم کی لڑکی دروازے کے کھونٹے سے لٹکے پنجرے میں بند ایک طوطے کو کچے آم کی پھانکیں کھلانے میں مصروف تھی--- عجیب بے نیاز سی لڑکی--- بالکل الھڑسی' طوائفانہ رکھ رکھاؤ نہ کوئی ادائیں اشارے' جیسے وہ بازار میں نہیں اپنے گھر کے آنگن میں کھڑی ہو--- ہاتھ میں آم پکڑے میں اسے دیکھنے میں محو تھا۔ اچانک اس کی نگاہ مجھ پہ پڑی' یقیناً اس نے میرے ہاتھ میں آم بھی دیکھے ہوں گے۔ وہ بڑی معصومیت سے مسکرائی' ادھر میں بھی جواب میں مسکرایا۔ اس نے اشارے سے قریب آنے کا اذن دیا۔ مَیں اس کے پاس پہنچا تو وہ کہنے لگی بازار کھڑے ہو کر آم چوسنا بری بات ہے۔ آؤ' اندر آرام سے بیٹھ کر چُوسو--- مَیں اس کی آم سے بھی رسیلی بات پہ قربان ہوتے ہوئے کھولی کے اندر چلا گیا۔ بڑے روزمرّہ کے انداز میں' سکون سے اس نے طوطے کا پنجرہ دروازے کے کھونٹے سے اتار کر اندر رکھا اور دروازہ بھیڑ دیا۔ پاس پلنگ پہ بیٹھتے ہوئے میرے ہاتھ کی گرفت سے آم نکلا' پلیٹ میں دَھرا۔ مَیں نے دوسرے ہاتھ میں دبائی ہوئی دونّی اس آم کے ساتھ رکھ دی مگر ظالم نے مسکراتے ہوئے وہ دونّی میری سامنے والی جیب میں ڈال دی اور میرے گال پہ ہلکی چپت لگاتے ہوئے بولی' بُری بات--- مَیں حیران ششدر کہ یہ طوائف ہے یا کوئی استانی؟ مَیں یہاں بداخلاقی کی نیّت سے آیا اور یہ مجھے اخلاق سکھا رہی ہے۔ کیا کہوں' کیا نہ کہوں--- اسی شش و پنج میں تھا کہ وہ پوچھنے لگی۔

"تمہیں آم پسند ہیں---؟"

"پسند ہی ہیں تو چوس رہا ہوں--- جیسے تمہارے طوطے کو پسند ہیں' تم اسے بھی تو بازار میں کھلا رہی تھیں۔ پھر میرے بازار میں کھانے سے کون سی برائی کا پہلو نکلتا ہے؟" مَیں نے کہا۔

وہ میرا ادھ چوسا ہوا آم چوستے ہوئے بولی۔ "بڑا میٹھا آم ہے' کہاں سے لائے--- ایک آدھ میرے لئے بھی لے آتے---"

مَیں نے بغلی جیب سے ایک آم نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ "تم نے میری بات کا

جواب نہیں دیا---"

"گھر کے دروازے کی چوکھٹ' دہلیز بھی گھر کا ہی حصہ ہوتی ہے' دہلیز سے اک قدم باہر بازار ہوتا ہے---" وہ بولی۔

"--- اور بازار کی جانب دروازے کے پٹ اگر کھلے ہوں اور وہاں ایک جوان لڑکی کھڑی ہو جو کسی تماش بین کا انتظار کر رہی ہو تو وہ طوائف یا طوائف نما ہوتی ہے' کیا یہ بری بات نہیں؟---" مَیں نے اس کے جواب میں کہا۔

وہ بڑے سکون سے آم دھو رہی تھی' وہیں سے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہنے لگی۔ "تم نے مجھے طوطے کو آم کھلاتے ہوئے دیکھا اور مَیں نے تمہیں آم چوستے دیکھا۔ ہم دونوں کھا' کِھلا رہے تھے--- تم یہاں کی ان گلیوں کے رہنے والے نہیں ہو' کہیں سے آئے ہو۔ رہ گزرو ہوتے تو خاموشی سے گزر جاتے' کھڑے ہو کر مجھے نہ دیکھتے۔ پھر دونّی تم نے میری تھالی پہ رکھی' مَیں نے واپس تمہاری جیب میں ڈال دی--- بولو' میں کہاں بُری ہوں؟--- رہا یہ سوال کہ مَیں نے تمہیں اندر بلایا' دروازہ بند کیا لیکن کچھ اور تو نہیں کیا---"

اس نے یہ کہہ کر ایک دم قمیض اٹھائی' ایک چھوٹا سا خنجر نیفے میں اڑسا ہوا تھا۔ اسی لمحے اچانک طوطا پھڑپھڑایا۔ "اللہ میری حفاظت کرنا' اللہ میری حفاظت کرنا---" جیسے ٹیپ ریکارڈر آن ہو گیا ہو' یہی الفاظ وہ بار بار دُہرا رہا تھا اور اِدھر وہ رو رہی تھی۔ سسکیاں بھرتی ہوئی کہنے لگی۔

"جب بھی کوئی مجھے ہاتھ لگاتا ہے تو مَیں یہی الفاظ دہراتی ہوں اور طوطا بھی---"

"تمہارا نام---؟" مَیں نے پوچھا۔

"امبی--- اصل نام امینہ ہے۔" اس نے بتایا۔

"امبی کیوں---؟"

"مجھے بچپن سے امبیاں بہت پسند ہیں---؟"

"آم کیوں نہیں---؟"

"ان میں مٹھاس بہت ہوتی ہے اور--- اور مردوں کی مانند رنگ بہت بدلتے ہیں۔ امبی یک رنگی ہوتی ہے ترشی اور مٹھاس کا ایک عجیب سا امتزاج--- زندگی کی

طرح---"

"اتنی سی عمر میں ایسے مشاہدے اور تجربے کی باتیں--- پڑھی لکھی اور کسی اچھے گھرانے سے لگتی ہو۔ پھر یہاں اس جگہ' اس بازار میں---؟"

"تم بھی تو پڑھے لکھے' عزت دار گھرانے سے لگتے ہو۔ تم اس بازار میں---؟"

مَیں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ "تم بحث بہت کرتی ہو---"

"جب تم کسی کے زخموں کو ایسے سوالات سے کریدو گے' پھر پیپ اور گندہ لہو تو نکلے گا--- تم اسے بحث کہہ سکتے ہو۔"

یہ میری زندگی میں پہلی لڑکی تھی جس کے سامنے میری بولتی بند ہو گئی تھی۔ مَیں نے اس سے باقاعدہ عشق کیا اور پھر جب مَیں اسے بتائے بغیر بمبئی بھاگ گیا تو اس کی جان چھوٹی--- دراصل مَیں خود ہی اس کے سامنے دابو ہو گیا تھا۔ میری عادتیں بھی ایسی تھیں کہ مَیں اس پاک دامن شریف لڑکی کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مَیں اب جب بھی میٹھے آم کھاتا ہوں تو مجھے وہ کھٹی میٹھی امبی یاد آ جاتی ہے۔ تین برس مَیں نے اس سے عشق گھسیٹا' ایک بار بھی اس نے بھولے سے پنچے پہ ہاتھ دھرنے نہ دیا--- بتایئے' یہ کیسا عشق تھا؟ لاکھ بہتر ہوتا کہ میں اسے ماں بہن کہہ دیتا---"

منٹو صاحب چند دوستوں کے ساتھ لکشمی چوک سے گزر رہے تھے' رتن سینما کے پاس ایک ریڑھی والا نوجوان نظر آیا جو آم بیچ رہا تھا۔ چھیل چھبیلا' بڑا خوبصورت--- پاس پہنچ کر اس کے سراپے کو دیکھنے لگے' اک نظر آموں پہ ڈالی' بھاؤ پوچھے بغیر سب بندھوا لئے اور پیسے دینے کے بعد اسے کہنے لگے۔

"برخوردار! سیدھے گھر کا رستہ پکڑو---" مزید دو روپے دیتے ہوئے تاکید کی۔ "ان کی مٹھائی لیتے ہوئے جانا---"

ساتھی حیران کہ منٹو صاحب کو کیا سوجھی' ڈھیر سارے آم خرید لئے اور پھر زبردستی اسے مٹھائی کے ساتھ گھر بھیج رہے ہیں--- آموں سے لدے پھدے' "چٹان" کے دفتر کے پہنچے' شاید آغا شورش کے ہاں آم پارٹی جانے کا ارادہ تھا۔ آموں کے بوجھ سے ہانپتے ہوئے دوست نے پوچھ لیا۔

"یہ الٹی گنگا کیسی--- انگور کی بیٹی کی جگہ آم کے بیٹے' اتنے سارے آم---؟"

سنہری فریم' شفاف عدسے' مسکراتی ہوئی شرارتی آنکھیں--- جواب دیا۔ "یار! تم نے اس جوان کو غور سے دیکھا--- اس کا کھلا ہوا شاداب چہرہ' تیل سے چپڑے ہوئے سنہری بال' نئے کپڑے' آنکھوں میں سرمہ' ہاتھوں پہ تازہ تازہ مہندی' انگلی میں سونے کی انگوٹھی--- اس کی نئی نئی شادی ہوئی ہے۔ آم نہ جانے کب بکتے' نہ بکتے۔ یہی سوچتے ہوئے سارے خرید لئے کہ بچہ جلد گھر چلا جائے' اس کی نئی بیاہتا دلہن خوش ہو جائے گی۔ آج ہماری طرف سے ہی موج میلہ کر لے--- وہ دو روپے اس کی بیوی کی سلامی تھی---"

واہ رے آم!

✿✿✿

کہندے نیں نیناں

خواب و بیداری سے یادِ یار میں غفلت نہ ہو
اصطلاحِ اہلِ دل میں یہ ہی کہلاتی ہے نیند

سنتے آئے ہیں کہ نیند سولی پہ بھی آجاتی ہے۔ ہمیں تو ذاتی طور پر ایسا تجربہ نہیں، یہ کوئی سولی پہ لٹکنے والا ہی بتا سکتا ہے یا کوئی تارا مسیح اس معاملے میں زبان کھول سکتا ہے۔ ہمیں تو حیرت ہے کہ اس موقع پہ بھی مجرم ہاتھ ٹخنے بندھوائے، چہرے پہ سیاہ میلا کچیلا بدبودار غلاف چڑھوائے کھڑے کھڑے نیند سے نین ملانے لگتا ہے جبکہ چند لمحوں بعد اس نیند کی بڑی بہن سے بھی اسے بغلگیر ہونا ہوتا ہے۔۔۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نیند کانٹوں کی سیج پہ بھی آجاتی ہے۔۔۔ آجاتی ہوگی، ہمیں تو اس کا بھی کوئی تجربہ نہیں اس لئے ہم چند ایک موقعوں کے علاوہ کبھی کسی سیج پہ لیٹے ہی نہیں البتہ فرش یا کسی جھلنگی چارپائی پہ دھرنا دے لیتے ہیں اور پھر سیج پہ یہ کانٹے بچھانا بھی کیا کوئی ضروری ہے؟۔۔۔ ہاں، اگر میسر ہو تو حسب توفیق ایک آدھ پھول پتی ساتھ رکھی جا سکتی ہے یا پھر ایک دو فاضل تکئے رکھ کر شوق پورا کیا جا سکتا ہے۔ سیج اور گھریلو چارپائی میں فرق شاید پھول پتیوں کا ہی ہوتا ہے۔ چارپائی پہ آتی پائنتی پورا کنبہ سو، بیٹھ یا سستا سکتا ہے بلکہ مرغی، بلی اور بکری تک بیٹھ سکتی ہے جبکہ سیج ان خرابات کی متحمل نہیں ہوتی۔ یہ کسی محبوب کی خاطر تواضع اور آرام و قیام کی خاطر بچھائی جاتی ہے اور پھر یہ سونے سے زیادہ جاگنے یا اوپر بیٹھ کر انتظار کھینچے کے لئے ہوتی ہے۔

وارث شاہ نے اپنی منظوم کتاب "اصلی تے وڈی ہیر وارث شاہ" میں ہیر کی سیج کی

بڑی دلنشین انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ فلم "ہیر رانجھا" کا وہ سین بھی نظر کے سامنے ہے کہ نووارد رانجھا تھکاماندہ دریا کے کنارے اُترتا ہے' سامنے ہرے بھرے باغ میں رنگیلے منقش پایوں والی بڑی سی سیج اس کے انتظار میں خالی پڑی ہوتی ہے۔ تھکاوٹ اور نیند کے غلبے میں وہ اس پہ ذرا کی ذرا بیٹھ جاتا ہے' قدرے سکون ملتا ہے تو پھرپاؤں پسار لیتا ہے۔ بیلے کی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا' باغ باغیچے کی معطر فضا' قمریوں' بلبلوں کی ترنم ریزیاں۔ وہ پُرسکون نیند کی آغوش میں محوِ خواب ہو جاتا ہے۔ بس یہی چند لمحے تھے جو وہ کسی سیج پہ سویا۔ اس کے بعد اس بے چارے کو مویشیوں کے چارے کی کھُرلیاں ہی نصیب رہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کھُرلیوں میں اسے نیند آتی تھی یا نہیں؟ لیکن میرا خیال ہے' وہ مزے سے سوتا ہو گا۔ کانٹوں سے کی سیج سے تو یہ بہر طور بہتر ہوں گی۔ یہ نیند ہی تھی جو ہیرے تصادم کا باعث بنی' اسی کی وجہ سے بوبک' کیدو' سیدو' اس کی عشق پیشہ بہن اور جوگیوں سے تعارف ہوا۔۔۔ اپنے قبلہ مرزا صاحب بھی ان کی جہاندیدہ والدہ صاحبہ اور تجربہ کار ہمشیرگان نے بار ہا سمجھایا کہ عزیز از جان! راہِ عشق میں بڑھتے ہی رہنے میں منزل ملتی ہے۔ یہ گھڑی دو گھڑی کمر سیدھی کرنے کی عادت چھوڑ دو مگر وہ عاشق اور نیند کا رسیا ہی کیا جو کسی کی نصیحت پہ کان دھرے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا صاحب نیند کے ہاتھوں نیزہ ریز ہو گئے۔۔۔ مہینوال میں بھی یہی عیب تھا۔ بھینسیں' کٹے کٹیاں چر رہے ہیں یا جگالی کے شغل میں مصروف ہیں اور یہ کسی ببول کے سائے میں سوئے پڑے ہیں۔ سوہنی بے چاری بچ بچا کر آتی تو یہ اس کے نرم زانو پہ سر رکھے جمائیاں توڑنے لگتے۔ سوہنی کی غرقابی کے سمے بھی یہ سوئے ہوئے تھے۔ وہ چیختی چلاتی رہی' کچا گھڑا کبھی کا ساتھ چھوڑ چکا تھا' ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ طوفان بادوباراں' ایسے موسم میں نیند بھی خوب چڑھائی کرتی ہے۔ نیند کے گھوڑے نے کہیں جھٹکا دیا تو "بچاؤ بچاؤ" کی آواز کان پڑی۔ بھاگے' ٹھوکریں کھاتے دریا کنارے پہنچے تو دُور' بیچ دریا سوہنی غوطے لے رہی تھی۔ چھلانگ لگائی' زانوں کا زخم بھی ابھی ہرا تھا۔ دوبازو' ایک ٹانگ' چپو چلاتے رہے۔ چناب کا ٹھنڈا پانی' سہلاتی لہروں کی آغوش' سرسراتی گدگداتی ہُوا۔ پچھلی نیند کا خمار ابھی ٹوٹا نہ تھا' آنکھوں میں طراوٹ اتری تو جھپکی لے لی' مُردہ تاری کرتے ہوئے سوہنی کے پاس گزر رہے تھے کہ اس نے ان کی ٹانگ پکڑ لی مگر سویا ہوا کیا کسی کو سہارا دے گا۔ چنیوٹ تک وہ بے چاری انہیں جگانے کے

جتن کرتی رہی۔

پنوں کی بھی یہی خراب عادت تھی۔ سفر کے دوران ڈاچی کی مہار اس کے گلے کے گرد لپیٹ کر سوجایا کرتا تھا۔ ڈاچی تھل میں اِدھراُدھر گھوم گھام کر واپس ٹھکانے پہ آجاتی اور سسی انتظار میں بیٹھی بیٹھی صبح کر دیتی' پھر مایوس ہو کر وہ بھی گھر آکر سو جاتی البتہ مراد رات کو وقت پہ پہنچ جاتا' سسی کو اس معاملے میں اس سے کبھی شکایت نہ ہوئی کیونکہ مراد بلوچ سارا دن بغیر کچھ کھائے پیئے سویا رہتا۔ میرا اپنا خیال ہے کہ عشق میں نائیٹ شفٹ کی ابتدا اسی سے ہوئی تھی۔۔۔ باقی رہے' مجنوں میاں! تو دن ہو یا رات' ایک عالمِ غنودگی ان پہ طاری رہتا۔ انہیں کسی نے نہ جاگتے دیکھا' نہ سوتے۔ ایک درمیانی سی کیفیت ہمیشہ رہتی۔ اسی وجہ سے ایک عجیب وحشت ان کی آنکھوں سے ٹپکتی رہتی تھی۔ لیلیٰ کے محلوں کے نیچے کشکول پکڑے اک لمبی سی لائن میں لگے کھڑے رہتے' زیادہ نقاہت محسوس ہوتی تو دیوار کے ساتھ سہارا لے لیتے۔ لیلیٰ کے کتے کی راہ دیکھتے رہتے اور وہ ستم ظریف بھی ان کے چیتھڑوں کو بھیڑیے جان کر بھنبھوڑتا رہتا۔ میاں مجنوں کو اس کی اس اٹکھیلی سے بڑا سکون حاصل ہوتا' اکثر اوقات اتنا پیار آتا کہ اٹھا کر چوم لیتے۔ تبدیلی طبع کی خاطر کبھی کبھار صحراؤں کی جانب نکل لیتے' ایسا اکثر تب ہوتا جب لیلیٰ بی بی کا منہ چڑھا کتا اپنی کسی ضروری حاجت کی فراغت کی غرض سے ادھر کا رخ کرتا۔ وہ انہیں اپنے پیچھے آتے دیکھ کر بھونکتا رہتا' پھر انہیں غچہ دے کر کسی ٹیلے کی اوٹ ہو لیتا۔ یہ وحشت میں گانا شروع کر دیتے ۔

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں مَیں بن میں
لیلیٰ پیاری بسی مورے من میں

گڑھا پُر کر کے کتا کسی ٹیکری کی اوٹ سے ظاہر ہو جاتا اور بھول بھوں یعنی "پاگل ای اوے" کہتا ہوا محلوں کی جانب بھاگ لیتا۔ یہ وفورِ غیض سے گریباں چاک' خاک اڑا کر صحرانوردی پہ نکل جاتے' دوسرے لفظوں میں یہ کتے کے خلاف احتجاج ہوتا۔ لیلیٰ انہیں کئی دنوں سے غیر حاضر پا کر سخت متردّد ہوتی' کئی کئی بار کتے کو باہر بھیجتی۔ درشن پوائنٹ یعنی دریچے میں بہلانے بہانے کھڑی ہوتی مگر اپنے دیوانے کو نہ پا کر سمجھ جاتی کہ مزاجِ یار برہم ہیں۔ کچی کھجوریں کھانے کے بہانے صحرا کو نکل لیتی' کتا بھی ساتھ ساتھ بھاگ رہا

ہوتا۔ ناقہ نتھنے پھلا کر بلوِ مغموم کا کھُرا اُٹھاتی ہوئی رُخ پکڑتی' وادیٔ سراب کے اس پار نخلِ نا آسودگاں میں بابا عشقِ مجازی کے مزار پہ قیس قمیض کی دَھجیاں اُڑا اُڑا کر قوالی گا رہا ہوتا۔ یہ محمل کا پردہ سرکا' نقاب ہٹا کر اس کی آشفتہ سری کا ملاحظہ کرتی اور پھر دھیرے سے اس کے پیچھے پہنچ کر شانے پہ ہاتھ رکھتی' کھانا کھلا کر نیا جوڑا کپڑوں کا عطا کرتی۔

فرہاد صاحب اور وامق' یہ دونوں بڑے شریف اور محنتی عاشق تھے۔ نکھٹو' ہڈ حرام اور ہتھ ٹُٹے نہیں تھے۔ عشق میں محض نام ہی نہیں' کچھ کام بھی دکھانے پہ یقین رکھتے تھے۔ عشق کو کُل وقتی نہیں بلکہ جُزوقتی مشغلہ یا وظیفہ گردانتے تھے۔ دوسرے نکمے عاشقوں کے بر عکس جاگتے اور مصروف کار زیادہ رہتے۔ کپڑے' جوتے' کھانے' ناشتے کا خیال رکھتے--- اوچھے اور بازاری عاشقوں کی طرح تاک جھانک نہیں کرتے تھے' کہنے کا مطلب ہے کہ بڑے حیا والے مردِ عاشق تھے۔

بات نیند سے چلی تھی کہ اکثر لوگوں کو نیند کا "ہوکا" ہوتا ہے۔ ایسے افراد میں زیادہ تر وہ لوگ--- جو بے کار' غیر ذمہ دار' آرام پسند' اکلوتے لاڈلے' تنہائی طلب یا پھر کسی ذہنی یا جسمانی عارضے کی وجہ سے مجبور ہوتے ہیں۔ ساٹھے پاٹھے یا اس سے آگے کی منزل پہ پہنچے ہوئے مجھ ایسے قریب القبر بڈھے ہوتے ہیں۔ یہ سب موقع بے موقع' وقت بے وقت نیند لینے کی عادت پوری کر لیتے ہیں۔ اپنے گھر کا کیا مذکور' یہ اللہ کے گھر میں احوالِ قبر' سانپ بچھو' بجو' جیسے حشرات الارض کی اذیت اور جہنم کے لرزہ بپا کر دینے والے عذاب کے بیان کے دوران بھی لاپروائی اور نری ڈھٹائی سے خراٹے توڑتے نظر آتے ہیں۔ ایسے نیندرئیے' مساجد اور فرشی مجالس میں دیواروں' ستونوں اور پچھلی صفوں میں دھرے ہوتے ہیں۔ گہرے شیڈ کی عینک یا سر پہ بڑا سا رومال رکھتے ہیں جن کی اوٹ میں ان کی بند آنکھیں دکھائی نہیں دیتیں۔ یہ بہت بڑے ایکٹر ہوتے ہیں۔ مراقبے کی سی نشست اختیار کرتے ہیں' ہاتھ ناف پہ باندھ کر سر جھکا لیتے ہیں۔ ہر تین چار منٹ کے وقفے پہ سر اٹھا کر دائیں بائیں دیکھیں گے اور "اللہ" کہہ کر پھر سر جھکا لیں گے۔ خراٹے ایسی صفائی سے لیں گے کہ دائیں بائیں کو محسوس ہو گا' بزرگوں کا قلب جاری ہے۔ اکثر قعدے میں بیٹھے بیٹھے سو جاتے ہیں۔ لوگ سلام پھیر کر دعا مانگ رہے ہوتے ہیں' یہ ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے قیام پکڑ لیتے ہیں--- ایک مرتبہ فرضوں کے اختتام پہ مَیں نے جب دائیں

جانب گردن موڑتے ہوئے "السلام علیکم ورحمتہ اللہ" کہا تو سوئے بزرگ نے ہڑبڑا کر قدرے توقف سے "وعلیکم السلام" جواب دیا' بلکہ باقاعدہ مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

اکثر اخباروں کی تصویروں میں آپ نے بڑے بڑے لیڈروں کو پارلیمانی اجلاس میں گھوڑے بیچتے دیکھا ہو گا۔ آنجہانی خروشیف' روز ویلٹ' سرونسٹن چرچل' پنڈت نہرو' بابائے اردو' اپنے اقبال تک ٹھونگا لگا جایا کرتے تھے۔ جسٹس کیانی مرحوم بھی باز نہیں آتے تھے۔ جب ذرا نیند میں وقفہ آتا تو "واہ واہ' سبحان اللہ" کہتے جیسے شعر محسوس کر کے داد دے رہے ہوں۔ اختر شیرانی' عبدالحمید' عدم مجید لاہوری بڑی ہوشیاری سے یہ کام کرتے تھے۔ مجید صاحب کی تو باقاعدہ شرارتی سی آنکھیں کھُلی رہتی تھیں۔ داد بھی دی جا رہی ہے' مسکرا بھی رہے ہیں اور سوئے ہوئے تو ہیں ہی--- ساغر صدیقی اکثر غٹ رہتے تھے اس لئے اندازہ نہ ہوتا کہ مدہوش ہیں یا خواب خرگوش میں ہیں۔ باقاعدہ کبڑ نکال' دُلہن کی مانند دہرے ہو کر لیٹ جاتے تھے۔

خالق دینا ہال کراچی میں بڑی اونچی سطح کا مشاعرہ تھا۔ ہند و پاک کے بڑے بڑے شعراء موجود تھے۔ ریڈیو ڈائریکٹ ریلے کر رہا تھا۔ سٹیج شعراء کرام سے جل تھل تھا۔ کچھ شعراء سامعین کی اگلی صفوں میں بھی تشریف فرما تھے۔ غیر متوقع طور پر سامعین کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا۔ غیر مدعوین شعراء کی تعداد بھی کافی تھی۔ ہر شاعر پڑھنا چاہتا تھا اور سامعین سب کو سننا چاہتے تھے داد و تحسین اور ہوٹنگ بھی چل رہی تھی۔ انتظامیہ کے لئے پریشانیاں پیدا ہو گئیں۔ شعراء کی ترتیب بگڑ گئی۔ جو پڑھ رہا ہے وہ لسٹ پہ نہیں اور جس کی باری ہے وہ ہال میں ہی موجود نہیں۔ ایسی ہی صورت حال میں جگر غائب تھے۔ ادھر ایک صاحب باتھ روم کے باہر آزاربند پکڑے کھڑے تھے اور اندر والا شاید کسی مصیبت میں گرفتار تھا کہ باہر برآمد ہی نہیں ہو رہا تھا۔ دروازہ کئی بار کھٹکھٹایا گیا مگر جواب ندارد' دو چار اشد حاجت والے بھی لائن میں آ کھڑے ہوئے تھے' انہوں نے بھی دروازہ پیٹا مگر وہی خاموشی--- ایک بے شرم نے دوسرے کے کاندھے پہ چڑھ کر اندر جو جھانکا تو جگر صاحب بڑے مزے سے کموڈ پہ اکڑوں سو رہے تھے۔ پھندنے والی رومی ٹوپی بغل میں دابے ہلکے ہلکے خراٹے لے رہے تھے--- ساغر صدیقی تو کئی مرتبہ سٹیج کے نیچے سے نکالے گئے۔ شاد امرتسری بھی سونے کے بادشاہ تھے۔ مولانا عبدالمجید سالک' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم بھی

مشاعروں میں نیند کے کچے تھے۔ ہم نے تو ایک نامور قوال کو بھی سٹیج پہ لے کاری کے دوران نیند میں ڈبکی لگاتے دیکھا ہے' ساتھ ہار مونیم پہ بیٹھے ہوئے بھائی نے کہنی کی ٹھونگ سے ہوشیار کیا۔ ریکارڈنگ کے دوران ریکاٹسٹ سو جاتے ہیں۔ سٹوڈیو فلور میں اوپر مچانوں پہ بیٹھے ہوئے لائٹ مین اکثر اپنی نیند وہیں پوری کر لیتے ہیں' ایک سوتا ہوا لائٹ مین لائٹ سمیت گر گیا۔ پھر شام کو اسے دفنا دیا گیا تھا۔ مدارس کے جیمنی سرکس کے دو نہایت قیمتی فنکار' ایک دوسرے اہلکار کی نیند کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ وہ فلائنگ جھولے کی بک بروقت نہ پھینک سکا اور معلوم ہوا کہ وہ اوپر ٹینٹ پہ سو گیا تھا۔۔۔۔ کالجوں میں پروفیسر' لیکچرار' سکولوں میں استاد' کچہریوں میں عدالتوں کے مجسٹریٹ جج' تھانوں میں افسران اور عملہ' دفتروں میں کار کن' واسا کے ٹیوب ویلوں کے آپریٹر' واپڈا کے لائن مین' فائر بریگیڈ کا عملہ۔ جیلوں' ہسپتالوں کے سینئر بڑے لوگوں کے چپڑاسی' صفائی کرنے والا عملہ' ٹیلی فون ایکسچینج والے' ریلوے کے گارڈ ڈرائیور' ریلوے لائینوں کی نگرانی والا عملہ' ریلوے کراسنگ والے بیشتر اوقات قیلولے کے عالم میں ہی ہوتے ہیں۔ پتا نہیں یہ قوم کب جاگے گی۔۔۔۔ کچھ پیرانِ عظام تو اکثر غنودگی کے عالم میں ہوتے ہیں جسے وہ مراقبے کا نام دیتے ہیں۔ آج تک میری یہ سمجھ میں نہ آ سکا کہ کیسا مراقبہ ہے جو بیچ بازار' سینکڑوں ہزاروں کے مجمع میں عود کر آتا ہے۔ مراقبے کے لئے تو یکسوئی' تنہائی اور ماحول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اغلب یہی ہے کہ پیٹ اور جیب جب بھاری ہو تو آنکھوں کے پپوٹے بھی بھاری ہو جاتے ہیں۔ آنکھوں میں سُرمہ' عطرِ حنا کی سکون آور مہکی مہکی خوشبو' مرغن غذاؤں کا خمار' رگوں میں گیلنوں سُرخ لہو کی یلغار' صدری میں درہم و دینار' قیمتی گھڑی کی طلائی زنجیر' شانوں پہ مُشکیں زُلفِ گرہ گیر' انگشتریوں میں عقیق و مرجان' زربفت کی عبا' دیبا کی قبا' مال و جمال' آسودہ حال۔ خُور بدَبت' ایں بہشت است۔ اب بھی پپوٹے بھاری نہ ہوں' خلوت جلوت میں نیند طاری نہ ہو؟۔۔۔ خیر' اگر کوئی شخص نیند کا متوالا ہے تو کسی کا کیا لیتا ہے۔ خوب سوئے' حشر تک سوئے لیکن کچھ لوگ ایسے ہی ہیں جن کی نیند یا غنودگی مجھے اور آپ جیسے کینوں کو ہمیشہ کے لئے سلا سکتی ہے۔ یہ ویگن' بس' ٹرک' ٹرالر کے اکثر ڈرئیور صاحبان ہیں۔ محصول' کسٹم' پولیس' ڈاکوؤں' جیب کتروں' ملک الموت اور شیطان سے ان کا ٹک مکا ہوتا ہے۔ پرچون اور تھوک' دونوں طرح سے یہ کاروبار کرتے

ہیں۔ ان کی گاڑیاں تو صرف پٹرول اور ڈیزل سے چلتی ہیں لیکن یہ خود سگریٹ' چرس' نسوار' شراب' سپیشل کڑاہی گوشت' عطا اللہ نیازی' اللہ دِتا لُونے والا اور منصور ملنگی سے چلتے ہیں۔ ڈبل چونا کتھا' تین سو گرو ان کا اسٹارٹ ہوتا ہے۔ ان کا اعلان ہوتا ہے کہ سواری اپنے سامان کے علاوہ اپنی جان مال' عزت اور ایمان کی خود ذمہ دار ہے۔ اپنے کپڑوں' گٹے گوڈوں' پسلیوں' کان کے پردوں' سردرد' پیشاب کی رکاوٹ' دو نمبر ہوٹلوں' باسی برگروں' سموسوں اور زہریلی چائے وغیرہ سے نقصانات اور نتائج کے بھی آپ خود ہی ذمہ دار ہیں۔ آج آپ کو ہر تیسرا شخص جو مخبوط الحواس' دِق زدہ' مرِیل اور سڑیل مزاج دکھائی دیتا ہے جسے نہ تو سنائی دیتا ہے اور نہ صحیح سے دکھائی دیتا ہے۔ کمردرد' سر سے فارغ البال' شادی سے بیزار ہے تو وہ یقیناً اس ٹرانسپورٹ سسٹم کا ڈنگا ہوا ہے۔ لاہور سے ملتان' اسلام آباد' سرگودھا کے درمیان سفر کرتا رہا ہے یا اس کا یتیم خانے کے چوک' سمن آباد موڑ' بتی چوک' کلمہ چوک' مزنگ' ریلوے اسٹیشن پہ کوئی کاروبار ہے یا وہاں قریب رہائش پذیر ہے۔

بات نیند اور ڈرائیوروں کی تھی۔ ایک دفعہ مجھے ملتان جانا تھا۔ بڑی مشکلوں سے فرنٹ سیٹ حاصل کی کہ آرام سکون سے کھُلاڈُلا بیٹھ کر سفر سے لطف اندوز ہوں گا۔ فلائنگ کوچ بھی نئی تھی۔ ڈرائیور بھی صاف ستھرا' جی دار دکھائی پڑا۔ رات کا سفر تھا' سامان کا جھنجھٹ بھی نہیں تھا۔ ایک کتاب اور اخبار لئے بڑے خوش گوار موڈ میں اپنی نشست پہ بیٹھ گیا۔ سواریاں پوری تھیں' فولڈنگ سیٹیں خالی تھیں۔ میرے اور ڈرائیور کے درمیان انجن کے بونٹ پر چھوٹی سی سیٹ پہ ایک مکروہ شکل بدمعاش سا آ بیٹھا۔ لمبی لمبی ٹانگیں پھیلانے کے لئے جگہ نہ تھی' وہ ترچھا ہو کر ٹانگیں سمیٹے ڈرائیور کی جانب منہ کر کے باتیں کرنے لگا۔ مجھے بڑا ناگوار گزرا کہ یہ کیا مصیبت آ بیٹھی۔ گاڑی اڈے سے نکل کر سڑک پہ آئی تو میں نے بڑے پیار سے ڈرائیور سے کہا۔

"یہاں یہ تنگ بیٹھے ہیں۔ انہیں پیچھے فولڈنگ سیٹ پہ بیٹھا دیں' انہیں بھی سہولت رہے گی۔"

ڈرائیور کی بجائے وہ اُجڈ بولا۔ "مولبی صاحب! دل تنگ نہیں ہونا چاہئے' جگہ تنگ نہیں ہوتی۔"

میں اپنا سامُنہ لے کر رہ گیا۔ موڈ بگڑ چکا تھا' مَیں نے کتاب کھول لی۔ یتیم خانہ چوک پہنچ کر کاروان ہوٹل کے پاس گاڑی رکی۔ وہ اجڈ پان لینے کے لئے اترا' ڈرائیور بھی گاڑی بند کر کے اتر گیا--- دو سواریاں یہاں سے سوار ہوئیں۔ دس منٹ۔ پندرہ' بیس--- مَیں نیچے اترا' سوچا کہ ذرا فراغت حاصل کر لوں۔ وہ دونوں پاس پان کی دوکان پہ کھڑے باتیں کر رہے تھے' مَیں بھی وہیں پہنچ گیا۔ میٹھی سونف اور سپرائیٹ کی بوتل لی' اپنی عادت کے مطابق مَیں نے انہیں بھی بوتل پینے کا پوچھ لیا۔ وہی اجڈ جھٹ بولا۔

"ضرور پئیں گے' آپ جیسے نیک بزرگ پلائیں اور ہم نہ پئیں---؟"

واپس آئے تو گاڑی فل تھی۔ دو لیڈیز سواریاں بھی تھیں' وہ ایک ساتھ سیٹ مانگ رہی تھیں۔ ایک ساتھ سیٹوں والے اپنی جگہ خالی کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بڑی بک بک جھک جھک کے بعد ایک بار پھر روانہ ہوئے' ٹھوکر نیاز بیگ کے پاس پہنچ کر اس اجڈ نے اپنی لمبی سی ٹانگیں میری والی طرف گھُسیڑ دیں۔

"بھائی! یہ آپ کیا کر رہے ہیں' یہاں صرف ایک مسافر کے پاؤں رکھنے کی جگہ ہے---" مَیں نے اپنے پھنسے ہوئے پاؤں نکالتے ہوئے احتجاج کیا۔

"مولبی صاحب! دل وچ تھاں ہونی چاہئے' جگہ کی کمی نہیں۔ آپ بھی پاؤں دھرلیں---"

اب ڈرائیور بولا۔ "حاجی جی! یہ اپنا جگر ہے--- اوکاڑے اتر جائے گا' بس گھنٹے ڈیڑھ کی بات ہے۔"

بھینسے کے پاؤں تلے پاؤں' دانتوں تلے زبان' صبر اور جبر کے گھونٹ پی خاموش ہو لیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ پھر وہ واقعی اوکاڑے اتر گیا۔ پاؤں جیسے شکنجے میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ چپل پہنے ہوئے تھا' ٹخنے رگڑ سے سرخ ہو رہے تھے' مَیں نے ڈرائیور کو سونف کی رشوت پیش کرتے ہوئے التجا کی۔

"بھائی! یہاں اب کسی کو نہ بٹھانا---"

"نہیں جی' حاجی صاحب! وہ اپنا جگر تھا' یہیں رہتا ہے۔ صبح کی گاڑی سے لاہور واپس جائے گا۔"

اوکاڑہ پیچھے رہ گیا تھا۔ ہم ہوا کی طرح اڑے جا رہے تھے۔ سواریاں سکون سے سونے

کی کوشش میں مصروف تھیں کہ ڈرائیور نے ڈیک کو ٹٹولا' میں بڑا خوش ہوا کہ ہلکی ہلکی موسیقی مزہ دے گی' سفر خوشگوار کٹے گا۔

"یار! آپ کے پاس نورجہاں کی ٹیپ ہے--- پرانے سے گیت۔"

مَیں نے آگے جھک کر آہستہ سے کہا تھا کہ پچھلی لیڈیز سواریاں نہ سُن لیں--- اس نے مجھے یوں گھُورا جیسے مَیں نے کوئی بہت ہی ناگوار سی بات کہہ دی ہو اور خبیث سی مسکراہٹ سے گویا ہوا۔

"حاجی صاحب! ایس عمرے اے شوق' جوانی وچ کی شے ہوؤ گے---؟"

یقیناً آدھی گاڑی نے تو سُن لیا ہوگا۔ مجھ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا' شرمندگی سے سامنے سڑک پہ نظریں جما دیں۔ خود کو سنبھالنے کے لئے سونف منہ میں ڈال لی' عادتاً اسے بھی پیش کی۔ وہ سونف منہ میں ڈال کر پوچھنے لگا۔

"حاجی صاحب' ناراض ہو گئے او؟--- اے بے ہی ایسی اے' ایہنوں مُنڈے گھٹ تے بڈھے زیادہ سُندے نے--- حاجی صاحب! تہاڈی کی عمر ہونی ایں' خیر نال؟"

اس کم بخت نے پھر اوچھا وار کیا تھا۔ اب میں کس طرح اسے سمجھاتا کہ بھلے مانس! اگر تو نے ایسی بیہودہ باتیں ہی کرنی ہیں تو کم از کم آہستہ تو بول' کیوں دو سروں کو سنا سنا کر میری "بے عزتی خراب" کر رہا ہے؟--- مگر وہ تو ڈرائیور تھا' آدابِ گفتگو سے اسے کیا سروکار؟

"ہاں' جواب نہیں بے دتا---؟"

"بھائی! مَیں اپنی عمر کیا بتاؤں' یہ بھی کوئی بتانے والی چیز ہے---؟"

"حاجی صاحب! کی گل اے' اپنی عمر دے کانے او--- اج تے زنانیاں جواب دیندیاں نیں---"

پیچھے سے کسی عورت کی ہنسی کی آواز آئی۔ پھر اس کے ساتھی مرد کی آواز ابھری' وہ شاید میرے بارے میں کوئی تبصرہ کر رہا تھا--- حلق خشک' سینہ دھک دھک--- الٰہی! کس گنوار اور واہیات پاگل سے واسطہ پڑا ہے؟--- مَیں پچھتا رہا تھا کہ یہاں فرنٹ سیٹ پہ کیوں بیٹھا' آرام سے پیچھے کہیں ٹِک جاتا' سائیڈ شیشے سے سر لگا کر کچھ دیر آرام کر لیتا--- اس کے لئے کوئی جواب سوچنے لگا' ڈر تھا کہ کہیں اور بکواس نہ کر بیٹھے۔

"یار! آپ لاہور رہتے ہیں یا ملتان؟"

"حاجی صاحب! مَیں آپ کی نورجہان کے شہر میں رہتا ہوں۔۔۔"

کم بخت نے یہ کہتے وقت نورجہان پہ خاصا وزن ڈالا تھا۔ میرا تو بلڈ پریشر ہائی ہو گیا مگر اس سے پہلے کہ میری زبان سے کوئی فائر ہوتا' ڈیک آن ہو چکا تھا۔ والیم فل۔۔۔ کیا خرابات تھی۔ کم از کم مَیں تو یہی سمجھا کہ کوئی انتہائی مفلوک الحال دوست اپنے آسودہ حال' بے وفا دوست سے انتہائی عاجزی سے درخواست کر رہا ہے کہ یار! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو اور برائے کرم ایک ٹکٹ میرے لئے بھی لے لو۔۔۔ لاحول ولا!۔۔۔ مَیں نے بڑی احتیاط سے پیچھے مسافروں کی جانب نگاہ کی۔ سوئے ہوئے مسافر بڑبڑا کر پھٹی پھٹی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ چلو' کچھ تو فضا تبدیل ہوئی۔ میرا ذہن بھی اس تبدیلی سے کچھ ہلکا ہوا۔۔۔ ایک گانا' دوسرا' تیسرا' سب ہی اسی قبیل کے۔ اک بے ہنگم شور۔ ساز کہیں' آواز کہیں۔ پیچھے سے ایک ادھیڑ عمر کا معزز سا آدمی آگے آیا اور ڈرائیور سے درخواست کی کہ یہ بیہودہ گانے بند کر دیں یا پھر اتنا والیم کھولیں جسے صرف آپ ہی سن سکیں۔ ڈرائیور کے کچھ جواب دینے سے پیشتر' ایک دو اور بول پڑے۔

"بند کر' یار! جے کج سننا ای ضروری اے تے فیر کوئی قوالی سنا۔۔۔"

ایک عورت بولی۔ "بند کر دے وے' پُتر! مَیں درود شریف پڑھنی آں پئی۔۔۔"

ڈرائیور نے بڑی شکررنجی سے پیچھے سواریوں کی طرف دیکھا' ناچار ایک اور ٹیپ چڑھا دی۔ اب عطاءاللہ خان نیازی کسی گوری چٹی میم کے لباس کی تعریف کر رہے تھے جو بلیک کلر کا ہے' اس پہ خوبصورت پھولوں کی بہار کھلی ہوئی ہے۔ وہ اس کو دھمکی دیتے ہیں کہ سیدھی طرح میرے آگے لگو ورنہ تمہیں میامی سے میانوالی لانا میرے لئے مشکل نہیں ہے۔۔۔ مَیں نے کم از کم یہی ترجمہ کیا' ہو سکتا ہے کہ کچھ آگے پیچھے ہو گیا ہو لیکن قریب قریب مفہوم یہی نکلتا ہے۔

"ڈرائیور صاحب! آپ کو قوالی کے لئے کہا تھا' یہ کیا لگا دیا ہے۔۔۔ کچھ حیا کرو' یار! یہاں مائیں بہنیں بھی بیٹھی ہیں۔"

پچھلی ڈبل سیٹ پہ بیٹھے ایک صاحب نے یہ جراُت دکھائی تھی۔ مَیں نے مڑ کر دیکھا' ان کے ساتھ ایک ماڈرن سی پر کٹی خاتون تھی' ظاہر ہے کہ بیوی ہوگی۔ آدھے بازوؤں والی

کالی قمیض پہ سفید کپاس کے گالوں جیسے پھول۔۔۔ مَیں نے فوراً" گردن سیدھی کر لی۔ ٹیپ بند کر دی گئی تھی۔ پہلی بار وہ مردِ بے حیا سرگوشی کے انداز میں میری جانب جھک کر انکشاف کرنے لگا۔

"گھر میں چاہے بیوی بچوں کے ساتھ بیہودہ فلمیں دیکھتے ہوں' گاڑی میں بیٹھتے ہی پکے مومن بن جاتے ہیں۔"

مَیں نے مصلحتاً ہاں میں ہاں ملائی۔

"دیکھو نا' حاجی صاحب! چھ سات گھنٹے کا سفر' کالی شا رات۔ مَیں بھی آخر انسان ہوں' باندر تو نہیں۔۔۔ ویسے باندروں کو بھی نیند آ جاتی ہے۔' موسیقی سے ذرا شغل میلہ رہتا ہے۔۔۔" پھر ایک کیسٹ نکالتے ہوئے کہنے لگا۔ "حکم کرو تے مائی دے چونڈے گانے لا دیاں۔۔۔؟"

"مائی کون۔۔۔؟"

"جی' وہی آپ کی میڈم نورجہان۔۔۔"

"انہیں آئندہ مائی مت کہنا۔ وہ تو اپنے پوتوں' نواسوں کو دادی' نانی کہنے نہیں دیتیں' زبردستی نورجہان جی کہلواتی ہیں۔ تم انہیں مائی کیسے کہہ سکتے ہو۔۔۔؟"

وہ بے ادب بڑی سردمہری سے مسکرایا' ایک تنگ سا موڑ کاٹتے ہوئے کہنے لگا۔

"معاف کرو بادیو! غلطی ہو گئی۔۔۔ گانے لگاواں؟"

"نہیں' لوگ سو رہے ہیں۔ مجھے خود بھی نیند آ رہی ہے' سر میں بھی درد ہے۔"

"توبہ' توبہ! کناں نوں ہتھ لاؤ۔ فرنٹ سیٹ والا تو سو ہی نہیں سکتا' زرا خطرہ چار سو چالی دولٹ۔۔۔ فرنٹ سیٹ والا تو آدھا ڈرائیور ہوتا ہے۔ اسی لئے تو ہم ساتھ کسی جگر کو بٹھاتے ہیں۔"

مَیں عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ ابھی تو مشکل سے ساہیوال پہنچے ہیں' آدھے سے زیادہ سفر باقی تھا۔

"بھائی! مَیں بیمار اور بڈھا آدمی ہوں' زیادہ جاگنے کی مشقت برداشت نہیں کر سکتا۔ میں تو۔۔۔"

ایک اور موڑ اور میری بات درمیان سے کاٹتے ہوئے وہ بولا۔ "آپ سے بیس سال

بڑی نورجہان' اسے تو آپ مائی کہنے نہیں دیتے اور اپنے آپ کو آپ بڈھا کہتے ہیں---
وڈیو! نورجہاں کو سننے اور چاہنے والے کبھی بوڑھے نہیں ہوتے' اس کے سدابہار نغموں کی
تاثیر انھیں ہمیشہ جوان اور تروتازہ رکھتی ہے۔ آپ نے اسے ٹیلی ویژن پہ نہیں دیکھا' قیمتی
خوبصورت ساڑھیاں' ہیرے موتی' شوخ تیز میک اپ' سولہ سترہ برس والی ادائیں اور
اشارے--- وہ آپ کو کہیں بوڑھی دادی نانی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی سچی اور کھری
سُریں' پاسے کے سونے جیسی کھنکتی آواز جو کانوں کی راہ سے روح کی گہرائیوں میں جاتی
ہے' یہی اس کی جوانی اور سدابہار شخصیت کے سحر کا راز ہے۔"

مَیں حیرت میں ڈوبا ہوا' میڈم کے بارے میں اس کا پُرمغز' حقیقت افروز' تبصرہ سن رہا
تھا۔ لُوٹنے والے' راہی اور عطاء اللہ کو سننے والا اس کی سچائی' سلامتی اور اس کی صراحت کو
بھی سمجھتا تھا۔

"اتنا کچھ سمجھنے اور جاننے کے باوجود تم ان ننگے بڑنگے لوگوں کو سنتے ہو---؟" مَیں
نے دلچسپی لیتے ہوئے مزید پوچھا۔

"باؤیو! مَیں کہاں سنتا ہوں--- جاگنا اور ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ اسی غرض سے اِک
بے ہنگم شور اور بے سُروں' بے سمجھوں کی ہاؤ ہو لگا دیتا ہوں جس سے طبیعت میں
طراوت کی بجائے تناؤ پیدا ہو جاتا ہے--- سرکار! میڈم تو جیتے جاگتے چاروں کھونٹ ہشیار
آدمی کو سروں کے تین پلٹوں میں ایسی پلٹیاں دیتی ہے کہ وہ بیچارا سُدھ بُدھ بھول کر کسی
اور جہان میں پہنچ جاتا ہے جبکہ مَیں نے سواریوں اور گاڑی کو صحیح سلامت لے کر ملتان اور
پھر لاہور واپس پہنچنا ہوتا ہے---"

ہم ان ہی باتوں میں مگن ساہیوال پہنچ چکے تھے۔ وہ مجھے لے کر ہوٹل میں آگیا' ہاتھ
روم سے فارغ ہو کر ہم دونوں ڈرائیوروں کے مخصوص کمرے میں کھانے کی میز پر بیٹھے
ہوئے تھے۔ اس کے بارے میں میری رائے یکسر بدل گئی تھی' مَیں محسوس کر رہا تھا کہ یہ
دکھائی تو ڈرائیور دے رہا ہے لیکن اصل میں اس کا کچھ اور ہے۔

"ڈرائیور بھائی! یہ آپ کی اپنی گاڑی ہے یا ملازمت کر رہے ہیں---؟"

وہ لقمہ توڑتے ہوئے بولا۔ "اتنی طاقت اور ہمت کہاں کہ گاڑی رکھ سکیں۔ ہمارے
نصیب میں تو دَر دَر کی ٹھوکریں اور ٹکے ٹکے کے لوگوں کی باتیں ہیں--- میٹرک کے بعد

مزید پڑھنا چاہا لیکن حالات نے اجازت نہیں دی۔ کلینڈری کی' پھر ڈرائیوری سیکھی۔ اچھی
بری دال روٹی چل رہی ہے۔ اللہ کا شکر ہے--- آپ بتائیں' کیا کرتے ہیں۔ بچے وچے
ہوں گے۔ لاہور رہتے ہیں یا ملتان---؟"

"یار! مَیں بوڑھا بیمار آدمی ہوں--- کرنا ورنا کیا ہے' بس اللہ اللہ ہے۔"

کھانے' چائے سے فارغ ہوئے تو پھر سفر شروع ہوا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں
ہوئیں۔ کھانے کا خمار' سیدھی سڑک کا بے زار کر دینے والا سفر' بھیگی رات کا جادو۔ مسافر
بھی مُنڈیاں ڈالے نیند کی آغوش میں پڑے ہوئے تھے' درمیان میں ایک مدہم سی سرخ
لائٹ روشن تھی۔ نیند اور تھکن نے اپنا آپ دکھانا شروع کر دیا' کوشش کے باوجود
آنکھیں خودبخود بند ہو جاتی تھیں۔ مَیں بائیں جانب شیشے کے ساتھ سر ٹکا کر ٹیکی لینے لگا۔

"باؤیو! سو گئے او---؟"

"ہوں---" مَیں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔ "بس' یار! ذرا سستی سی
محسوس ہو رہی ہے---"

خدا جانے وہ کیا کچھ کہتا رہا' میں تو بے سُدھ سو رہا تھا۔ راستے میں کہیں پولیس ناکے
پر گاڑی جھٹکے سے رُکی تو میری آنکھ بھی کھل گئی' گردن بائیں جانب جھکی رہنے سے دکھنے
لگی تھی۔ ایک پولیس والا اندر آیا' سرسری سے نظر ڈال کر اُتر گیا۔

اس نے اپنی جیب سے ایک ٹیپ نکال کر ڈیک میں ڈال دی۔ مَیں گردن کا پچھلا حصہ
شیشے سے ٹکائے منہ اس کی طرف کئے اس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا---

آواز دے کہاں ہے' دنیا میری جوان ہے

اس نغمے کا شروع کا الاپ انسان کو زمین سے اٹھا کر کہیں آسمانوں کی جانب لے جاتا
ہے۔ نیم کھلی آنکھوں کے سامنے سڑک جیسے غائب ہو گئی۔ گاڑی کی بجائے ہم کسی اڑن
کھٹولے میں' تاروں بھرے آسمان کی جانب پرواز کر رہے تھے۔ سُروں کے ہلکے ہلکے
ہلکوروں میں مسافر گہری اور میٹھی نیند کے مزے لے رہے تھے۔ عجیب سا ملکوتی ماحول' جسم
اور اس کی ساری کثافتیں جیسے آہستہ آہستہ معدوم' اس کی جگہ روح اور اس کی صلاحتیں'
لطافتیں ابھر آئی ہوں۔ سڑک کنارے ایک درختوں کے جھنڈ سے نکلے تو سامنے پونم کا
چاند مسکرا رہا تھا۔ اڑن کھٹولہ جیسے چاندنی کے قلزم میں اُتر آیا ہو۔ ایک جہانِ نور'

نورجہاں! گانا تو پانچ سات منٹ میں ختم ہو جاتا ہے" یہ کون سا سلسلہ تھا جو ازل تا ابد تک دراز ہو گیا۔۔۔ یہی نغمہ پوری کیسٹ میں ریکارڈ کیا ہوا تھا۔ ختم ہونے کا احساس تک نہ ہوتا۔ پھر وہیں سے شروع' ہر بار مختلف وجدانی کیفیتوں کی لذت آشنائی' نغمگی و آہنگ کی عجیب عجیب جہتیں اور انگ رنگ۔ کھُلی آنکھیں' اِک عالمِ سکوت۔ ہم دونوں خاموش' مدہوش سے اپنی اپنی مَن بھاونا کے بھید جان رہے تھے۔۔۔ سڑک کچھ خراب تھی یا شاید مرمت ہو رہی تھی۔ گاڑی بُری طرح اُچھل کود کرنے لگی' دھچکے لگ رہے تھے۔ اصولی طور پر رفتار میں کمی آنا چاہئے تھی' کچھ مسافر بھی جھٹکوں سے گھبرا کر جاگ پڑے مگر گاڑی تھی کہ آندھی کی طرح اُڑی جا رہی تھی۔ مَیں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا احتیاط کرنے کو کہا۔ اس نے جب سُنی اَن سُنی کی تو ہاتھ بڑھا کر میں نے ڈیک آف کر دیا' اسی ہاتھ سے اسے ٹہوکا دیا تو وہ ہڑبڑا کر میری جانب دیکھنے لگا' ادھر گاڑی بُری طرح ڈولی' کچے پہ اتر گئی۔ ٹائروں کے نیچے مٹی پتھر رگیدے جا رہے تھی۔ مسافر کلمہ پڑھنے لگے۔ کچھ دُور آگے بریک چیخے' زبردست جھٹکے سے گاڑی رُک گئی۔ الٰہی خیر!۔۔۔ وہ وہ مسکراتے ہوئے میری جانب دیکھنے لگا۔ میرا رنگ فق' مسافر گھبرائے ہوئے کھڑکیوں سے باہر اندھیرے میں دیکھ رہے تھے۔

"کیا ہوا' خیریت تو ہے۔۔۔؟" ایک مسافر پوچھنے لگا۔

"سب خیریت ہے۔ سڑک خراب ہے' مرمت ہو رہی ہے۔" مَیں نے ہی جواب دیا۔

بلویو' اجازت ہو تو ایک سگریٹ پی لوں۔۔۔؟

وہ بڑی انگڑائی توڑتے ہوئے مجھ سے کہہ رہا تھا۔ سگریٹ ہونٹوں سے لگا کر وہ نیچے اتر گیا' مجھے بھی حاجت محسوس ہوئی۔ ہمیں اترتے دیکھ کر دو چار مسافر بھی نیچے آ گئے۔ کچھ دیر بعد وہ مجھ سے سرگوشی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"آپ نے مجھے جگا کر بڑی خطرناک غلطی کی ہے۔"

"ہائیں' جگا کر غلطی کی۔۔۔؟" مَیں نے اس کی بات کو جب پوری طرح سمجھا تو میرے تو طوطے اڑ گئے۔ "تو تم سو رہے تھے۔۔۔؟"

"بھولے' باویو! میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ میڈم بڑی جادوگرنی ہے' جاگتے کو سلا دیتی

ہے اور سوئے کو جگا دیتی ہے' اس کی سروں میں سلامتی ہوتی ہے۔ آپ نہ جگاتے تو مَیں نے چیچا وطنی پہنچ کر جاگنا تھا' آپ نے بڑا کام خراب کر دیا۔۔۔"

"کیا کہہ رہے ہو۔۔۔ تمہاری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں' اَوور ٹیک بھی ہو رہے تھے۔ انڈی کیٹر اور اشارے بھی چل رہے تھے۔ ہارن۔۔۔"

"ہاں ہاں' سب کچھ ہو رہا تھا لیکن مَیں سویا ہوا تھا۔ راتوں کو سفر کرنے والے اکثر مسافر اس حقیقت سے واقف ہوتے ہیں کہ ڈرائیور کہاں جاگ رہا ہے اور کہاں سو رہا ہے۔"

میرا مُنہ کھلا ہوا تھا' حیرت اور خوف سے مجھے کپکپی سی آ گئی۔ مَیں نے کہا۔ "مسافر جانتے ہوئے بھی خوشی خوشی سفر کرتے ہیں' حیرت ہے۔۔۔"

"حیرت کی کون سی بات ہے۔۔۔ سب جانتے ہیں کہ خوراک' دواؤں' دودھ میں ملاوٹ ہوتی ہے۔ پانی جراثیم سے بھرپور ہے۔ فضائی آلودگی پھیپھڑوں کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ ہوشربا گرانی کمر توڑ ہے' قانون بے بس اور انصاف لاحاصل ہے۔ لوگ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔۔۔ پیٹھا اور کھری سُریں' مشفق ماں کی گود کی طرح ہوتی ہیں۔ بچے کو نیند آ جاتی ہے۔ بے سُرے گلا پھاڑنے والے' سوتیلے نشے باز باپ کی ڈانٹ ڈپٹ کی مانند ہوتے ہیں' بچے سوتے ہوئے بھی چیختے چلاتے رہتے ہیں۔۔۔"

باقی سفر وہ سویا یا جاگتا رہا' مَیں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ مَیں نے پلک سے پلک نہیں ملائی۔ نورجہاں کی کیسٹ اس نے جیب میں ڈال لی تھی۔۔۔ مَیں نے کئی ریڑھی بانوں کو دیکھا کہ گدھا اپنا لگے بندھے رُوٹ پہ رواں دواں ہے' باگیں پاؤں کے انگوٹھے میں دبی ہیں اور ریڑھی بان خوابِ خر کے مزے لوٹ رہا ہے۔ دفتروں کے چپڑاسی' لفٹ مین' ڈیوٹی پہ ہیں اور ترقی کے خواب بھی دیکھ رہے ہیں۔ آنکھیں کھلی ہوئی' آپ سے باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ پنڈلی بھی کھجائی جا رہی ہے' سگریٹ کے کش بھی جاری ہیں اور سو بھی رہے ہیں۔ مصروف کار دکھائی دیتے ہوئے سونا' بڑے جوکھوں اور پریکٹس کا کام ہے' پرانے پاپی جو سرکاری عہدوں پہ اپنی طبعی عمر ملازمت مکمل کرنے پہ مجبور ٹھہرتے ہیں' اس فن کے پکے استاد ہوتے ہیں۔۔۔ حکماء کا ارشاد ہے کہ جب انسان کام کاج سے تھک جاتا ہے تو اسے آرام کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ تھکے ہوئے مضمحل اعصاب کو سکون مل سکے۔ اس طرح

اس کی کھوئی ہوئی توانائی بحال' پھر مصروف کار کے لئے تیار ہوتی ہے۔ جدید تحقیق یہ ہے کہ صدیوں لمبے پڑنا ضروری نہیں ہے' دو چار گھنٹے پرسکون نیند لینے سے ہی تھکاوٹ اور نیند کا اضمحلال دور ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے دانشور' موجد' مصنف' حکماء اور علماء نے اس حقیقت کی عملی طور پہ تصدیق بھی کی۔ یہ توجیہہ بھی پیش کی کہ مختصر دورِ حیات محض سو کر ضائع کر دینا' زندگی کے مقصد کو پورا نہیں کرتا۔ یہ بھی کہا گیا کہ سونا محض ایک فضول سی عادت کے علاوہ اور کچھ نہیں مگر کیا کہئے کہ جس طرح بہت سے لوگ محض کھانے پینے کے لئے زندہ ہوتے ہیں اسی طرح اکثر انسان صرف سونے کے لئے پیدا ہوتے ہیں' باقی کام ثانوی حیثیت رکھتے ہیں--- سوچنے کی بات ہے۔ ایک انسان کی اوسط زندگی اگر ساٹھ برس ہے اور روزانہ آٹھ گھنٹے سوتا ہے۔ باتھ روم' کھانا پینا' ٹیلی ویژن' آنا جانا' سیرو تفریح۔ چار گھنٹے کم از کم یہ روزانہ لگا لیجئے تو بارہ گھنٹے یہ ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بمشکل بیس پچیس برس جیا۔ یہ کم سے کم اندازہ ہے' اگر سونے کا وقفہ بڑھا لیا جائے تو نیندرئیے محض پیدا ہونے کی تہمت اپنے سر لیتے ہیں' زندگی یا جینے کی کوئی بات نہیں ہوتی--- شیرخوار بچے مشکل سے سوتے ہیں بیچاری ماؤں کو بڑے جتنوں' دَم جھاڑ' ڈانٹ ڈپٹ' ڈَھول دَھپا' موسیقی' لوریوں سے کام لینا پڑتا ہے تب جا کر یہ بچے کہیں سوتے ہیں' یہ الگ بات ہے کہ اس مشقت میں اکثر ماں بیچاری نڈھال ہو کر خود بھی ساتھ لیٹ کر سو جاتی ہے۔ بڑی دادیاں' نانیاں تو اپنا صدری نسخہ آزمایا کرتیں۔ افیون کی باجرہ گولی گھول کر پلا دی' بیچارہ بچہ گھنٹوں نچنت بے سُدھ پڑا رہتا ہے۔ بڑا ہو کر یہی بچہ ذمہ داریوں اور کام کاج' محنت و مشقت سے جی چرا کر پہروں سویا رہتا ہے اور بے بے بیچاری گالی کوسنوں' بددعاؤں اور پانی کی بالٹی کے باوجود اسے جگانے میں ناکام رہتی ہے۔ صرف عشق کی بیماری کی شروعات میں ایسے لوگوں کی نیند کہیں غائب ہو جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عشق میں صحت مندی کے بعد یہ سونے والی عادت مزید اضافے کے ساتھ پھر در آتی ہے۔

نیند کی بات ہو رہی تھی۔ یہ جو ہلکا ہلکا سرور نینوں میں لہریئے مارتا رہتا ہے بالآخر یہ نیند پہ منتج ہوتا ہے اور یہ نیند پھر سولی' کانٹوں کی سیج' فٹ پاتھ' گھاس یا زانوئے محبوب نہیں دیکھتی' بس اپنا کام کر جاتی ہے۔ اکثر لوگ ریلوے اسٹیشن یا ایئرپورٹ پہ سوئے پڑے رہ جاتے ہیں۔ کئی طالب علم امتحان میں صرف اسی کے کارن فیل ہو جاتے ہیں۔ کئی جرنیل

نیند کی وجہ سے جنگیں ہار گئے' ہر برس دنیا بھر میں لاکھوں گھنٹے اس نیند خانہ خراب کی وجہ سے ضائع ہو جاتے ہیں' لندن کی ٹیوب (زیر زمین ریلوے) پیرس' نیویارک میں صبح صبح اگر آپ کو سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہو تو دیکھا ہو گا کہ مسافر اخبار سامنے پھیلائے اونگھ رہے ہیں' جو کھڑے ہیں وہ بھی جھول رہے۔ ہر شخص نیند کی گود میں سر رکھے سو رہا ہے--- میرے اپنے بابا جی ثناء اللہ صاحب' میری دانست میں دورِ حاضر کے سب سے بڑے "نیندرئیے" ہیں۔ صاحب سلوک ہیں' شاید عالمِ مراقبت میں رہتے ہوں' خوبصورت نینوں کے کٹورے ہر وقت تابِ نوم سے لبالب بھرے رہتے ہیں۔ ان سے آنکھ ملانے والا اگر پاؤں کا پکا اور نیند کا کچا نہ ہو تو بچ جاتا ہے ورنہ سامنے کھڑے کھڑے انگڑائیاں توڑنے اور جمائیاں جمانے لگتا ہے یا کم از کم سرور سے پتلیاں سکڑنے لگتا ہے۔ مَیں تو خیر اب عادی اور محتاط ہو چکا ہوں' شروع شروع میں اپنی بے خبری اور کچے پن کی وجہ سے بڑی زک اُٹھا چکا ہوں۔ سیاہ پوش ہیں۔ شانوں پہ اُمڈی ہوئی اَبریشمی کاکلوں کی گھنگھور گھٹائیں' ہلکی سی مترشح اَسودی داڑھی' لب لعلین کے اوپر کھڑی پُروقار ناک' آبرومند اَبروہ' کشادہ پیشانی اور وسط سے جوالہ سیماب کی مانند ابھرتی لپکتی ہوئی رگ کی ریگ ماہی۔ اتنی نعمتیں اور دولتیں پالینے کے بعد باقی کیا رہ جاتا ہے جس کی طلب و جستجو کے لئے آدمی جاگے یا ہوش میں رہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ عالمِ کیف و غنود میں رہتے ہیں۔ ایران کی زیارتوں سے پہلے ہی کئی اللہ والوں کے مزاروں' عرسوں پہ ان کی ہمراہی اور مصاحبت کی سعادت نصیب ہو چکی تھی۔ سیانوں کا کہنا ہے کہ انسان کے اصل کی پہچان سفر' دسترخوان اور عالم غیض و سرخوشی سے ہوتی ہے۔ مَیں نے اپنے طور پہ اس بات کو یوں بڑھایا کہ طالب' مُرید یا عقیدت مند کی پہچان مطلوب' پیر یا محبوب کو مخصوص حالات اور کیفیات میں برداشت کرنے میں ہوتی ہے۔ ہر معاملے میں ثابت قدمی دکھائی لیکن بابا جی کی نیند یا مراقبے کی عادتِ دِلپذیر سے میں ہمیشہ دلگیر ہی ہوا' بڑی کوشش اور خود کو سمجھانے کے باوجود مَیں خود کو آمادۂ صبر نہ پا سکا' قہرِ دَرویش بَرجانِ دَرویش والی کہاوت نہ ہوتی تو مدتوں پہلے میری کہانی اور ان کا فسانہ ختم ہو چکا ہوتا--- مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ مندرجہ بالا ایک سطر میں مجھ سے بابا جی کی شان میں گستاخی سرزد ہو چکی ہے' مجھے انہیں نیند کی عادت کے حوالے سے "نیندریا" نہیں لکھنا چاہئے تھا بلکہ معرفت و تصوف کے تناظر میں صاحب

مراقبہ لکھنا چاہئے تھا۔ مجھے ان کی ذاتِ کشادہ نظر سے اُمید ہے کہ وہ میری اس گستاخی سے صَرفِ نظر فرمائیں گے۔ صاحبِ تصرف بزرگوں' حکماء' علماء کے ہاں غلبہ نیند کو مراقبے سے معنون کیا جاتا ہے چاہے وہ مرغن غذاؤں کی بسیار خوری کا خُمار ہی کیوں نہ ہو یا اضمحلال طبیعت یا شکستگی اعصاب' جو بھی ہو وہ نیند نہیں مراقبہ ہی ہوتا ہے۔ غریب کے بیکار' زندگی سے آوازار بچے کی نیند سوتڑا' آسودہ حال کا سونا سکون ہوتا ہے' بوڑھوں اور دیندار روایت پسندوں کے ہاں یہ نیند قیلولہ کہلاتی ہے جبکہ یہی نیند پڑھے لکھے آزاد خیال لوگوں کے بیڈ رومز میں ریسٹ ہوتی ہے۔ بیوروکریٹ' وکلاء' جج صاحبان' سیاستدانوں' جاگیرداروں کے پاس یہ ریلیکس کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور شاعروں کے ہاں آمد ہوتی ہے۔ بیماروں کے ساتھ مجبوری' کسی کے لئے وصل' کسی کے لئے ہجر و فراق۔ یہ ستم ظریف بڑے بڑے روپ اختیار کرتی ہے۔

ہاں' تو مَیں کہہ رہا تھا کہ باباجی کے وقت بے وقت' حال بے حال مراقبے بڑے بڑے رنگ دکھاتے ہیں۔ رنگ میں بھنگ اور کبھی کبھی بھنگ میں رنگ ڈالتے ہیں۔ مجھے چونکہ ان کے مزاج میں خاصا دخل حاصل ہے بلکہ ندیم خاص کی حیثیت سے بھی ہمہ وقت ان کی خدمت کرنے کا موقع حاصل رہتا ہے اس لئے اَن کے مراقبوں کے نتائج سے براہ راست میں ہی متاثر ہوتا ہوں' بلکہ کبھی کبھی تو اتنا زیادہ ہوتا ہوں کہ کچھ کھا چاٹ کر کسی لمبے ہی مراقبے میں ڈوب جانے کو جی چاہنے لگتا ہے--- اچھی خاصی گفتگو چل رہی ہے۔ روزمرّہ کے ڈاکے' قتل و غارت' زنابالجبر' اجتماعی زیادتیاں' سیاسی قلابازیاں۔ بڑے بڑے لوگوں کی بے وقت اَموات۔ ایسے میں تو سوئے ہوؤں کے دِیدے بھی کھُل جاتے ہیں مگر آپ ہیں کہ سو رہے ہیں یا اُونگھ رہے ہیں یا پھر بڑی بڑی بلوامی آنکھوں کے بھاری پپوٹوں کو پٹپٹا رہے ہیں جبکہ ابھی دن کی شروعات ہی ہوتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے ذرا پاؤں پساریں گے' انگڑائی توڑنے لگیں گے۔ پھر ننھی سی جمائی لیں گے اور پھر یا علی مدد--- موٹر کار میں مجھے ہمیشہ آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیں گے کہ آپ بزرگ ہیں' خود پیچھے میرے عقب میں دھرنا دے لیں گے۔ بظاہر مجھے عزت دے رہے ہوتے ہیں مگر بہ باطن وہ خود کو میری نظروں سے چھپ کر سونے کی سہولت دے رہے ہوتے ہیں۔ گاڑی کے چوتھے گیئر کی سپیڈ پکڑنے تک طوعاً" و کرعاً" کسی نہ کسی طور پر خود کو سنبھال لیتے ہیں' بعد میں انہیں

خود بخود مراقبے کے گیئر لگ جاتے ہیں۔ طبیعت اتنی ٹیون اپ کہ کیا مجال جو خراٹے کی ہلکی سی بھی ڈسٹربنس ہو' وقفے وقفے سے ہوں' ہاں بھی ہوتی رہے گی' اکھیوں کے نیم باز جھروکوں سے دائیں بائیں اور میری طرف بھی دیکھ لیں گے' سب کی طرح کی خیریت کے بعد پھر--- ۔

بیکسی میں چشمِ خفتہ طالع بیدار ہے
یاد کی دیوار کے سائے میں آ جاتی ہے نیند

انہیں مسلسل چُپ پا کر' گردن گھُما کر جب مَیں انہیں دیکھوں گا تو کمال ہوشیاری و بیداری سے ارشاد ہو گا کہ سن رہا ہوں' سو نہیں رہا۔ بڑے بڑے نین دکھا کر ہلکا سا مسکرائیں گے--- بڑے بڑے صاحبِ سلوک دیکھے مگر ان ایسا بیدار ضمیر اور سوتا سریر آج تک کوئی بزرگ نہیں دیکھا--- باباجی کے ہاں سونے کے' معاف کیجئے گا پھر غلطی ہوگئی۔ میرا مطلب ہے کہ مراقبے کے بڑے سٹائل ہیں۔ عام طور پر تو یہی دیکھا ہے کہ بزرگ بوڑھے اکثر سیدھے چِت پڑے ہوئے ہوتے ہیں کیونکہ یہ مراقبہ الموت کر کے لیٹتے ہیں کہ جاگیں' نہ جاگیں۔ یہ مراقبہ ان کی ضرورت اور احتیاط بھی ہوتی ہے' مسلسل ہلانے اور جگانے کے باوجود بھی اگر یہ بیدار نہ ہوں تو گھروالوں کو صرف کھُلے مُنہ سے مصنوعی دانتوں کا بیڑہ نکال کر ڈھاٹا باندھنا ہوتا ہے' باقی سارا انتظام و اہتمام مرحوم نے تو پیشگی ہی کر لیا ہوتا ہے--- ادھر ادھیڑ عمرے عیال دار فاقہ مستوں کا بھی اپنا الگ سٹائل ہوتا ہے۔ یہ اکثر دائیں کروٹ سوتے ہیں تاکہ دکھیا اور کمزور دل پہ زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ دایاں بازو' کھُلے ہاتھ کے ساتھ لمبا سا چارپائی کی حدود سے باہر جھُول رہا ہوتا ہے کہ ہاتھ خالی ہے۔ بایاں ہاتھ مکھیاں اڑانے کے لئے آزاد ہوتا ہے۔ یہ زندگی اور لولاد سے بیزار اکثر پھٹی پرائی دھوتی میں سوتے ہیں جسے اکثر وقفے وقفے سے ان کی' ان سے بیزار بیوی درست کرتی رہتی ہے۔ ان کے فریاد آمیز دردیلے خراٹوں سے ان کی آوارہ اور بے ادب بے دِید اولاد بڑی آوازار ہوتی ہے۔ یہ اکثر سو کر پھر بیدار ہو جاتے ہیں' اٹھنے پہ ان کے منہ کڑوی کسیلی تھوک اور مغلظات سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں--- کچھ نوجوانوں کے بھی سونے کے سٹائل ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے قابل دید سٹائل اِن نوجوانوں کا ہوتا ہے جو جسمانی' ذہنی اور جذباتی لحاظ سے شادی کے لائق ہوتے ہیں مگر پرَلے درجے کے نکھٹو' بے روزگار اور تن آسان

ہوتے ہیں۔ کلائی پہ دل اور اس کے اندر سے ایک تیر آرپار ہوتا ہے' انگریزی میں کسی نامحرم کے نام کا پہلا حرف بھی گندھا ہوا ہوتا ہے کہ واضح طور پر لکھنے میں چند مجبوریاں حائل ہوتی ہیں۔ یہ اکثر اپنے اکلوتے ٹریک سوٹ کے پائجامے میں سوتے ہیں۔ الجھے ہوئے بڑے بڑے بال' تکیہ سر کی بجائے سینے سے چمٹا ہوتا ہے۔ یہ ٹیڑھے میڑھے کچو کے کی مانند دکھائی دیتے ہیں جسے کتے ۔ھنبھوڑ کر پھینک جاتے ہیں' سینے سے چمٹائے ہوئے تکئے کے اندر کسی کی تصویر' خوشبو میں بسا ہوا رومال اور چند خطوط بھی ہوتے ہیں۔ ان کے سونے والے کمرے میں یادوں' سپنوں اور چھوٹے بھانجے کے علاوہ کسی اور کو آنے جانے کی اجازت نہیں ہوتی' بھانجا کبوتروں اور پتنگوں کے لالچ میں کبوتروں والا وہی کام کرتا ہے جو ٹیلی فون کے عام ہونے سے پہلے کبوتروں سے لیا جاتا تھا۔ ایسے نوجوانوں کو گھروالے جگانے یا اٹھانے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ جاگ کر یہ کوئی کام دھندے یا لکھنے پڑھنے کی بجائے بن سنور کر نکل جاتے ہیں' ان کا خیال ہے کہ نیند بہر طور آوارگی سے بہتر ہے۔

بات بابا جی کی نیند سے بڑھی تھی۔ نیند کے حوالے سے ان کے ایک پٹی بھائی نویڈ اشرف بھی ہیں جو ہمارے مشترکہ دوست ہیں۔ ہم تینوں کی تکون سفر و حضر میں اکثر بنی رہتی ہے۔ کچھ بابا جی کی صحبت کا اثر' کچھ جوانی اور جیب کی آسودگی کی سرور انگیزی اور کچھ میری ناز چونچلے اٹھانے اور خدمت گزاری کی عادت--- خاص طور پہ سفر میں تو ایسا ہوتا ہے کہ ایک دائیں اور دوسرا بائیں جانب' دونوں کے سر آہستہ آہستہ میرے شانوں پہ ٹکنے شروع ہو جاتے ہیں۔ مَیں درمیان میں پھنسا ان کی رالیں پونچھتا رہتا ہوں اور وہ معصوم بچوں کی مانند اپنی بے بے کی گود میں سوتے رہتے ہیں--- بے بے تو مَیں ہوں ہی' باپ کے فرائض بھی انہوں نے مجھے ہی تفویض کر رکھے ہیں۔ بابا جی کے بابا تو انہیں میری گود میں ڈال کر خود خُلد نشین ہو گئے تھے' رہے نویڈ صاحب! تو ان کے والد صاحب ماشاء اللہ بقید حیات ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ' لئے دیئے میں رہنے والے انتہائی شریف انسان ہیں۔ کویت میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں مگر ان میں خامی یہی ہے کہ وہ محض والد صاحب ہیں' باپ بننا انہیں کبھی نہ آیا۔ مجبوراً" مجھے یہ ڈیوٹی بھی نبھانا پڑتی ہے۔ یہ تو آپ شاید جانتے ہی ہوں گے کہ والد اور ہوتا ہے' اور باپ تو بہت ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ جو بات ماں جی میں ہے وہ والدہ میں کہاں اور اسی طرح بیوی اور شریک حیات میں بھی بڑا فرق ہوتا

ہے۔ جو یار ہوتا ہے' وہ دوست کہاں ہو سکتا ہے--- ان دونوں نوجوان بزرگوں نے آہستہ آہستہ مجھے امرت دھارا قسم کی چیز بنالیا ہوا ہے۔ ماں' باپ' دوست' مشیر' خازن' ڈرائیور' باورچی' چوکیدار' داستان گو' گلوکار' بزرگ اور پیر تک' چلئے ٹھیک ہے۔ یہ رشتے قائم کرنے اور نبھانے سے کچھ تو ان کا بھلا ہوتا ہوگا۔ مَیں بھی اپنی ہمت اور بساط کے مطابق ان کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہوں' بس ایک ان کی نیند مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ان کے لئے کسی "سلیپنگ بیوٹی" کا انتظام کیا جائے--- میں بتانا بھول گیا کہ یہ دونوں نوجوان بزرگ پینڈو ہیں۔ حافظ آباد اور خانقاہ ڈوگراں کے رہنے والے' حیرت ہے کہ ان میں نہ تو کوئی حافظ ہے اور نہ ہی ڈوگر--- مَیں نے دونوں سے سلسلہ جنبانی شروع کیا' سمجھایا کہ اللہ کے بندو! جوان ہو' کماتے کھاتے ہو' سمجھدار بھی کسی حد تک ہو اور ذمہ داریاں نبھانا بھی کبھی سیکھ ہی جاؤ گے۔ شادی کر لو--- بڑا مقصد یہی تھا کہ کوئی جگانے والی آئے گی تو دھیرے دھیرے ان کی یہ وقت' بے وقت سونے کی عادت چھوٹ جائے گی۔ نوید صاحب نے تو جیسے میرے منہ کی چھین لی' فوراً" سر جھکا لیا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے انڈر گراؤنڈ سارا سلسلہ پکا کر لیا ہوا تھا' بس میرے منہ سے نکالنے کی دیر تھی۔ البتہ بابا جی نے رسمی طور پر کچھ اگر مگر کی' کہنے لگے کہ دو بڑے بھائی لنڈورے پڑے ہیں اور مَیں سب سے چھوٹا ہوں اتنی بڑی حرکت کیسے کر گزروں--- بڑی دلیلیں دیں' شادی خانہ آبادی کے فوائد گنوائے۔ سلامیوں اور نیندوں کی رقوم کا تخمینہ بتایا۔ ننھے ننھے پھول سے بچوں کی برکتیں اور حرکتیں بتائیں۔ سسرال کی طرف سے ملنے والی انگوٹھی' گھڑی اور کپڑوں کا لالچ دکھایا۔ دُلہا بن کر ویڈیو اور تصویریں کھنچوانے کے متعلق بھی بتایا اور پھر جب دلہن کی تصویر کشی کی کہ جوڑے آسمان پہ بنتے ہیں' یقیناً وہ کہیں ہے اور انتظار کروانا گناہ ہے لہٰذا ثواب کی نیت سے انہوں نے فوراً" شادی کی حامی بھر لی۔ اب مسئلہ یہ آ کھڑا ہوا کہ گھروالوں کو کون بتائے اور انہیں دو بڑے بُرج پھلانگ کر چھوٹے کی جانب توجہ کرنے پہ کون راضی کرے اور یہ بھی کہ اس لڑکی کو کس طرح تلاش کیا جائے جو آسمانوں پہ ان کے نام لگ چکی ہے اور اب بیچاری کہیں پڑی روکھی سوکھی کھا رہی ہے--- خیر' پہلے مرحلے میں ان کے گھروالوں کے کان میں اڑتی اڑتی سی ڈالی۔ پھر چنگاریاں اُڑیں۔

"تجھے بڑی آگ لگی ہوئی ہے--- بڑے بھائی چالیس چالیس برس کے ہو گئے، کبھی محلے سے شکایت تک نہیں آئی اور تُو!--- دودھ کے دانت ابھی نکلے نہیں، ناک پونچھ صاف کرنے کی تمیز نہیں اور شادی مانگ رہا ہے---؟"

بابا جی سرکار نے دلائل دے کر سمجھانے کی کوشش کی کہ شادی اور موت کا دن مقرر ہے، جوڑے آسمان پہ اسمبل ہوتے ہیں۔ چھوٹے کو اگر بھوک لگی ہے تو کھا لے، یہ نہیں کہ بڑے نے کچھ نہیں کھایا تو چھوٹا بھی بھوکا رہے۔ سب سے بڑا سعودیہ میں عاقبت خراب کر رہا ہے۔ منجھلا دوکاندار ہے، اس کا ابھی شادی کا موڈ نہیں--- نکاح سنت ہے، گناہوں سے بچاتا ہے۔ سب سے بڑی وزنی دلیل یہ دی کہ میری ہونے والی بیوی میرا انتظار کر رہی ہے اور کسی بے زبان، خاص طور پہ لڑکی کو انتظار کروانا بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ بڑی بڑی علمی باتیں سن کر ان کی بے بے نے جوتی اتاری، دو چار انہیں دھرتے ہوئے فرمانے لگیں۔

"وڈیا، مولویا! یہ تو نہیں، تیرا بابا بول رہا ہے۔ مَیں تو جب تک اپنے بڑے پتُروں کا نہ کر لوں، تیرے متعلق تو سوچ بھی نہیں سکتی--- توبہ توبہ، حلیہ ملنگوں والا اور شوق تلنگوں والا---"

"ٹھیک ہے، بے بے! مَیں نے اچھا برا سمجھا دیا ہے--- تم نے یہ مسئلہ تو سنا ہو گا کہ شادی کے قابل اولاد کے ماں باپ اگر اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی برتیں تو ان کی عبادت قبول نہیں ہوتی اور اولاد سے اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کی سزا خاص طور پہ ماں کو ملتی ہے---"

پینڈو ذہن کی ماؤں کا دلائل سے کیا واسطہ، ان کی ہوڑ مغزی کے اپنے اصول طریقے ہوتے ہیں جن کے سامنے وہ خاص طور پہ اولاد کی تو کچھ چلنے نہیں دیتیں مگر اس وقت بابا جی کی آخری دلیل کام کر گئی۔ وہ ہتھیار، یعنی جوتی پھینکتے ہوئے بولیں۔

"جا، جو مرضی آئے کر--- اپنے بابے سے ہی کہہ کہ وہ تمہارے لئے کوئی حُور اں پَری تلاش کرے۔ مَیں تو کہیں نہیں جاتی، لوگوں کی باتیں ہی سُنی ہیں--- نی وڈے ویاہ لئے نے جے چھوٹے دا لبھدی ایں؟"

گھر کا مسئلہ حل ہوا تو باہر کا مسئلہ کھڑا ہو گیا کہ ہمارے بابا جی کا نصف بہتر کس چھت

تلے محو خواب ہے۔ وہ چنگاری، الٰہی! کس خاکستر میں چھپی ہے جس نے شعلہ جوالا بن کر ہمارے بابا جی کے خواب و خرمن میں چکاچوند کرنی ہے۔ بابا جی قبلہ نے کئی مرتبہ، باتوں باتوں میں مجھ سے ٹوہ لینے کی کوشش فرمائی۔

"بابا جی! وہ واقعی کہیں میرا انتظار کر رہی ہے--- اللہ جانے وہ کیسی ہو گی۔ آنکھیں، ناک، رنگ، شوق، مزاج---؟"

وہ ایک ایک چیز کی تفصیل پوچھتے، جیسے مَیں نے اُسے کہیں چھپا رکھا ہے--- میں بھی بھولا بن کر انہیں بہلاتا رہتا۔ شادی شدہ زندگی کی دلچسپیاں، رنگینیاں، موجیں اور برکتیں۔ یہاں تک کہ انہیں پہلوٹھی کے نرینہ فرضی بچوں کی نوید بھی سنا دی، محمد علی اور احمد علی نام بھی تجویز کر دینے کے بعد ناک نقشہ بھی پیش کر دیا۔ گھر والوں نے تو لال جھنڈی دکھا دی تھی، بلکہ شادی کے معاملے میں کسی قسم کے تعاون و اعانت سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ ہم دونوں لنڈورے ادھر ادھر گھروں میں تاک جھانک کر رہے ہیں کہ ہمارا مال کہاں چھپا بیٹھا ہے۔ فیصل آباد، گجرات تک پھیرا ڈال آئے، لاہور میں بھی چند بیریوں والے گھروں میں روڑے پھینکے۔ اس قسم کے سلسلے تو عورتیں جوڑتی توڑتی ہیں، ہم ملنگ یہ جوڑ توڑ کیا جانیں؟--- آخر بہت سی کھے خرابی کی بعد قدرت کو ہم پہ رحم آ ہی گیا، بہت قریبی رشتے میں ہمیں رشتہ مل گیا۔ بات پکی ہوئی اور شادی نکاح کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ گھر والوں نے جب یہ صورت دیکھی تو چھلانگ لگا کر میدان میں آ گئے اور شادی کے لئے رضامند ہو گئے، صرف ہم سے بیر پکڑ لیا اور اس طرح ہم شادی میں شریک نہ ہو سکے۔ خوشی تھی کہ بابا جی، صاحبِ بی بی ہو گئے، ہمارے لئے یہی کافی تھا۔

شادی سے ایک روز پیشتر ہم نے بابا جی سے دست بستہ عرض کی کہ خدا کے لئے، یہ ایک آدھ دن سونے سے پرہیز کیجئے گا۔ ہم تو وہاں ہوں گے نہیں، آپ کو کون سنبھالے گا؟--- شادی کے روز، پہلی رات اور دوسری صبح تک ہمیں یہی کھٹکا اور دھڑکا لگا رہا۔ دوسرے روز انہوں نے ہمیں بڑے فخر سے بتایا کہ وہ پچھلی رات بالکل نہیں سوئے مگر ان سے پہلے معلوم ہو چکا تھا کہ بابا جی نے نیند کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیا کیا گُل کھلائے ہیں۔ سہرابندی کے دوران ٹھونکا لگانے سے باز نہ آئے۔ سہرا چہرے پہ پڑا ہوا تھا، کون دیکھتا کہ نین کُھلے ہیں یا بند؟ قدرت نے موقع فراہم کیا تھا۔ بڑے ڈھرلے اور پروٹوکول سے ٹھیکی

لے لی۔ پھر بارات روانہ ہوئی۔ آپ کار میں تشریف فرما تھے' ہزار' دو ہزار نوٹوں کے ہار' مہکتے مسکراتے گلابوں کی لڑیاں' کنول نینوں میں سرمے کی دھار' معطّر لباس اور رومال' شادی کا خمار اور میرے شادی میں شامل نہ ہونے کا غبار۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کبھی بے پناہ خوشی کے موقع پہ کہیں ہلکی سی غمی بھی آ شامل ہوتی ہے۔ اچھے اور بردبار لوگ اس غمی کو بھی "خالِ رُخِ یار" سمجھ کر لُطف کا سامان پیدا کر لیتے ہیں' ایسی ملی جلی کیفیت میں نیند کی غنودگی کا عود کر آنا کچھ بعید از قیاس نہیں۔ چنانچہ باباجی سسرال والوں کے گھر تک بڑے سکون سے سکوت فرماتے رہے' سسرالی انتظامیہ نے بارات کی آمد آمد پہ جو اطلاعا" پٹاخے داغے تو نوشہ میاں ہڑبڑا کر' ادھر ادھر پریشانی سے دیکھتے ہوئے بولے' پولیس مقابلہ؟---

ملن ملاپ کی رسم کے بعد بڑی عزت و شان سے مخصوص جگہ پہ بٹھائے گئے۔ دائیں بائیں اور پیچھے اپنے عزیز دوست بیٹھ گئے' کچھ اس طرح کہ کسی جانب غنودگی میں لڑھکیں تو لیٹنے کی گنجائش نہ ہو۔ نکاح سے پہلے کا انتظار بڑے جوکھوں کا کام ہوتا ہے۔ ہر شخص کی نظروں کا نور دُولہا ہی ہوتا ہے۔ دُولہے کے گلے میں پڑے ہوئے نوٹوں کے ہار' کی جانب بڑی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ان سے میں اکثر بڑے نوٹ غائب ہو جاتے ہیں۔ سر پہ کُلہِ دُنما کلاہ جس پہ سہرے کا بوجھ ہوتا ہے۔ میک اپ' چہرے پہ احمقانہ سی سنجیدگی یا مسکراہٹ۔ نئے کپڑوں' واسکٹ کا بوجھ' پاؤں میں پھنسا ہوا نیا جوتا' پسینہ' تیز لائٹیں' کیمرے اور یہ احساس کہ ہر شخص خاص طور پر سسرال والے' والیاں بڑی تنقیدی نظروں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں انسان تین جگہوں پہ بے وقوف بن جاتا ہے۔ آئینے کے سامنے' بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے اور دُولہا بنے ہوئے مگر یہ تو دنیاداروں کے لئے ہوتا ہوگا۔ باباجی کو دنیا کے جھنجھٹوں سے کیا واسطہ' وہ تو ٹھہرے درویش منش اور وہ یہاں بھی اپنی ترنگ میں ہر چیز سے بے نیاز دھرے ہوئے تھے۔ دودھ شربت کی تواضع نے اور بھی ٹھنڈک و خمار کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ دائیں والے پہ بوجھ پڑا تو اس نے دباؤ ڈال کر بائیں والے کی جانب دھکیل دیا' بائیں والا تھکا تو اس نے دائیں جانب بڑھا دیا اور پیچھے والا تو گھٹنوں سے انہیں مسلسل ٹیک دیئے ہوئے تھا' مشکیں زلفوں میں منہ دیئے بڑبڑا بھی رہا تھا۔

"یار! خدا کے لئے کم از کم یہاں تو نیستی مت دکھاؤ۔ تمہارے سسرال والے کیا

سوچیں گے کہ لاڑا جہاز ہے' پوڈریا ہے---؟"

خدا خدا کر کے مولوی صاحب ایک رجسٹر تھامے تشریف لائے تو باباجی کو بغل میں گدگدی کر کے ہوشیار کر دیا گیا۔ گھروالوں سے اجازت لے کر انہوں نے اپنی کارروائی شروع کر دی' مولوی صاحب پڑھتے گئے' یہ پیچھے پیچھے آہستہ آہستہ دہراتے گئے۔ کئی دولہے اس مقام پہ خوب پھنستے ہیں' بعض تو اسی موقعہ پہ باقاعدہ مسلمان ہوتے ہیں۔ کلمے اور دیگر آئتیں دعائیں تو انہیں آتی نہیں' نہ ہی صحت سے انہیں دہرانے کی توفیق ہوتی ہے بس زیرِلب نوں ٹاں کرتے رہتے ہیں۔ مولوی صاحب بھی ان کی مجبوری سے آگاہ ہوتے ہوئے روٹین کی خانہ پری کرتے ہیں اور دولہا میاں بھی روٹین کی خانہ آبادی کا چکر پورا کرتے ہیں--- بتانے والے نے بتایا کہ باباجی نیم وا آنکھوں سے مولوی صاحب کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ لب ہلا رہے تھے' ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ پڑھ رہے ہوں گے۔ اصل الجھن تو اس وقت پیدا ہوئی جب مولوی صاحب قبلہ نے دلہن کا نام اور اس کے والد کا نام جملہ کوائف حق مہر وغیرہ قبول کرنے کے متعلق ان کے خیالات معلوم کرنے چاہے مگر یہ انہیں پیار اور خمار بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ کافی دیر جب مولوی صاحب کو ان سے متوقع جواب موصول نہ ہوا تو انہوں نے پھر استفسار دہرایا' بغل سے پسلی پہ ایک ٹھونگا بھی پڑا جو انہیں ان کے باڈی گارڈ مقبول نے ہوشیار کرنے کی غرض سے لگایا تھا۔ یہ بیساختہ بول پڑے "مقبول ہے۔"--- مولوی صاحب نے اسے بھی "قبول ہے" ہی سمجھا۔ دوسری مرتبہ پھر مولوی صاحب نے یہی پوچھا۔ اس دوران ان کے ایک عزیز نے کان میں پھونکا کہ بھلے مانس! مقبول ہے نہیں' قبول ہے کہو--- ستم بالائے ستم کہ نکاح نامہ پہ دستخط بھی دُلہن کے خانے میں کر دیئے' وہ بھی بوکھلاہٹ میں ایسے ثبت کر گئے کہ ثناء اللہ کی بجائے یااللہ سمجھ میں آتے تھے۔ یہاں بھی مولوی صاحب نے کمال فراست اور شرافت سے صحیح خانہ دکھایا اور یہ سمجھا کہ دوبارہ دستخط کرائے کہ برخودار اپنا اسم گرامی لکھیں' اللہ میاں کا نہیں۔ دوبارہ انہوں نے دستخط انگریزی اور اردو میں واضح طور پر کئے تھے۔ پھر دلہن کی رضامندی اور دستخطوں کے بعد مبارک سلامت' دُعا ہوئی۔ چھوہارے' پیلی پتی اور پان مصالحے کی پڑیاں تقسیم ہوئیں۔ کھانے پینے تک قدرے خیریت رہی۔ رخصتی سے قبل دولہا میاں کو اندر زنان خانے میں طلب کیا گیا جہاں سالیوں اور

بہنوئی کے درمیان جوتیوں میں دال بٹنے کی رسم ادا ہوتی ہے' دلہن کو بھی ساتھ بٹھایا جاتا ہے۔ آرسی مصحف کی رسم تو اب عنقا ہو چکی ہے۔ اب تو صرف بیہودگیاں اور سستی سی چہلیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔ پن پنڈال صرف سالیوں کے ہاتھ رہتا ہے' وہ جی بھر کر جیجاجی کو دق کرتی ہیں۔ جوتی غائب کر دیتی ہیں اور اگر سالیاں' دلہن سے چھوٹی ہوں تو گود میں بھی بیٹھنے سے گریز نہیں کرتیں۔ یہاں سب ہی سالیاں بڑی بڑی گرانڈیل تھیں اور باباجی بیچارے دھنا پان' لونگ الائچی قسم کے تھے۔ بڑے برے پھنسے ہوئے تھے' کوئی ان کی عنبریں ریشم سی پیچ دار زلفوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے پوچھ رہی ہے کہ کون سا تیل اور شیمپو استعمال کرتے ہیں' کوئی ان کی کلی قمیض اور مرون واسکٹ کی میچنگ کی تعریف کر رہی ہے۔ ایک سالی نے ان کے موی پیروں سے نازک سا کھسہ اتارا جو اس کی بڑی لڑکی کے پاؤں میں بھی پورا نہ تھا۔ اسے اتارنا کیا اور چھپانا کیا؟ بڑی سالی نے ترس کھا کر واپس پہنا دیا۔ انہوں نے بھی شرافت سے ان کی ڈیمانڈ پوری کر دی' کچھ گردن کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا کیونکہ بڑے نوٹوں والے تین ہار بھی ڈیمانڈ میں اتر گئے تھے' باقی بچوں بچیوں نے نوچ کھسوٹ لئے۔ باہر برآمد ہوئے تو گلے میں نچے بچے طِلّے کے ہاروں میں دو چار روپے والے نوٹ اٹکے ہوئے تھے البتہ شادی مبارک والا بڑا سا دل سلامت تھا۔ پانچ ماشے اڑھائی رتی کی سسرالی انگوٹھی پچک کر ٹیڑھی ہو چکی تھی۔ دس سال پرانی' پرانے ڈیزائن کی سیکو گھڑی تو پہلے سے ہی بند تھی تو وقت کیا بتاتی؟--- بہرحال' کہیں شام کے وقت واپسی ہوئی۔ کار میں بیٹھتے ہی ان کی پرانی علوت عود کر آئی' اپنے گھر تک اچھی خاصی نیند توڑ لی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پہلی رات بھی یہ خوب سوئے ہوں گے اور بیگم خوب جاگی ہوگی۔

باباجی اپنی دوکان پہ بھی کھڑے کھڑے نیکی لے لیتے ہیں یا عالم غنودگی میں ہوش اور مدہوشی کے درمیان کسی مقام پہ ہوتے ہیں۔ روزمرہ کے گاہک جان جاتے ہیں کہ باباجی کہیں پہنچے ہوئے ہیں' اس حالت میں وہ اکثر خود اپنا کام کر لیتے ہیں' صرف ایک نمبر گرو تین سو تمباکو کے لئے انہیں زحمت دیتے ہوئے جگانا پڑتا ہے جس کا ڈبا نیچے کونٹر میں رکھا ہوتا ہے۔ ہوتا وہ بھی دو نمبر ہے' صرف ڈبا اصل ہوتا ہے۔ صبح سویرے کام کلج پہ آنے جانے والے لوگ اکثر انہیں ہاتھ بھی دکھا جاتے ہیں' پان بھی لئے اور پانچ روپے بھی لے

لئے۔ کئی ایک تو پانچ کا نوٹ دے کر پچاس کا بقایا مع پانوں کے لئے جاتے ہیں اور ان کے جانے کے بعد انہیں معلوم ہوتا ہے کہ پچاس کا نوٹ تو گلے میں موجود ہی نہیں' اور یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے کہ کے ٹو والے کو کیپسٹن دے رہے ہیں۔ ولز مانگنے پہ ایمبیسی دی جا رہی ہے۔ پیپسی پینے والا ان کے ہاتھوں آر سی بی پی کر جاتا ہے البتہ لینا نہیں بھولتے ادھار یئے خوب آتے ہیں۔ کوئی پان سگریٹ لئے' پیسے دیئے بغیر نکلنے لگے تو یہ پکڑیں گے۔

"ماموں جان (آپ پنجابی میں ترجمہ کر کے پڑھیں) پچھلے پندرہ پان' چھ بوتلیں' تین ڈبیاں بھی ہیں اور نو روپے نقد--- کیا یہاں سدا ورت لگی ہوئی ہے؟"

"شاہ جی' بس پہلی نوں مل جان گے۔"

ڈیوٹی ختم ہوئی تو یہ اونگھتے ہوئے ویگن میں گھستے ہیں' چار پانچ سٹاپ آگے کوکاکولا گیٹ پہ اترنا ہوتا ہے مگر اُترے تو وہ جو جاگ رہا ہو۔ اب سواریوں میں پھنسا' سویا ہوا کہاں اترنے کی زحمت کرے۔ ملتان چنگی یا ٹھوکر نیاز بیگ کہیں دھچکے سے اگر آنکھ کھلی تو اردگرد خمار آلود نظروں سے نظارہ کریں گے اور پھر فرمائیں گے۔

"یار! مَیں نے کوکاکولا موڑ اترنا تھا' تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟"

"بلویو! اترنا آپ نے تھا' مَیں نے نہیں--- لاؤ دو روپے اور دو۔"

ایک بار جو ایک واقف کار کی بس پہ بیٹھے تو اوکاڑے جا کر جاگے۔ کنڈیکٹر ان سے پان لیتا تھا' ان کی علوت سے واقف تھا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگا کہ مَیں نے سوچا' چلو شاہ جی ذرا آرام سکون کر لیں--- سنا ہے کہ ان کی بیگم ان کے سونے کی علوت سے بہت تنگ ہے۔ وہ بیچاری انہیں جگاتی رہتی ہے اور یہ لمبی سی "اوں" کر کے اسے بھی تھپک تھپک کر سلا دیتے ہیں--- اللہ جانے کون بشر ہے؟

دیکھا گیا ہے کہ جن کے نین رسیلے ہوتے ہیں انہیں نیند ٹوٹ کر آتی ہیں بلکہ انہیں ذرا سا جھانک لینے والے بھی اپنا دل اور جسم ٹوٹتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ مسمریزم کرنے والے بھی زیادہ تر اپنی آنکھوں سے ہی کام لیتے ہیں اور اپنے یہ شاعر حضرات! ان کا تو سارا کاروبار ہی آنکھوں سے چلتا ہے--- مدت ہوئی ایک سچا واقعہ پڑھا تھا۔ راجستھان کے ایک راجپوت راجہ کے ہاں ان کے کوئی دور دراز کے دوست مہمان ہوئے جو انہیں بہت عزیز تھے۔ بڑی شان و شوکت سے استقبال کیا۔ دعوت طعام پہ مہمان دوست کو ایک

خوبصورت آنکھوں والی لڑکی نظر پڑی جو اندر باہر آ جا رہی تھی۔ ایسی آنکھیں' ایسے نین کٹورے جو کبھی نہ دیکھے تھے۔ یہ خود بھی راجہ تھے' خوبصورت عورتوں کی ان کے ہاں بھی کمی نہ تھی لیکن یہاں تو بات ہی نرالی تھی۔ نہ رہا گیا تو لڑکی کو پاس بلایا' خوبصورت آنکھوں کی تعریف کی اور اِک بیش قیمت نیلم جڑا ہار گلے سے اتار کر اسے بھینٹ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تمہاری آنکھیں مَیں کبھی نہیں بھول سکتا۔۔۔ جتنے روز قیام رہا' بے کَل و بے چین رہے۔ رخصت کا وقت آیا تو میزبان راجہ اپنے مہمان دوست کو ایک چاندی کا جڑاؤ ڈبا بھینٹ کرتے ہوئے بولا کہ اس سے زیادہ میں اپنے دوست کو اور کچھ نہیں دے سکتا تھا' ساتھ ہی درخواست کی کہ اس حقیر سے تحفے کو اپنے گھر جا کر کھولیئے گا۔ گھر پہنچ کر ڈبا کھولا تو سفید مخمل میں لپیٹے ہوئے خون آلودہ دو نین تھے اور نینوں کا دان دینے والی میزبان راجہ کی چہیتی بیوی تھی' ساتھ لکھا ہوا رکھا تھا۔۔۔ "آپ کو یہ نین پسند آئے' آپ کی بھینٹ۔"

یہ واقعہ پڑھ کر کئی دن میں سوتے جاگتے یہ اَن دیکھے نین دیکھتا رہا۔

یہ اپنے عبدالحمید عدم' اختر شیرانی اور سراج الدین ظفر بھی بڑی خوبصورت آنکھیں رکھتے تھے۔ بڑے بڑے نین کٹورے' مدُھ اور مدُھرتا سے جل تھل۔ مٹی اور بلوری پیالوں سے تو پیتے ہی رہتے تھے' یہ نینوں کے پیالوں سے بھی جی بھر کر پیا کرتے تھے' بڑی بڑی مدھ بھرے نینوں والیاں ان کے جام بھرا کرتی تھیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ خمریات اور نینوں کے حوالے سے انہوں نے خوب کہا' خوب لکھا۔۔۔ جگر مراد آبادی بھی بے درد قسم کے بادہ نوش تھے' تن و توش کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ چشم یار سے آنکھ ملا کر پیتے تھے بلکہ سارا گناہ انہیں پہ رکھتے تھے۔

سویڈن میں میرے ایک دوست جو ایرانی افغانی قالینوں کا وسیع کاروبار کرتے ہیں' کمال کے جمال پرست واقع ہوئے ہیں۔ کامیاب کاروباری ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے اچھے شاعر اور گلوکار بھی ہیں۔ خوبصورت آنکھیں اور قیمتی پرانی شرابیں ان کی کمزوری ہیں۔ قیامت تو اس وقت بپا ہوتی ہے جب یہ دونوں نشے کہیں ان کے روبرو ہو جاتے ہیں۔ آبِ گلگوں سے چہرہ گلاب ہوتے ہی نین نیلگوں سے پینا شروع کر دیتے ہیں۔ حلقہ احباب و اثر بڑا وسیع ہے۔ آئے دن پارٹیاں' دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ پاکستان' انڈیا سے کوئی اچھا

گانے والا آ گیا تو محفل ناؤنوش جم گئی۔ چترانگھ اپنی خوبصورت آنکھوں اور سریلی مدھم سی گائیکی کے باعث ان کی پسندیدہ رہی ہے بس اس میں صرف ایک خامی ہے کہ وہ شادی شدہ اور بچے کی ماں ہے۔۔۔ تیس بتیس کے پیٹے میں ابھی تک بیوی بچوں کے آزار سے بیزار تھے۔ کہیں سپین ہالیڈے کے لئے گئے' واپسی پہ ایک نینوں والی ساتھ لیتے آئے اور شادی کا دن مقرر کیا۔ احباب اکٹھے ہوئے' بہت بڑے ہوٹل میں انتظام تھا۔ احباب دوست آگے ان کے ملنے ملانے والے' اچھے اچھے کاروباری' آزاد خیال' شاعر' موسیقار' گانے والے' ٹیلی ویژن ریڈیو کے چیدہ چیدہ فنکار' ماڈل' آرٹسٹ' انسانوں کے روپ میں آسمان سے کہکشاں اتری ہوئی تھی۔ حسن و جمال کا اک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ خوشبوئیں' مہکاریں' روشنیاں' جلوے' ادائیں' غمزے۔۔۔ آپ خود بڑھ بڑھ کر مسکراتے ہوئے ہر اک کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اسپینش دُلہن بڑی بڑی کٹیلی بولتی ہوئی آنکھوں اور بیش قیمت جڑاؤ عروسی روایتی لباس میں چاند کا اک ٹکڑا دکھائی پڑتی تھی' اس کے والدین بھی اپنی خوش بختی پہ نازاں تھے۔ اچانک ان کی نظر ایک معصوم سی دوشیزہ پہ پڑی جو اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی اپنی دین و دنیا سے بیگانہ کر دینے والی آنکھوں کو حیرت سے پٹ پٹا رہی تھی۔ گلابی سی عمر' شہابی رنگت' چہرے پہ اَمرود کے اوپر گلابی تکوں کی سی کہکشاں' رسیلے بیر بہوٹی جیسے ابھرے ہوئے ہونٹ' سیاہ لہلہاتی کاکلوں کا اسودی غبار' سیاہ ریشمی دراز پلکیں' سیاہ چشم کلاں کی لوؤں تک کھینچی ہوئی۔ یہ کسی افغانی ڈپلومیٹ کی صاحبزادی تھی جو تعطیلات گزارنے یہاں آئی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر سُدھ بدُھ ماری گئی' اس ناگن کے نینوں نے ایسا ڈسا کہ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اب کہاں کی شادی اور کہاں وہ اسپینش لڑکی جو تھوڑی دیر بعد ان کی دُلہن بننے والی تھی اور جس کی انگلی میں منگنی کی قیمتی ہیرے کی انگوٹھی جگمگا رہی تھی۔ آپ نے برملا اس لڑکی کے پاس جا کر کہہ دیا کہ آپ کی آنکھیں بڑی خوبصورت ہیں' ان پہ تو پورا اسپین نچھاور کیا جا سکتا ہے۔۔۔ پھر اسپین والی روتی دھوتی اسپین واپس چلی گئی اور افغانستان والی ہنستی مسکراتی ان کی بیوی بن گئی۔ اس میرے دوست کے عالیشان گھر میں بے شمار قیمتی فریم آویزاں ہیں لیکن ہر فریم میں ان کی بیوی کی صرف آنکھیں ہیں اور دیکھنے والا تو صرف انہیں ایک لمحہ دیکھ کر ہی مدہوش سا ہو جاتا ہے۔۔ دیکھا آپ نے' آنکھیں کس طرح لڑتی ہیں۔ میرا مطلب ہے' ڈنک مارتی ہیں جبکہ

اس افغانی فتنہ طراز کی ایک ٹانگ میں معمولی سالنگ بھی تھا لیکن یہ سقم بھی اس کی سیاہ چشم حشرساماں کے سامنے عذرِ لنگ ٹھہرا۔

مولوی عبدالسلام نیازی دہلویؒ اپنے دور کے نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ صفاچٹ داڑھی مونچھ، گھٹا تالو، موٹی سی گردن، پہلوانوں سا تن و توش، کھلتی ہوئی شہاب میدہ رنگت، کسی انگ رنگ سے عالمِ اجل دکھائی نہ پڑتے تھے مگر علم و فضل کا یہ عالم کہ ہر مروّجہ علم سے وجود باری تعالیٰ ثابت کر دیتے تھے۔ دنیا جہاں کے علوم گھوٹ پی رکھے تھے۔ متروک، غیر متروک زبانوں کے عالمِ بے بدل۔ حکمت، دین، تصوّف، فقہ، ریاضی، ہیئت، ریاضی، تقویم، تنجیم، موسیقی، راگ داری، نجوم، علم الانسان، علم الاجسام، علم البیان، معقول و منقول، علم الانساب، علوم علوی و سفلی، عروض و معروض، ایسا کون سا علم تھا جہاں وہ حرفِ آخر نہ تھے۔ وقت کے بڑے بڑے عالم فاضل، امراء، حاکم وقت حاضری پہ لرزہ براندام رہتے، قطعی کسی کا لحاظ روا نہ رکھتے اور جو من میں آتا کر گزرتے۔ جو زبان پہ آتا کہہ جاتے تھے۔ ہم عصروں میں ابوالکلام آزاد، جواہر لعل نہرو، میر عثمان، سرسید احمد خان، ظفر علی خان، سرمسعود اور بہت سے اکابرین تھے جو شرف باریابی کے متمنی رہتے مگر کسی کو درخور اعتناء نہ گردانتے۔ جن خوش نصیبوں سے التفات فرماتے، وہ فیض یاب ہو کر لوٹتے۔ مولوی کرامت علی اور خواجہ حسن نظامیؒ سے خوب بنتی تھی۔ مجلّہ ریاست کے ایڈیٹر سردار دیوان سنگھ مفتوں، بیسویں صدی کے مدیرِاعلیٰ خوشتر گرامی سے بھی دانت کاٹی تھی، گو یہ دونوں حضرات غیر مسلم تھے۔ تیلیوں، میلیوں اور چھوٹے طبقے کے لوگوں سے خوب کھلتے تھے۔ درویش طبع، ملنگ آدمی تھے۔ نہ کھانے کی ہوش، نہ پہنے کا لپکا۔ دھوتی، بنیان میں سردیاں گرمیاں کاٹ دیتے۔ لگی بندھی آمدن، نہ بظاہر روزی کا وسیلہ لیکن کوٹھری میں بوریاں اور تھیلے اپلوں کی طرح نوٹوں سے بھرے رہتے۔ آشفتہ مزاج بھی تھے، جھٹ پٹ مرنے مارنے پہ اتر آتے۔ دشنام طرازی کے موحد و موخر تھے۔ ایسے ایسے گالیوں کے سلسلے ملاتے کہ سماعت کو پسینہ آ جاتا۔ بدقسمتی سے یا خوش نصیبی کہ دہلی کے ایک جیّد عالم مولانا ابصار بلگرامی کہیں مسئلہ وحدت الوجود پہ ان سے بھڑ گئے۔ وہ بھی تو اپنے طور پہ بہت بڑے عالم تھے۔ ہزاروں معتقد، شاگرد اور مرید اور ادھر مولانا! بھڑوں کا چھتہ۔ خدا دے اور بندہ لے۔ اسے آڑے ہاتھوں لیا، کڑک کر کہنے لگے۔

"دو ٹکے کے مولوی! اگر اپنی میا کا دودھ پیا ہے تو آدھا پہر شام کا میرے نام کر دے اور اپنا ٹیڑھا منہ مت کھولنا۔ پھر تو جو فیصلہ کرے، مجھے قبول ہوگا۔"

ایک شاگرد کو بھگایا، تھوڑی دیر میں ہی ان کا منظور نظر عثمان اور اس کا جوڑی دار رمضان حاضر ہو گئے۔ عثمان عارفانہ کلام گاتا تھا، رمضان اس کا گتیا تھا۔ عثمان کا گلا تھا کہ سرسوتی کا استھان، مولوی عبدالسلام کی نظر خاص نے اس بالشت بھر کے سانولے سے لونڈے کو بڑا قد آور کر دیا ہوا تھا راگ ودّیا کے ساگر سے دو چار قطرے اس کے حلق میں ٹپکا دیئے ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے سُر سچائی، سینچائی دونوں برابر براجمان تھیں۔ بچے اجازت پا کر، راگ ساز درست کرنے بیٹھے تو مولانا ابصار گرامی بھڑک اٹھے۔

"مولانا! یہ کیا خرافات ہے، آپ ان لونڈوں کو میرے سامنے بٹھا کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ غیر شرعی اہتمام ہے---"

مولانا بھڑک اٹھے، سیخ پا ہو کر فرمانے لگے۔ "آپ خاموش بیٹھے رہیں، یہ رُموزِ وحدیت اس آسانی سے آپ کی بُدھی میں آنے والے نہیں--- مَیں موسیقی کی راہ سے آپ کو راستہ دکھاتا ہوں۔" ادھر عثمان کو اشارہ کر دیا۔

جمال مطلق آمد جلوہ آہنگ، مقید گشت یک رنگی بصد

عثمان نے امیر خسروؒ کا دامن تصوّف پکڑ لیا تھا۔ کلام کا تصوفانہ رنگ، راگ کی بندش، سر کا رچاؤ، وقت کی بات، شعر کی مختلف انداز میں تکرار۔ جیسے گرہ پہ گرہ کھلتی گئی، اک اک کر کے تمام حجاب دور ہوتے چلے گئے۔ مولانا ابصار کو جیسے چپ نے نگل لیا۔ منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے عثمان کو دیکھے چلے جا رہے ہیں۔ تن کا ہوش، نہ من کی خبر۔ ساتھ دو چار اور بھی مولوی ٹائپ کے لوگ تھے، انہیں بھی سانپ سونگھ گیا تھا۔ سر ایسی لڑی کہ جھٹ سے علم کا سارا اٹرکپن رفوچکر ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد داڑھی سینے سے لگ گئی۔ سر ہلنے لگا، پھر لب ہلے اور "جمال مطلق آمد جلوہ آہنگ، مقید گشت یک رنگی بصد رنگ" دہراتے ہوئے احباب کے ساتھ سیڑھیاں اتر گئے۔ پھر جب تک قیام سانس و دم رہا، یہی دہراتے رہے۔

بول کا ڈنک بھی انسان کو بے حال کر دیتا ہے۔ یہ جسم سے زیادہ تحریم انا اور عزت نفس پہ محسوس ہوتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ کسی اپنے بیگانے کا بول ایسا لڑا کہ زندگی اور فکر و

اعمال کا رُخ ہی بدل گیا۔ جیسی میاں رانجھے کو بھابیوں نے بول مارا تھا کہ دیکھیں گے جب ہیر سیال کو بیاہ کر لاؤ گے--- بیجو باورا بھی اِک بول کر بناء پہ باورا بنا تھا' تیمور لنگ اور نپولین کے علاوہ ہٹلر بھی اسی بول کے ڈسے ہوئے تھے' نطشے جیسے عظیم دبنگ فلاسفر کو جذب کی ڈگر پہ ڈالنے کے لئے اس کے ایک ہم عصر حکیم کا ایک بول ہی کارگر ثابت ہوا۔ ابراہم لنکن کو اپنے وقت کا عظیم صدر بنانے میں ایک بول کا ہاتھ تھا۔ اپنے قائداعظم محمد علی جناح کی کانگرس سے علیحدگی بھی گاندھی کے ایک بول کی وجہ سے ہوئی تھی اور کاروں والے ہنری فورڈ کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ ہوا تھا۔

میرا اپنا معاملہ بھی ایسا ہی ہے' اکثر جمعرات کے روز داتا سرکارؒ کے قبیلہ رُخ برآمدے میں مولوی فیروزالدین مرحوم کے مرقد کے پاس ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھتا ہوں۔ کمر کے عارضے کی وجہ سے مجبور ہوتا ہوں کہ اپنے وزن پہ بیٹھ نہیں سکتا' ہلکی سی چادر سے خود کو ڈھانپا ہوتا ہے کہ اکثر جان پہچان والے میری توجہ میں خلل ڈالتے ہیں۔ اکثر اللہ کے بندے لنگر کی شرینی' الائچی دانے' مٹھائی وغیرہ آگے رکھ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی سادہ لوح مجھ گنہگار سیاہ کار کو "پہنچاہوا" سمجھ کر پاس بھی بیٹھ جاتا ہے' دُعا کے لئے کہتا ہے۔ اکثر پاؤں ہاتھوں کے گرد ہو جاتے ہیں۔ میں حتیٰ الوسع ان چیزوں سے اجتناب برتتا ہوں۔ دوسروں کو بھی ان غیرضروری اور غیرشرعی حرکات سے بچنے کی تلقین کرتا رہتا ہوں لیکن کیا کیا جائے ان لوگوں کو جو محض اپنی عقیدت اور سادہ لوحی کی بناء پہ ہر بزرگ نما شخص کو کوئی پہنچا ہوا ولی یا اللہ والا جان کر اس کی پوجا شروع کر دیتے ہیں اور اسے اپنا ملجا و ماوا سمجھ کر اس کے آگے بچھے جاتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے کئی دو نمبر کے بزرگ نما نوسرباز فراڈیئے محض وہاں جاتے ہی اس لئے ہیں کہ سادہ لوح انسانوں کو اُلو بنا کر اُلو سیدھا کریں۔

ایسے ہی ایک دن میں سر ڈھانپے اپنی چتا میں پھنسا ہوا وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ اچھا خاصا ہجوم تھا' ہر کوئی اپنی اپنی چکی چلا رہا ہے۔ میرا جھکا ہوا سر گھٹنوں میں تھا' حسبِ عادت خودبخود میرے منہ سے "اللہ اکبر کبیرہ" نکلا۔ نہ بلند اور نہ آہستہ' معمول کے مطابق نارمل انداز میں لیکن مجھے کیا خبر کہ میری بائیں جانب میری ٹیک والے ستون سے کوئی کبیر صاحب بھی ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔

"جی' آپ نے کچھ مجھ سے فرمایا---؟"

اس جوان نے مجھے ہلکے سے ہلاتے ہوئے کہا۔ مَیں نے گھونگھٹ پلٹ کر اسے دیکھا۔ سُوجی ہوئی سُرخ سرخ آنکھیں' سکندر بخت ماتھا' ایک آدھ عشرے کی بڑھی ہوئی داڑھی' مضبوط مردانہ جبڑا' اُٹھی ہوئی ستواں ناک کے نیچے خوبصورت سنہری مونچھیں' سرخ بھوئی ہونٹوں کے اندر چمکدار سپید برابر سطح دانت' تومند گردن۔ سلوا سا سفید موٹے کھدر کا کھلے گریبان والا کُرتہ پہنے وہ کسی ریاست کا معتوب ولی عہد دکھائی پڑتا تھا۔ قیمتی سیاہ شال اس کے شانوں پہ بڑی بڑی شاندار دکھائی دے رہی تھی۔ میری نظروں کی تاب نہ لا کر اس نے نگاہیں جھکالی تھیں۔ چند ثانیئے میں اسے دیکھتا رہا۔

"بیٹا! کیا میں نے تم سے کچھ کہا؟"

بجلی سی چمک سے وہ مجھے دیکھ کر نگاہیں جھکاتے ہوئے ادب سے بولا۔ "یوں لگا تھا جیسے آپ نے میرا نام لیا ہو--- میرا نام کبیر ہے لیکن سب مجھے کبیرا کہتے ہیں---"

مَیں مسکرا دیا' بولا۔ "ہاں' مَیں نے اللہ اکبر کبیرہ کہا تھا---" اس کی جانب پہلو بدلتے ہوئے مَیں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "کبیرہ کا مطلب ہے' بڑوں کا بڑا--- ویسے تمہیں کبیر ہی کہلوانا چاہئے' کبیرہ نہیں---"

"بزرگوار! مَیں تو کبیر بھی کہلوانے کے لائق نہیں---" وہ مزار شریف کو دیکھتے ہوئے پھر بولا۔ "--- نہ جانے کیا سوچ کر والدین نے میرا یہ نام رکھ دیا ہے۔ باباجی! کیا مَیں اپنا نام بدل سکتا ہوں۔ ایسا نام جس کے معنی کوئی بت ہی--- میرا مطلب ہے کہ ایسا نام جس سے بت ہی گنہگار' بُرا' بے ضمیر' حقیر جیسے معنی نکلتے ہوں۔"

"نہیں' بیٹا! نام تو اچھا ہی ہونا چاہئے' یہ اللہ رسول کا حکم ہے۔ تمہیں ایسا نہیں سوچنا چاہئے--- خطا اور نسیان تو انسان کی فطرت میں شامل ہیں۔ ایسا تو بالکل نہیں ہے کہ انسان بھولے سے کوئی غلطی کر بیٹھے اور پھر مزید غلطی کر کے اپنا اچھا نام بھی بدل کر بُرا نام رکھ لے' نام تبدیل کرنے سے کچھ نہیں ہوتا بلکہ نیت' عمل اور قبلہ بدلنے سے کچھ ہوتا ہے۔" مَیں نے اس کے ماتھے پہ نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔ "ماتھا چتون' رکھو تو سکندر کی مگر بات--- تو وہ آپ نے پورس سی بھی نہیں کی---"

وہ ماتھا جھکا کر فرش کھوجنے لگا اور مَیں خاموشی سے بے آہٹ اٹھ کر مسجد کی جانب چلا

گیا۔

آنے والی جمعرات وہ میری پسندیدہ جگہ پہ میرے والے انداز میں ہی بیٹھا ہوا تھا۔ اِک لمحہ کو تو مجھے یوں لگا جیسے میرا ہمزاد بیٹھا ہو۔ وہی سیاہ شال' منہ سر چھپایا ہوا' سر گھٹنوں میں۔۔ سبیل کے پاس کھڑا مَیں کتنے ہی لمحے اسے گھورتا رہا۔ اچانک اس نے سر اٹھایا' میری نگاہوں اور اس کی شعلہ بار آنکھوں کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ وہ سمٹا' بیٹھے ہی بیٹھے کھسک کر بائیں جانب ہو لیا۔ مَیں عجلت سے بڑھ کر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ "السلام علیکم" کے جواب میں مَیں نے "وعلیکم السلام" کہا۔

"آپ اس دن مجھے دلدل میں پھینک کر چلے گئے تھے۔"

بن دیکھے وہ ہَولے سے مجھ سے مخاطب تھا' میرے منہ سے بیساختہ نکلا۔

"جب انسان جواب دینے کی بجائے نظریں جھکا کر زمین دیکھنے لگتا ہے تو دلدل خودبخود ہی پیدا ہو جاتی ہے' سمجھ اور عمل نیچے نہیں بلکہ سامنے اور دُور تک دیکھنے کے نام ہیں۔۔۔"

"سامنے دیواریں اور دُور آگے اندھیرے ہیں۔۔۔" اس کی آواز اندھیرے کنویں سے آتی ہوئی سنائی دی۔

"ایسے میں تدبیر اور تحمّل کی روشنی اور کسی روشن ضمیر کی رفاقت و مصاحبت تلاش کرنی چاہئے۔۔۔" مَیں نے جواب دیا۔

چند لمحے سکوت کے بعد وہ بولا۔

"نظر کور' پاؤں میں چھالے' مایوسیوں کے گہرے بادل۔۔۔ کیسے تلاش ہو؟"

"ظاہر دکھائی اور سجھائی نہ دے تو باطن کو روشن کر لینا چاہئے' اسی روشنی میں راہ اور رہبر دکھائی پڑتے ہیں۔"

"باطن کا دِیا کیسے جلے۔۔۔؟"

"جہاں صبح و شام دل اور دیئے سلگ رہے ہوتے ہیں وہاں اہلِ طلب و شوق کے باطن خودبخود روشن ہو جاتے ہیں۔"

"بزرگوار! پچھلی دو جمعراتوں سے یہاں پڑا ہوا ہوں' ابھی تک کوئی راستہ سجھائی نہیں دیا۔ میری حالت اس مرُدے سی ہے جس کا قبر میں حساب کتاب ہی نہیں ہو رہا۔۔۔ کچھ

آپ ہی میری رہبری فرمائیں؟"

"بھائی' میرے! تم جس کے دَر پہ بیٹھے ہوئے ہو وہ تمہیں اور تمہاری مشکل کو خوب جانتا ہے۔ بے صبری مَت دکھاؤ' تمہاری مُشکل کشائی ضرور ہوگی بس نیّت میں سچائی اور حسُنِ طلب میں کجی نہیں ہونی چاہئے۔ داتاؒ کے وسیلے سے اللہ سے فریاد کرو' یقیناً تم یہاں سے خالی ہاتھ نہیں لوٹو گے۔"

وہ یقیناً پھر کسی دلدل میں اتر گیا ہوگا' کافی دیر جب کوئی جواب موصول نہ ہوا تو مَیں نے اس کی جانب دیکھا۔ گھٹنوں میں سر دیئے وہ شاید اندر کا دِیا روشن کرنے کی کوشش میں تھا۔ میری اپنی طبیعت بڑی بوجھل ہو چکی تھی' سر میں ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ مَیں باہر نکل آیا اور چائے پینے کے بعد نماز کے وقت دوبارہ پہنچ گیا۔ نماز کے بعد کچھ دیر کمر سیدھی کرنے کی نیّت سے لیٹ گیا' آنکھیں مُوندھ لیں۔ دو موٹی موٹی متوّرم سُرخ آنکھیں جن میں شاید کئی جاگتی اونگھتی راتوں کی جلن اور کرب تھا' میرے روبرو آ گئیں۔ میں عجیب سی بے چینی محسوس کرنے لگا تھا۔ آنکھیں کھولتے ہی وہ آنکھیں غائب ہو گئیں۔ سامنے مسجد کے برآمدوں کی خوبصورت محرابیں دیکھتا رہا۔ پھر ذرا آنکھیں مُوندھیں مگر وہی آنکھیں پھر سامنے جیسے دو جلتی ہوئی مشعلیں ہوں۔ یوں لگا کہ جیسے وہ اپنے باطن کا دِیا روشن کرنے میں کامیاب ہو چکا ہو۔۔۔ وضو تازہ کرنے کے بعد مَیں داتا صاحبؒ کے برآمدے میں آ گیا۔ وہ وہیں میری جگہ پہ جما سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھا تھا۔ اب کے وہ میری طرف متوّجہ بھی نہ ہوا جبکہ مجھے یقین تھا کہ وہ میری آمد سے بے خبر نہیں ہے۔ مَیں مسکراتے ہوئے گھر جانے کے لئے باہر نکل آیا مگر رات بھر میں اس کی آنکھوں سے آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ کبھی سویا اور کبھی جاگا۔ صبح کی نماز سے بھی اک عجیب سا خمار چھایا ہوا تھا۔ نہانے دھونے کے بعد مَیں خلاف معمول پھر داتا سرکارؒ کے قدموں میں پہنچ چکا تھا۔ جمعہ مبارک کی وجہ سے زائرین جمعرات سے ہی یہاں پڑے ہوتے ہیں۔ وہی ہجوم' وہی دھکم پیل۔ وہی رونق' وہی نورانی ماحول۔۔۔ وہ وہیں تھا' اسی حالت میں جس میں اسے چھوڑ کر آیا تھا۔ حجرہ غریب نوازؒ کے پاس کھڑا مَیں اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ لوگ درمیان میں آ گئے' پھر نظروں سے نظریں مل گئیں۔ سمٹ کر شاید وہ مجھے اپنی مخصوص جگہ بیٹھنے کا اشارہ دے رہا تھا۔ میرے قریب آتے ہی وہ ذرا پرے کھسک گیا۔

"السلام علیکم---!" اس بار پہل میری جانب سے ہوئی تھی۔

"وعلیکم السلام---!" وہ مسکرایا--- "آپ آ گئے---؟"

"ہاں--- مگر تم ابھی تک یہیں بیٹھے ہوئے ہو؟"

وہ بڑے سکون سے بولا۔ "بتایئے' کہاں جاؤں--- یہی تو مَیں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں؟"

مَیں عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ جس طرح مچھلی کے حلق میں کانٹا پھنس جاتا ہے' میرے حلق میں بھی یہ نوجوان کانٹے کی طرح پھنس چکا تھا--- چند لمحے دونوں طرف خاموشی سے گزر گئی' پھر میں اٹھتے ہوئے بولا۔

"آیئے میرے ساتھ---"

بغیر کوئی جواب دیئے وہ سیاہ شال سمیٹتا ہوا اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ سیڑھیاں اُترے' مَیں نے اپنے جوتے لئے۔ وہ خاموش کھڑا تھا۔

"آپ کے جوتے کہاں ہیں---؟" مَیں نے جوتے پہنتے ہوئے پوچھا۔

وہ لاپرواہی سے کہنے لگا۔ "کچھ یاد نہیں' دو ہفتے پہلے کہیں رکھے تو تھے--- ویسے بھی دلدل سے بچ نکلنے والا جوتوں کے بارے میں متردّد نہیں ہوتا۔"

مَیں عجیب سے عالم استعجاب میں اسی کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور جوتوں کے متعلق دلدل کے حوالے سے جواب پہ لطف لے رہا تھا۔

"بیٹا! ذرا جیب دیکھیں' گتے کا کوئی نمبر والا ٹکڑا پڑا ہو گا---"

اس نے کھڑے کھڑے جیب الٹی۔ کئی چھوٹے بڑے' تڑے مڑے نوٹ پڑے تھے مگر جوتوں کا نمبر نہیں تھا--- ہم سروس کی دوکان تک آئے' ایک سادہ سی چپل خریدی اور پھر پیدل ہی بھاٹی دروازے کے اندر داخل ہو گئے۔ گلی پٹ رنگاں کے سامنے اچانک وہ رک گیا۔

"کیا بات ہے' رک کیوں گئے---؟"

"گستاخی نہ سمجھیں تو کیا مَیں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں---؟"

مَیں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "حکیم کے پاس---"

اس نے کہا۔ "--- لیکن مجھے تو کوئی جسمانی تکلیف یا پریشانی نہیں۔ جہاں تک مَیں سمجھ پایا ہوں' میرا معاملہ تو باطنی اور روحانی ہے---"

مَیں نے مسکرا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سمجھایا۔ "بھائی! وہ بھی کوئی پڑیاں باندھنے والے حکیم نہیں' وہ تو حکیم الامّت ہیں' مردِ حق آگاہ ہیں--- اور ہاں' اب جب تم میرے ساتھ چل ہی پڑے ہو تو اپنی مرضی' سوچ اور اَنا کو الگ باندھ کر رکھو ورنہ تم میرا اور اپنا راستہ اور وقت بھی کھوٹا کرو گے۔"

وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔ "اجازت دیں تو ایک درخواست کرنے کی جرأت کروں؟"

"فرمایئے--- کیا کہنا چاہتے ہیں آپ---؟" مَیں نے قدرے جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو باہر سے رکشہ پکڑ کر مینار اور قلعہ کے راستے علامہ صاحب کے مزار پہ چلے جاتے ہیں' ہیرامنڈی سے گزرنا میرے لئے اذیت کا باعث ہو گا---"

میں کوئی جواب دیئے بغیر ہیرامنڈی کی جانب چل پڑا' پولیس چوکی والے چوک میں کسی مریل سے نشئی کی لاش پڑی تھی' ایک اس جیسا ہی نشئی پاس کھڑا کفن دفن کے لئے چندہ اکٹھا کر رہا تھا۔ میں نے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھا' دوسرا نوٹ سو روپے کا تھا جو کبیر نے اسے دیا تھا' شال سے منہ ڈھانپے وہ میرے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا--- مزار پہ فاتحہ پڑھنے میں وہ میرے ساتھ شامل تھا' فارغ ہوئے تو میں اسے سامنے ہی حضوری باغ میں لے کر بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھتے ہی وہ کہنے لگا۔

"میری کسی حماقت یا گستاخی سے آپ کو زحمت ہوئی ہو تو درگزر فرما دیں--- دراصل اسی بازار نے مجھے ڈسا ہوا ہے' اس بازار کے کئی لوگ مجھے جانتے بھی ہیں۔ اِدھر میری شہرت اچھی نہیں' مَیں نہیں چاہتا تھا کہ آپ میرے ساتھ کسی بدمزگی کا نشانہ بنیں---"

میں نے مسجد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ عزیزا! وہ اللہ کا گھر ہے' یہ سامنے اللہ کے ایک بندے کا مرقد ہے۔ جہاں ہم بیٹھے ہیں' یہ حضوری باغ کہلاتا ہے اور جہاں سے ہم آئے ہیں وہ گنج بخش ہے۔ جدھر سے ہم گزرے ہیں وہ ہیرامنڈی ہے۔ تم درمیان میں

ہو۔ پہلے حضوری پکڑو' اللہ اکبر کبیرہ کہو اور پھر بات کرو۔"

☆☆

میرا نام سید کبیر علی شاہ ہے' ملتان کے ایک متمول کاروباری خاندان سے میرا تعلق ہے۔ میٹرک کے بعد میری ہی خواہش کے مطابق والدین نے مجھے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے لاہور بھیج دیا۔ کالج میں تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ اور دلچسپیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ اسٹوڈنٹ یونین میں سرگرمی دکھانے لگا۔ اچھے بُرے دوستوں کی صحبتیں' جائز ناجائز کام' ہنگامے' جلوس' توڑپھوڑ' ناجائز اسلحہ' منشیات' ڈکیتیاں' قتل و غارت' دشمنیاں' دوستیاں' غرض کہ مَیں طالب علم کی بجائے ایک ناپسندیدہ عنصر بن گیا۔ گھروالوں نے مجھے ان راستوں سے واپس لانے کی بہت کوشش کی مگر مَیں بہت آگے نکل چکا تھا۔ پولیس کے ایک پھڈے میں مجھے اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مجبوراً" اور ضرورتاً" انڈر گراؤنڈ ہونا پڑا۔ روپے پیسے اور وسائل کی کچھ کمی نہ تھی' ہر قسم کی اچھی بُری مصروفیات ختم کر کے ہم ایک محفوظ جگہ پہ فراغت کے دن گزارنے لگے۔ شراب' کباب اور شباب۔ دن رات محفل آرائیاں' دہشت' وحشت اور دولت--- جو چاہتے' ہو جاتا۔ جسے بلاتے' پہنچ جاتا۔ ایسی ہی ایک محفل میں ایک نئی لڑکی آئی۔ لڑکی کیا تھی' میٹھی اور دھیمی سی آگ تھی۔ دوسروں کے لئے شاید وہ اتنی اہمیت کی حامل نہ تھی' نہ ہی وہ کوئی ایسی حسین تھی کہ جس کے لئے کوئی اپنا سب کچھ قربان کر دے لیکن وہ لڑکی جیسے مجھے چُبھ سی گئی۔ مَیں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس دن وہ پہلی بار ہمارے ٹھکانے پہ آئی تھی۔ معصوم سا چہرہ' ناک میں نازک سی نتھ--- ایک عجیب بات' جو مَیں نے شدت سے محسوس کی' اس میں طوائف پن نام کو نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے حیائی اور عیاری کی بجائے اِک دھیمی سی حیا اور جھجک سی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں سوقیانہ اور بازاری پن نہیں تھا۔ وہ رقص کر رہی تھی مگر نہ اشارے' نہ کنایئے' نہ نوٹوں کی جانب حریصانہ نگاہ۔ جسم اور اعضا کی بے جانمائش نہ سفلی جذبات کو ابھارنے والی حرکات و ادائیں جو اس قماش کی عورتوں کا کارگر حربہ ہوتی ہیں۔ یار لوگ بس اسے گوارہ کر رہے تھے' بڑی بے دلی سے اس پہ چھوٹے چھوٹے نوٹ پھینک رہے تھے۔ مَیں تو کسی اور ہی عالم میں تھا' مَیں نے جتنے بھی نوٹ پھینکے وہ سب پانچ پانچ سو کے تھے۔ دوستوں نے کہا بھی کہ پاگل ہو گئے ہو' ماٹھی پہ ماٹھے نوٹ پھینکو--- خیر' دوستوں نے بہت جلد اسے ماٹھی سمجھ کر فارغ کر دیا گیا۔ وہ چلی گئی' جانے سے پہلے میرے لئے پیغام چھوڑ گئی کہ مجھے ملو--- میری تو دنیا ہی بدل گئی' وہ نہ بھی بلاتی تو مَیں خود ہی اس کے پاس پہنچ جاتا۔

ایک رات مَیں اس کے کوٹھے پہ تھا۔ اس کے سرپرست بھی کوئی اچھے حالات میں نہ تھے' شاید اس کی وجہ اس کا ماٹھا پن تھا۔ ایسی شریف طوائفوں کی پروفیشنل لائف بہت کم ہوتی ہے' ان کے سرپرست اور سازندے بڑے ناخوش اور خستہ حال ہوتے ہیں۔ تنگ پڑ کر ایسی گائیں کسی دولت مند بڈھے کے گھونٹے پہ باندھ کر پلا پاک کر لیا جاتا ہے یا پھر کل وقتی جسم فروش بن کر اپنے سرپرستوں کا دال دلیہ چلاتی رہتی ہیں--- میری آمد کو انہوں نے اپنی خوش قسمتی سمجھا' بڑی آؤ بھگت کی۔ خاطرمدارت کے بعد انہوں نے ہم دونوں کو تنہائی کا محفوظ اور پُرلطف موقعہ فراہم کر دیا۔ معمولی سا پر آسائش کمرا تھا۔ وہ میرے سامنے پلنگ پہ بیٹھی میٹھی میٹھی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میری بھی عجیب سی کیفیت تھی' مَیں اس تھکے ماندے مسافر کی طرح تھا جس نے اپنی منزل پالی ہو' یہ جاننے کے باوجود بھی کہ یہ اس بازار کا مال ہے جانے کس کس کے ہاتھوں بکا ہو--- سب کچھ سہی لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ نہیں' یہ لڑکی پاکیزہ ہے۔ بالکل وہی جس کی مجھے تلاش تھی۔ یہی آنکھیں' یہی چہرہ' یہی معصومیت' ایسا ہی سراپا' یہی رکھ رکھاؤ--- مَیں اپنے خیالوں میں مگن اسے چاہت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ اٹھی اور الماری سے ایک رومال اٹھا لائی۔ میرے سامنے لادھرا' وہی میرے دیئے ہوئے کئی نوٹ تہہ در تہہ--- میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

"بھائی جان! انہیں اپنے پاس رکھ لیجئے' میری ڈولی اٹھاتے وقت کام آئیں گے---"

ایک دھماکہ سا ہوا' میری آنکھوں کے آگے اندھیرے کی دبیز چادر تن گئی' کانوں میں جیسے کسی نے پگھلتا ہوا سیسہ انڈیل دیا ہو--- پھر نہ جانے کیا ہوا' اچانک میرا ہاتھ اٹھا اور اس کے پھول سے نازک گال کو چاٹتا ہوا لہرا گیا۔ وہ بے دم سے ہو کر پلنگ پہ ڈھے گئی۔ میں نے نیفے میں اڑسا ہوا موزر نکالا' اس سے پیشتر کہ ٹریگر پہ انگلی کا دباؤ پڑتا وہ ایک ملکوتی سی مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بڑی بے خوفی سے ہاتھ بڑھا کر موزر کو پکڑ لیا' بولی۔

"میں مرنے سے نہیں ڈرتی لیکن اس طرح آپ کے لئے پریشانی پیدا ہو جائے گی۔ پھر بھی اگر آپ مجھے مارنا ہی چاہتے ہیں تو مجھے ختم کرنے سے پہلے میرا قصور بتا دیں جس کی سزا آپ کے نزدیک صرف میری موت ہے---؟" "ذلیل طوائف ! تمہیں مجھے بھائی کہنے کی جرأت کیوں کر ہوئی؟" میں نے موزر اس کے سینے پہ رکھتے ہوئے پوچھا۔

وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ "آپ کے فولادی موزر کے آگے دو انچ کے فاصلے پہ ایک گوشت پوست کا لوتھڑا دھڑک رہا ہے جسے دل کہتے ہیں' یہ اس کی آواز ہے۔ آپ کا دل کسی کی بہن پہ آ جائے تو آپ اسے محبوبہ بنا لیتے ہیں' میرا یہ دل اگر کسی کو بھائی بنا لے تو اس میں میرا کیا قصور؟--- یہ صحیح ہے کہ ہم طوائف خانے میں ہیں' بدنام ہیں' رُسوا ہیں۔ محبوبہ یا رکھیل بنیں تو دل و دولت ہمارے قدموں میں اور بہن بننا چاہیں تو فولاد اور بارود ہمارے سینے پہ---" بڑی بے خوفی سے موزر ہٹاتے ہوئے وہ پھر الماری تک گئی اور ایک پرانی سی تصویر اٹھا لائی' بولی۔ "اس تصویر کو دیکھو' یہ میرا اکلوتا بڑا بھائی تھا۔ میرے مرحوم باپ کی جگہ تھا۔ ماں کینسر سے چل بسی' باپ کو میری ماں کی بے وقت موت کا غم اور میری فکر لے ڈوبی۔ اکلوتا بھائی بُروں کی صحبت میں جا بیٹھا' منشیات اور جوئے کی لت میں میرا بھی سودا کر بیٹھا--- اوپر جاؤ' کوٹھے پہ کبوتروں کی چھتری کے پاس مدہوش پڑا ہوگا۔ اس کے نشے پانی کا انتظام بھی میری ذمہ داری ہے۔"

میری نظریں ایک خوبرو جوان کی تصویر پہ جمی ہوئی تھیں۔ وہ ہوبہو مجھ جیسا تھا۔ میری ہی آنکھیں' مونچھیں' چہرہ' ناک نقشہ' کہیں بھی تو کوئی فرق نہ تھا اور وہ کہہ رہی تھی۔

"اس دن محفل میں' میں نے تمہیں دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ جیسے میرا اپنا بھائی میرا مجرا دیکھ رہا ہو۔ ایک تم ہی تو تھے جو مجھے داد و دولت دے رہے تھے' میں نے اسی رات فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہیں اپنے دل کی آواز ضرور سناؤں گی چاہے اس کا انجام جو بھی ہو۔ میں نے تمہارے سارے نوٹ سنبھال کر رکھے' تمہیں آنے کا پیغام دیا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ابھی تک مجھے محفوظ اور باعصمت رکھا ہوا ہے---" وہ مجھے ایک کیپسول دکھاتے ہوئے بولی۔ "یہ زہر ہے' میری عزت کا محافظ۔ جس دن میں گناہ کے لئے مجبور کر دی گئی وہ میرا آخری دن ہوگا---"

میں موزر پھینک کر پلنگ کی پٹی پہ سر جھکائے بیٹھ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہوئے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ اس کی معصوم آنکھیں آنسوؤں سے جل تھل تھیں' ہونٹوں پہ کپکپاہٹ اور جسم پہ لرزہ طاری تھا۔ وہ التجا کر رہی تھی کہ بس ایک بار مجھے بہن کہہ دو' یہی میری پہلی اور آخری خواہش ہے۔ بھائی بن کر ڈولی پہ سوار کرا دو یا میت کی چارپائی پہ ڈال دو' تمہیں اختیار ہے۔"--- میرے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں' دل جیسے پھڑپھڑا کر سینے سے باہر اچھلنے کو ہو۔ کوئی فیصلہ کیا کرتا' مجھے تو اس کا چہرہ دھندلا اور کمرے میں ہر سو غبار اور دھند سی چھائی ہوئی دکھائی دے رہی تھی--- کئی طویل لمحے یونہی گزر گئے۔ وہ میرے پاؤں پکڑے' سر جھکائے بیٹھی تھی اور میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ہوئے اپنے اندر کے انسان سے گتھم گتھا تھا۔ پھر میں نے ہولے سے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے سر پہ رکھا' دوسرا ہاتھ اس کی ٹھوڑی کے نیچے لا کر بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا اور بولا۔

"آنسو پونچھ ڈالو' میری بہن---!"

وہ دھاڑیں مارتی ہوئی میرے قدموں سے لپٹ گئی۔ میں نے اسے تسلی دی' اٹھا کر اپنے ساتھ بٹھایا اور پوچھا۔

"بتاؤ' اب تم اور کیا چاہتی ہو؟"

وہ بولی۔ "بڑے بھائی کے ہوتے ہوئے میں کیا چاہ سکتی ہوں؟"

چند ثانئے غور کرنے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ جاؤ' اپنے بھائی اور کوٹھے داروں کو بلاؤ۔ اس کے باہر جاتے ہی میں نے لپک کر موزر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پہلے اندر اس کا بھائی داخل ہوا۔ مکروہ شکل' نشے میں جھولتا ہوا' اندر داخل ہوتے ہی ہاتھ جوڑ کر فرش پہ بیٹھ گیا۔ ادھیڑ عمر خرانٹ سی ڈیرہ دارنی۔ ایک کبڑا مدقوق سا جو شاید استاد جی ٹائپ کوئی چیز تھا۔ ایک اور بدمعاش سا نوجوان جو شاید ایسی جگہوں پہ محض نیکے اور حفاظت کے لئے ہوتے ہیں۔ وہ سب فرش پہ ڈھیر ہو گئے۔ وہ بدمعاش مجھے کھڑا گھور رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا' اشارے سے اسے پاس بلایا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں' پھر زناٹے کا ایک تھپڑ اسے رسید کرتے ہوئے کہا کہ تمہیں دیکھنے کی تمیز نہیں؟--- اس سے پیشتر کہ میں ایک اور دھرتا' نائیکہ ہاتھ جوڑے درمیان میں آ گئی اور بولی۔

"معاف کر دیں سرکار! اس حرامخور کی نظریں ہی ایسی ہیں--- آپ حکم کریں' ہمیں

کس لئے یاد فرمایا ہے؟"

مَیں نے کہا۔ "اس لڑکی کو مَیں نے بہن کہہ دیا ہے' یہ آج کے بعد یہاں نہیں رہے گی اور نہ ہی آج کے بعد آپ لوگوں کا اس سے کوئی تعلق ناتا ہو گا۔۔۔"

ان کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا۔۔۔ بیوی' رکھیل' معشوقہ بنانے والے تو آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ یہ بہن بھائی کا رشتہ جوڑنے والا کہاں سے آ گیا۔۔۔ انہیں جیسے میری بات پہ یقین نہ آیا ہو' منہ پھاڑے ایک دوجے کو تکنے لگے۔ نائیکہ کے حلق میں جیسے چھالے پڑ گئے تھے' کھنکارتی ہوئی ممیائی۔

"سرکار! آپ کیا کہہ رہے ہیں' مَیں کچھ سمجھی نہیں؟"

مَیں نے اس کے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ اس لڑکی کا کون ہے"

"وہ بولی۔ "سرکار! یہ اس کا سگا بھائی عنایت شاہ ہے۔"

"۔۔۔ اور مَیں اس کا منہ بولا بھائی' کبیر علی شاہ ہوں۔" مَیں نے پلنگ پہ پڑے پانچ پانچ سو کے نوٹ اس کی طرف پھینکتے ہوئے مزید کہا۔ "یہ وہ نوٹ ہیں جو مَیں نے اسے اس رات مجرے پہ دیئے تھے' اس نے یہ مجھے واپس کر دیئے ہیں۔ ایسے نوٹ جتنے چاہو' اس کا سر صدقہ لے لو۔۔۔ یہ آج اور ابھی میرے ساتھ جائے گی اور پھر کبھی بھولے سے بھی اس کے بارے میں مت سوچنا۔۔۔ بولو' اور تمہیں کتنی رقم چاہئے؟"

وہ چند قدم سرک کر میرے قریب پہنچ کر کھکھیائی۔ "سرکار! آپ سخی سید بادشاہ ہیں' یہ بچی بھی باعصمت ہے۔ میں لاکھ بُری سہی لیکن اس بچی کو برائی سے بچائے رکھا' روٹین کا گانا ناچنا تعلیم ضرور کراتی رہی۔ آپ اس سے پوچھ لیں' یہ سچے نگینے کی مانند پاکیزہ ہے۔ نماز روزے کی پابند' اس بازار والیوں کی طرح اس میں کوئی گُن نہیں۔ یہ اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی یہاں نہیں رہتی۔ اسی لئے یہاں اسے سب مانو مائی کہتے ہیں۔ اسے آپ بصد شوق لے جایئے' میری بھی خواہش تھی کہ یہ کسی شریف آدمی کے ساتھ گھر گرہستی کر لے۔ یہ اس بازار کی چیز نہیں ہے۔۔۔"

"تم اپنی بات کرو' تمہیں کتنی رقم چاہئے۔۔۔؟" مَیں نے بات کو سمیٹنے کی غرض سے کہا۔

"آپ مجھے کچھ دینا چاہتے ہیں تو میری عاقبت اور آخرت کے لئے دو خیر کے بول دے

دیں۔ مَیں راضی' میرا خدا راضی۔۔۔"

مَیں اسی رات اسے لے کر اپنے گھر ملتان آ گیا۔ گھر والوں کو بٹھا کر صاف صاف ہر بات بتائی۔ والد صاحب تو پہلے ہی میری حرکتوں سے عاجز تھے اور آئے دن پولیس کے چھاپوں سے تنگ آئے ہوئے تھے' آگ بگولا ہو گئے۔ انہوں نے کھڑے کھڑے ہم دونوں کو دھکے دے کر نکال دیا اور آئندہ گھر میں قدم نہ رکھنے کی سخت وارننگ دے دی۔ عجیب سی پریشانی آ پڑی تھی۔ پولیس سے پہلے ہی میں چھپتا پھر رہا تھا۔ جوان منہ بولی بہن کا ساتھ' مخبری کا خوف علیحدہ۔۔۔ ملتان کسی دوست کو بھی آزمائش میں ڈالنا مناسب نہ تھا۔ کدھر جاؤں' کہاں سر چھپاؤں؟۔۔۔ کوئی راستہ اور پناہ نہ پا کر پھر لاہور کا رُخ کیا۔ لاہور اسٹیشن پہ اترتے ہی پولیس نے مجھے دھر لیا' ملتان سے ہی مخبری ہو چکی تھی۔ میری بہن پاس ہی کھڑی بجھی بجھی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مَیں نے اسی خدشے کے پیشِ نظر اسے نہ تو اپنے ساتھ بٹھایا تھا اور نہ ہی ہم اکٹھے باہر نکلے تھے۔ وہ بچ گئی' پولیس کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بھی مَیں اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آندھی اور طوفان میں کسی بچھڑی ہوئی معصوم بچی کی طرح لرزیدہ سی تنہا کھڑی تھی۔ گاڑی چل پڑی' میری آنکھوں میں آنسو تھے' سوچ رہا تھا کہ کیا قسمت پائی تھی اس نے۔۔۔ ماں چھوڑ گئی' باپ رزق خاک ہوا۔ سگا بھائی نشے اور جوئے کی اندھی کھائیوں میں اتر گیا اور مَیں منہ بولا بھائی جو شاید اس کی آخری پناہ گاہ تھا اس کٹھن موقع پہ اسے بھٹکنے کے لئے چھوڑنے پہ مجبور ہوا۔

وقت کی چکی نے مجھے کئی ماہ اذیّت اور تنہائی کے پاٹوں بیچ کچل کچل کر ریزہ ریزہ کر دیا' اس دوران میرے سارے ساتھی بھی قانون کے شکنجے میں جکڑے گئے۔ اگر کسی سے رابطہ بھی ہوا تو اس مسئلے پہ مصلحتاً کوئی بات چیت نہ ہوئی۔ سب اپنی اپنی بپتا میں پھنسے ہوئے تھے' نہ ہی ان حالات میں کسی کو میں اعتماد میں لے سکتا تھا۔ مجبوراً" سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دیا۔

آخر جیل سے نکلا۔ میرا کوئی بھی اپنا دروازے پہ موجود نہ تھا' ہوتا بھی کوئی تو پہچان نہ پاتا۔ اسی حلئے میں سیدھا ہیرامنڈی پہنچا' سیڑھیاں چڑھا تو گھنگھروؤں کی چھن چھن اور طبلے کی تھاپ نے میرا استقبال کیا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اوپر پہنچا' پردہ ہٹایا۔ ایک خوبصورت سی نوخیز لڑکی تماش بینوں کے درمیان محوِ رقص تھی۔ وہی نائیکہ بنی سنوری

بیٹھی اپنی نئی نوچی کو داد بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی دیکھ لیا۔ اس بازار کے باسی بڑے مردم شناس ہوتے ہیں' یقیناً اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ اٹھی اور سرعت سے میرے پاس آئی' باہر ہی بالکونی سے مجھے اوپر کی منزل پہ لے گئی۔ ایک کمرے میں بٹھایا' حال احوال پوچھا۔ جو میں پوچھنا چاہ رہا تھا' اس کا وہ موقع ہی نہ دے رہی تھی۔ کبھی چائے' کبھی بوتل۔ زبردستی نہلایا' حجام کو بلا کر حلیہ درست کروایا۔ نئے کپڑوں کا جوڑا منگوایا۔ سب کچھ ہونے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ خدا کے لئے اب تو میری بہن کی خبردو' وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟--- وہ کچھ جواب دیئے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میرے دل و دماغ میں مختلف خدشات سر اٹھا رہے تھے--- وہ کہاں ہے' یہاں ہوتی تو اس وقت تک میرے سامنے ہوتی۔ نیچے نئی لڑکی ڈانس کر رہی ہے۔ اس کا مطلب ہے وہ یہاں نہیں' خدانخواستہ بیمار تو نہیں؟--- انہی قیاسات میں الجھا ہوا تھا کہ وہ نائیکہ سر جھکائے بڑے ٹوٹے ہوئے قدموں سے اندر داخل ہوئی۔ ایک بندھا ہوا رومال مجھے تھماتے ہوئے' بغیر کچھ کہے بولے الٹے قدموں واپس چلی گئی۔ میں خالی خالی نظروں سے رومال کو دیکھ رہا تھا۔ خون رنگ سرخ رومال مضبوطی سے دوہری گانٹھ سے بندھا ہوا کانپتے ہاتھوں بڑی مشکل سے کھولا۔ وہی نوٹ ساتھ ایک لفافے میں بند۔ ایک رقعہ جس پہ تحریر تھا۔

"بھائی جان! اللہ کرے جس وقت آپ یہ تحریر پڑھ رہے ہوں' آپ ہر قسم کی بلاؤں سے محفوظ ہو چکے ہوں--- میں کمزور اور بے بس لڑکی آپ کی کوئی مدد یا خدمت نہ کر سکی' اس بات کا مجھے افسوس رہے گا۔ اس بات کا بھی مجھے ازحد دکھ ہے کہ میری وجہ سے آپ اور آپ کے والدین کے درمیان بدمزگی پیدا ہوئی۔ میں پوری ایمانداری سے یہ محسوس کرتی ہوں کہ آپ مجھے بہن بنا کر اس سماج میں باعزت اور پروقار زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ میری پہلی اور آخری خواہش آپ نے پوری کر دی' میرے لئے یہی کافی ہے--- میں اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہوں' یہی میرے اور آپ کے لئے بہتر ہے۔ میری تحریری ہدایت کے مطابق آپ کے دیئے ہوئے روپوں سے میرا کفن دفن ہو گا' باقی اپنی امانت آپ لے لیجئے گا۔ میری عاقبت کی بہتری کے لئے دعا کرتے رہئے گا--- آپ کی بہن' مانو مانھی۔"

وہ اپنی کتھا سنا چکا تو یہی رقعہ اس نے میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اک نظر دیکھا' پھر اسے واپس کر دیا۔ وہ گھاس کی پتیوں کو سہلاتے ہوئے پھر کہنے لگا۔

"کوٹھے سے اتر کر میں سیدھا داتا دربار آگیا۔ اس دن کے بعد آج پہلی بار آپ کے ساتھ باہر نکلا ہوں۔"

"بھائی! پھول گلستان میں ہی نہیں' جوہڑوں اور دلدلوں میں بھی کھلتے ہیں۔ اللہ والے مسجدوں اور خانقاہوں میں ہی نہیں' ایسی جگہوں پہ بھی ہوتے ہیں جہاں ان کی موجودگی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کسی گنہگار اور بدکار کا بولا ایسا اثر دکھاتا ہے کہ زندگی کا رخ اور سوچ کا دھارا تک بدل جاتا ہے اور کہیں کسی نیکو کار کی نصیحت کچھ اثر نہیں کرتی--- آپ کو بول لڑ گیا تھا' ایسے ہی جیسے زہر ہلاہل کہیں تریاق بن جاتا ہے--- اٹھو' جاؤ اپنے گھر اور والدین سے معافی مانگو۔ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری میں نئی زندگی کی شروعات کرو اور اس کی بخشش کی دعا کیا کرو جس نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر تمہیں اچھائی اور بھلائی کی راہ دکھائی---"

وہ بیرونی بڑے دروازے سے باہر نکل رہا تھا اور میں اپنے حکیم کے مزار کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

اللہ اکبر' کبیرہ!

❁❁❁

کھانے کھابے

بہت سے کھانے' کھابے ایسے ہیں جن سے لطف اندوز ہونے کے لئے آنکھوں اور تجسس کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ اگر آپ نے ان پر ضرورت سے زیادہ غور کیا' پکاتے دیکھ لیا یا ان کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں تجسس فرمایا تو جانئے کہ تمام عمر کے لئے آپ ان سے متنفر ہو گئے' یہ بھی بچے اور آپ کی جان بھی چھوٹی۔ مثلاً سری پائے' حلیم' ہریسہ' نہاری' شب دیگ' قلفہ قلفیاں' آئس کریم' کافی' چائے' چکڑ چھولے' چھتر کباب' روغنی نان قیمہ' آلو بھرے پراٹھے' شامی کباب' تکا تک اور تکیاں' کڑاہی ہانڈی' بالٹی اور لوٹا گوشت' مٹھائیاں اور بھی بہت سی چیزیں جنہیں ہم انگلیاں چاٹ چاٹ کر چٹ کر جاتے ہیں اور پھر سارا دن ڈکارتے ہوئے ملنے ملانے والوں سے فخریہ تذکرہ کرتے ہیں۔

"یار! آج سری پائے کھائے تھے۔ ابھی تک نشہ چڑھا ہوا ہے' ابھی تک منہ میں سواد باقی ہے۔"

میں خود بھی حد درجہ چٹورا اور چسکورا واقع ہوا ہوں' کسی سے کیا کہوں--- کہ پیلا پھیکا بے رنگ و بے مرچ مصالحہ کھانا' میرے اندر یرقانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے اور مجھے اختلاج سا ہونے لگتا ہے۔ بڑھاپے کے باوجود میں بیمار ہونے سے پرہیز کرتا ہوں کہ کہیں پھیکی کھچڑی یا ارہر کی آش نہ پینی پڑ جائے۔ دانتوں کی خستگی اور بے چارگی بھی ظاہر نہیں ہونے دیتا کہ اس سے تکے' بھنا گوشت' بونگ نلیاں اور روسٹ بروسٹ پہ زک پڑتی ہے۔ آنتوں اور نظام ہضم کی کمزوری' ناکارگی کا تو کبھی ذکر ہی نہیں کرتا کہ کہیں روسی چڑے' گوجرانوالہ کے بٹیرے' جڑانوالے کے تیتر اور راوی کے کھگے کسی دوسری طرف نہ

کھسکا دیئے جائیں۔ میرے احباب میں مشہور ہے کہ اگر "بلباجی" کے دل میں گھسنا ہو یا ان کی توجہ التفات چاہئے ہو تو ان سے براستہ معدہ رابطہ کیا جائے تو بلت یقیناً بن جائے گی۔ سخت نالائق ہیں جو اس طرح بے پر کی اڑاتے ہیں۔ خدا لگتی کہیں' کہیں خالی پیٹ یا بھنڈی توری سے شکم پری کر کے تعلقات میں گرم جوشی یا توجہ میں استحکام پیدا کیا جا سکتا ہے؟ سبزی ترکاری تو ویسے بھی اچھے بھلے مرد کا پتہ مار دیتی ہے۔ یہی حال دالوں کا ہے جو از قسم خشک سبزی ہوتی ہیں۔ انہیں مسلسل کھانے والے دل و دماغ اور جیب ہی کے نہیں' مزاج محبت کے معاملے میں بھی غریب ہوتے ہیں۔ چنے ذرا الگ زمرے میں آتے ہیں' جس طرح گدھے کابل سے آتے ہیں اسی طرح چنے بھی وہیں سے آتے ہیں۔ یہ کابلی چنے ہوتے ہیں' کاسٹک سوڈا ڈال کر ابالے جاتے ہیں۔ پھر گھوٹا لگایا جاتا ہے اس وقت تک جب تک یہ شکل اور ذائقے میں چکڑ نہ ہو جائیں۔ پھر اس پر ہری مرچ' دھنیا' پودینہ اور مٹی رنگت مصالحہ چھڑک کر شیشم کی لکڑی کے تابوت میں لوپر پھٹی دھوتی کا کفن ڈال کر حبسِ دم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح جو نادر الوُجود ملغوبہ تیار ہوتا ہے اس کا صفاتی نام "چکڑ چھولے" ہے۔ اس "بارود" کو زندگی' حالات اور ازواج سے بیزار حضرات صبح دوپہر مزے لے لے کر کھاتے ہیں۔ یہ بزعمِ خویش چسکورے لوگ اپنی خوش خوراکی کا ثبوت کچھ اس طریقے سے فراہم کرتے ہیں کہ نان یا روٹی کے بڑے سے لقمے کو بن دیکھے' برق رفتاری سے زہریلے مواد میں لیرٹتے ہیں اور ہڑپ کرنے کی کرتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر یہ حضرات بھک سے اڑ جانے والی اس شے کو سرسری نگاہ سے بھی دیکھنے کی حماقت کر بیٹھیں تو لقمہ حلق میں اٹک کر رہ جائے۔ اس کارروائی کا دُہرا فائدہ ہوتا ہے کہ ان کی جان اور ایمان دونوں سلامت رہتے ہیں اور کون نہیں جانتا کہ ایمان بالغیب بلند مرتبت ہوتا ہے۔ جس طرح فلمیں اسٹوڈیو میں بنتی ہیں وہ صرف اس لئے یہاں بنتی ہیں کہ لوگ سینما میں یا گھر بیٹھ کر دیکھیں۔ اگر کسی کو فلموں اور ایکٹرسوں اور ایکٹروں کے گلیمر سے توبہ کرانی ہو تو اسے چند روز کسی فلم کے سیٹ پہ بٹھا دیں۔ سنگیتا' ریشم' نیلی اور ریما کی صبح صبح زیارت کروا دیں۔ غلام محی الدین' رنگیلا یا سعود کو میک اپ کے بغیر دکھا دیں تو وہ کانوں کو ہاتھ لگا کر صدق دل سے تائب ہو جائے گا۔

ایورنیو اسٹوڈیو کے سامنے سیدپور کی ایک گلی میں مجھے ایک فلمی آدمی سے ملنا تھا۔

صبح صبح اس کے پاس پہنچا۔ تنگ و تاریک گلی میں قرونِ وسطیٰ کا یادگار مکان' ڈربانما کمرے' چھوٹا سا صحن' مشترکہ باتھ روم کے قریب حفظانِ صحت کے اصولوں کا منکر ایک شخص' کلونسے ہوئے کنستر میں ہاکی نما لکڑی سے زور آزمائی کر رہا تھا۔ دھوئیں سے مسلسل مار کھاتے ہوئے گھی کے کنستر کو دیکھ کر مجھے وہ تصمیڑہ یاد آگیا جس میں غیر ترقی یافتہ زمانے کے گھرانے غسل کے لئے پانی گرم کیا کرتے تھے مگر یہاں اس کنستر میں چنے ابل رہے تھے۔ پرانے کنستر کے پاس پڑیوں میں پڑے ہوئے لون مرچ مصالحے' ایک المونیم کی پچکی ہوئی دیگچی میں ہر روز کا بچا ہوا ڈیزل رنگ جما ہوا گھی یا چربی' دوسری طرف بڑا دیگچہ۔ ڈھکن کے اوپر گندی سی چار پانچ انٹیں--- شاید وہ سری پائے تھے۔ اس صحت مند ماحول میں مجھے مطلوبہ شخص کی زیارت ہوئی۔ وہ بڑی محبت سے مجھے اوپر اپنے کمرے میں لے گیا۔ چار پانچ لڑکے دھوتیوں' نیکروں میں ابھی تک فرش کی چٹائی پہ اوندھے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ بات چیت سے فارغ ہوا تو میں نے اجازت چاہی' مگر اس نے کمال محبت سے مجھے دعوت دی۔

"ذرا دس منٹ اور رک جائیں۔ نیچے چنے تیار ہو رہے ہیں' ناشتہ کر کے جایئے گا--- بڑے لذیذ ہوتے ہیں یہ سپیشل چنے' اسٹوڈیو کے ہر دفتر میں جاتے ہیں۔"

میں نے انکساری سے مسکراتے ہوئے بہانہ تراشا۔

"دراصل میں سری پائے کا ناشتہ کرتا ہوں اس لئے---"

"وہ بھی تیار ہو رہے ہیں۔" اس نے میرا فقرہ اچک لیا۔ "آپ رکیں تو سہی---"

میں نے رسہ تڑوا کر بھاگنے والی بات کی' نیچے اترا تو باتھ روم کے باہر لائن لگی ہوئی تھی۔ مرد و زن "باہم تکرار و تعجیل" حوائجِ ضروریہ تھے--- انگلیوں میں سگریٹ' بدبو کے بھبکے' ٹپ ٹپ کرتا ہوا نلکا۔ نیچے پلاسٹک کا گندہ ٹب' اسی میں لوٹا اور اسی میں جگ۔ آخر چنوں میں پانی بھی تو پڑتا ہے۔ بس! اسی دن سے میرے چکڑ چھولے چھوٹے--- مرغیوں کی دوکان پہ آپ نے نیلے پلاسٹک کے ڈرم میں نرخرہ کٹی مرغیوں کا رقصِ بسمل تو ملاحظہ کیا ہوگا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے صرف دور ہی سے "تھاتھیا" کی آواز سنی ہوگی' کبھی قریب آکر اس امراؤ جان کا آخری رقص نہیں دیکھا ہوگا۔ اس کے نازک پاؤں تلے غلاظت اور خون کی دلدل نہیں دیکھی ہوگی۔ ڈرم کے اندر سے جو دھڑم دھڑم کی دھر

تانیں ابھرتی ہیں وہ گردن کٹنے کے وجہ سے نہیں بلکہ اندر کے تنگ خونی ماحول کے خلاف احتجاج ہوتا ہے اور جب وہ بدذوق اس "قتیلِ چرغہ" کو اچک کر نکالتا ہے تو مقتولہ کا سفید لباس' سہاگ کے جوڑے میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ بوٹی بوٹی تھرک رہی ہوتی ہے۔ ابھی زندہ گرم گرم چاک پیٹ سے جب وہ بے درد کھال ادھیڑتا ہے' چشمِ زدن میں انگلیوں کی آہنی سلاخوں سے آنتیں باہر کھینچتا ہے۔ نک سے آدھی کھوپڑی کلٹ کر ڈرم میں پھینک دیتا ہے۔ پوٹے کا استر' دل کے ارمان' کلیجے کے داغ' سب نک نک۔ گرم گرم پھڑکتی ہوئی بوٹیاں--- بڑا حوصلہ ہے' یہ سب کچھ دیکھ کر آپ اسے مزے لے لے کر حلق سے اتار لیتے ہیں۔ جیسے کوہنے والے' ویسے کھانے والے' ویسی ہی مرغیاں!--- جیسے عوام' ویسے ہی حاکم۔ جب ذوقِ جمال ہی ختم ہو جائے تو صاحبِ کمال کہاں سے پیدا ہوں گے؟ جہاں نفاست طہارت' قرینہ سلیقہ بے وجود ہو جائیں وہاں چنگیز اور ہلاکو معرضِ وجود میں آ جاتے ہیں جن کی شروعات' جانوروں سے ایسے ناروا سلوک ہی سے ہوتی ہے۔

بات کھانوں' کھابوں سے شروع ہوئی تھی۔ ہماری بوڑھیاں نانیاں' دادیاں بڑی لمبی لمبی عمریں پاتی تھیں اس لئے کہ وہ آج کی نانو' دادو کی مانند برگر برانڈ بوڑھیاں نہیں تھیں اور نہ ہی کام کوس کہ گئے گوڈے لے کر پلنگ توڑتی رہتی تھیں بلکہ اپنے روزمرہ کو بڑے مفید مشاغل میں مصروف رکھتی تھیں۔ کھونٹے لگے کپڑوں کو رفو کرنا' بچیوں بالیوں کو سلائی کڑھائی سکھانا' کلمے یاد کرانا' پاکی پلیدی کے مسائل بتانا' اور کچھ نہیں تو پرانے اناج کو نکلوا کر بیٹھ جانا۔ چھان پھٹک کروانی' مہندی پسوانی' ابٹن بنانا' ٹوٹا چاول پسوا کر فرنی تیار کروانا' گندم بھگوا کر نشاستہ نکالنا۔ کہیں حلوا کدو' کدوکش ہو رہا ہے۔ بیسن کے لڈو' سوجی کے کھوپے کا حلوا۔ خربوزے' تربوز کے مغز چھیلے جا رہے ہیں تو کہیں موسم پہ پھلوں کے رس سے شربت بنائے جا رہے ہیں۔ آچار کے لئے کچے آم' نیبو' مرچیں دھوپ کھا رہی ہیں۔ کریلے' شلجم خشک ہو رہے ہیں اور کچھ نہیں تو سویوں کی گھوڑی چل رہی ہے۔ گھر گوشت آیا۔ قورمے کے لئے علیحدہ بوٹیاں' یخنی پلاؤ کی علیحدہ' اروی ٹینڈوں کے لئے الگ' ریشمی کبابوں کا قیمہ الگ اور شامی کبابوں کا الگ۔ حلیم کا پروگرام ہوتا تو دو روز پہلے ہی سامان اکٹھا کرنا شروع ہو جاتا چاروں دالیں' چاروں اناج' چربیلا گول بوٹی' گوشت' دالوں اناجوں کی ایک روز پہلے بھگوئی ہو جاتی۔ قورمہ الگ پکتا' پیاز الگ سنہری ہوتی۔ ادرک کے

لچھے' ہری مرچیں' پودینہ' گرم مصالحے' ترشی کے نمبو' دیسی گھی کا بگھار ——— گھوٹ گھوٹ سارے گھروالوں کے ہاتھوں پہ گانٹھیں پڑ جاتیں مگر کیا مجال کہ کوئی پکتے لمحے انگلی چاٹنے یا لون مرچ چکھے کہ بے برکتی ہوتی ہے۔ تیاری پہ پڑھ پڑھا کر دعا مانگی جاتی اور جب تک پاس پڑوس سات گھروں میں دیگچیاں نہ پہنچائی جاتیں' گھروالے چکھتے نہ تھے۔ خوب انگلیاں چاٹ چاٹ' سی سی کرتے ہوئے حلیم کھائی جاتی۔ شبانہ روز کی مشقت' ہاتھوں کے چھالے' سب کچھ بھول جاتا ——— اصل میں یہ لفظ لحیم ہے' حلیم غلط العام ہے۔ حرف "یا ئے" کو خارج کر دیا جائے تو لحم (گوشت) رہ جاتا ہے یعنی حلیم میں لحم کے تین حروف کے مطابق تین حصے گوشت ہونا چاہئے اور حلیم کو نوش جان کرنے کے لئے بھی بڑی حلیمی طبع کی ضرورت ہے اور ایک خاص ماحول اور وقت بھی۔ اسے آپ ندیدوں کی طرح بھی کھاسکتے ہیں' روٹی یا نان کلچے کے ساتھ کھانا تو انتہائی بدذوقی بلکہ جہالت ہے۔ چمچے سے کھانا نازک مزاجوں اور خوش طعاموں کا خاصہ ہے ——— دو چار دانے جو حلیم کھلانے پکانے والے تقسیم کے وقت یہاں آئے تھے' وہ مرکھپ گئے' جو ایک آدھ کہیں اگر ہوگا تو وہ یہاں اس کا حشرنشر دیکھ کر کبھی کا تارک الحلیم ہو چکا ہوگا۔ کراچی میں اس کا لاشہ سب سے زیادہ گھسیٹے خان کے ہاں گھسیٹا جاتا ہے۔ حیدر آباد اور لاہور میں بھی اس کی خوب ریڑھ ماری جاتی ہے۔ بڑی بڑی دیگوں کے علاوہ یہ ننھی ننھی گڑویوں میں پکائی جاتی ہے۔ نئی' پرانی انار کلی' میو ہسپتال' ادھر ادھر بازاروں میں آپ کو منحنی سے بوڑھے ننھی منی چمکدار دیگچیوں میں حلیم بیچتے نظر آئیں گے۔ یہ پتلی سی' پیلی رنگت کی لیس دار چیز ہوتی ہے مگر کیا مجال جو آپ جان پائیں کہ یہ کیا ہے۔ گوشت کا مزہ' دال کا ذائقہ' کچھ بھی تو آپ محسوس نہیں کر سکتے' بس! حلیم ہے ——— بڑے بڑے حلیمئے آپ کو بھاٹی چوک' لکشمی' ریلوے اسٹیشن' انار کلی' لوہاری' ایبٹ روڈ' یادگار' اچھرے' فیروزپور روڈ' یتیم خانہ' دوبئی چوک' بادامی باغ' باغبانپورہ میں نظر آئیں گے۔ کم و بیش دس بیس ٹن حلیم روزانہ شہریوں کے پیٹ میں اتر جاتی ہے۔ ہر حلیم فروش کے اپنے صدری نسخے ہیں جو سینہ بہ سینہ اگلی نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ انہیں حلیم بنانے کے لئے اس کے بنیادی لوازمات کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی اور نہ ہی شب و روز کی محنت شاقہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ گندم اور مکئی کے آٹے کی لئی' گھوڑے کے دانے جیسی پرانی آوٹ آف ڈیٹ چنے کی دال' زردہ رنگ' تیز مصالحے'

سڑا گلا ادرک' ہری مرچ' لیموں اور بڑے گوشت کی باسی زبانیں' پھیپھڑے' دال اور سری کا گوشت۔ سب کچھ بڑی دیگ میں جو تھڑے پہ گڑی ہوتی ہے ڈال دیا جاتا ہے۔ کچھ ہنرمند اپنا علیحدہ ہی ذائقہ یعنی ٹیسٹ بنانے کے لئے پرانی روئی' سوکھی روٹیوں کا برادہ' سنگھاڑوں کا آٹا' اروی اور بھنڈیوں کی لیس دار رطوبت بھی شامل کر لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں آپ نے اخبار میں حلیم والوں پہ فیچر پڑھا ہوگا اور تصویریں بھی دیکھی ہوں گی۔ ایک محکمے نے حلیم کے کچھ نمونے حاصل کئے۔ ململ کے کپڑے میں ڈال کر نلکے کے نیچے رکھے۔ سب کچھ بہہ گیا صرف پرانی روئی اور زبان' پھیپھڑے کی بوٹیوں کے تھلے کپڑے میں رہ گئے۔ ایسی حلیم کھائی بڑی آسانی سے جاتی ہے' نان کے لقمے کے ساتھ یہ پھسلتی ہوئی حلق پار کر جاتی ہے لیکن اسے معدے سے خارج کرنا خارج از بحث ہوتا ہے۔ سُنا ہے کہ پرانے السر کے مریض اس سے شفا پاتے پائے گئے ہیں۔ پرانی روئی اور ہلدی اندرونی زخموں کو مندمل کر دیتی ہوگی۔ واللہ اعلم! ہم سے تو یہ بھی چھوٹی ——— اب ہم حلیم المعدہ کی بجائے حلیم الطبع ہو گئے ہیں۔ چکڑ چھولوں کو چھوڑا' حلیم سے علیحدگی اختیار کر کے ہم اب سری پائیوں پہ گزارہ کر رہے تھے ——— اصل میں یہ ہمیں بے حد مرغوب ہیں۔ خوب پکے ہوئے پائیوں کی لذت کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ گرم گرم تنور سے اترتے ہوئے کلچے' کنارا ٹوٹا ہوا' سری پائے کا سرخ شوربے سے بھرا ہوا پیالہ' اوپر چھڑکا ہوا گرم مصالحہ۔ اگر دیگچے کے ڈھکن کے اوپر مرحوم بکروں کی شکستہ کھوپڑیوں' دیسی رائفل کی نال جیسی بڑی بڑی نلیوں سے صرفِ نظر کر لیا جائے تو صبح صبح یہ قوت بخش ناشتہ بڑا لُطفیلا ہوتا ہے۔ مغز کھانے کا موڈ ہو تو دوکاندار کو کھوپڑی توڑتے ہوئے قطعی مت دیکھیں بلکہ اپنی نظریں دوسرے کھاتے ہوئے گاہکوں پہ جمالیں' اس طرح آپ کی طبیعت پہ بوجھ نہیں پڑے گا اور اشتہا میں بھی اضافہ ہوگا۔

مَیں اکثر یہ ناشتہ ایورنیو سٹوڈیو کے دروازے کے پاس ایک خان صاحب کے کھوکھے پہ کرتا ہوں۔ وہ شریف آدمی میرا لحاظ اور عزت بھی کرتا ہے' لکڑی کا اسٹول منگوا کر اپنے پاس میز پہ جگہ بھی بنا دیتا ہے۔ اس میز پہ اس کا لوہے کا گلہ' پانی بھرا پیالہ جس میں وہ شوربے میں لتھڑی ہوئی انگلیاں صاف کرتا رہتا ہے۔ دیگچوں والے لوہے کے ریک کے اندر پکے ہوئے خشک پائے پڑے رہتے ہیں جنہیں وہ حسب ضرورت گرم شوربے میں

ڈال کر گاہکوں کو پیش کرتا ہے۔ دیگچے کے اُبلتے ہوئے شوربے میں دو لخت زبانیں، سری کی کھدیں اور مغزوں والی کھوپڑیاں کھول رہی ہوتی ہیں۔ میَں نے اندازہ لگایا کہ اصل چیز شوربا ہے ملٹی وٹامن حیاتین سے بھرپور ـــــ ذرا تصوّر میں لائیں۔ جس دیگ میں بکرے کے سارے اعضائے رئیسہ پڑے ہوئے ہوں۔ پائے، کھوپڑی، مغز، زبان، سری بمع کان، جبڑا دانت، آنکھوں کے پپوٹے، ڈیلے، تالو کا کھُردرا سفید گوشت، مسوڑھے، حلقوم کا حلقہ، زخرہ، ناک کے ملائم سے نتھنے، موٹے موٹے ہونٹ، چِری ہوئی باچھیں، رُخسار اور اس پہ ملائم نرم سے بال اور پھر وہ دیگ تمام رات دَم پخت ہوتی رہے، صبح دَم اوپر سے موٹے موٹے دانت، بال، نازک ہڈیوں کی کِرچیاں اُتار چھان کر جو باقی شوربا تیار ہو گا وہ کیا ہو گا۔ اس شوربے کا ایک گھونٹ پی لیں تو چودہ طبق روشن ہو جاتے ہیں، جیسے ہزاروں بکرے آپ کے اندر "میَں، میَں" کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس بے سمجھ کی "میَں" ختم نہ ہوئی جبکہ اسی "میَں" کی وجہ سے یہ کٹا، ساری رات انگاروں پہ دَم پُخت ہوتا رہا۔ اس کا انگ انگ، پور پور دانتوں تلے پیسے گئے پھر بھی اس کی "میَں" نہ گئی۔

کھا، ڈکار، مٹکے کی لسّی کا ایک گلاس پی کر میَں بڑا مطمئن ہوتا ہوں۔ واپسی گھر تک اندر باہر پسینے سے بکرے کی "میَں، میَں" ہو جاتی ہے۔ پھر میرا سارا دن سبزہ زار میں آوارہ گردی کرنے کو جی چاہتا ہے۔ سبزہ ہو، گھاس اور نرم نرم شاخساریں ہوں اور جس دن محض مغز کھالوں تو اس روز عجیب عجیب خیالات آتے ہیں۔ سندھی ٹیڈی بکریاں پالنے کے متعلق سوچتا رہتا ہوں، لُس لُس کرتے پشم جیسے میمنوں کا خیال آتا رہتا ہے۔ تصوّر میں میَں انہیں کُلیلیں بھرتے دیکھتا رہتا ہوں۔ اس دن قصائیوں سے نفرت سی ہو جاتی ہے، عید قربان کے دنوں اور مہینوں کا حساب لگاتا رہتا ہوں۔

اسی سری پائے کے جھنجھٹ میں پچھلے دنوں اپنے بابا جی اور عزیزم نوید اشرف کو زبردستی کار میں بٹھا کر ایبٹ آباد لے گیا۔ وہاں سے مانسہرہ پہنچے، بابا جی نے کیا پوچھنا تھا انہیں سلاتے ہوئے آپ بے شک قطب شمالی لے جائیں، بس انہیں جگائیں نہیں ـــ نوید نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"بابا جی، منزل کا اتا پتا بتائیں تو کچھ ہمارے پلّے بھی پڑے۔"

میَں بالاکوٹ تک خاموش رہا کہ عین ناک کے نیچے جا کر بتاؤں گا، پہلے بتا دیا تو بدک

جائیں گے۔ پل پار ایک ہوٹل میں گزر گزران کی، صبح نہا دھو کر اس نے پھر میری منزل کے متعلق پوچھا۔ میَں نے ہولے سے سری پائے کا ذکر کیا۔ کہنے لگا۔

"اول تو یہاں ملیں گے نہیں، اگر کہیں مل بھی گئے تو مولوی مدن سی بات نہ ہوگی لہٰذا آپ اسی ہوٹل کے ٹوسٹ اور آملیٹ پر گزارہ کر لیں۔"

"میَں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "عقل کے کورے! میَں یہاں بکرے کے سری پائے کی بات نہیں کر رہا، یہاں سے آگے شوگراں کے پاس جو سَری پائے ہیں ان کا ذکر ہے۔"

وہ ایسی ہنسی ہنسا جو بزرگ کسی بیوقوف بچے کی بیوقوفی سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے ہنستے ہیں۔

"وہاں آپ کیوں جانا چاہتے ہیں ـــــ وہاں بالکل ایسی ہی لوکیشن ہے جو یہاں ہے۔ کوئی خاص بات؟"

میَں نے دبی زبان سے بتایا۔ "میاں بھائی! جس گاؤں یا جگہ کا نام ہی سری پائے ہو وہاں کے سری پائے چکھنے میں کیا مضائقہ ہے ـــــ چلو اٹھو، ناشتہ وہیں ہوگا۔ ذرا ذائقے کی تبدیلی مقصود ہے۔ بہت ممکن ہے، کسی خاص ترکیب سے بناتے ہوں ورنہ اتنی خوبصورت جگہ کا نام، سری پائے کے بجائے سری دیوی بھی رکھ سکتے تھے۔"

پینڈو آدمی ہے، گاؤں میں صبح صبح کھلے کھیتوں میں فراغت کے بعد مولی گونگلوؤں سے ناشتہ کرنے والا میری اس ناشتے والی بات کی نزاکت اور باریکی کو کیا سمجھتا۔ بولا۔ "آپ کو سری پائے سے بھی لذیذ ٹراؤٹ مچھلی کا ناشتہ کراتے ہیں۔ اب ڈرائیونگ سیٹ پہ وہ بیٹھا تھا، چل سو چل وہی پہاڑوں کے زگ زیگ۔ اونچے نیچے، پرپیچ راستے، وہی سمٹتا، سکڑتا، پھیلتا دریا سڑک کے ساتھ ساتھ، یقیناً ٹراؤٹ مچھلیاں اس میں ہوں گی اور میَں لذیذ ٹراؤٹ کے ناشتے کے انتظار میں! ـــــ پیٹ میں بھوک سے کینچوے کلبلانے لگے تھے۔ بابا جی پیچھے ہنوز سوئے ہوئے، ٹراؤٹ سے رغبت نہ دریا پہاڑوں سے دلچسپی، اونچائی سے ڈر نہ گہرائی کا خوف، بھوک نہ پیاس ـــــ یااللہ! میَں کھابے کھانے والا، دن بھر بکریوں کی مانند چرنے والا کن بے بھوکوں میں پھنس گیا۔ تنگ آ کر میَں نے نوید سے کہا۔

"ابے کہاں ہے تیری کچھ لگتی لذیذ ٹراؤٹ؟"

"بس بابا جی' ناران پہنچنے ہی والے ہیں۔"

"ناران؟--- میں ناران کی نہیں' لذیذ ٹراؤٹ کی بات کر رہا ہوں جسے تم مجھے ناشتے میں پیش کر رہے تھے۔ اب تو شام کے کھانے کا وقت آ لگا ہے۔ تم مجھے یہاں اتارو اور جو الٹی سیدھی کھانے کی چیز میسر ہو' مجھے کھلاؤ۔"

"بس چند منٹ اور--- وہ دیکھیں' ناران نظر آ رہا ہے؟"

"کیسے بدذوق لوگ ہیں۔ نام بھی کیا رکھا ہے' ناران! استغفراللہ' حد ہو گئی کور مذاقی کی۔ کم از کم مجھ سے ہی مشورہ کر لیتے۔"

"آپ کیا نام تجویز کرتے؟" نوید نے مزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی! میں اس کا نام' ناران جیسے بے معنی نام کی بجائے' لاران تجویز کرتا۔ پیچھے سری پائے کھاؤ' آگے آکر کہو کہ لا' ران--- سری پائے ناشتے میں' ظہرانے پہ بروسٹ سالم ران--- کیسا---؟"

"اُونہہ' بات تو وہی رہی۔ لاران نام رکھنے سے بھی ران نہیں ملے گی' بلکہ بالکل ہی نہیں۔"

میرا تو میٹر گھوم گیا۔ ایک تو بھوکا مارا' دوسرے ران بھی نہیں لانے دیتا۔

"کیوں' ران کیوں نہیں ملے گی؟"

"اس لئے کہ "لا" کا مطلب "نہیں" ہے۔ اس لئے ران نہیں ملے گی۔"

"پینڈو صاحب! مَیں عربی نہیں' عجمی ہوں۔ میری زبان اردو ہے' اُردو میں لا کا مطلب "لاؤ" ہے۔ سمجھے؟"

ناران پہنچ چکے تھے۔ پوری بستی میں ران تو کجا' چڑیا کے بچے کی چونچ تک دکھائی نہ دی۔ ہوٹل والوں سے ٹراؤٹ کا پتا کیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے پچاس روپے کا پرمٹ حاصل کرو۔ پھر کسی شکاری کو تلاش کریں۔ پھر دریا پہ بیٹھو' ٹراؤٹ بی بی کی مرضی وہ سلسلہ جُنبانی کرے' نہ کرے۔ صرف تین عدد ٹراؤٹ یا "ٹراؤٹیاں" آپ پکڑ سکتے--- شکاری کو تلاش کیا۔ اس نے حق محنت تین سو روپے صرف دو گھنٹوں کے بتائے۔

"بھائی! لذیذ ٹراؤٹ کا نارمل سائز کیا ہوتا ہے؟" مَیں نے غلطی سے پوچھ لیا۔

اس نے ہاتھ پہ بڑی انگلی کی پَور سے کلائی کے شروع تک کا سائز بتایا۔

"یعنی کل پانچ چھ انچ--- شکاری بھائی! کبھی اس سے بڑی مچھلی پکڑی ہے؟"

"ہاں جی' آپ کی قسمت کی بات ہے۔ آدھ کلو بھی آ سکتی ہے--- ویسے یہ سیزن آٹھ دس اونس ہی کا ہے۔"

فوراً حساب لگایا۔ ساڑھے تین سو' پرمٹ اور شکار کا خرچہ۔ سو روپے پکوائی' جمع بیس روپے ٹپ۔ کل چار سو ستر۔ چھیل چھال' صفائی کے بعد کل وزن اٹھارہ اونس۔ پکنے کے بعد بارہ اونس۔ کانٹے' درمیانی کنگھی' سری گلپھڑے' مونچھیں نکال کر ساڑھے سات اونس--- مجھے بُری طرح لاہور یاد آیا۔ اچھرہ' مزنگ چوک' گوالمنڈی۔

"چھوڑیں بابا جی اسے' کل انشاءاللہ آپ کو جھیل سیف الملوک سے ٹراؤٹ کھلائیں گے۔" نوید نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "رات کو ویسے بھی یہ ٹراؤٹ مچھلی نہیں کھانی چاہئے' بڑی زبردست گرم ہوتی ہے۔"

بابا جی' پُل کے سہارے کھڑے اونگھ رہے تھے' انہیں گھسیٹا۔ بیچ بازار ایک بوڑھا سا چھترکباب کی پرات جمائے بیٹھا تھا۔ شکر ہے کہ روٹیاں گرم مل گئیں۔ وہیں بیچ کھیت کھڑے بیٹھے پیٹ بھرا۔ چائے چسک کر ہوٹل میں آ پڑے۔ ان چھترکبابوں نے جو رات بھر پیٹ میں جُوتم پیزار کی' وہ ایک الگ المیہ ہے۔

پنجاب میں جو چھترکباب بنتے ہیں وہ روایتی چھترکبابوں میں بڑے شہری قسم کے ہوتے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہمارے ہاں چائنیز ریسٹورانٹس میں چائنیز کھانے جو اصلی کھانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ اگر آپ ہانگ کانگ یا چین نہیں گئے تو آپ ان کا فرق نہیں جان سکتے۔ اسی طرح اصلی چھترکباب بھی آپ بارغبت کھا نہیں سکتے۔ اصل کمال اس کے لئے قیمہ تیار کرنا ہوتا ہے' نرم بچھڑے یا صحتمند گائے بھینس کا خام گوشت بے کار ہے۔ لاغر' بیمار یا قریب المرگ بیل کا نیلگوں گوشت اصل چیز ہے' اسی بیل کی پیلی پھٹک چربی میں یہ تلے جاتے ہیں۔ تیل یا گھی استعمال کیا جائے تو ان میں خستگی اور کرارہ پن پیدا نہیں ہوتا۔ گندم' جو یا مکئی کا آٹا' آدھ پسی کوٹی ہوئی ثابت سرخ مرچ' اسی طرح کا دھنیا' گرم مصالحے' انڈے' سبز پیاز کے ڈنٹھل' نسوار کی چٹکی' ٹوٹے ہوئے ناخن' پاؤں ہاتھوں کا میل' پشتو گالیوں کی بوچھاڑ' حسب ذائقہ ہری مرچ' راکھ اور خاک اس کباب کے جزولاینفک ہیں۔ ان کو ہضم کرنے کے لئے پشاوری قہوہ اور پشوری چلم کی اشد ضرورت

پڑتی ہے۔ ضعف معدہ' سینے کی جلن اور آنتوں میں السر کے مریض وصیت لکھ کر اسے نوش جان کرتے ہیں۔ شاید کسی پولیس ملازم نے پہلی مرتبہ انہیں چھتر کباب کا نام دیا ہوگا ورنہ شریف شہری اور سفید پوش انہیں چپل کباب کہتے ہیں۔ اس کا سائز کھانے والے کے پاؤں کے مطابق ہوتا ہے۔ کباب کا رنگ نیم سرخ' تلتے وقت ڈارک براؤن اور پلیٹ میں پہنچ کر کوئلہ رنگت ہوتا ہے۔ حلق میں داخل کرتے ہوئے نارمل ٹائم اور فصیلِ جاں سے بے دخل کرتے ہوئے البتہ خاصا طویل وقت درکار ہوتا ہے لیکن اگر اسے نان کے ساتھ نوش جان کیا ہو تو وقفہ "جِدوجُہد" بڑھ بھی سکتا ہے۔ کاسوری' مولی نمک' کالے لون' اجوائن کی پھکی' فروٹ سالٹ' دو نمبر سیون اپ' پتھر ہضم لکڑ ہضم ٹھاہ ٹھاہ والی سوڈے کی بوتلیں اس کی وجہ سے خوب بکتی ہیں اور بیچنے والے نفع کماتے ہیں۔ اسی کباب کا ایک چھوٹا بھائی شامی کباب کہلاتا ہے۔ غریب طبقے کے لوگ سادگی میں اسے ٹکی بھی کہہ لیتے ہیں۔ یہ بڑا شرمیلا اور پَردہ پوش قسم کا کباب ہوتا ہے۔ اس کے باطن کا تو خدا جانے' اوپر اس کے اٹھارہ کیرٹ انڈے کی لیس چڑھی ہوتی ہے جسے آپ کھا بھی سکتے ہیں' کریدنے سے چنے کی دال کا بھرتہ برآمد ہوتا ہے جسے آپ چاہیں تو پھینک بھی سکتے ہیں کیونکہ نمکین روٹی کا لقمہ اس سے کہیں زیادہ مزہ دیتا ہے۔ غذائی اعتبار سے یہ بے ضرر ہوتا ہے' اس کے بنیادی اجزاء باسی چنے کی دال' باسی چاول' سوکھی روٹیوں کا آٹا' بچی ہوئی بوٹیاں اور حسب ذائقہ یا دستیابی' ہری مرچ' سرخ مرچ' پیاز اور موسمی کھیاں' مچھر' سگریٹوں کے جلے ہوئے ٹکڑے' مٹی اور چھوٹے چھوٹے بے ضرر معصوم سے کنکر وغیرہ ہیں۔ اسے قیمے کی مشین سے دھکے دے دے کر نکالا جاتا ہے۔ شوپالش کی بڑی ڈبی کے ڈھکنے سے گول گول ٹکیاں بنا کر فریزر میں یخ بستہ کر لی جاتی ہیں۔ وہاں سے ڈائریکٹ نکال کر انڈے کی جھلی کے ساتھ جلا کر گرم گرم پیش کئے جاتے ہیں۔ بڑے گھرانوں میں یہ اکثر شام کی چائے کے ساتھ ہوتے ہیں۔ فٹ پاتھی ہوٹلوں میں ٹکی کی صورت جہانگیری پلاؤ کے ساتھ بھی تحفے کے طور پر ملتے ہیں۔ ایران میں ناپید البتہ شام میں دستیاب ہیں۔ اپنے مجیب الرحمٰن شامی بڑے رغبت سے کھاتے ہیں اور جب سے شام کے اخباروں نے رواج پکڑا ہے' اپنے محمود شام صاحب نے ہماری طرح ان سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔

چھتر کباب کے خاندان سے شامی کباب کے بعد کچھ کبابوں کے مزید سلسلے بھی آگے

بڑھے ہیں جیسے ریشمی کباب' بہاری کباب' سیخ کباب' چلو کباب' گولا کباب وغیرہ وغیرہ۔ ان میں کچھ تو "مٹھی چاپی" کر کے سیخوں پہ چڑھائے جاتے ہیں اور جو طبعاً "رقیق الاجزاء" ہوتے ہیں' انہیں مضبوط دھاگے سے باندھ کر سلائی سے وابستہ رکھا جاتا ہے۔ کچھ سخت جان کلیجہ چھدوا کر سیخ سلائی ہوتے ہیں۔ ایک قدر مشترک سب میں ہوتی ہے۔ ایک دو کروٹ بدلنے کے بعد یہ رونا ٹسوے بہانا شروع کر دیتے ہیں۔ ان آنچ نصیبوں کے جو آنسو ہوتے ہیں ان میں ستر فیصد چربی ہوتی ہے جو کوئلوں کی بجت اور فضا میں مسحور کُن مہک پیدا کرتی ہے سیخ پہ چڑھے ہوئے چِڑے' بٹیرے' کلیجے' دل' پوٹے نفاست طبع لوگوں کے لئے بڑا دلفریب منظر ہوتا ہے' اب سنا ہے غذائیت سے بھرپور کچھوے کا گوشت بھی سیخوں اور کڑاھیوں میں بہار دکھلانے لگا ہے' گھوڑے گدھے کا گوشت چونکہ سخت ریشہ اور بدذائقہ ہوتا ہے اس لئے وہ اندرون دو کلن پریشر ککروں میں نیم پکا دھرا ہوتا ہے' دس فیصد کے حساب سے بوبکرے کے گوشت میں شامل کر کے معزز گاہکوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہ کڑاہی گوشت کہلاتا ہے۔ کڑائی تو صرف درشنی ہوتی ہی' پکتا یہ پریشر ککر میں ہے۔ گھوڑے' گدھے اور بکرے کی پہچان اور ذائقہ مٹانے کے لئے اس میں اینٹی ٹیسٹ (ANTI TASTE) مصالحے ڈالے جاتے ہیں مثلاً لہسن بمع چھلکے ڈنٹھل' ادرک بغیر چھلکے صاف کئے' ڈنڈی سمیت ہری مرچیں' کالی مرچ' ملتانی مٹی جیسے ہلدی کا رنگ روپ دیا جاتا ہے۔ پیاز موچھوں سمیت' ثابت انڈے اور ایک خاص مصالحہ جو استلو تیاری کے بعد اوپر چھڑکتا ہے' پلپلے ٹماٹر جو سبزی منڈی سے اٹھائے جاتے ہیں' کڑاہی گوشت والوں کے ہاں آپ نے دیکھا ہوگا' بڑی نفیس رانیں' کالی کالی پونچھلوں' کپوروں سمیت باہر لٹکی ہوتی ہیں۔ ایسا صحت مند گوشت دیکھ کر آپ کا جی للچا اٹھتا ہے' بے اختیار ایک کلو کڑاہی کا آرڈر دینے پر پیٹ آپ کو اکساتا ہے۔

ایک شام بلاجی اور نویدؔ میاں ساتھ تھے۔ پیٹ خراب کرنے کا موڈ بنا۔ ایک مشہور و معروف کڑاہی گوشت والے کے ہاں پہنچے۔ بڑے بڑے چیتوں اور گاڑیوں والے دھرے پڑے تھے' باہر سولی پہ کئی سالم بکرے لٹکے ہوئے تھے۔ الٹے' کھال کھینچی ہوئی' پونچھل اور کپورے چھوڑنے کا مقصد بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ مجھ ایسے دیوانے کہیں منصور کے قبیل کی کوئی شے نہ سمجھ بیٹھیں کیونکہ "میَں' میَں" اور اناالحق کا مفہوم قریب قریب ایک ہی

ہے۔ جس سے یہ سرزد ہو گیا' اس کا انجام یہی ہو گا۔ دو منزلہ پنجرے کے اوپر والی منزل میں اصیل دیسی مرغ حالت مراقبہ میں تھے یا شائد مشاہدہ ذات میں محو تھے۔ مَیں اپنی علت بد سے مجبور کہیں کا کہیں پہنچا ہوا تھا' نوید نے مجھے بلایا۔

"باباجی' بڑی بھوک لگی ہے۔ آرڈر دیں بلکہ خود سامنے کھڑے ہو کر مرضی کا گوشت کٹوائیں اور اپنی نگرانی میں بنوائیں۔"

اپنے سامنے کلو بھر ران کٹوائی' نلی ثابت رکھنے کی ہدایت کی' اچھی طرح بوٹیاں صاف ستھری کر کے قصائی نے کڑاہی میں ڈال کر چھوٹے کو دھونے کے لئے دے دیں۔ ہم تینوں سامنے کرسیوں پہ بیٹھ گئے۔ میرا دھیان ادھر ہی تھا۔ چھوٹا' کڑاہی واپس لایا' استاد نے چولہے پہ دھر دی' بیس منٹ کے اندر اندر کڑاہی سامنے تھی' اپنی پسندیدہ نلی کی تلاش میں ساری کڑاہی کو اتھل پتھل کر دیا۔ وہ ہوتی تو ملتی' مجھے کچھ شک پڑا کہ جو گوشت میں نے اپنے سامنے کٹوایا تھا یہ وہ نہیں ہے' مَیں استاد کے پاس گیا۔

"یا استاد! یہ ہماری کڑاہی ہے یا کسی اور گاہک کی' میرے گوشت میں بڑی سی نلی تھی۔"

"بزرگو! دس نلیاں لو--- اوئے چھوٹے! حاجی صاحب کو دو چار نلیاں لا دو۔" اس نے سلسلہ کلام منقطع کئے بغیر ہانک لگائی۔

یہ باہر لٹکا ہوا درشنی گوشت ہوتا ہے۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور' دکھانے کے اور--- اندر کچا پکا تیار ہوتا ہے۔ جو گاہکوں سے بچتا ہے وہ بھی اندر چلا جاتا ہے جو دوسری کی کڑاہی میں شامل ہو کر پھر باہر آ جاتا ہے۔ سارا کمال چھوٹے کا اور بڑے استاد کا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہانڈی کا گوشت بھی ہوتا جو اندر پکتا ہے' باہر صرف ہانڈی میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ بالٹی گوشت بھی چلا تھا جو صرف بالٹی کے معنوی استعمال کی وجہ سے دلپذیر نہ ہو سکا' لوٹا گوشت الیکشن کے دنوں میں مقبول عام ہوتا ہے۔ یہ باورچی خانے کے بجائے ناقابل ذکر جگہ دَم پخت کیا جاتا ہے' خوب لذیذ اور مہک آور ہوتا ہے--- بوٹی تکہ بھی ہوتا ہے۔ یہ کٹے کے نرم اور کچھوے کے گرم گوشت سے بنتا ہے' آنچ اور مصالحے سب چھوٹے بڑے' حلال حرام کا امتیاز مٹا دیتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں یہ ایک آدھ بوٹی' شملہ مرچ' ٹماٹر اور پیاز کے وافر قتلوں کے ساتھ' نازک سی لوہے کی تار میں پرو دیا ہوا چاول کی

ڈش پہ ڈیکوریشن کے طور پہ دھرا ہوتا ہے اسے رنگ والے برش' کوچی یا گھی آلود گندی صافی سے خوب لیڑا جاتا ہے پھر خوب جلایا جاتا ہے تاکہ بوٹیاں' شملہ مرچ' ٹماٹر' پیاز "اِک مِک" ہو جائیں۔ نہ کوئی بندہ رہے نہ کوئی بندہ نواز۔

چائنیز میں چاولوں کی بیچ' اُبلی گوبھی' مٹر' پیاز' ناریل کا تیل' گاجریں' شملے کی مرچیں' کچے بانس کی کونپلیں' سویا کی جڑیں' لوبیا' بٹن بین' مکئی کے کچے دانے' جھینگے اور چن شنک ھنگ جس سے ہم پہلے ہی جلے بھنے بیٹھے تھے--- کڑاہی گوشت' برگر اور کبابوں سے بھی جی کباب ہو گیا۔

ایک لذیذ اور نفیس کھاجا' بریانی بھی ہوتی ہے۔ اس کا ذائقہ اور لفظ "بریانی" کا صَوتی آہنگ ہمیں خوب محظوظ کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ حیدر آباد اور بمبئی' دہلی میں اس کے بڑے بڑے استاد موجود تھے۔ اب بھی شائد ہوں گے مگر اس بیچاری بریانی کا اپنے ہاں جن استادوں اور قدردانوں سے واسطہ پڑا ہے انہوں نے نام کے علاوہ بیچاری کو بالکل ہی بے ننگ و نام اور تاراج کر کے رکھ دیا ہوا ہے۔ ذرا ملاحظہ کیجئے۔ حیدر آبادی بریانی' بمبئی بریانی' دہلی والوں کی بریانی' کراچی اور سندھی بریانی' کچے گوشت کی بریانی' مچھلی اور جھینگے کی بریانی' کھڑے مصالحے کی بریانی۔ یہ سب مختلف ذائقوں اور ترکیبوں کی بریانیاں ہیں۔ ایک تہہ دار بریانی بھی ہوتی ہے۔ آپ نے سٹوڈنٹ بریانی بھی پڑھا ہو گا۔ سُنا ہے کہ بریانی کے لئے سب سے پہلے ایک نفیس ذوقِ طعام رکھنے والا ضروری ہے۔ پھر جانور کے ایک خاص حصے کا گوشت' شملہ یا ڈیرہ دونی اعلیٰ ترین پُرانے چاول' روغنِ زرد یعنی ناگوری گائے کا گھی۔ کم از کم کشمیری زعفران' جاوتری' رُوح کیوڑہ' دہی' جائفل' بالائی' لونگ اور تیزپات' دودھ اور بریاں پیاز' پودینہ' خشک آلو بخارہ' زردہ رنگ اور بہت سا فالتو وقت--- بریانی بنانے کی ترکیب بتانا' وقت ضائع کرنا ہے کیونکہ اس کے لئے بھی "فرصت کے دو چار دن" درکار ہیں۔ ہماری بدنصیبی کہ ہم نے اصلی بریانیاں کھائی ہیں' بلکہ خود بناتے اور کِھلاتے بھی ہیں۔ چاول ہماری کمزوری ہیں--- ہم سیالکوٹی' بیگم امرتسری' رہائش لاہور میں ہم اگر اس پہ جان نہیں چھڑکیں گے تو اور کیا کریں گے بلکہ ہر روز' ہر شام کا ساتھ ہوتا ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ یہی کھائے پکائے جاتے ہیں۔ چینی' جاپانی اسے مقدس اناج کہتے ہیں۔ اپنے مُردوں کی قبروں پہ پھولوں کی بجائے چاول ہی بکھیرتے ہیں۔

ایک امریکن اور چینی قبرستان میں قریب قریب کھڑے اپنے عزیزوں کی قبروں پہ سر جھکائے' ان کے حق میں دُعائیں پڑھ رہے تھے' امریکن نے بڑے احترام سے پھولوں کا گلدستہ قبر پر رکھا۔ پاس کھڑے چینی' چاول بکھیر رہا تھا۔ امریکن کی ہنسی چھوٹ گئی' نہ رہا گیا تو پوچھنے لگا۔

"کیا تم توقع رکھتے ہو کہ تمہارا مُردہ اُٹھ کر چاول پکائے گا؟"

چینی نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ویسی ہی توقع' جو تم اپنے مُردے سے رکھتے ہو کہ وہ اُٹھ کر تمہارے رکھے ہوئے پھول سونگھے گا۔"

جس طرح امریکن کی ہنسی چھوٹی تھی' اسی طرح یہاں بریانی کا حشر اور صورت ذائقہ دیکھ چکھ کر ہماری ہنسی نکل جاتی ہے اور بعد میں اندر ہی اندر رونے بھی لگتے ہیں۔

استاد امانت علی خان ایک زمانے میں راوی کے کنارے ریاض کے لئے جایا کرتے تھے۔ گجردم' بھیرویں کے الاپ لے رہے تھے۔ وقت اور سُر کی گرہ ایسی کُھلی کہ مائی بھیرویں نے درشن دیئے' آشیرباد دی۔۔۔ کاش! مجھے کہیں مائی بریانی حیدر آبادی درشن دے جائے تو میں ہاتھ جوڑ کر بنتی کروں۔

"مائی جی! کرپا کر کے ان بریانی والوں کو کم از کم لفظ بریانی کے معنی ہی بتا دو۔"

یہاں جو نئے سستے چاول ہوتے ہیں۔ دوکان کھلنے سے دو گھنٹے پیشتر یہ انہیں ٹب میں پانی ڈال کر بھگو دیتے ہیں۔ ساتھ ہی دوسرے دیگچے میں پانی ڈال کر مرغی کے ٹکڑے ابلنے رکھ دیئے۔ کچے پکے کر کے گھی میں میں فرائی کئے' اسی گھی میں ٹماٹر' پیاز' ہری مرچ' مصالحے' دہی اور پانی ڈال یخنی بنائی۔ چاول ڈالے' دَم دے دیا۔ دس منٹ بعد زردہ رنگ' فرائی پیاز' ادرک کے لچھے' کترا پودینہ اور ساتھ اوپر فرائی کئے ہوئے مرغی کے ٹکڑے۔۔۔ گھنٹے بھر میں تیار' یہ ہے بریانی۔۔۔ ترکی' سعودی عربیہ' لیبیا' شام' روسی مسلم ریاستیں' کابل' عراق' ایران بہت سی جگہوں پہ ہم نے رنگارنگ پلاؤ کھائے ہیں' اکثر کا جزو اعظم وافر گوشت ہی ہوتا ہے' بڑے لذیذ' زود ہضم اور اشتہا آور۔ یہ اپنے جہانگیری' شاہجہانی' پشاوری' لاہوری پلاؤ سب پیاز سے بگھارے ہوئے رنگدار چاول اور اوپر رکھی ہوئی علیحدہ مرغی کی ٹانگ۔ ساتھ دہی کا رائتہ شائد اسی لئے ہوتا ہے کہ پینتیس روپے

دینے والا دو لقمے اسی کی وجہ سے نِگل لے۔

چاولوں کے حوالے سے کئی ایک دیگر پکوان بھی لذتِ کام و دہن کے لئے مشہور ہیں۔ مثلاً تنجن ہے۔ مزاعفر اور شولا ہے۔ زردہ' تہولی' کھچڑا اور کھچڑی کی کئی اقسام۔ گنے کے رس کا میٹھا' گڑ کے میٹھے چاول۔

جاننے والے جانتے ہیں کہ صبوحی' ظہرانے' عصرانے اور عشائیے کے مختلف پکوان ہوتے ہیں جو وقت کے راگ کی طرح اثر و انداز رکھتے ہیں۔ حکماء اور ماہرینِ طعام کے نزدیک ان کی صحیح وقت ہی پر ضرورت اور اہمیت ہے۔ صبح صبح ناشتے پہ آپ پلاؤ یا بریانی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے' اسی طرح دوپہر کے کھانے میں نہاری یا شب دیگ' بے وقت کے راگ کی طرح ہیں۔ رات کھانے پہ مُرغن اور تلی بھنی ہوئی چیزیں بگاڑ پیدا کریں گی۔ غذا کے بروقت صحیح استعمال کو اہل یورپ نے سمجھا ہے۔ صبح' دوپہر' شام' رات بلکہ ہفتے کے ساتوں دنوں کے باقاعدہ چارٹ کچن میں لٹکے ہوتے ہیں۔ کیا مجال جو ایک آدھ "کلو ریز" سوت برابر اِدھر اُدھر ہو جائے جبکہ اپنے ہاں اس کا تصوّر تک نہیں۔ جس وقت جو مِلا' سامنے آیا' کھا ٹھونس لیا۔ سارا دن نہاری چلتی رہتی ہے۔ بندہ خدا' یہ نعمت صبح صبح نہار منہ ناشتے کے لئے ہے۔ اس وقت کے بعد کھانا بدذوقی ہی نہیں اس کی توہین بھی ہے۔ نہاری کا وقت اور سورج کی روشنی سے بھی تعلق ہے' سورج اندر باہر ہو تو یہ اپنے ذائقے اور افادیت کے پرَت کھولتی ہے۔ جہاں سُورج نے چہرہ دکھایا وہیں اس کے لطف و مہک نے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔

بٹوارے کے بعد ایک پاکستانی دہلی گیا۔ دہلی والوں کی حلیم چکھنے کا شوق چرایا۔ نہا دھو' تیار ہو کر ایک مشہور نہاری والے کی دوکان پہ پہنچا۔ وہ دوکان بڑھا کر گھر جانے کی تیاری میں تھا۔ جھجکتے ہوئے اپنا مُدعا بیان کیا۔ وہ خشمگیں نظروں سے تولتا ہوا گویا ہوا۔

"میاں! پاکستانی دکھائی پڑتے ہو۔ نہاری کھانے کا شوق ہو تو پہلی اذان پہ پہنچ جانا' نصیب میں ہوئی تو مل جائے گی۔ اس وقت تک تو نہاری اپنے سسرال' سہاگن بن چکی ہوتی ہے۔"

شوکت تھانوی مرحوم دہلی آئے ہوئے تھے۔ شاہد احمد دہلوی سے ملاقات کرنا چاہی۔ شاہد صاحب نے انہیں اگلی صبح نہاری کی دعوت پر اپنے گھر بلایا۔ شوکت صاحب کسی وجہ

سے لیٹ ہو گئے' ادھر شاہد صاحب انتظار میں سُوکھ رہے ہیں' اصل مسئلہ تو نہاری تھا۔ بگھار لگی' دَم پُخت تیار پڑی تھی۔ دن چڑھے شوکت صاحب تشریف لائے' خالی پیٹ دکھاتے ہوئے دیر میں آنے کی معذرت کی' شاہد صاحب نے کمال تحمّل سے انہیں عزت سے بٹھایا۔ زنان خانے میں آئے' بیگم سے چائے پراٹھے تیار کرنے کو کہا۔ نیک بخت نے جواب دیا۔

"نہاری تیار پڑی ہے' چائے پراٹھے کی کیا تُک بنتی ہے۔"

جواب دیا۔ "اب نہاری کہاں رہی---- باسی قورمہ ہو چکی' تم چائے پراٹھے بناؤ!"

اب اپنے ہاں نہاری سارا دن کم سَوادوں میں بٹتی رہتی ہے جو نہ قورمہ ہوتی ہے نہ قلیہ۔ بس ایک بسنتی سی لئی جس پہ ہری مرچ' اَدرک' دھنیہ اور ایک چھڑے کا ٹکڑا ادھر ہوتا ہے۔ کچھ ذائقے کی خاطر لیمو کا نصف ٹکڑا بھی مل جاتا ہے جس سے رَس کے بجائے موٹے موٹے بیج ٹپکتے ہیں---- نہاری کی پکوائی اور تیاری بڑی احتیاط' نفاست اور وقت کی متقاضی ہوتی ہے اصل چیز اجزاء' ان کا تناسب' آنچ اور نگہداری ہے۔ مَغز' نلیاں' پائے' بونگ' بالائی' گھی اور مصالحے' دودھ میں گھلا ہوا مکئی کا آٹا اپنے اپنے خاص تناسب سے پڑتے ہیں۔ ساری رات ایک مخصوص آنچ پہ دَم پُخت ہوتی ہے' حسبِ ذوق' تَرتَراتے ہوئے گھی کے بگھار سے ادرک' ہرے دھنئے' ہری مرچ' پودینے کے گچھوں اور بِریاں پیاز کے ساتھ گرم گرم پیش کی جاتی ہے لیمو بھی مزید ذائقے کے لئے نچوڑا جا سکتا ہے۔ تنور سے نکلا ہوا گرم گرم کلچہ اس کے ساتھ بڑا لطف دیتا ہے۔ یہ نفیس مزاجوں کے ذوق کی چیز ہے' ہڑپاہب ٹھونسنے اور پیٹ بُری کے لئے نہیں---- ہماری نہاری کا تو اللہ وارث ہے۔ گنجی نہائے گی کیا نچوڑے گی کیا لیکن اسی نہاری کی بدولت بڑی بڑی شہرتوں کے کئی وارث اور سلطان بن گئے ہیں۔ اے کاش! کوئی ہمیں نہاری کھلا دے ؎

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے

بلوچی بجی بھی ہماری توجہ کا مرکز بنی کہ چلو اسی سے اپنے چسکے کی علت پوری کر لیا کریں گے۔ ہمارے ایک مرحوم بزرگ دوست حکیم یوسف حسن رانا جو کافی عرصہ بلوچستان میں رہے' انہوں نے ایک مرتبہ کسی بلوچ سردار کی ضیافت کا ذکر کیا تھا جس میں حکیم صاحب بھی بنفس نفیس شامل تھے۔ ضیافت کے لئے ایک شتر بچہ لیا گیا' ذبح کر کے

آلائش صاف کرنے کے بعد اس کے پیٹ میں بکرا ڈالا گیا' بکرے کے پیٹ میں ہرن کا بچہ' اس کے پیٹ میں مُرغا۔ اس کے اندر تیتر پھر بٹیرا اور بٹیر کے پیٹ میں فاختہ کا انڈا۔ مصالحوں اور چاولوں کی بھرت میں اسے گڑھا کھود گرم بوبھل میں دَم پُخت کر دیا گیا۔ اُوپر اور اِرد گرد آگ دہکا دی گئی۔ بجی کی جو تصویر کشی انہوں نے فرمائی تھی وہ ہماری معدے پہ نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ پنجاب میں تو اس کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا۔ اب ہم بلوچستان جانے کا جواز تلاش کرنے لگے واہ رہے چسکے---- اس عمر میں بھی ہم سے کیسے کیسے ڈرامے کراتا ہے۔ کئی روز اِدھر اُدھر کی جوڑ توڑ کے بعد ہم نے پورا نقشہ تیار کر لیا۔ بابا جی اور نوید میاں کو آمادہ کیا کہ بھائی لوگو! زندگی کا کیا بھروسہ۔ دم آئے' نہ آئے۔ یہ ساتھ برادر ملک ایران ہے' اُٹھو کمر باندھو' ذرا مشہد شریف کی زیارت کر آئیں۔ بابا جی خوش ہوئے کہ سونے اور اُونگھنے کے وافر مواقع ملیں گے۔ نوید بھی راضی ہو گئے' وہ بھی مصروف اور لگی بندھی زندگی سے فرار کے راستے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ ہم ویزے کے لئے ایران کے سفارت خانے پہنچے' بابا جی کی بڑی بڑی زُلفیں دیکھ کر وہ ستم ظریف افسر بولا۔

"بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ زیارتوں کے لئے ایران جا رہے ہیں لیکن ان کے بال----؟"

مَیں نے بابا کی خوبصورت زُلفوں کو دیکھتے ہوئے اس افسر سے پوچھا۔ "آپ ان بالوں کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟"

وہ بات بناتے ہوئے کہنے لگا۔ "بڑے خوبصورت بال ہیں' اچھے لگتے ہیں لیکن ایران میں کسی مرد کے شانوں پہ لمبے جھولتے ہوئے بالوں کو پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اگر آپ انہیں ذرا چھوٹا کر دیں تو میرے لئے ویزا فراہم کرنے میں آسانی ہو گی۔"

"دیکھئے' یہ دَرویش آدمی ہیں' ہمارے بابا جی ہیں۔ یہ بال فیشنی نہیں ہیں بلکہ ایک خاص----" ہم نے وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی۔ وہ مسکرایا۔

"انہیں یہ کالا لباس بھی بہت بھلا لگتا ہے' آپ لوگ شیعہ ہیں؟"

اس نے جھجکتے جھجکتے پوچھا۔ مَیں بھی جواباً" مسکرایا۔

"ہم آدھے شیعہ اور آدھے سنی ہیں---- ٹھیک ہے' ہم ان کے بال آدھے کٹوا دیتے ہیں۔"

بجی کی خاطر ہماری یہ پہلی قربانی تھی۔ بجی درمیان میں نہ ہوتی تو میں بابا جی کے بالوں کو کٹوانے کی بات پہ اس افسر کی بجّی کبھی دونوں دُکھیاں پھاڑ دیتا—— جانا تو ہمیں دراصل بلوچستان تھا۔ ایران کی اٹریکشن زیارتوں کے حوالے سے ڈالی تھی۔ میرے اندرونِ معدہ' اصل دلچسپی چلو کباب تھے جن کی بڑی شہرت سُنی تھی' شوق بھی انسان سے کیسی کیسی بے ایمانیاں کرواتا ہے' کیا مجال جو میں نے اپنے چٹورپن کی بابا جی اور نوید کے کانوں میں بھنک پڑنے دی ہو' وہ دونوں سادہ لوح زیارتوں کے دِھیانے لگے ہوئے اور میں مکّار' بجّی اور چلو کباب کی اشتہاانگیز خوشبوئیں سُونگھ رہا تھا۔

ایران تک ارادہ ٹرین اور بسوں پہ سفر کرنے کا تھا' ضروری سفری سامان اٹھایا' ٹرین پہ سوار ہو گئے۔ بابا جی حسبِ معمول اُوپر برتھ پہ محوِ خواب ہو گئے' ہم دونوں نچلّے نیچے کھڑکیوں سے لگے تماشائے اہل کرم دیکھنے لگے۔ چل سو چل' گاڑی بھری ہوئی تھی۔ ہماری نشستیں محفوظ تھیں' اس لئے بڑے ٹھُسّے سے ڈَٹے بیٹھے تھے۔ لیکن تلبہ کے لاہور کینٹ سے رائیونڈیوں نے یلغار کی۔ مروّت میں تو دو چار کو جگہ دی مگر کچھ پھلانگ کر اُوپر بابا جی کی گود میں جا گھُسے۔ پھر کیا' ہم تینوں مُرغی کے چوزوں کی مانند کونوں کھدروں میں دُبک گئے اور ہماری محفوظ نشستوں پہ رائیونڈیئے قابض ہو چکے تھے۔ سوچا کہ چلو' تبلیغی مرکز کے باسی ہیں۔ ہمیں تو کبھی وہاں جانے کی توفیق نہیں ہوئی' ان کی خدمت سے ہی کچھ ثواب کمالیں۔ رائے ونڈ آیا' وہ اُترے تو کچھ اور آ بیٹھے۔ کچھ ہمارے حلیئے بھی دَرویشوں ایسے کہ لوگ ہمیں دَرخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے تھے۔

"بابا جی ذرا اِدھر سرکئے۔"

"ہم کمال سعادت مندی سے سِرک جاتے۔

"بزرگو! ذرا سی جگہ دینا۔"

ہم بہت سی جگہ دے دیتے—— نہ کھانا نہ پینا' سِرکتے سِرکتے ہماری ہَوا سِرک گئی۔ اُجاڑ نظروں سے ایک دوُجے کو دیکھ رہے تھے الٰہی! کس دَلدل میں پھنس گئے ہیں؟—— بابا جی کا موڈ الگ خراب تھا۔ سُرخ سُرخ کھا جانے والی نظروں سے ہمیں گھُور رہے تھے کہ ان کی نیند میں کھنڈت پڑی ہوئی تھی۔ ملتان تک ہماری خوب مٹی پلید ہوئی۔ خدا خدا کر کے ملتان گاڑی رُکی۔ بھوک پیاس سے بُرا حال تھا۔ میں اور نوید اُترے کہ کچھ پیٹ پوجا کا

بندوبست کریں۔ ایک ٹھیلے پر قیمے کے کباب دکھائی دیئے' جھٹ روٹیاں اور کباب بندھوائے۔ ملتانی حلوے کا ایک ڈبہ' کھجوریں' منرل واٹر کی بوتلیں' چیونگم' کچھ کیلے—— واپس آئے تو بابا جی سے کچھ مسافروں نے پھڈا ڈالا ہوا تھا۔ مسافر صرف تھوڑی سی جگہ کے طلب گار تھے' بابا جی کا موقف کہ یہ سیٹیں ریزرو ہیں۔ ہم دونوں نے بھی شرافت پرے پلیٹ فارم پہ پھینکی' انہیں وہاں سے زبردستی اٹھایا اور پاؤں پسار کر لیٹ گئے۔ وہ کھڑے خونخوار نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے—— ایک بولا۔

"داڑھیاں دیکھو' جیسے بڑے اللہ والے ہوں۔ کسی کو بالشت بھر جگہ تو بیٹھنے کو نہیں دے رہے' فیض کیا دیں گے۔"

میں بڑے آرام سے بولا۔ "بھائی! لاہور ہی سے ہمارا یہ حال ہے کہ دوسرے بیٹھے ہیں اور ہم کھڑے ہیں۔ یہ سیٹیں ہم نے سو سو روپیہ زائد دے کر ریزرو کروائی ہیں۔ کوئٹہ تک کا سفر ہے' آپ بھی اپنی سیٹیں ریزرو کروا لیتے۔"

کھانا کھولا جو بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کباب پتھر' روٹیاں ربڑ—— پہلے لقمے پہ ہی محسوس ہوا کہ جنہیں ہم قیمے کے کباب سمجھ رہے تھے وہ تو اصل میں پیاز اور چنے کی دال ہے' کباب دیکھتے ہوئے کافی دیر ہم مُلتانی ہنرمندوں کے کمال پہ غور کرتے رہے۔ دال اور کترا پیاز' ہو بہو قیمے کی شکل میں تبدیل کر دیا تھا۔ باہر پھینک کر حلوے اور کیلوں سے وقت پاس کیا—— خدا جانے کب سوئے' کب جاگے۔ کون سا شہر' کون سا قصبہ' کب دن چڑھا' شام ہوئی یا رات ڈھلی۔ اِک نہ ختم ہونے والا سفر' ایک اذیتِ مسلسل۔ دَرجنوں بار میں نے ایک بَرّاعظم سے دوسرے بَرّاعظم تک سفر کئے' کبھی سفر کی تھکاوٹ سے یوں نہ ٹوٹا جیسے اس ٹرین کے معمولی سفر نے ہلکان کر دیا تھا۔ کوئٹہ اُترے تو یوں حالت تھی جیسے مچھ جیل سے تین قیدی بیس بیس سال قید کاٹ کر آئے ہوں۔ ابھی ایران تک عشق کے امتحان باقی تھے' سوچا ہوائی جہاز پکڑ لیں' یہ خواری اپنے بس سے باہر ہے—— نوید نے کہا۔

"بابا جی! ہوائی جہاز پکڑنا تھا تو لاہور سے پکڑ لیتے' اب کوئی فائدہ نہیں۔ جو ہونا تھا ہو چکا' اور جو آگے ہو گا وہ بھی دیکھ لیں گے۔ اللہ مالک ہے' سفر تو نام ہی SUFFUR کا ہے' ایڈونچر ہی سہی۔"

بات معقول نظر آئی—— ٹیکسی پکڑی' ایک ہوٹل پہنچے۔ بابا جی کمرے میں داخل

ہوتے ہی بغیر کچھ کہے سُنے پلنگ پر پڑ گئے۔

باہو جتیاں ڈے مارو مینوں جنگلاں تل
رچل وا' میں' سونا بن سال عملاں تل

مَیں نے نوید سے کہا۔ "پہلے کچھ پیٹ پوجا کرتے ہیں پھر آرام کریں گے۔"

نوید باتھ روم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "بابا جی! حلوا اور کیلے کھا کھا کر پیٹ پتھر ہو گیا ہے' مجھے تو قطعی بھوک نہیں۔"

"تو ایک آدھ کباب ہی چکھ لیتے ہیں' سجی وغیرہ بعد میں ہوتی رہے گی۔"

مَیں نے رائے پیش کی تو وہ پینڈو' اندر سے دروازے کی چٹخی چڑھاتے ہوئے بولا۔

"اخراج و انخلا اوّل' اور نان و کباب آخر۔"

خوب بے سدھ پڑ کر سوئے' اگلے روز دوپہر کہیں تھکاوٹ اور نیند کے حصار سے باہر نکلے' نہانے دھونے اور فراغت کے بعد ذرا ہوش و حواس بحال ہوئے تو پیٹ پوجا کی سُوجھی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ کیا اور کہاں کھایا جائے؟ ایک دو پاس کے ہوٹل والوں سے دریافت کیا۔

"بھائی! ہم سجی کھانا چاہتے ہیں۔"

انھوں نے ہمیں ایک بازار کا پتا بتایا' گھومتے گھومتے وہاں پہنچے۔ دو تین دکانیں' باہر تھڑے پہ الاؤ کے گرد لمبی لمبی سیخیں گڑی تھیں۔

جن کے ساتھ شاید بکرے کی رانیں اور دستیاں عجیب بے رنگ و آب سی' دہکتے کوئلوں کی راکھ سے اَٹی ہوئی۔ ایسا منظر یقیناً آپ نے فورٹریس اسٹیڈیم میں بندو خان کے سامنے بلوچی سجی والوں کے ہاں دیکھا ہو گا۔ ہماری تو سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ یہی کچھ کھانا تھا تو لاہور کیا بُرا تھا۔ وہ جو سجی لونٹ' ہرن' بکرے' بٹیروں والی تھی وہ کیدھر ہے؟---- نوید نے مجھے جھنجھوڑا۔

"بابا جی! باہر کھڑے کیا سوچ رہے ہیں۔ اندر چلئے' بڑے زوروں کی بھوک لگی ہے۔"

"یار! یہ تو وہی چیز ہے لاہور والی----"

"آپ اور کون سی تلاش کر رہے ہیں---- سجی تو یہی ہوگی' لاہور ہو یا کوئٹہ۔"

ہم اس پینڈو کو کیا بتاتے کہ ہمارے دماغ میں کون سی سجی گھُسی ہوئی ہے جس کی خاطر

ہم نے ان کالے کوسوں کی مسافت اور اذیّت برداشت کی ہے۔ بجھے دل سے دکان پہ گئے۔ ایک عدد ران کا آرڈر دیا۔ کھانے کے بعد ہماری یہ حالت تھی جیسے کسی گوشت جھنجھوڑ مقابلے سے فارغ ہوئے ہوں' دو دو بوتلیں سیون اپ پینے کے بعد ہم خلال کرتے ہوئے باہر آ گئے۔ انچ انچ بھر لمبے سجی کے ریشے دانتوں سے گھسیٹتے ہوئے باہر کھنچے۔ جبڑے دُکھنے لگے تھے۔ وہاں سے ہم پوچھتے پوچھتے کرنسی بازار میں آئے' بیس ہزار پاکستانی روپے ایرانی کرنسی میں تبدیل کروائے جو لگ بھگ ایک لاکھ بیس ہزار تھے' نوٹوں سے جیبیں بھری ہوئی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار ہم تینوں لکھ پتی ہوئے۔ بس اڈے پر پہنچے۔ شام کو روانہ ہونے والی بس کے ٹکٹ ہوا کر کوئٹہ کے بازاروں میں گھومنے لگے۔ اب ہماری منزل ایران کا بارڈر تھی۔ معلوم ہوا' چوبیس گھنٹے کا مسلسل سفر ہے۔ راستہ پہاڑی اور صحرائی ہے۔ سفر شروع ہوا تو کوئٹہ سے نکلتے نکلتے گھنٹہ بھر لگ گیا۔ کوئٹہ کی پہاڑیوں کو عبور کرتے ہی نواحی علاقہ شروع ہو گیا۔ اکا دکا گاؤں' ٹیلے' بے آب و گیاہ بستیاں---- آہستہ آہستہ اندھیرا چھانے لگا۔ بابا جی ہم سے الگ پچھلی سیٹ پر نیند کے مراقبے میں اترے ہوئے سفر کا لطف لے رہے تھے۔ اونگھتے جاگتے آدھی رات بیت گئی۔ کہیں سٹاپ نہ ہوٹل۔ سامنے سے آتی ہوئی گاڑیوں کی روشنی' پھر گھپ اندھیرا' نیم پہاڑی علاقہ---- سُست روی' عجیب شکنجے میں جان پھنسی ہوئی تھی۔ سجی سے معدہ بولایا ہوا تھا۔ مثانے میں مدھانی سی پھر رہی تھی۔

"یار نوید! یہ کاروانِ شوق تو کہیں ٹھہرتا دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے تو زوروں کا پیشاب لگا ہوا ہے۔"

"میں بھی آپ سے یہی کہنے والا تھا۔"

"پھر کیا کریں؟"

"ہم کیا کر سکتے ہیں؟"

"ڈرائیور سے بات کرو۔"

"کوئی فائدہ نہیں---- وہ سفر کے دوران اس قسم کی باتیں سننا پسند نہیں کرتے۔ ہاں' یاد آیا۔ آپ نے ہمیں ایک بار پیشاب وغیرہ کی بندش کا ٹوٹکا بتایا تھا' وہی لعاب اور ناف والا----"

پیشتر اس کے کہ مَیں اسے کوئی جواب دیتا یا اپنے ہی بتائے ہوئے ٹوٹکے پر عمل کرتا' سامنے کچھ روشنیاں سی دکھائی دیں۔ کوئی بستی تھی' قریب پہنچ کر بس ایک بڑے سے ڈیرے نما جھونپڑے کے سامنے رُک گئی۔ جان میں جان آئی۔ لپک کر نیچے آئے' اندھیرے میں ہمیں دکھائی بھی واجبی سا دیتا تھا۔ بابا جی' ہمیں پکڑ کر ذرا دوَر ایک کھائی میں اُتر آئے۔ بس' بیٹھے ہیں اور جس کام سے بیٹھے ہیں وہ کام ہی نہیں ہو رہا۔ بابا جی' ٹارچ کی روشنی میں ہمارے سر پر پانی کی بوتل لئے کھڑے تھے۔ آخر بولے۔

"کیا ہوا؟"

"وہی جو نہیں ہو رہا۔"

پندرہ منٹ وہیں گزر گئے۔ پاؤں اینٹھنے لگے' آخر فارغ ہوئے تو ہانپتے ہوئے اُٹھے۔ ہاتھ دُھوئے' جھونپڑے میں نوید کھانا سامنے رکھے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اکلوتی لالٹین کی اندھی روشنی' کچے فرش پر کھپریل بچھی ہوئی۔ پوری بس کے مسافر وہیں بیٹھے باجماعت کھانا کھا رہے تھے۔ پہاڑی روٹیاں جو شاید دو روز کی باسی تھیں' آلو اور گوشت کا شوربا' عجیب سا دھواں دُھواں ذائقہ۔ پانی کا گھونٹ لیا تو ابکائی آ گئی۔ کھارا نمکین' ہاتھ کھینچ لیا۔ واپس آئے' بسکٹ اور منرل واٹر نکالا' پیٹ آسرا کر کے پھر باہر ٹہلنے آ نکلے۔

اگلا سٹاپ صبح نماز کے وقت ایک رینجر چیک پوسٹ پر ہوا۔ پھر آگے ایک اور جگہ آئی' چند دوکانیں بھی تھیں۔ ناشتا یہاں ہوا پھر چل سو چل۔ دن نکل آیا' ہلکی ہلکی روشنی نے اردگرد کے ماحول کو واضح کر دیا تھا۔ دوَر دوُر تک پھیلے ہوئے پتھریلے چٹیل میدان' دوُر کھڑے بلند و بالا پہاڑ۔ چرند نہ پرند' کانٹے دار جھاڑیاں' سڑک کے ساتھ ساتھ گزرتی ہوئی ریلوے لائن کہیں کہیں اُدھڑی ہوئی بھی نظر آئی۔ سڑک بھی بہت بہتر' ایرانی اور بلوچی مزدوروں کی ٹولیاں جو شاید نئی سڑک کی تعمیر میں مصروف تھیں۔ آہستہ آہستہ دھوپ تمازت پکڑ رہی تھی۔ ریت' پتھر' ٹیلے' پہاڑ آنکھوں میں چُبھنے سے لگے۔ رات بھر کے سوئے ان سوئے مسافر سخت بے چینی محسوس کرنے لگے۔ بس والوں نے پچھلی جگہ سے کولروں میں پانی بھر لیا تھا جو صاف میٹھا پینے کے لائق تھا۔ پانی نہ ہوتا تو یقیناً بڑی مشکل پیش آتی۔ سفر اب نئے دور میں داخل ہو گیا۔ بلوچستان اپنی آخری حدوں اور ایران اپنی شروعات میں تھا۔ خدا خدا کر کے ایران کا بارڈر نظر آیا۔ یہاں دیر نہ لگی۔ آدھے گھنٹے ہی

میں ہم ایران میں داخل ہو چکے تھے مگر اصل عشق کے امتحان تو آگے تھے۔ وہاں پھر ایرانی بسوں میں لدے' اتنا ہی سفر آگے تھا۔ کہیں دوُسرے روز ہم تہران وارد ہوئے۔ بوٹی بوٹی تھکاوٹ سے ٹوٹ رہی تھی۔ ایک دوسرے سے بیزار' خاموش جیسے ایک دوُجے کے چور ہوں' گِرتے پڑتے بس سے باہر نکلے۔ ایک بھلا سا ٹیکسی والا مل گیا جس نے ہمیں بن پوچھے تہران کے وسط میں ایک سرائے نما ہوٹل میں لا پھینکا۔ لاہور سٹیشن پر حافظ ہوٹل جیسا ہوٹل جس میں پاکستانی پھیرے باز مرد اور عورتیں بھری پڑی تھیں۔ ہم تھکاوٹ اور بیزاری کے نشے میں دُھت تھے۔ ہمیں اچھے برُے کی کیا تمیز--- کمرا لیا' سامان پھینکا اور لمبے پڑ گئے۔

میری بہت سی عادتوں میں ایک برُی عادت یہ بھی ہے کہ کیسی بھی نیند اور تھکاوٹ کیوں نہ ہو' مَیں بستر پر پڑتے ہی سو نہیں سکتا۔ اکثر لوگ دیکھے ہیں کہ بستر پر پڑتے ہی دنیا جہاں سے بے خبر خراٹے بھرنے لگتے ہیں۔ حیرت کے ساتھ ساتھ رشک بھی آتا ہے کہ کیسے خوش نصیب ہیں۔ اِک ہم کہ پہلے دن بھر کی اچھائی برائی کی فلم چلے گی۔ دائیں بائیں کروٹیں لی جائیں گی' سرہانے تکیے اِدھر اُدھر ہوں گے' ایک آدھ جمائی آئے گی' کوئی شعر اُبھر کر آ جائے گا' اس کے جمالی' فنی' فکری اور معنوی پہلوؤں پر غور و فکر ہو گا۔ پھر کسی سے لینا دینا' رشتہ داروں کے سلوک' دوستوں کی بے وفائیاں' گھر کے بِل' باری باری سامنے آئیں گے۔ اسی دوران محسوس ہو گا کہ بیت الخلاء جانے کی حاجت ہے۔ واپس بستر پر پہنچو تو پھر سب کچھ نئے سرے سے--- ہمارے ساتھ کے سوئے ہوئے آدھی نیند بھی لے لیتے ہیں اور مَیں نیند کی دیوی کی راہیں دیکھ رہا ہوتا ہوں۔ یہاں بھی دونوں دَرویش کسی دنیادار کی طرح دین و دنیا سے بے خبر سو رہے تھے۔ مَیں باری باری ان کے چہروں کی جانب دیکھ رہا تھا۔ یہ معصوم کیا جانیں کہ وہ کس سرزمین پر پہنچ کر ایسی بے فکری کی نیند سوئے ہوئے ہیں۔ یہاں پہنچ کر تو سوئی ہوئی فکر بیدار ہو جاتی ہے۔ اس سرزمینِ گلُ و بُلبل' طائر و طاؤس' رنگ و آہنگ' نغمہ و شعر' جمال و جذب' ہنُر و کمال میں کیسے کیسے مہرِ درخشاں' چہار دانگ عالم میں اپنی نشانیاں دے کر مُشک خاک بنے پڑے ہیں۔ جن کے علم و فن' تعلیم و تعلم کی خوشبو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کا چپّہ چپّہ ان کی عظمت اور جلالت و جمالت کا امین ہے۔ کیسے ذیشان جلالت مآب شاہاں' علمائے اجل' دیو سکہ زور آور

ضرب و حرب پہلوان، بے نظیر شاعر و مغنی، اصنام گر، فلسوف و فصحاء، فلکیات، نکتہ اور علم ریاضی کے عالم جن کے تجرِ علمی سے آج بھی دنیا فیض یاب ہو رہی ہے۔ میرے بابا علامہ اقبالؒ کے پیرِ رومیؒ، رازیؒ، حافظؒ اور شیرازی، سعدیؒ کا مسکنِ پُرامن۔۔۔ عمرِ خیّام کا خیمہ دادو فکر۔ جمشید کا جام پردانش و تدبّر، رستم و سہراب کا اکھاڑہ، ضرب و حرب، تختِ جمشید، شیراز کی شمامہ پرور فضائیں، نیشاپور کی علم پَرور دَرسگاہیں، اصفہان، ہمدان، تبریز اور تہران۔ آریہ مُہر ظاہر شاہ پہلوی، فریدہ، دیبا اور خمینی جیسا رہبر جس نے ایران کی قسمت بدل دی۔ آج کا ایران صاف ستھرا، خود مختار، اپنے پاؤں اور اپنے وسائل پر سربلند کھڑا سامراج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے، وقت سے بہت پہلے سنبھل گیا۔ ترقی و تکمل کی راہوں پر گامزن۔۔۔ نیند آنکھوں میں ہلکے ہلکے ہلکورے لے رہی تھی۔ مُندھی آنکھوں سے ان دَرویشوں کی جانب دیکھا وہاں تو ۔

پڑھو	فارسی	بیچو	تیل
دیکھو	قدرت	کے	کھیل

کوئی ہولے ہولے دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ دونوں دَرویشوں میں اگر کسی نے کھٹکا سنا بھی ہو تو ان میں اُٹھنے والا کون تھا؟ یہ سب معمولی معمولی غیر اہم کام انہوں نے مجھے بزرگ بنا کر سونپ رکھے تھے۔ شاید مجھ ایسے ناکارہ بڈھے، عمر کے اس عالم میں صرف اسی لئے محفوظ رکھے جاتے ہیں کھانے پینے کا بندوبست، سامان، کمرے کی نگرانی، خرچ اخراجات کے معاملات کی درستگی، صابن تولئے اور گرم پانی کا انتظام، دروازہ بند کرنا، کھولنا، لائٹ کو آن آف کرنا، سوتے ہوئے ان کی رالیں صاف کرنا، چادر اوڑھانا، نماز یا کھانے کے لئے بیدار کرنے کی خدمات انجام دیں۔۔۔ بہرکیف، مَیں اٹھا، کھڑکی کی جانب دیکھا۔ سنہری سنہری دُھوپ نکلی ہوئی تھی۔ گھڑی پر نظر ڈالی، ساڑھے گیارہ، گویا ہم پچھلی رات خوب ڈٹ کر سوئے تھے۔ دروازہ کھولا، بظاہر ایک احمق سا شخص بتیسی نکالے کھڑا تھا۔

"جی۔۔۔؟" ذرا سا دروازہ کھول کر مَیں نے پوچھا۔

وہ سر سے پاؤں تک میرا معائنہ کرتے ہوئی بولا۔ "تُسی پنجابی لگ دے او۔۔۔؟"

"بھائی جی! مَیں پنجابی دے علاوہ سندھی، بلوچی، تے پٹھان وں آں۔۔۔ فرماؤ کیہ حکم اے؟"

وہ میرا جواب سن کر ذرا گھوم سا گیا۔ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔

"لاہوریئے لگ دے او۔۔۔؟"

"آپ نے مجھ میں کون سی لاہوریوں والی بات دیکھی؟" مَیں اپنی اوقات اُردو پہ آگیا تھا۔

"تہاڈی مذاقیہ طبیعت توں پچھانیا اے بزرگو!" اندر جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔ "اندر آ جاں، بیٹھ کے گل بات کرنے آں۔۔۔"

"بھا جی، بچے سو رہے ہیں۔ پھر کبھی سہی۔" مَیں نے لاحول ولا پڑھتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

"کون تھا۔۔۔؟" نوید نے بند آنکھوں سے پوچھا۔

"کوئی لاہوری جُوٹھ تھی، گولی مارو۔۔۔ دونوں اُٹھ کر نہا دھو لو، بارہ بجنے کو ہیں۔ پیٹ میں چوہے دوڑ لگا رہے ہیں۔"

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "ابھی تو ساڑھے گیارہ ہوئے ہیں۔"

کروٹ بدل کر اس نے دیوار کی جانب منہ کر لیا۔ کھڑکیوں کے پَردے کھولتے ہوئے مَیں نے زبان کھولی۔

"پینڈو! ضرور سِکھوں کے ٹائم ہی اُٹھنا ہے۔۔۔ مَیں باتھ روم جا رہا ہوں، میرے نکلنے تک تم دونوں بستروں سے باہر نکل آؤ ورنہ۔۔۔!"

باہر نکلا تو وہ دونوں حسب توقع ابھی نیند کے اندر ہی تھے۔ تمہاری تو ایسی کی تیسی، کہتا ہوں میں واپس غسل خانے میں گھسا۔ پانی کا لوٹا بھر کر واپس آیا تو وہ دونوں بیڈ سے باہر کھڑے مجھے گھُور رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ بیڈ سے باہر نہ نکلے تو بابا جی ہمیں اشنان کرا دیں گے، واقعی مَیں اس معاملے میں قطعی کوئی لحاظ رَوا نہیں رکھتا۔ اس وقت خاص طور پر بابا جی جن خشمگیں نگاہوں سے مجھے گھُور رہے تھے، اگر انہیں الفاظ دیئے جائیں تو یہی ہو سکتے ہیں۔ "اٹھا لو اپنی بزرگی کا جائز فائدہ، ہماری عمر کے ہوتے تو دو دَھر کر تمہیں بھی سُلا دیتے۔"

"سیدھے سیدھے باری باری غسل کرو۔۔۔ ذرا باہر کا موسم دیکھو، کیسا سہانا ہو رہا ہے۔" مَیں نے ہر شے نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

کوئی گھنٹے بھر میں ہم کمرے سے باہر تھے۔ ہوٹل کی یہ منزل کسی پرانے بحری جہاز کے تھرڈ کلاس عرشے کا منظر پیش کر رہی تھی۔ کمروں کے کھُلے پٹ، کمرے مختلف سامان سے بھرے ہوئے۔ قالین، واٹر کولر، ہوزری کا سامان، الم غلم۔۔۔ سامان کی پیکنگ کرتے ہوئے مرد عورتیں، باہر راہداری میں تیل، گیس کے چولہے، اُبلتی ہوئی دالیں، سبزیاں۔ کوئی بیٹھا پیاز کاٹ رہا ہے، کوئی چاول بھگو رہا ہے، کوئی پارٹی بیٹھی پاکستانی اور ایرانی کرنسی کا حساب کتاب جوڑ رہی ہے۔ ہم باہر نکلے تو سب کی نظریں ہم پہ جم گئیں۔ ہم چولہے پھلانگتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، ایک پارٹی نے ہمیں روک لیا۔

"بھائی صاحب! کیا لائے ہو اور کیا لے جا رہے ہو۔۔۔ کرنسی کسٹم کی کوئی پرابلم ہو تو بتائیں۔ بارڈر پہ سب انتظام ہے، جتنا بھی مال ہو، سب نکلوا دیں گے۔"

ہماری تو سٹی گم ہو گئی۔ اللہ! ہم کن پھیرے بازوں میں آ پھنسے؟۔۔۔ سب سے معذرت کرتے ہوئے بڑی مشکلوں سے ہوٹل کی سیڑھیاں اُتر آئے، باہر پہنچے ہی تھے ایک داڑھی والا بلوچی آ پہنچا۔

"حاجی صاحب! پاکستان، ترکی، افغانستان۔ امیگریشن، ویزے، مال، کرنسی۔ کوئی بھی خدمت ہو تو بتائیں؟"

مَیں نے مزہ لیتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "بھائی! ترکی کا کیا چکر ہے؟"

وہ ہمیں ذرا پرے لے گیا اور بڑی رازداری سے بتانے لگا۔

"میرا تو کام ہی یہی ہے، سینکڑوں لوگوں کو ترکی پہنچا چکا ہوں۔ آپ بولیں، کتنے آدی ہیں؟"

"یہ دونوں۔" میں نے نوید اور باباجی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"پے منٹ، ڈالروں ہی میں کریں گے یا پاکستانی روپوں میں؟"

"دونوں میں بتاؤ؟"

"حاجی صاحب، ایک ہی بات۔ آپ شریف آدی ہیں، ہزار ڈالر اور پاکستانی روپوں میں پندرہ ہزار۔ کوئی رسک نہیں، بارڈر پار کرا دیں گے۔ ہمارا پکا بندوبست ہے۔"

ہم شکریہ ادا کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ کمبخت بڑی دُور تک ہمارے پیچھے آیا، ہزار سے پانچ سو تک آ گیا مگر ہم نے منہ نہ لگایا۔۔۔ صاف ستھری کھلی سڑکیں، دو رویہ

یکساں سرسبز درختوں کی قطاریں، ساتھ ساتھ صاف شفاف پانی کی چھوٹی سی آبنائے۔ نہ کہیں آلودگی نہ کوئی کوڑے کرکٹ کے ڈھیر۔ لوگ صاف ستھرے، کشادہ خندہ پیشانی، چہروں پہ طمانیت آسودگی کی جھلک، متوازن طبع، خوش مزاج۔ بازار، سٹور دوکانیں سلیقے سے سجی ہوئی، مال و سامان سے بھری ہوئیں۔ ہم خاموش اشتیاق بھری نظروں سے دیکھتے جا رہے تھے۔ کوئی خوانچہ فروش نہ کوئی ٹھیلے کھوکھے والا، جس نے فٹ پاتھ پہ آنے جانے والوں کا راستہ اور ناطقہ بند کر رکھا ہو۔ نہ ہی کوئی بھِک منگا نظر آیا۔۔۔ کوئی لُولا لنگڑا اور نہ کوئی معصوم بچے انگلی لگائے عورت۔ ایرانی عورتیں دیکھیں، سرتاپا سیاہ عبا میں ملبوس، سر ڈھانپا ہوا، پاؤں پہ باریک جرابیں چڑھی ہوئیں، دست دستانے، خوبصورت صحت مند، باوقار۔ شعبہ ہائے زندگی میں فعال۔ دفتروں سٹوروں، ایئرپورٹ، ریلوے اسٹیشن، پولیس ہر جگہ متعین۔ نہ وہاں کسی کو نظربازی کی عادت دیکھی نہ وہاں کوئی بھونڈی شے دیکھی۔ حیران و ششدر۔۔۔ الٰہی! یہ کیسا ملک ہے، یہ کس طرح کا معاشرہ ہے۔ یہ انوکھا نظام، یہ کاروبارِ حیات۔ یہ کیسی مخلوق ہے، یہ کس نوع و انداز کے مسلمان ہیں۔ خدا ایک، دین ایک قرآن اور رسول ایک پھر ایسا طرزِ حیات اپنانے میں ہمیں کون سی دِقت مانع ہے۔ ہم ان ایسے متمدّن اور باسلیقہ کیوں نہیں ہیں؟ یہ تو صدیوں سے آتش پرست تھے، پھر ان پہ آمرانہ ذہنیت کے شہنشاہ مسلط رہے جنھوں نے عورت، کو ننگا کر دیا، مغربی تہذیب کو رائج کر دیا، تیل کی دولت نے عیش کوش بنا دیا، ایران ایک منی یورپ بن گیا۔ عورت محض تعیش و تفریح کا سامان بن کر رہ گئی۔ بوڑھے گماشت، جوان پلے بوائے بن گئے۔ مسجدوں مدرسوں کی بغلوں میں کلب اور عشرت گاہیں آباد ہو گئیں۔ پھر ایک مردِ دَرویش اُٹھا، پیرانہ سال، جاہ و حشمت سے خالی۔ اس کے پاس صرف جُراتِ ایمانی اور اخلاص تھا، اس کے رَعشہ زدہ ہاتھوں میں یدِ بیضگی تھی۔ اس کے نحیف دل میں اللہ کا خوف اور قوم کا درد تھا۔ اس کی ضعیف آنکھوں میں حشر کی گرمی تھی۔ وہ سیاہ پوش، اس قوم کے سارے اندھیرے ختم کر گیا۔ اپنے جذبے اور تعلیمات کی روشنی بکھیر کر ایک منزل کی نشاندہی کر گیا۔۔۔ واہ رے پاکستانیو! جہاں جاؤ گے، اپنی خباثتیں، غلاظتیں ساتھ لئے جاؤ گے، کلنک کا ٹیکہ بن کر پہنچو گے۔ تم لوگوں نے مکے مدینے کو بھی نہیں چھوڑا، چرس ہیروئن تم نے وہاں پہنچائی، رشوت، بدمعاملگی، غیر قانونی قیام، ساری بے ایمانیاں تم نے سکھائیں۔ حج بھی کئے، عمرے

بھی گئے۔ ویزے بھی بیچے۔ اونٹوں کی ریس کے لئے بچے بھی اسمگل کئے، پورے پورے خاندان سے بھیک منگوائی، عورتوں کے نازک حصوں میں پوڈر پہنچایا، بوڑھوں بچوں تک کو آلہ کار بنایا۔ بند گوبھی، اچار کی بوتلیں، قرآن پاک کے نسخے، کھلونے، حتیٰ کہ تسبیح کے منکے تک، ہیروئن کی اسمگلنگ میں استعمال ہوئے۔ سر قلم کروائے، ہاتھ کٹوائے، قومی اور سفارتی سطح پہ جوتے کھائے مگر تم باز نہ آئے۔ ایران، انڈیا، بنکاک، چین، تائیوان، کوریا، روس کی ریاستیں، افغانستان، کہیں بھی چلے جائیں، پاکستانی پھیرے باز آپ کو ایئرپورٹ، کسٹم والوں، چیک پوسٹوں پر جوتے کھاتے، ذلیل ہوتے دکھائی دیں گے اور تو اور، اپنے ہاں پشاور سے کسی بس میں آپ رات کو لاہور تک سفر کریں۔ آپ دیکھیں گے، ایک حرافہ سی، چتر عورت پہلی دو سیٹوں پہ قابض ہوگی۔ بس کی سیٹوں کے نیچے خفیہ خانوں میں لاکھوں کا سامان چھپا ہوگا۔ یہ پیشہ ور پھیرے بازنی ہے۔ بس والوں سے سامان لاہور پہنچانے کا ٹھیکہ ہے۔ ہر چیک پوسٹ، چنگی پر کنڈیکٹر اترتا ہے، بھتہ دے کر آ جاتا ہے۔ کبھی کبھی وہ چمپے کٹنی بھی اُترتی ہے۔ شاہدرہ سے ذرا پہلے وہ سامان اتر جاتا ہے۔ انتظار میں کھڑی ویگنوں میں لوڈ ہو کر غائب ہو جاتا ہے۔

ہم لوگ انجانے میں جس ہوٹل میں ٹھہرے تھے، یہ پھیرے بازوں کا اڈہ تھا۔ ٹیکسی والے نے ہمیں اپنی دانست میں صحیح جگہ پر پہنچایا تھا۔ اس کی نظر میں ہر پاکستانی سمگلر، پھیرے باز اور کرپٹ ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی ایئرپورٹ پر چلے جائیں، آپ کی صورت اور پاسپورٹ آپ کو مشکوک بنانے کے لئے کافی ہیں۔ جوتے ادھیڑ دیں گے، سوٹ کیس کاٹ دیں گے۔ دواؤں کی شیشیاں، منجن کی ڈبی، کتابوں کی جلدیں، کپڑوں کے بڑے بڑے بٹن، فونٹین پن کی ٹیوب، ٹوتھ پیسٹ کے ساتھ ساتھ آپ کے پیٹ کی بڑی آنت تک چیک کریں گے۔ عورتوں اور بچوں کے ایکسرے تک ہوتے ہیں۔ کئی مرد ہیروئن کے پوڈر کا کلف کپڑوں کو لگائے پکڑے گئے۔ عورتوں کے گوٹہ کناری پوڈر کے بنے لگے، زیورات میں چھپائی پکڑی گئی۔ ہوائی جہاز کا عملہ، ایئرفورس والے پکڑے گئے۔ تربیت یافتہ کتے، بڑی بڑی حساس مشینیں اور قابل کھوجی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بیرون ممالک اس بات پر مہر ثبت کر دی گئی کہ وہ پاکستانی ہو ہی نہیں جو پاکستان سے آیا ہو اور خالی ہو۔۔۔ سبحان اللہ! کیا عزت افزائی ہے؟

میں خود ازلی جہاں گشت، آئے دن میرا دنیا بھر میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ میں خود دنیا کے بڑے بڑے ایئرپورٹس پر مشکوک ہوں لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ مجھے کبھی بھی کسی نے چھیڑا نہیں بلکہ "ہیلوبابا، ہیلوبابا" کہتے ہوئے فارغ کر دیتے ہیں یا پھر شاید یہ سوچتے ہیں، پرانا پاپی ہے۔ بوڑھا سالمنگ، کیا وقت ضائع کریں۔

بازاروں میں گھومتے گھومتے پیٹ میں گھونسے سے پڑنے لگے تھے۔ سوچا، کسی ہوٹل میں پڑاؤ ڈالا جائے۔ سچی بات ہے، میں تو کہیں چلو کباب کی تلاش میں مگن تھا۔ خیال تھا کہ پاکستان کی طرح یہ چیز بھی باہر فٹ پاتھوں پر پکتی یا بھنتی نظر پڑے گی، جھٹ منہ ماری کر لیں گے لیکن یہ تو یہاں کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ اسی کھوج میں ایک ہوٹل میں اُترے جو زیر زمین تھا۔ نفیس کشادہ، صاف ستھرا، کوئی شور نہ ریکارڈنگ، خوبصورت پردہ نشیں، خوبرو خندہ دہن دیدہ زیب پوشاکوں والے ویٹر، اچھے خاصے لوگ جن میں بچے خواتین بھی تھیں، بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ نہ چپ چپ نہ سڑپ سڑپ، باہم گفتگو بھی تو ایک مدھم سا ترنم آہنگ، فارسی اور پھر شیریں لہجہ جیسے ہال کے گوشے میں کوئی جلترنگ سے چہلیں کر رہا ہو۔۔۔ ہمیں بڑے احترام سے ایک پُر آرائش گوشے میں بٹھایا گیا۔ تازہ چنبیلی کی کلیاں، گلِ شبنم سے مہکتا ہوا گلدان ہماری سامنے میز پر دھرا تھا۔ مینو دکھانے سے پہلے ہی ایک نازک سی ٹوکری میں ہماری آگے رومالی روٹیوں کے آدھے آدھے ٹکڑے رکھ دیئے گئے۔ چھوا تو ہلکی پاپڑ جیسے لیکن گداز اور یخ۔۔۔ مغربی ممالک میں بھی یوں ہوتا ہے، وہاں لنچ یا ڈنر پر پہلے بریڈ رول اور مکھن رکھا جاتا ہے، ساتھ سوپ بھی ہوتا ہے۔ نظر بچا کر اس روٹی کا ایک ٹکڑا منہ میں رکھا۔۔۔ پھیکی، بے لذت جیسے کئی روز کی باسی ہو۔ ایسی روٹیاں ہمارے چھان بورے والوں کے ہاں ہوتی ہیں۔ دیکھا دیکھی باباجی اور نوید نے بھی ایک ایک لقمہ توڑتے ہوئے منہ میں رکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولے، ویٹر آرڈر لینے کے لئے سر پہ کھڑا تھا۔

"چلو کباب، پلیز!"

وہ سر جھکا کر چلا گیا تو نوید پوچھنے لگا۔

"باباجی، یہ کیا چیز ہے؟"

"بندہ خدا!۔۔۔ نظر نہیں آتی، روٹی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

روٹی تو ہے لیکن اس سے بہتر تو وہ روٹی تھی جو ہم نے راستے میں آلوگوشت کے شوربے کے ساتھ بلوچستان میں کھائی تھی۔ یہ ٹھنڈی اور باسی ہی سہی لیکن نمک' نہ کوئی سواد ذائقہ۔ ذرا مٹی اور کنکر شامل کر لئے جائیں تو بالکل ہماری فیروزپور روڈ جیل جیسی روٹی ہے۔"

"یار نوید' ایک تو تم بحث بہت کرتے ہو—— بحث کرو' اس سے علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن خدا کے لئے کج بحثی مت کرو۔ اس سے حمق پیدا ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔"

"اچھا—— آپ نے لقمہ لیا نا! ایمانداری سے بتائیں' کیا یہ روٹی ہے؟"

مَیں نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ "بھائی پینڈو نوید میاں داد! تمہارا نام نویدَ نہیں' کُرید ہونا چاہئے تھا۔ ہر بات کی کھال اُتارنے کی عادت بہت بُری ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں تمہاری وہ جسے تم اب بیوی کہہ سکتے ہو' اگر تم سے یہ کہہ دے مَیں تم سے اب بھی محبت کرتی ہوں تو تم خوش ہونے کی بجائے پوچھو گے' کیوں محبت کرتی ہو یا اس کی اب کیا ضرورت ہے؟ تم محبت کرتی ہو تو مَیں کیوں نہیں کرتا' تم نفرت کرو تاکہ مَیں تم سے محبت کروں—— بات دراصل یہ ہے کہ تم ایسے پینڈو جو شہر آکر کسی نہ کسی طَور پڑھے لکھے بن جاتے ہیں پھر خواہ مخواہ بحث کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ مقابل کو اپنے پڑھے لکھے ہونے کا تاثر دے سکیں۔ مانا کہ مَیں تمہارے ایسا پڑھا لکھا نہیں ہوں مگر صد شکر' تم سا کج بحث بھی نہیں۔"

بابا جی صدیوں بعد بولے۔ "اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ مَیں بھی زیادہ پڑھا لکھا نہیں—— سُنوں نہ بُولوں' نہ جواب دوں۔ اِک چُپ سو سُکھ۔"

"باباجی! آپ تو بات کا بتنگڑ نہیں بلکہ بتنگڑ ابنا لیتے ہیں' بات صرف روٹی——"

"بھائی! یہ خاص قسم کی روٹی ہے۔ اس کی خاص بات اس کا باسی اور بے نمک' بے ڈول ہونا ہے۔ یہ خاص قسم کے ایرانی جَو سے بڑے ہی جوکھموں' جتنوں سے بنتی ہے۔ اس کو شروعات میں پیش کرنا ایران کی قدیمی روایات میں شامل ہے۔ دیکھو اِردگرد' ہر کھانے والے کے سامنے دَھری نظر آئے گی۔"

ویٹر چُلو کباب اُٹھائے چلا آرہا تھا۔ ہمارے سامنے اس نے سادہ اُبلے ہوئے خشک چاولوں کی ایک ایک پلیٹ رکھ دی' اُوپر تین تین سلائیاں جن میں بوٹیاں' ٹماٹر' پیاز اور

شملہ مرچ کے قتلے پَروئے ہوئے تھے۔ ایک بڑی سی پلیٹ میں کھیرے شلجم کا اچار جو سفید سرکے میں بھیگا ہوا اور سفید سی لسّی کا جگ جس کی سطح پر زیتون کا تیل چھوٹے چھوٹے بلبلوں کی شکل میں چمک رہا تھا—— ویٹر کھانا سجا کر چلا گیا۔ نوید نے زبان کھولی۔

"باباجی! ہم نے تو چُلو کباب منگوائے تھے' وہ کِدھر ہیں؟"

"پینڈو جی! یہ کوئی اپنا گھر نہیں جہاں سب کچھ ایک ہی بار سامنے ٹھنڈا ہونے کے لئے دَھر دیا جاتا ہے۔ یہ ہوٹل ہے اور پھر تم تہران جیسے ماڈرن شہر میں بیٹھے ہو' پھپھو کی مُلیاں یا چُوہڑ کلنہ میں نہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانے مختلف کورسوں کی صورت میں آتے ہیں۔ پہلے روٹی آئی' پھر چاول اور سلاد آیا۔ تیسرے کورس میں چُلو کباب اور چوتھا کورس سویٹ ڈش کا ہوگا۔ آخر میں چائے یا قہوہ—— چلو کھاؤ۔"

بھوک چمکی ہوئی تھی۔ پھیکے چاول کبھی بوٹی' ٹماٹر پیاز' کبھی شملہ مرچ کے ساتھ نگلتے رہے۔ سرکے والا شلجم کھیرا اچار نہ ہوتا تو بڑی مشکل پیش آتی۔ جیسے تیسے کھانا نگلا۔ پلیٹیں صاف تھیں' اب چُلو کباب کا انتظار تھا۔ ویٹر ذرا دُور کھڑا شاید ہمارے اشارے کا منتظر تھا۔ اس کی جانب دیکھا تو وہ فوراً آگیا۔ ہم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"چُلو کباب' پلیز!"

سَر جھکائے وہ پلیٹیں اٹھا کر چلا گیا۔ مَیں نے کہا۔

"دیکھا' بڑے ہوٹلوں میں کیا قرینہ سلیقہ ہوتا ہے۔ کام اور مطلب کی بات—— ہمارے ہاں جیسا شور اور ایک طوفان بدتمیزی نہیں ہوتا' نہ ہبڑ ہبڑ ٹھونسا جاتا ہے۔ اوئے چھوٹے' ہیلو۔ نہ ٹیبل بجائے جاتے ہیں اور نہ ہی یہاں "ذرا گریوی" طلب کی جاتی ہے۔"

بابا جی بولے۔ "یتیم خانے کے ہوٹلوں میں تو بِلّیوں جیسے بڑے بڑے چوہے' میزوں کے نیچے کھانے والوں کے پیروں میں گھومتے رہتے ہیں۔ تندورئیے کے سامنے بیٹھے آگ تاپتے ہیں۔"

"شش!" مَیں نے ہونٹ سکیڑ کر مہین سی آواز نکالی۔ "ابھی ہم نے کھانا ختم نہیں کیا' یہ ذکر پھر کبھی سہی' اپنے ہاں کی کسی چیز کا ذکر مَت کریں۔"

چُلو کباب نہیں آرہے تھے۔ اتنی دیر ہم اِدھر اُدھر کی باتیں اور سرکے میں ڈوبے ہوئے ترش گونگلوؤں کے قتلے کھاتے رہے۔

"بڑی دیر لگا دی۔" نوید حسب عادت بولا۔

"یہی تو بڑے ہوٹلوں کی بات ہے۔ ایک کورس سے دوسرے کورس کے درمیان ایک مناسب اور خوبصورت سا وقفہ رکھتے ہیں تاکہ پہلی کھائی ہوئی غذا' آنتوں میں اپنی جگہ بنا لے اور پیچھے آنے والے کھانے کے لئے خاطر خواہ گنجائش نکال لے۔ اس طرح تہہ دَر تہہ اور وقفہ چھوڑ کر کھایا ہوا کھانا جلد ہضم ہوتا ہے' ڈکاروں اور نفخِ شکم سے طبیعت اور لوگ بُوجھل نہیں ہوتے۔"

بابا جی بولے۔ "ہاں' وقفہ بڑا ضروری ہے۔"

جس کا انتظار تھا آخر وہ شاہکار آ ہی گیا۔ ہمارے تو طوطے اُڑ گئے۔ وہی چاول' وہی بوٹی سلائیاں--- ہم تینوں پہلے تو ایک دوسرے تیسرے کی جانب دیکھنے لگے۔ پھر اس "مردِ چُلّو کباب" کو گھُورا۔

"بھائی' ہم چُلّو کباب کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ تو ہم پہلے ہی کھا چکے ہیں۔"

وہ بڑے اَدب سے بولا۔ "آغائے پاکستانی' پہلے بھی چلّو کباب تھے--- اب بھی یہی ہیں۔"

یقین کریں' پورے ایران سے نفرت ہو گئی۔ اتنا خرچہ اور دَلدَر برداشت کر کے یہاں چُلّو کباب کھانے آئے اور کھایا کیا؟ یہی کچھ کھانا تھا تو بندو خان کیا بُرا ہے۔ کم از کم کھایا تو جا سکتا ہے۔ آپ چاہیں تو شاشلک کو چُلّو کباب کہہ سکتے ہیں-- بچی اور چُلّو کبابوں سے بھی جان چھوٹی۔

یورپ بلکہ اب ساری دنیا میں کنٹکی فرائیڈ چکن' پیزا' پَیسٹا' میکڈونلڈ بڑے مقبول ہیں۔ روس' چین' جاپان اور سعودی عرب جیسے ممالک میں بھی بڑے بڑے ریستوران کھل گئے ہیں جہاں نئی پود کی لمبی لمبی قطاریں لگی دکھائی دیتی ہیں۔ بَرگرز بھی اسی قبیل کا فاسٹ فوڈ ہے۔ فش اینڈ چپس بھی ہیں جو مغربی ممالک میں سب سے زیادہ مقبول عام ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ پاکستان میں بھی یہ بدیسی کھانے آ گئے ہیں جو صرف خواص میں ہی مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ سارے کھانے مشینیں بناتی ہیں' بہت ہی کم انسانی ہاتھوں سے انہیں چھُوا جاتا ہے۔ حفظانِ صحت کے اُصولوں کے تحت انہیں بنایا اور پرَوسا جاتا ہے۔ سٹاف تربیت یافتہ ہوتا ہے۔ خام اشیاء سے لے کر تیاری اور فروخت کرنے تک

ایک ایک مرحلے پر نِگاہ رکھی جاتی ہے۔ پیکنگ اور پیش کاری بڑی پروفیشنل اور دلچسپ ہوتی ہے۔ گوشت اور سبزی خوروں کے لئے مختلف ورائٹیاں مرچ مصالحوں' سیاہ مرچ' ٹماٹو کیچپ' سلاد آئل' مسٹرڈ پیسٹ' سلاد کریم اور ٹوتھ پک ساتھ ہوتا ہے۔ کاغذی رومال اور چاکلیٹ بار بھی۔ اصل چیز معیار کو برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے اسی چیز کا ہمارے ہاں فقدان ہے۔ چکن فرائی' چپس' روسٹ بروسٹ ہمارے ہاں دیسی طور طریقوں سے بنتا ہے۔ بڑی بڑی دوکانیں ہیں۔ خوبصورت نیون سائن جگمگا رہے ہوتے ہیں لیکن اندر وہی گند اور بَدبُو ہوتی ہے۔ مشینیں بھی ہیں۔ فریزر سے نکلا' سیدھا ہائی ٹمپریچر میں ڈال دیا۔ باہر سے جلا ہوا۔ اندر سے کچا اور ٹھنڈا' باتھ روم پیپر رول کے دو ٹکڑوں اور ہوم میڈ ٹماٹو کیچپ کی گندی بوتل' جلے سڑے مُرجھائے ہوئے چند چپس' کٹی ہوئی بند گوبھی--- یہ ہے ہمارا فاسٹ فوڈ۔ ہری پور ہزارہ کے گندے لونڈے جو کئی کئی ہفتے نہاتے نہیں' گاہکوں کو سرو کر رہے ہوتے ہیں۔ یہی حال ہماری فرائی مچھلی اور سروس کا ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے ستاروں والے ہوٹلوں کا بھی یہی رونا۔ اونچی دوکان' پھیکا پکوان۔

ذرا غور کریں اٹلی اور گریک کا پیزا اور پیسٹا' ہمارے ہاں اتنی مسافت طے کر کے کیوں آیا۔ انگلینڈ کا میکڈونلڈ اور کنٹکی فرائی چکن بَرگر ان کے کھانے اور سسٹم' سات سمندر پار کر کے ہمارے ہاں پذیرائی حاصل کر رہے ہیں۔ کیوں؟ حالانکہ یہ بہت مہنگے بھی ہیں اور ہمارے مزاج' تہذیب اور ذائقے سے میل بھی نہیں کھاتے۔ ایک ڈونر کباب بھی جو از قسم برگر ہے' یورپ کے علاوہ تمام عرب ممالک میں آپ کو ہر جگہ بکتے نظر آئیں گے۔ بے حد صاف ستھری اپ ٹوڈیٹ مشینیں' نفیس و خالص اجزاء' بہترین سروس' صفائی ستھرائی کے اصولوں کا خیال' اور تو اور پاکستان والے تو ٹماٹو کیچپ اور معمولی آلو کے چپس بھی ابھی تک صحیح شکل و ذائقے میں تیار نہیں کر پا رہے۔ گولڈن فرنچ فرائی تو بہت دُور کی بات ہے--- مندرجہ بالا سطور میں تحریر کر چکا ہوں۔ ہم یورپ والوں کی نقل و تقلید تو کر لیتے ہیں' اِن کے اصُولوں اور طریقوں کو نہیں اپناتے۔ ہم راتوں رات امیر اور کامیاب ہونا چاہتے ہیں' نئی نئی جدتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں لیکن محنت' صبر اور تربیت حاصل نہیں کرتے۔ صاف ستھری کوالیفائیڈ سروس مہیا نہیں کرتے اور سب سے اہم بات' اپنا معیار برقرار نہیں رکھ پاتے۔ مغربی دنیا میں ہر ٹریڈ' خاص طور پر کیٹرنگ یعنی ہوٹلوں کلبوں

کے ٹریڈ میں ہر نئے سیزن پوری پوری سیٹنگ' ڈیکوریشن اور کلر سکیم تک بدل دی جاتی ہے۔ سٹاف کی یونیفارم' مینو کا ڈیزائن' نیوئن سائن' فرنیچر' کارپٹ' کٹلری' کراکری تک اپ ٹوڈیٹ کر دی جاتی ہے بلکہ نئی نئی ڈشیں' نئے نئے ذائقے نت نئی دلچسپیوں کے ساتھ متعارف کرائے جاتے ہیں۔ ایک ٹیلیفون کال پر پندرہ بیس منٹ میں آپ کا پسندیدہ کھانا' گرماگرم آپ کے دروازے پر حاضر ہوتا ہے۔ ریسٹورنٹوں میں بچے' بوڑھوں' سینئر سٹیزن اور معذور لوگوں کے لئے فرنیچر' باتھ روم' مینو اور ریٹ تک مختلف ہوتے ہیں۔ مستعد' باوقار تربیت یافتہ۔۔۔ گروپس کی شکل میں سپیشل رعایت بھی ملتی ہے۔ کوئی شکایت ہو تو وہ سُنی جاتی ہے بلکہ اس کا فوراً" تدارک کر کے زبانی اور تحریری معذرت بھی کریں گے۔ محکمہ ہیلتھ باقاعدہ کچن' باتھ روم' ماحول اور کھانے چیک کرتا رہتا ہے۔ کوالٹی کنٹرول چیک ہوتا ہے۔ فریج فریزر' سٹور روم' کوکنگ لکر کے اندر باہر' چھریاں چاقو تولیے ہر چیز پر نظر رکھی جاتی ہے۔

میں خود اس ٹریڈ سے اک لمبے عرصے تک وابستہ رہا ہوں اور آج بھی کسی حد تک ہوں۔ بہت سے واقعات مجھے یاد ہیں جن کی وجہ سے مجھے محکمہ ہیلتھ کے آگے جواب دہ ہونا پڑا۔۔۔ انگلینڈ میں میرے ایک ہوٹل میں ایک جوڑا کھانا کھانے کے لئے آیا۔ بڑے اچھے طریقے سے کھانا کھا کر وہ لوگ چلے گئے۔ رات دو بجے' ان دونوں کو فوڈ پوائزنگ ہو گئی۔ وہ ہسپتال چلے گئے۔ ہسپتال والوں سے محکمہ ہیلتھ والوں تک بات جا پہنچی۔ وہ فوراً" میرے ہاں پہنچے۔ کچن میں ایک ایک پکی' ان پکی چیز چیک کی۔ ہر چیز ان کے معیار کے مطابق تھی۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے کہیں اور سے بدپرہیزی کی تھی۔۔۔ ایک بار ہمارے ایک کھانے سے گاہک کو ایک عدد چھوٹا سا بال مل گیا جس کی پاداش میں گاہک سے زبانی اور تحریری معذرت کے علاوہ' ایک بھاری جرمانہ بھی دینا پڑا۔ شیشے کے ٹکڑے' ننھی سی تار۔۔۔ ایسے کئی واقعات پیش آئے جن کا کیٹرنگ کے ٹریڈ میں سرزد ہو جانا بعید از امکان نہیں لیکن محکمہ ہیلتھ نے کبھی بھی چشم پوشی یا رعایت سے کام نہیں لیا' ہمیشہ وارننگ اور جرمانے ہوئے۔

ایک مرتبہ امریکن ایئرلائن پر سفر کرتے ہوئے میرے ویجیٹرین کھانے میں ایک چھوٹا سا پلاسٹک کا ٹکڑا برآمد ہوا۔ ایئرہوسٹس کو بلایا' دکھایا۔ وہ فوراً" پورا کھانا اٹھا کر لے گئی۔

چند ہی لمحوں بعد سیکنڈ کیپٹن میرے پاس آیا' مجھے ساتھ لے کر فرسٹ کلاس کیبن میں جا کر بٹھایا۔ معذرت کی' پُرلطف کھانا کھلایا بلکہ اضافی فواکہات بھی کھانے کے لئے پیش کئے جو صرف فرسٹ یا ایگزیکٹو کلاس کے لئے مخصوص ہوتے ہیں' کمپلینٹ بک پر ساری شکایت لکھی بلکہ پیشکش کی کہ آپ چاہیں تو نیویارک تک اسی کلاس میں سفر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ایک مرتبہ سٹاف کی غلطی سے میرا ویجیٹرین کھانا لوڈ نہ ہونے کی وجہ سے جہاز آدھ گھنٹہ لیٹ ہو گیا اور اپنی اس غلطی کی تمام مسافروں سے معذرت چاہی۔

یہ ساری باتیں بیان کرنے کا مقصد یہی ہے کہ ان ممالک میں پیشہ ورانہ احساس ذمہ داری ہے۔ وہ لوگ ہماری طرح سہل پسند اور کام کوس نہیں ہیں۔ ٹریڈ میں بھی ہوں گے تو اس کی تربیت اور تجربہ حاصل کریں گے۔ معیار برقرار رکھتے ہوئے نئی نئی جہتیں اور نُدرتیں پیدا کریں گے۔ اگر کسی بھی وجہ سے کاروبار میں ناکام ہو گئے تو سُنڈی کی طرح چمٹے نہیں رہیں گے بلکہ بڑی فراخ دلی سے خسارہ برداشت کرتے ہوئے اس کاروبار کی جان چھوڑ کر کسی اور جگہ یا کسی اور ٹریڈ میں قسمت آزمائی کریں گے۔ ہماری طرح نہیں کہ قرضے پر قرضہ چڑھتا جا رہا ہے' دوکان خالی ہوتی جا رہی ہے مگر ہم لکیر کے فقیر بنے چمٹے ہوئے ہیں۔ نہ ہی وہ ہماری طرح رشک اور حسد کرتے ہیں اور نہ ہی بھیڑچال پر یقین رکھتے ہیں کہ اگر ایک نے جنرل سٹور کھول کر کامیابی حاصل کی تو ساتھ والے سبزی فروش نے بھی اسٹور کھول دیا۔ ایک نے تکے کباب لگائے تو دوسرے نائی نے بھی یہی کام شروع کر دیا۔ ہماری ناکامی کی ایک وجہ پیشہ ورانہ حسد بھی ہے کہ ہم کسی کو کھاتا نہیں دیکھ سکتے۔

آپ نے پرائز بانڈ والوں کو دیکھا ہو گا۔ سڑک کے ساتھ میز پر نمبروں کی کتابیں سجائے دوکاندار دیکھے ہوں گے۔ جگمگاتی روشنیوں میں دُلہنوں کی طرح سجی ہوئی موٹر سائیکلیں اور کاریں ملاحظہ کی ہوں گی۔ ہر کوئی پہلا انعام دینے والا بااعتماد ادارہ ہے۔ بعض کاروباری جگہوں پر ہر تیسری دوکان یہی کاروبار والی ہے۔ گلیوں کی گلیاں' بازار' محلے یہی جوا خانے کھلے ہوئے ہیں۔ نائی' قصائی' دھوبی' اسٹیشنری والے' درزی' ہوٹل والے حتیٰ کہ سینٹری والوں نے بھی یہی دھندا شروع کر دیا یا کم از کم اپنے آگے میز ضرور دھر لیا۔ یہی بات کہ دوسرے کھا کما گئے ہم کیوں پیچھے رہیں؟ گھر میں آٹا نہیں مگر سینکڑوں روپوں کے نمبر خریدے جا رہے ہیں۔ میں کئی لوگوں سے واقف ہوں جنہوں نے مکان' زیور گروی رکھ

دیئے۔ اپنی جوان بیٹیوں کا تیار جہیز لاکھوں کے انعام کے لالچ میں اونے پونے فروخت کر دیا۔ تنخواہ ہاتھ آتے ہی سیدھے نمبروں والی دوکان سے کاپیاں اٹھائے گھر پہنچے۔ بیوی نے خرچہ مانگا۔ آٹا' دال' گھی' مکان کا کرایہ اور بِلوں کا رونا رویا۔ تو انہوں نے نوٹوں کی گڈیوں کی مانند نمبروں کی کاپیاں تھمادیں۔

"بس چند روز صَبر اور دُعا کرو' پچاس لاکھ نکلنے ہی والا ہے ورنہ پچاس ہزار کی تو دوکان والے نے بھی گارنٹی دی ہے اسی لئے پوری سیریل ہی لے آیا ہوں۔ تنخواہ کی رقم کم پڑی تھی' اگلی تنخواہ تک ادُھار کر آیا ہوں۔"

ہمارے ایک جاننے والے جو سینٹری کا کاروبار کرتے ہیں' پہلے شوقیہ طور پر نمبر خریدتے رہے دو چار ہزار آئے تو دل کھُل گیا۔ ہزاروں لگا دیئے بلکہ اپنے آگے میز بچھا کر یہی کاروبار شروع کر دیا۔ جوان اولاد کو ساتھ لگایا بلکہ میز پر بٹھایا۔ جب بھٹہ بیٹھ گیا' دوکان خالی ہو گئی' لینے دینے والے سر پر آ گئے تو ہوش آیا۔ میز ہٹائی' توبہ کی--- اب تسبیح کرتے رہتے ہیں۔ بچوں کو محنت کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ دوکان میں رزق میں برکت کے لئے آیتیں بھی لٹکائی ہیں۔ مجھ سے بھی رُوزی رَزق میں دُعا کے لئے کہتے رہتے ہیں۔ مَیں بھی مفت کی چائے پی کر دُعا کر دیتا ہوں اور دُعا کی بجائے زیرِ لب دہراتا ہوں۔

"سب کچھ لٹا کر ہوش میں آئے تو کیا کیا"

اس کاروبار اور اس کے نتائج سے بڑے بڑے پاپی مسلمان ہو گئے۔ داڑھیاں رکھے' تسبیح پکڑے' نمازوں اور وظیفوں میں مگن نظر آئیں گے۔ خاص طور پر انعاموں کے نتائج کے دنوں میں تو ان کا خشوع و خضوع دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ایک رات پہلے تو گھروں محلوں میں میلاد شریف سا سماں ہوتا ہے۔ بوڑھے' جوان' عورتیں بلکہ معصوم بچے سب مصلوں پر باجماعت سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ عالموں اور پیروں کے بتائے ہوئے وظائف اور چلّے چل رہے ہوتے ہیں۔ مَنتیں مانگی جا رہی ہوتی ہیں۔ شادی کی منتظر جوان بچیاں' قرضے اور تنگی حالات سے پریشان ماں باپ' قرخواہ اور قرض دار' ملک مکان اور کرایہ دار' اُدھار دینے والے دوکاندار' واپڈا' واسا' ٹیلیفون اور ٹیکس' درزی دھوبی' نائی اور پان سگریٹ والے' طالب علم کتابوں اور فیسوں کے لئے' بچے کھلونوں کے لئے۔ سب بانڈوں کے نتائج کے منتظر ہوتے ہیں۔ نتائج کے دن دو چار گھروں میں رونق' پلاؤ زردہ' باقی سب علاقے میں

صف ماتم بچھی ہوتی ہے۔ بار بار لسٹوں کو بغور دیکھا جاتا ہے۔ دوکانوں پر جا کر چیک کیا جاتا ہے۔ بس کہیں ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے۔ پُوری قوم کھُو کھلی ہو گئی ہے' خاص طور پر یہ غریب طبقہ جس سے اِن پرائز بانڈ والے ظالموں نے روکھی سوکھی بھی چھین لی۔

مَیں ایک شادیوں پہ باجے بجانے والے سے واقف ہوں' پہلے یہ جو بھی کماتا تھا بچوں کو کھلاتا تھا۔ اس کے گیارہ بچے ہیں' پانچ چھوٹے بڑے ڈھول تاشے بجاتے ہیں' باقی ننھے ننھے' کپڑوں کھلونوں اور تعلیم سے محروم' اپنی نئے سرے سے حاملہ ماں کی جان توڑتے رہتے ہیں۔ چھوٹے سے کمرے میں یہ درجن سے اوپر افراد رہائش پذیر ہیں (اسی کمرے میں سازندوں کی وردیاں اور ڈھول تاشے طنبورے بھی لٹکے ہوتے ہیں) اس کے نیچے ہی پرائز بانڈز کی دوکان ہے۔ یہ بینڈ ماسٹر صاحب کام دھندے کے بعد اور فراغت کے دنوں میں اسی دکان میں دھرے ہوتے ہیں۔ یہاں ان کا اُدھار بھی چلتا ہے۔ جب دیکھو' یہ یہاں کاپیاں اور نمبروں کی الٹ پلٹ کرتے نظر آئیں گے۔ بدقسمتی سے کسی پچھلے جنم میں ان کی موٹر سائیکل نکل آئی تھی اور دو چار بار چھوٹے چھوٹے نمبر لگ گئے تھے۔ بیوی پیٹ سنبھالے پڑی رہتی ہے' یہ اپنی بڑی سی توند لئے دوکان پہ لکی نمبروں کی چھان بین کرتے رہتے ہیں۔ اب اس انعام نکلنے والی موٹر سائیکل کا حشر بھی سن لیں۔ وہیں کھڑے کھڑے پینتیس ہزار مول لگا' انعام والے نمبر کی ویلیو ساڑھے دس ہزار تھی' کمیشن کے بعد ساڑھے نو بچے' اگلا پچھلا ادھار نکالا' چھ ہزار نقد نکلے۔ تین ہزار کے اسی وقت اور سیریز خرید لئے۔ دو سو روپے نیچے پان سگریٹ والے' تین مہینے کا پچھلا کرایہ۔ ایک ڈنڈا گولڈ فلیک' تین کلو مٹھائی انعام نکلنے کی خوشی میں بانٹنے کے لئے خریدی۔ اب جیب میں رات کی روٹی کے لئے ایک دھیلا نہ تھا کلارنٹ کی جیب' تینوں ڈھولوں کے پُڑے بَراس باجوں کے پمپوں کی واشلیں' سکاٹشی فلوٹ کی مَشک' ڈَرم کی ہُکیں اور سٹکیں' سب مرمت طلب ہیں۔ صرف لکڑی کے مجیرے کھڑتالیں اور ماسٹر سٹک ان آرڈر ہیں--- اب تو باقاعدہ' اپنے نام کی کمیٹی نکلوائیں' پرائز بانڈوں کے کامیاب نمبر بتانے والے عاملوں کے اشتہار بھی چھپتے ہیں۔

جو اس پرائز بانڈوں کے چکر میں نہیں آئے وہ امریکن لاٹری کے چکر میں پھنس گئے جو کئی ملین ڈالروں میں نکلتی ہے۔ جو اسے بھی مکروہ سمجھتے ہیں' وہ امریکن ویزہ لاٹری میں اُلجھ گئے۔ امریکن ویزہ لاٹری کی صحیح اور بَروقت رہنمائی کے لئے بڑے بڑے کنسلٹنٹ بھی

معرض وجود میں آ گئے جن کے بڑے بڑے بیرسٹر' ماہرینِ امیگریشن' امریکہ اور کینیڈا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ محض فارم پر کر کے قانونی بھول بھلیوں میں اُلجھا کر' سو فیصد امریکہ میں قانونی انٹری کی یقین دہانی کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی رقمیں بٹورتے ہیں اور ہم تھَن نُٹ' نکمے' اُمید فردا پہ تکیہ لگائے' زمینیں' مکان بیچ یا گروی رکھ کر قرضہ حاصل کر کے' ان کی ڈیمانڈ پوری کرتے ہیں۔ انہی ویزوں' پرائز بانڈوں کی وجہ سے غریب طبقہ' سُود خور پٹھانوں کے چُنگل میں بھی پھنس جاتا ہے جو انہیں سُود دَر سُود کے بیلنے میں جکڑ کر ان کی زندگی کا رَس نچوڑ لیتا ہے۔ اسی طرح آسان قسطوں پہ ضروریات زندگی کی اشیاء فراہم کرنے والے ہیں۔ یہ بھی زیادہ تر پٹھان ہیں۔ پنکھے سے لے کر موٹر سائیکل تک فراہم کرتے ہیں۔ آخر یہ پنکھا' جنریٹر کی قیمت اور موٹر سائیکل' موٹر کار کے ریٹ دکھاتی ہے۔ کچھ ایسا ملتا جلتا معاملہ اقساط پہ پلاٹ اور دوکانیں مکان دینے والوں کا بھی ہے۔ کچھ تو رقم بٹور کر سرے سے ہی غائب ہو جاتے ہیں اور کچھ کاغذات پہ ہی جنت کے نقشے کھینچتے ہیں اور کچھ ایسی ایسی اُڑچھن پیدا کرتے ہیں کہ آپ کئی قسطیں ادا کرنے کے بعد' خود ہی لعنت بھیج کر خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر کبھی آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا الاٹ شدہ پلاٹ ساتویں بار بک کر' آٹھویں بار پھر بک رہا ہے۔ اگر کوئی پلاٹ مل بھی گیا تو وہ ترقیاتی اخراجات' ٹیکس' ویلتھ ٹیکس' خرچہ رجسٹری' وکیلوں اور متعلقہ محکموں کی فیسوں اور نذرانوں کے بعد اس قیمت پہ پڑتا ہے کہ اس قیمت سے کہیں سستا مریخ پہ مل جائے۔۔۔ کوئی بتائے؟ ہم کون ہیں' کیا ہیں؟۔۔۔ ہمارا آج یہ ہے تو کل کیا ہوگا۔ ہم زندہ ہیں تو کیسے ہیں' کیوں ہیں۔۔۔ دراصل ہم مفت کا پکا پکایا حلوا کھانے والی قوم ہیں۔ ہم شیخ چلی کے مُرید ہیں' اسی شاخ کو کاٹیں گے جس کا آسرا ہوگا۔ ہم تصوّر میں اَنڈے' مرغیاں اور پھر انڈے کھاتے اور پالتے رہتے ہیں۔ پھر حقیقت کی ایک ٹھوکر سے ہی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ ہماری خواہشوں کی بھیڑ بکریاں خوب پھلتی پھولتی اور بچے دیتی ہیں۔ ہم تصوّراتی پلاؤ بنانے کے بڑے ماہر اور شوقین ہیں لیکن اصلی پلاؤ کسی دوسرے کے گھر میں کھانا پسند کرتے ہیں۔ ہم اپنی محنت پہ بھروسہ کرنے والا کسان بننا نہیں چاہتے جو بیج بوتا' محنت اور حفاظت کرتا اور پھر صبر اور انتظار کرتا ہے' دُعا مانگ کر اپنے رَبّ سے اس کے فضل اور کرم کا طلبگار ہوتا ہے۔ ہمیں گڈریا بننا پسند ہے جو اپنی خواہشوں کی بھیڑ بکریاں دوسروں

کی چراگاہوں میں ہنکا کر خود کسی گھنے درخت کے نیچے ٹیک لگا کر سکون کی بانسری نکال لیتا ہے۔ درخت کا پھل کھایا' چشمے سے پانی پیا۔ کاہل' بے کار وجود کو ریوڑ سمیت شام گھر لے آیا۔۔۔ آپ نے اس گڈریئے کا قِصّہ تو سنا ہوگا۔

کسی اقلیم کا بادشاہ قضائے الٰہی سے مر گیا تو وزرا امراء نے قانون کے مطابق ایک گڈریئے کو پکڑ گھسیٹ کر تخت پہ لا بٹھایا جو بد قسمتی یا خوش قسمتی سے صبح سویرے شہر میں داخل ہونے والا پہلا شخص تھا۔ وہ غریب گڈریا' بھیڑ بکریوں کو ہانکنے والا کیا جانے کہ طور طریق جہانگیری کیا ہوتے ہیں؟ ڈرا ڈرا سہما سا تخت کے ایک کونے میں سمٹا بیٹھا تھا' امیر وزیر ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ وزیرِ اعظم نے کورنش بجالا کر عرض کی۔

"جہاں پناہ! اب آپ اس ملک کے بادشاہ ہیں' ہم سب آپ کی رعایا ہیں۔ آپ اپنا پہلا حکم صادر فرمائیں تاکہ ہم بسرو چشم اسے بجالائیں۔"

وہ ازلی بھوکا ندیدہ' موٹی کھال اور عقل کا گڈریا۔ کوئی جواب بن نہ پڑا تو یونہی منہ سے نکل گیا۔

"حلوا پکواؤ' مجھے بھی کھلاؤ تم سب بھی کھاؤ۔۔۔"

دیر کیسی؟ فوراً" احکامات جاری کر دیئے گئے۔ شاہی مطبخ خانے میں حلوا تیار ہونے لگا' رعایا نے بھی بادشاہ کے حکم کے مطابق حلوے سے پیٹ بھرا' خاص و عام سب ہی خوش کہ بڑا میٹھا اور خوش خوراک بادشاہ میسر ہوا ہے۔۔۔ دوسرے روز پھر وزیرِ اعظم ہاتھ باندھے سامنے آ کھڑا ہوا' اُمور سلطنت کے بارے میں راہنمائی چاہی۔ صدیوں کے بھوکے گڈریئے بادشاہ کی موٹی سمجھ میں کچھ نہ آیا' عاجز ہو کر پھر حلوے کی تیاری کا حکم دیا۔ پھر حلوے کی کڑاہیاں چڑھ گئیں۔ اسی طرح ایک مدت' ہر چولہے پہ حلوا ہی پکتا رہا۔ حلوا کھا کھا کر لوگ تنگ اور بیمار پڑ گئے۔ گڈریا بادشاہ دن بدن موٹا تازہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ہاں حلوا ہی بادشاہی تھا۔ یہی حلوا' ہر چیز کی انتہا و منتہا ۔۔ اس کے آگے اس کی سوچ ہی ختم ہو جاتی تھی۔ ساتھ والے کسی بادشاہ نے جو حلوا خور بادشاہ دیکھا تو چڑھائی کر دی۔ دشمن کی فوجیں سرحد سے آ لگیں' وزیر نے خطرے کی اطلاع دی۔ حکم حلوے کا ہوا۔ دشمن اندر آ گیا مگر ادھر حلوے کی چاشنی تیار ہو رہی تھی۔ دشمن محل تک آ پہنچا تو بادشاہ سلامت حلوے سے لتھڑی ہوئی انگلیاں چاٹتے ہوئے تخت سے اٹھے' اپنی گڈری پہنی' لٹھ

ہاتھ میں لیا۔ یہ کہتے ہوئے شہر پناہ سے نکل لئے۔

"سنبھالو اپنا تخت و ملک۔۔۔ ہم نے جتنا حلوا کھانا تھا' کھالیا۔۔۔"

ہم سب خلوا کھانے والے گذر رہے ہیں۔ حلوا کھایا' ڈکار لیا اور چل دیئے۔

حلوے سے یاد آیا کہ کراچی میں بندو خان کا حلوا پراٹھا اور کباب بڑے مشہور تھے۔ اب بھی ہیں مگر وہ بات نہیں۔ پہلے بیرون ملک تک منگوائے جاتے تھے' پرانی دوکان بولٹن مارکیٹ کے قریب تھی' مجید لاہوری مرحوم بڑے شوق سے کھایا کرتے تھے اور کبھی کبھی میں بھی لینے جایا کرتا تھا۔ سید ذوالفقار علی بخاری' رفیق غزنوی' استاد جھنڈے خان' حفیظ جالندھری' سراج الدین ظفر' جوش اکثر مجید صاحب کے نمکدان والے دفتر میں دعوتیں اڑایا کرتے تھے۔ ان پرانے وقتوں پرانے لوگوں کی طرح وہ پرانی لذتیں بھی اٹھ گئیں۔ اب بندو خان کے نام سے کراچی کے علاوہ لاہور میں بھی تین چار جگہ کاروبار ہے اور بڑا وسیع پیمانے پر ہے لیکن اب نئی قدروں کے ساتھ ساتھ انہوں نے بھی کھانے پکانے کے انداز بدل لئے ہیں۔ کباب پراٹھا بھی چلتا ہے مگر برائے نام۔۔۔ دیگر جدید طرز کی ڈشوں نے اپنی جگہ بنالی ہے۔ غنیمت ہے کہ انہوں نے نام بندو خان ہی رہنے دیا ہے' مسٹر بندو خان نہیں رکھا۔

پرانے لاہوریوں نے ابھی تک اپنا پرانا انداز اور کھانے پینے کی حد تک اپنے ذوق و شوق میں تبدیلی پیدا کرنا گوارہ نہیں کیا۔ وہی گوالمنڈی' دوکانیں وہی' کھانے کھابے وہی' دوکاندار بھی وہی' اپنے بزرگوں کی گدیوں پہ بیٹھے ہوئے' حتیٰ کہ برتن' دیگچے' کڑاھیاں اور ذائقے بھی وہی۔۔۔ قلاقندیں' اندرسے' میسو' برفیاں' کھوئے کے پیڑے' دودھ' لسیاں' دہی' کھوئے' مچھلی' سری پائے' بونگ' باقرخانیاں' ہریسے' نہاریاں۔ میں سمجھتا ہوں یہ سب کچھ برقرار رکھنے میں پرانے امرتسریوں کا بڑا ہاتھ ہے جو سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں اپنی بولی' گالیاں اور کھابے نہیں چھوڑ سکتے۔ میں اکثر نوید صاحب اور باباجی کے ساتھ گوالمنڈی جاکر ان تینوں سے محظوظ ہوتا ہوں۔ اب برصغیر میں صرف لاہور ہی ایسا شہر رہ گیا ہے جو کم از کم کھانوں کھابوں کے معاملے میں پرانی قدروں اور لذتوں کا امین ہے۔ دہلی کو پرانے کاریگر لوگوں کے انخلاء نے خالی کردیا ہوا ہے۔ جب دہلی سہاگن تھی تو جامع مسجد' چاندنی چونک' پھاٹک حبش خان' بستی نظام الدین'' قطب صاحب' قاضی کا حوض' ریواڑی' بلیماراں'

ترکمان دروازہ' لال قلعے کے پاس بڑے بڑے نادر کاریگروں کے بھٹیار خانے اور ہوٹل ہوا کرتے تھے۔ اب نہ وہ لوگ رہے اور نہ وہ کھانے والے' اب چند ایک پرانے لوگ جامع مسجد اور ساتھ نواح میں بیٹھے عہدِ رفتہ کی یادگار پڑے ہوئے ہیں' جن کے دَم سے کوئی میرے ایسا وہاں جا پہنچتا ہے۔ حیدر آباد' لکھنؤ' بمبئی' علی گڑھ' مراد آباد اور امرتسر میں اب وہ پہلے والی بات ختم ہوگئی ہے۔ اگر کچھ ہے تو وہ پرانے گھرانوں میں ہے۔ بازاروں میں ہنڈیا اُلٹی پڑی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے سرینگر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں بھی اب وہ پہلے جیسا گوشتابہ نصیب نہ ہوا۔ پنیر' آلو مٹر' گونگلوؤں میں بھی وہ سُواد نہ ملا۔ انڈیا میں جگہ جگہ آپ کو مُغلئی کھانوں والے ہوٹل ملیں گے جو صرف نام کے حد تک ہیں۔

حیدر آباد دکن کی طرح سندھی بھی کھٹاس بہت پسند کرتے ہیں۔ ملتان والے کھانے پینے میں اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ بلوچی پٹھان کھانے پینے میں ملنگ ہیں' کراچی والے جو ملے نگل لیا سوائے ہندوستان سے آئے ہوئے چند گھرانوں کے۔۔۔ گوجرانوالئے کھانے پینے کے شیر ہیں۔ بنگالی' مچھلی بھات سے آگے نہیں بڑھتے۔۔۔ کھانے اور ورائٹی کے اعتبار سے فرانسیسی سب سے آگے ہیں۔ فرانس کے باورچی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ سابق شہنشاہ ایران نے اپنے صد سالہ جشن پہ جس میں دنیا بھر سے بادشاہ' حکمران اور بڑے بڑے لوگ شامل ہوئے تھے' دعوت طعام کا سارا انتظام فرانس کے سپرد کیا ہوا تھا۔ کھانے پیرس سے تیار ہوکر سپیشل ہوائی جہازوں سے آئے تھے جس میں ہرن' مُرغِ زریں' طاؤس اور تیتر وغیرہ تھے۔ ان گنت کورسوں پر مشتمل یہ دعوتیں کئی روز چلی تھیں۔۔۔ چین کے لوگ بڑے پیٹو ہیں۔ ہانگ کانگ' سنگاپور والے بھی قریب قریب اسی قبیل کے ہیں' بطخ اور چاول خاصہ خاص ہیں۔ اس کے علاوہ مینڈک' بلیاں' کتے' سانپ' چیونٹے' ان کا کڑاہی گوشت ہیں۔ سانپ جسے دیکھتے ہی ہماری ہوا سرک جاتی ہے' جس کے تصور سے ہی گھن اور کپکپی لگ جاتی ہے ان لوگوں کا مَن بھاتا کھاجا ہے۔ چین' جاپان' ہانگ کانگ' بنکاک سنگاپور کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں آپ کے سامنے ہی شیشے کے بڑے سے کیبن میں سینکڑوں سانپ لہرا رہے ہوتے ہیں۔ آپ کی پسند کے مطابق باورچی اسے ہاتھ سے پکڑ کر نکالے گا۔ نِک نِک سری دُم علیحدہ' پتلی سی چھُری سے کھال کو کٹ لگائے گا۔ جراب کی طرح اتار کر انگوٹھے سے پیٹ کی غلاظت صاف کرکے آپ کے سامنے کڑاھی میں ڈال دے گا'

چھچھوندر کے تیل اور وائن میں بھُون کر گرما گرم آپ کے سامنے رکھ دے گا۔ نہ انہیں سانپ کاٹتا ہے' نہ اس کی آنکھوں میں کاٹنے والے کی تصویر ساکت ہی اور نہ کوئی ناگن اس باورچی سے انتقام لینے آتی ہے۔ لاکھوں سانپ روز کٹتے ہیں' حیرت ہے؟

مَیں نے سانپوں کا ایک فارم ہانگ کانگ میں دیکھا' بالکل ایسا ہی جس طرح ہمارے ہاں مُرغیوں یا مچھلیوں کے فارم ہوتے ہیں۔ ان کی افزائشِ نسل بھی ہوتی ہے' ہر نوع اور ہر عمر کے لاکھوں سانپ' جوان اور بچے بھی--- یہ فارم دنیا بھر کے ریسٹورنٹس کو سانپ سپلائی کرتا ہے۔ یہاں کام کرنے والے اس طرح ان سے کھیلتے ہیں جس طرح ہم مرغیوں چوزوں کو پکڑتے ہیں۔ ان میں زہریلے بھی ہوتے ہیں جو دوسروں سے زیادہ قیمتی اور کھانے میں لذیذ ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کے سری پائیوں کا شوربا' بڑا مقوّی اور لَذیذ ہوتا ہے۔ بوڑھے بڑے شوق اور اہتمام سے نوش جان کرتے ہیں۔ میں نے ایک کارکن سے پوچھا۔

"تم ان سے ڈرتے نہیں ہو؟"

وہ ہنسا' کہنے لگا۔ "یہ تو خود ہم سے جان چھپاتے رہتے ہیں۔ کام کے بعد گھر جاتے ہیں تو دو چار ننھے منے سانپ تو کپڑے جھٹکنے سے باہر گرتے ہیں جنہیں ہماری بچے پکڑ کر بھُون کر کھا جاتے ہیں۔"

میکسیکو میں چیونٹیوں کا بھرتہ بڑے شوق سے کھایا جاتا ہے جو اعصابی قوت اور جوڑوں کے دَرد کے لئے بڑا مفید پایا گیا ہے۔ چھپکلیوں کی دُم کا سوپ' مگرمچھ کے ڈیلوں کا سوپ' سائبیرین چیتے کی مونچھوں اور ناخنوں کا سوپ۔ میامی بلی کے کلیجے اور پتے سے ڈبل روٹی کے سلائس پر لگانے والا ایک پیسٹ بنتا ہے۔ جسے صرف پیسے والے اور ہمت پیدا کرنے والے ہی کھاتے ہیں۔

بنارس میں' مَیں نے ایک سادھو کو زندہ سانپ کچ کچ کھاتے دیکھا' بغیر سری اور دُم کے تو کئی کھاتے دیکھتے۔ یہ سادھو بابا لگ بھگ سو برس کے تھے۔ بال سیاہ' نظر قائم' ہڈ گوڈے مضبوط۔ سری پہلے کھاتے تھے اور دُم بعد میں۔ پوچھا' کیا راز ہے؟

"لے بچہ! کھا کر دیکھ---"

ہم کھِسک گئے۔

برازیل میں زندہ بندر کے دماغ کو کچا کھایا جاتا ہے' اُوپر سے ایک خاص قسم کی برازیلی کافی کا گاڑھا مشروب پیا جاتا ہے۔ یہ عمل بھی ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ بندر بیچارہ بغیر اُوں آں کئے' ٹکٹکی باندھے خالی دماغ' دماغ کھانے والے کو دیکھتا رہتا ہے۔ پھر وہ آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ سُنا ہے بڑا لذیذ' دماغی قوتوں کو اُبھارتا ہے اور قوتِ لذیذہ کے لئے محرک ہے--- کچھوے کا گوشت جزائرانڈیمان میں سراندیپ وغیرہ میں بڑا مرغوب ہے۔ اب پاکستانیوں نے بھی اس کی افادیت کو محسوس کرتے ہوئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ راوی کنارے کشتیوں والے پہاڑ پہاڑ سے کچھوے اکثر پکڑ کر کنارے پر پھینکتے رہتے ہیں۔ صبح کو وہ غائب ہو جاتے ہیں۔ خدا جانے وہ بارہ دری جاتے ہیں یا لکشمی چوک ذرا رونق میلہ دیکھنے سرک آتے ہیں--- کُتے بیچارے تائیوان اور کوریا میں صرف چکھے جاتے ہیں۔ مکمل طوپہ اسے ہمارے ہاں ساہنی کھاتے ہیں اسی لئے وہ لوَر لوَر بھٹکتے رہتے ہیں۔ بلیاں گگڑے کھاتے ہیں' کُتے کو وہ مکروہ بلکہ حرام سمجھتے ہیں' اس لئے گگڑے اوُپر سے وفادار خوبصورت' دَروں بَدباطن اور بےوفا ہوتے ہیں۔ گوہ' سانڈے' پہاڑی کِرلے' پکھی واس اور بہڑے بھنگ پی کر کھاتے ہیں۔ بغیر بھنگ پیئے انہیں کھانا مشکل ہوتا ہے۔ ساحلوں پر بسنے والے اکثر قبائل' سمندری بگلوں کے علاوہ کچھوے' تیندوے' آبی سانپ اور زہریلی مچھلیاں تک ہڑپ کر جاتے ہیں۔ جو خاکی' آبی اور بادی جانور پرندے ہمارے لئے مکروہ اور کریہہ ہیں وہ اکثر اقوام کے لئے بڑے لذیذ' پسندیدہ اور قیمتی ہیں۔ گھوڑے' گدھوں کو تو عام کھایا جاتا ہے۔ میکسیکو' گریک' اسپین میں اکٹوپس بڑا مقبول ہے۔ مچھلیوں میں سامن' ٹراوٹ' ہیڈک' راہو مہاشیر کی ہردلعزیزی تو عام ہے۔ خطرناک زہریلی سمندری مخلوق اور نایاب سمندری کیڑے تک حضرت انسان کے دسترخوانوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ جیلی فش' شاک فش' شارک' ڈولفن' گھڑیال' مگرمچھ' سمندری گھوڑے کچی سیپوں کے لیسدار کیڑے' گھونگے' سمندری سینگ' مینڈک' سمندری ٹڈی' سمندری سانپ' مگرمچھوں کے انڈے' سمندری شیر وغیرہ' تازہ تازہ بند ڈبوں میں بڑے بڑے ہوٹلوں' اسٹوروں اور خاص طور پر چائنیز فوڈ شاپس پہ دستیاب ہیں۔ سائبیریا میں رینڈیر' برفانی بارہ سنگھا' برفانی چیتے' سفید عقاب' سفید ریچھ اور برفانی لومڑی بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں بلکہ ان کا خشک و تر گوشت چربی' پوست ہڈیاں اور آنتیں تک ان کے لئے ایک نعمتِ

غیرمترقبہ سے کم نہیں۔ ان کا وُجود اور زندگی کی سرگرمیاں انہی کی بدولت سے قائم ہیں۔ افریقہ کے قدیمی قبائل آج بھی انسان کو کھا جاتے ہیں۔ لق و دق صحراؤں کے باسی حرام حلال، مکروہ، جو بھی ہاتھ آئے، چٹ کر جاتے ہیں۔ انسان جیسا بھی مہذب ہو جائے، گوشت کو معاملے میں ہمیشہ کچا ہی رہے گا۔ سبزیاں ترکاریاں اسے سیر نہیں کرتیں۔ عربی تو دعوتوں میں کئی کئی اونٹ پیٹ میں اتار دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ جس کی بیوی اچھا کھانا پکاتی ہو اور اس کے ہاتھ میں لذت ہو اس کا خاوند ہمیشہ وقت پر گھر پہنچے گا، گھر کھانا کھائے گا اور یہ بھی کہا گیا کہ جس مالک کے پاس اچھا باورچی ہو اس مالک کا خدا ہی حافظ ہوتا ہے یعنی وہ باورچی اچھے اچھے مرغن لذیذ کھانے بنا کر کھلائے گا۔ مالک بھوک اور ضرورت سے زیادہ کھائے گا، بسیار خوری کے باعث بیمار پڑ کر اللہ کو پیارا ہو جائے گا۔ باورچی کسی اور صحت مند چسکورے مالک کے ہاں چلا جائے گا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسے مالکوں اور باورچیوں کے قصے بھی رقم ہیں۔

حیدر آباد دکن، گوالیار، پٹیالہ، رام پور اور اس سے پہلے بہت سے بادشاہوں، سلطانوں اور راجوں، مہاراجوں کے شاہی مطبخوں میں بڑے بڑے نادر روزگار جادوگر قسم کے باورچی استاد ہوا کرتے تھے جو اپنے فن میں ایسے ایسے محیّر العقول کرتب دکھلایا کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ دسترخوانوں پر ایسی ایسی بہار دکھلایا کرتے کہ لذتِ کام و دہن انگشت بدنداں ہو جاتی۔ بڑے بڑے انعام و عزاز، جاگیریں اور خطاب پاتے۔۔۔ ایک ریاست کے ولی عہد نے جو کچھ عرصہ اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں انگلستان مقیم رہے تھے، اپنے انگریز دوستوں کو شکار اور دعوت طعام پر مدعو کیا۔ اڑچن یہ آپڑی کہ وہ سارے گوشت خور تھے اور ادھر یہ عالم کہ انڈے تک سے پرہیز۔ شاہی طباخ سے مشورہ کیا، اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔

"سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

دعوت کے دن شاہی دسترخوان پر لحم اور مرغ و ماہی کی کہکشاں اتری ہوئی تھی۔ کئی طرح کے قورمے، پلاؤ، متنجن، انواع و اقسام کی مچھلیاں، تکے کباب، بھنے ہوئے مُرغ تیتر، کوفتے، اچار مربّے۔۔۔ میٹھے پھیکے تلخ ترش طرح طرح کے پکوان۔ مہمان کھانے سے بڑے لطف اندوز ہوئے۔ باورچی کو بطور خاص بلایا۔ تعریف کی، انعام سے نوازا۔ یہ

سارے کھانے ماش کی دال سے بنائے گئے تھے۔ کمال اور جادو تو یہ تھا کہ مرغ اپنے ذائقے میں، مچھلی، مچھلی کی لذت میں، گوشت، گوشت جیسا، کوئی بھی شبہ تک نہ کر سکا کہ وہ سب دال کھا رہے ہیں۔

والئی حیدر آباد میر سر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ ہفتم کے مطبخ شاہی میں یوں تو کئی ماہرینِ فن و کمال، یکتائے روزگار باورچی تھے جو شاہی دسترخوان کے لئے ہر روز نت نئے کھانے بنایا کرتے تھے۔ کھانے کے معاملے میں حضرت آصف جاہ بہادر خود تو بڑے سادگی پسند تھے۔ محض ارہر کی آش، چند لقمے خشکہ چاول، دو شاہی کباب تناول فرمائے، ہاتھ کھینچ لیا لیکن متعلقین اور خاص الخاص مصاحبین کے لئے سب کچھ ہوتا کہ ان کی تفصیل لکھی نہیں جا سکتی۔ ان شاہی باورچیوں میں ایک بوڑھا باورچی میاں فیض علی بھی تھا جو کبھی کبھار حکم کی تعمیل میں ارہر کی دال کی کھچڑی بنایا کرتا تھا۔ کس طرح بناتا تھا، یہ تو وہی جانتا ہوگا۔ مٹی کی کلیا میں پاؤ بھر کھچڑی پر اس وقت کے پانچ ہزار کا خرچہ پڑتا تھا۔ دو لقموں کے بعد تیسرا لقمہ اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، اعصاب میں بجلیاں کوندنے لگتیں۔ روغنِ زرد، کھنکتے سونے کی اشرفیوں کے بگھار، خدا جانے کیسے مُروارید و مَرجان اور کشتے مصالحے پڑتے ہوں گے؟

افریقہ کے جنگلوں میں ایک کیَرا بھینسا ہوتا ہے۔ بے حد غصیلا اور خونخوار، شیر کو سینگوں پر رکھ کر چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا ہے۔ اسی افریقہ میں ایک اور بھینسا نما آمر بھی تھا۔ کثیر الازواج اور وافر العیال۔ عیدی امین، یہ حضرت اسی کیسرے بھینسے کے نرخرے کا تازہ تازہ گرم لہو کسی جنگلی بوٹی کے جوشاندے میں ملا کر نوش جان کیا کرتے تھے۔ معزول نہ کر دیئے جاتے تو جنگل بھینسوں سے خالی اور ان کے ننھے ننھے کٹوں سے بھر گئے ہوتے۔۔۔ ادھر انڈیا کے سابقہ آنجہانی مہان منتری مرارجی ڈیسائی، سوامی دیوندر ناتھ اور راج کپور کے سالے پریم ناتھ سُدا سکھی اور لمبا جیون بیتانے کے لئے "سریر جل" پیا کرتے تھے یعنی وہ مائع جس سے پرہیزگاروں کا لباس ناپاک ہو جاتا ہے۔ پھر بھی وہ مر گئے۔۔۔ اپنے گورنر جنرل غلام محمد بھی اِک عجیب طُرفہ شخصیت تھے۔ مجموعۂ اضداد، صاحبِ سلوک بھی اور بندۂ دُشنام بھی۔ جہاں ہوش و خرد، علم و فضل کے بام و در روشن کئے وہیں مخبوط الحواسی و بے ہمتی کے مظاہرے بھی کئے۔ آپ مغزِ کنجشک یعنی چڑیوں کا دماغ استعمال کرتے تھے۔ شاید

یہی کھاکھا کر دماغ الٹ گیا تھا۔ ہزاروں چڑے پھانسے جاتے' ایک چڑے سے مکھی جتنا مغز نکلتا۔ درجنوں ملازم ماچس کی تیلیوں سے مغز نکالتے رہتے۔ ڈیڑھ اونس مغز اکٹھا ہوتا۔ ان کے پیرخانے کے ایک بزرگ نگرانی کرتے' شاہ ابن سعود ان کے ذاتی دوست تھے۔ یقیناً انہوں نے بھی معجونِ مغز کنجشک چکھی ہوگی؟

اپنے ناظم الدین مرحوم بھی ملنگ آدمی تھے۔ کستورا مچھلی کی چربی سے چاولوں پر بگھار لگواتے۔ سکندر مرزا کو شیراز کے زرّیں مرغ پسند تھے جنہیں ناہید مرزا خصوصی طور پر اپنے میکے والوں سے خوب فرمائش کر کے منگواتی تھیں۔ ایوب خان فوجی آدمی' دُنبے کی چکّی کا پلاؤ مزے لے لے کر کھاتے تھے۔ ضیاء صاحب ملنگ تھے جو بھی ملے' گزارہ چلا لیا۔ بھٹو صاحب ثقیل طعام سے پرہیز ہی کرتے' رقیق اشیاء زیادہ پسند تھیں مثلاً مشروب--- از قسم سوپ' یخنی' بلیک کافی بغیر شکر' سگار بلکہ دخترِ رز کو بھی اکثر "برجانِ درویش" کر کے پی جاتے تھے--- میناکماری تو ڈیٹول کی شیشی میں وہسکی ملا کر پیتی تھی۔ مجید لاہوری دیسی ٹھرّے میں گنّے کا رَس--- کہتے کہ اس طرح اس کی دیسی قسم کی تلخی اور غلاظت تلف ہو جاتی ہے۔ مجاز سگریٹ کی راکھ زبان پہ رکھ کر چسکی بھرا کرتے' فرماتے۔ دو آتشہ ہو جاتی ہے۔ عدم تو سگریٹ بھی شراب کے گلاس میں بُجھاتے تھے۔ جگر تائب ہونے سے پہلے کُلّی شراب سے کیا کرتے' کھانے پینے کے بعد غرارے بھی اس سے کرتے--- جوش کی ساقن ان کی اہلیہ تھیں جو گھریلو قسم کی صابر شاکر خاتون تھیں۔ ایک دفعہ کراچی میں مَیں نے جھجکتے ہوئے جوش صاحب سے دریافت کیا تو بیوی کو ساقی رکھنے کی وجہ تسمیہ بیان فرمائی۔

"سبحان اللہ! اول' بیوی خوش رہتی ہے۔ دُوم' اچھی بھلی شراب اس کے ہاتھوں آتے ہی سرکہ ہو جاتی ہے جو میرے مضمحل عُضلات پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں چھوڑتی۔ سوم' میرے گناہ میں شریک ہو جاتی ہے اسی لئے میں اسے بیوی نہیں' شریکِ حیات کہتا ہوں اور شریک خرابات بھی......"

میں اپنا سامنہ لے کر خاموش ہو گیا۔

اپنے اختر شیرانی' فیض' اُستاد امن' جالَب' صوفی تبسّم' بابا ظہیر کاشمیری' ان بزرگوں کے معدے بھی پیرانہ سالی کی وجہ سے کمزور تھے۔ سخت غذاؤں سے حتیٰ الوسع اجتناب برتتے تھے البتہ پتلی رقیق غذاؤں سے وقت گزارتے تھے۔ بچے کھچے اثاثوں میں منیر' فراز'

قتیل' جوَن ایلیا۔ ان کی خستہ بنیادوں میں بھی سیلن پڑی ہوئی ہے۔ اللہ انہیں محفوظ رکھے--- بابا ساغر صدیقی' اللہ ان سے صَرفِ نظر فرمائے' آج بُری طرح یاد آ رہے ہیں۔ اب کہاں ایسے پراگندہ طبع لوگ؟--- احسان دانش' استاد امن' قدرت اللہ شہاب' سیف' حفیظ جالندھری' ایم اسماعیل فلم ایکٹر' لقمان فلم ڈائریکٹر' نسیم بیگم گلوکارہ' استاد امانت علی خان' سلامت علی' نصرت فتح علی' نورجہاں' ضمیر جعفری' روشن آراء' مختار بیگم آغا حشر والی' شورش کاشمیری' شوکت تھانوی اور منٹو' ممتاز مفتی' بابا ضیغم' سلطان کھوسٹ اور علی بابا' عاشق حسین سراٹ اور تنویر نقوی' ریاض شاہد اور علاؤالدین' کہاں گے یہ لوگ--- یا تو اب کوئی ان جیسا ہے ہی نہیں یا میری بوڑھی آنکھوں کو دکھائی نہیں دیتا۔

ہم اپنی روایات' اثاثوں' قدروں کی قدر ہی نہیں کرتے۔ ہم ایسے شعور سے ہی محروم ہیں۔ مغرب کی اندھی تقلید نے ہمیں اس احساس سے ہی محروم کر دیا ہے۔ اب چرخہ دیکھیں' عجائب خانوں نمائشوں اور لوک ورثہ میں پڑا ہوا نظر آئے گا۔ رہٹ' دودھ بلونے کی مدھانیاں' کپڑا بُننے کی کھڈیاں۔ باجرے مکئی کے ٹوڈھے' کچے چنے کے بونگڑے' چاولوں کے لڈو۔ اب ٹانگے کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ اسے لاہور سے باہر نکالو۔ تانگے کی طرح ٹوٹی پھوٹی چوبرجی کو بھی چوک سے اکھاڑ دو' سڑک کھُلی ہو جائے گی۔ بارہ دری اور ہرن مینار کو مسمار کر دو' دریا کھلا ہو جائے گا۔ نادرہ بیگم اور نورجہاں کے مقبروں کو بلڈوز کرو' کئی پلازے تعمیر ہو سکتے ہیں۔ شاہی قلعہ کا فائیو سٹار ہوٹل بناؤ۔ شاہی مسجد میں تو عام دنوں میں بارہ نمازی بھی اکٹھے نہیں ہوتے۔ حج کیمپ ذرا اندر کر لو' ایبک اور ایاز کو تو پہلے ہی اندر کر دیا ہوا ہے۔ انارکلی کے مزار پر سرکاری بوتیک' لارنس گارڈن اور گول باغ کی زمین بڑی بَرموقع اور قیمتی ہے۔ اس کی کوئی پلاننگ کرو۔ یہ اشفاق احمد' بانو قدسیہ' احمد ندیم قسمی' احمد راہی' فریدہ' اقبال بانو' ریشماں' عابدہ پروین' معین اختر' فاطمہ بجیا' الطاف طافو' ناہید صدیقی' ضیاء محی الدین' انتظار حسین' جمیل الدین عالی' مہدی حسن' غلام علی' اسلم کمال استاد غلام حسین شگن یہاں کیا کر رہے ہیں۔ انہیں انڈیا دھکیل دو' پھر دیکھو کہ وہاں سردار جعفری' گلزار' لتا' کیفی اعظمی' ذاکر حسین کہاں بیٹھتے ہیں۔ یہ ویسے ہی وہاں چلے جائیں تو وہ لوگ فرش پر بیٹھ جاتے ہیں' زبان تک نہیں ہلاتے۔ بے قدرو' بے شعورو! قدر کرو اپنے ان اثاثوں کی۔ یہ ہستیاں دوبارہ نہیں آنے کی۔ استاد نصرت علی خان

کی طرح تم بعد میں روؤ گے' برسیاں مناؤ گے۔ ان رُوٹھوں کو اگلی زندگی میں منالو۔ یہ تمہاری آبرو اور افتخار ہیں۔

حکماء کہتے ہیں کہ انسان صرف کھانے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ اسے مناسب اور ضرورت کے مطابق کھاپی کر کچھ کام بھی کرنا چاہئے مگر کیا کیجئے ان لوگوں کو جن کا جزوِ ایمان ہے کہ بس کھاتے ہی جاؤ' اللہ مالک ہے۔ دنیا کے کام تو ہوتے ہی رہیں گے ـــــ اللہ نے کھانا سٹور اور ہضم کرنے کے لئے صرف معدہ تخلیق کیا جبکہ مثانے کا مصرف کچھ اور ہے مگر ہمارا بس چلے تو جسم کے سارے اعضاء مثلاً دل' پھیپھڑا' جگر' گردہ' معدہ' پتہ' کلیجہ باہر پھینک کر پورے وجود کو صرف معدے کے اسٹور میں تبدیل کر دیں۔ غور کریں کہ موٹر کار پٹرول یا ڈیزل بھرنے کے لئے نہیں۔ ایندھن تو حرکت کرنے کے لئے اس کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی عقل کا اندھا اس کے ریڈی ایٹر اور ڈگی میں بھی تیل ہی بھر دے تو گاڑی کا کیا حال ہو گا یا ٹنکی میں ہی اس کی گنجائش سے زیادہ بھرنے کی کوشش کریں تو وہ باہر ہی گرے گا۔ اسی طرح انسانی ٹنکی میں بھی جب گنجائش اور ضرورت سے زیادہ کھاپے ٹھونسے جاتے ہیں تو ڈکاروں کی صورت میں باہر بدبو پھیلاتے ہیں۔ ایسے جانور کے منہ سے پھر بات کی بجائے لعاب اور موٹے پیٹ کے چھان بورے کی دھانس زیادہ نکلتی ہے۔ ایسے کھاپے توڑ' بڑی بڑی توندوں' مندھی آنکھوں' بے نور چہروں والے اکثر آپ کو گلی کوچوں' تھڑوں اور ہوٹلوں پر نظر آئیں گے۔ تھانوں' ناکوں' سرکاری دفتروں' تحصیلوں' کچہریوں' پٹوار خانوں' غرض وہ محکمے ادارے جہاں "وٹامن فضل ربی" کی فراوانی ہوتی ہے وہاں یہ دریائی گھوڑے زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ اکثر شوگر' السر' اختلاج اور بدہضمی کے مریض ہوتے ہیں۔ ان کو قبر برد کرنے میں قطعی تاخیر نہیں کی جاتی۔ غسل دیتے ہی پاپ کا پھول کر شملہ پہاڑی بن جاتا ہے۔ منہ' ناک' کانوں اور دیگر دریدہ راستوں کو سفید سفید روئی سے بند کر دیا جاتا ہے تاکہ حرام کھاپے بڑبڑا کر کفن پلید نہ کر دیں۔ ان کی قبروں کی شکل حجم گولائی اونچائی ان کے پیٹ کے سائز کے مطابق ڈیزائن کی جاتی ہے۔ اوپر خوب پانی سے چھڑکائی کر کے ڈھیروں گلاب کی پتیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ ارد گرد اگربتیاں دافع بدبو کے لئے سلگا دی جاتی ہیں۔ رات جب پیٹ کی توپ دَم ہوتی ہے تو اپنی کوٹھری میں کچی نیند پڑا گورکن ہلکے سے مسکرا دیتا ہے۔

قل اور چالیسویں کے بڑے ختم اور شادی بیاہ' ولیموں' عقیقوں پر آپ نے ان کھاپے توشوں کے بڑے بڑے روح فرسا منظر دیکھے ہوں گے اور دنگل بھی۔ دنگل میں دو جیم جثیم پہلوان ایک دوجے سے بھڑتے ہیں اور اکثر دونوں میں سے ایک ہار جاتا ہے جبکہ دوسرا ہاروں سے لاد دیا جاتا ہے۔ پھر اسے کاندھوں پر اٹھا کر اکھاڑے میں لڈی اور بھنگڑا ڈالا جاتا ہے۔ کھانے کے اکھاڑے میں اکثر کھاپے پہلوان ہوتے ہیں جہاں ان کا مقابلہ روسٹ مرغوں' کبابوں اور یا پھر کڑاہی گوشت سے ہوتا ہے۔ یہ کھانا نکالنے والے چمچوں سے نہیں' ہاتھوں سے پسندیدہ بوٹیاں اٹھاتے ہیں۔ بچے تو ساتھ تھوڑا بہت شوربہ بھی لاتے ہیں جس کی ان کے ہاں مطلق کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ کھاپے پہلوان کے کھانا اٹھانے کے بعد ڈشوں میں صرف شوربے کی تلچھٹ بچتی ہے۔ دیگر معزز مہمان کسی اور میز کی جانب بڑھ جاتے ہیں۔ انہیں ٹھونستے ہوئے دیکھنا بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ خود بھی کھاتے ہوئے نظر آنا پسند نہیں کرتے۔ یہ اپنا مال لے کر لوگوں سے دُور کونوں کھدروں میں لگ جاتے ہیں تاکہ مہمانوں اور میزبانوں کو کوئی تکلیف نہ ہو اور اُدھر کھائی ہڈیاں قنات سے باہر پھینکنے میں آسانی ہو جہاں انکے ساتھی ہڈیوں کے انتظار میں دُمیں ہلا رہے ہوتے ہیں۔ سٹور بھرنے کے بعد اگر گاجر کا حلوا میسّر اور وافر ہو تو ذائقہ بدلی کے لئے دو چار پاؤ چکھ لیتے ہیں لیکن ہر صورت آلو بخارے کی چٹنی لینا نہیں بھولتے' جو ہاضمے کے لئے مفرح اور مفید ہوتی ہے۔ یہ بڑے حسابیے بھی ہوتے ہیں۔ نیوتا' سلامی یا نوٹوں کے ہار کا ٹوٹل ان کے دماغ میں ہوتا ہے۔ بس اسی کے حساب توازن سے کھاتے ہیں۔

"تم نے سلامی میں کیا دیا؟" ایک کھاپے پہلوان دوسرے سے پوچھنے لگا۔

"پانچ سو۔" وہ مرغ کی ران بھنبھوڑتے ہوئے بدقت جواب دینے لگا۔

"میں نے دو سو دیئے۔ یہ تیسرا مرغ ہے اور تم پانچ سو دے کر بیماروں کی طرح کھا رہے ہو' پہلوان! پیسے تو پورے کرو۔"

چاہے پانچ ہزار بعد میں علاج پر لگ جائیں' یہ وہاں اپنا پانچ سو ضرور پورا کریں گے۔

اپنے ممدوح پیر پگاڑہ صاحب' نوابزادہ نصراللہ خان' جتوئی صاحب بھی خورد و نوش' خرد و ہوش کے پرانے کھلاڑی ہیں۔ کھا کھلا کر خوش ہوتے ہیں۔ سیاسی میٹنگز تو محض مل بیٹھنے کا بہانہ ہوتی ہیں۔ اصل مقصد تو کھانا پینا ہوتا ہے۔ (پیٹ سے مطلب غلط نہ نکالئے

گا۔ میرا اشارہ حقے اور سگاروں کی جانب ہے) اپنے صدر لغاری صاحب بھی تیتر بٹیروں مرغابیوں کے شوقین تھے۔ اکثر شکار پارٹیوں پر مدعو ہوتے تھے۔

بے نظیر سے کھانا پینا تقریباً" چھوٹ گیا ہے۔ سنہری دنوں میں بھی وہ ڈائیٹ کھانا کھاتی تھیں۔ اِک زمانہ وہ مغرب میں رہیں۔ انگریزی زبان' انگریزی سوچ' انگریزی بودوباش' انگریزی لہجہ اور انگریزی کھانے ان کی کمزوری ہیں۔ لباس دوپٹہ' زبان اور تسبیح--- یہ ان کی سیاسی مجبوریاں ہیں۔

اپنے میاں صاحبان چونکہ اصلاً" کشمیری ہیں اس لئے کشمیری پکوان پسند کرتے ہیں۔ ہریسے' سری پائے بھی خوب کھاتے ہیں۔ سیاسی اور کاروباری مجبوریاں نہ ہوتیں تو آپ اکثر گوالمنڈی میں کسی ہریسے والے کے ہاں بنچ پہ بیٹھے نظر آتے۔

خوش خوراکی اور کھابہ اندوزنی میں بڑا فرق ہے۔ خوش خوراک لوگ بڑے نفیس الطبع ہوتے ہیں۔ خوش ذائقہ' خوش رنگ' زود ہضم اور خوش اثر غذائیں اپنی ضروریات اور وقت کے مطابق تناول کرتے ہیں۔ ان کے دسترخوانوں پہ جہاں ہمہ اقسام طعام ہوتے ہیں' وہیں ان کے ہاں لُطف و اکرام بھی ہوتا ہے۔ شائستگی' شفتگی' کھانے کھلانے کا قرینہ' لقمہ توڑنا' منہ میں رکھنا' لب بند' بے آواز و حرکت چبانا' ایک لقمے سے دوسرے لقمے کا درمیانی وقفہ--- دوسروں کی ضروریات اور پسند کا خیال رکھنا' نگاہوں کی حفاظت' پانی پینے کا سلیقہ--- مقصد یہ خوش خوراکی کا مطلب ہبڑ ہبڑ نگلنا اور ندیدوں کی مانند ٹھونسنا نہیں۔ یہ بھی نہیں کہ جو سامنے دھرا پڑا ہو سب کو کھانا فرض ہے۔ خوش خوراکی تو پسندیدہ خاصہ' سلیقے اور قرینے تحمل' مزہ لے لے کر کھانے کھلانے کا نام ہے۔ کھانا ایک فن ہے۔ کسی کے لقمہ توڑتے ہی اس کا حسب اور علم و ذوق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی کا اصل جاننا ہو تو اس کی ساتھ دسترخوان پہ بیٹھ جاؤ۔ سفر پہ ساتھ نکل جاؤ' عالم غیظ و سرمستی میں دیکھو' لین دین کر لو--- دودھ کا دودھ' پانی کا پانی' سب کچھ صاف دکھائی دے گا۔

بابائے اردو' ذہین شاہ تاجی'' رئیس امروہی' ذوالفقار علی شاہ بخاری ریڈیو والے' جوش ملیح آبادی' احسان دانش' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم' استاد اللہ بخش' فیروز نظامی' شورش کاشمیری' الیاس رشیدی نگار کراچی والے' سبطین فضلی' فضل کریم فضلی' تنویر نقوی'

ریاض شاہد' سنتوش کمار اور ان کے تمام بھائی' اور بھی بہت سے' یہ سارے بزرگ بڑے خوش خوراک اور صاحبِ دسترخوان تھے۔ اچھے اچھے کھانے کھلا کر خوش ہوتے تھے۔ جب بھی پہنچو' احباب جمع ہوتے۔ پکوان پک رہے ہیں' خوش گپیاں اور علم و ادب کے دھارے جاری ہیں۔ ہمیں ان بزرگوں کے قدموں میں بیٹھنے اور شاملِ طعام ہونے کے مواقع نصیب ہوئے۔ ہمیں ایک بزرگ کی بات یاد ہے کہ جو شخص کھانے اور کھلانے کا ہنر' سلیقہ اور شعور و شوق نہیں رکھتا وہ جاہلِ محض ہے چاہے اس نے سر پہ ڈھیروں کتابوں' ڈگریوں کا بوجھ لاد رکھا ہو۔

ہمارے ایک قریبی جاننے والے اصرار کر کے ہمیں ایک لڑکا دکھانے لے گئے۔ یہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکٹر تھا' ہمارے جاننے والے کی دُخترِ نیک اختر کے سلسلے میں ان دو خاندانوں کے درمیان سلسلۂ جُنبانی چل رہا تھا۔ آخری فیصلے کی بات ہم پہ ڈالی گئی کہ لڑکے کو دیکھو بھالو' اس کا اخلاق و طریق' عادت فطرت چیک کر کے فیصلہ کرو--- گئے' ملے' بہت سی ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ کھانے پہ بیٹھے' ڈاکٹر صاحب نے بائیں ہاتھ میں روٹی پکڑ لی' کتر کتر جاہلوں کی طرح کھانے لگے۔ ہم سے نہ رہا گیا اپنی علامت سے مجبور---!

"میاں! روٹی پکڑ رکھی ہے' بھاگی جا رہی ہے کیا؟--- دسترخوان پہ رکھو' یہاں سے لقمہ لو اور کھاؤ۔ اللہ رازق ہے۔" اس نے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے روٹی رکھ دی۔ "بیٹے! مِل جُل کر کھانے میں ہی تو برکت ہوتی ہے اور اللہ کی برکت بھی وہیں اُترتی ہے جہاں کھانا ایک جگہ پڑا ہو۔ تم اپنی روٹی پکڑو' میں اپنی اٹھا لوں۔ سب کھانے والے اپنی اپنی--- دسترخوان خالی' برکت کہاں اترے گی---؟ چھوٹا لقمہ' خوب چبا کر کھاؤ اور ہر لقمے پر الحمدللہ کہو۔"

خجل خجل سا ایک آدھ لقمہ لیا۔ میری بات شاید اسے ناگوار گزری تھی یا میرے بتائے ہوئے انداز میں وہ کھا ہی نہیں سکتا تھا۔ روٹی چھوڑ کر بریانی کو پکڑ لیا۔ پلیٹ میں شملہ پہاڑی جمائی' اوپر قورمہ ڈالا' پھر رائتے کا چھڑکاؤ کیا' سلاد کے پھول پتے سجائے--- میں کانی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی بیہودگی اور بے ذوقی دیکھ کر مجھ سے برداشت نہ ہوا' کھانے سے ہاتھ کھینچا اور اُٹھ گیا--- ہاتھ صاف کئے' باہر لان میں نکل آیا۔ پیچھے پیچھے میری جاننے والے بھی لپکے آئے' لڑکے کے والد اور بھائی بھی' ناسازی طبع کا بہانہ بنا کر ہم

لوگ نکل آئے۔

"یہ لڑکا انسانوں کا نہیں، ڈنگر ڈاکٹر ہے۔ اس لئے بہتر ہے تم اپنی لڑکی کسی مریض سے بیاہ دو مگر وہ ہو انسان! جسے کم از کم بھلے لوگوں کی طرح کھانے کا تو شعور ہو۔ اس پڑھے لکھے جاہل کو تو منہ میں لقمہ ڈالنا نہیں آتا، منہ سے مکالمہ نکالنا کیا آئے گا؟"

آج کل لڑکے کہاں ملتے ہیں، پھر پڑھے لکھے ڈاکٹر--- بڑی مشکلوں سے اِدھر بات بڑھی تھی، جو میری وجہ سے گڑبڑ ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میری بات سُن کر وہ خاموش ہو گئے، صاف ظاہر تھا انہیں یہ میری نکتہ چینی کچھ پسند نہ آئی تھی۔ مَیں بدمغز ا ایسی باتوں کو کہاں خاطر میں لاتا ہوں--- وہ اپنے گھر، مَیں اپنی جھونپڑی میں چلا آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لڑکے والوں نے اعتراض کیا کہ آپ کس سنکی بڈھے کو لے آئے تھے۔ مَیں پڑھا لکھا ڈاکٹر ہوں، صرف آپ کی وجہ سے خاموش رہا، کوئی کیسے کھاتا ہی، کیسے پیتا ہے یہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ بڈھا پاگل دکھائی پڑا، اس کے تو لباس اور حلئے سے ہی صاف ظاہر تھا۔ کسی کے گھر کوئی مہمان آتا ہے تو کم از کم سلیقے کے کپڑے تو پہن لیتا ہے۔ مجھے تو وہ کوئی پرانا خانساماں لگتا ہے--- میرے جاننے والے نے بچی کی مجبوری کی وجہ سے اس سے سوفیصد اتفاق کرتے ہوئے معذرت چاہی۔ شادی ہو گئی، مجھے دعوت دینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

شادی کے ٹھیک تین ماہ بعد وہی شخص میرے دروازے پہ تھا۔ پریشان حال، آنکھوں میں آنسو--- آتے ہی پاؤں پڑ گیا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا۔

"باباجی، مَیں آپ کا گنہگار ہوں--- مجھ سے غلطی ہوئی، مجھے معاف کر دیں۔"

مَیں نے اسے تسلی دیتے ہوئے بٹھایا، بچی کے متعلق دریافت کیا۔

"کیا بتاؤں، میں کیسی مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ میری بچی برباد ہو گئی ہے، دو مہینوں سے میرے گھر پڑی ہوئی ہے۔ وہ شخص بڑا بیہودہ اور بدمعاش ہے، لالچی اور حرصی ٹٹو--- کہتا ہے، باپ سے پانچ لاکھ لا کر دو، مَیں باہر مزید تعلیم کے لئے جانا چاہتا ہوں--- بتایئے، ہم اتنی خطیر رقم کہاں سے دیں؟ زیور چھین لئے۔ ہماری دی ہوئی موٹر میں سٹاف لیڈی ڈاکٹرز اور نرسوں کو بٹھا کر گلچھرے اڑا رہا ہے۔ آپ کا اس کے بارے میں تجزیہ سوفیصد درست تھا۔"

نواز شریف کا اللہ بھلا کرے جو اس نے غیر ضروری کھانوں پہ پابندی عائد کر دی۔ اس سے کم از کم غریبوں کو یہ امید تو بندھی کہ اب شاید یہ بھی اپنی بچیوں کے ہاتھ پیلے کر سکیں۔ شادی ہال والوں اور پروفیشنل کھابہ اندوزوں کو بھی تکلیف ضرور پہنچی مگر بہتوں کا بھلا ہوا، ہالوں والوں نے خوب کمایا لوٹا، انہوں نے لگایا ہوا کمالیا ہوا ہے۔ اصل زک تو کھابے والوں کو پہنچی۔ بتایئے، سموسوں، نمکو اور سیون اَپ کی بوتل سے ان کا کیا بنتا ہے لیکن یہ بھی بہتر ہی ہوا۔ ڈائننگ پیریڈ ہی سہی، قیلولہ ہی سمجھیں۔ ہسپتال کا بوجھ کم ہوا، میانی صاحب کے گورکنوں کو قدرے آرام کا موقع ملا، دانتوں آنتوں والوں کا رش کم ہوا۔ سیون اَپ والوں، بھانڈوں، کھسروں اور میوزک گروپس، لائیٹنگ والے، باورچی، ساؤنڈ سسٹم، پولٹری والوں کو کچھ سکون کرنے کا وقت ملا۔ کارپوریشن کی گراؤنڈز میں تازہ گھاس اگنے لگی، پھول کھلنے لگے۔ بچے کرکٹ کھیلنے لگے۔ واپڈا کی تاروں پہ بوجھ کم ہوا۔

مَیں بڑے لمبے تجزیئے کے بعد اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ اگر ہمارے اندر رزق حلال کمانے، اللہ کی نعمتوں کو کھانے برتنے اور ان کی عزت قدر کرنے کا شعور پیدا ہو جائے تو ہمارے سارے قرضے اتر سکتے ہیں، مسائل حل ہو سکتے ہیں اور کاروبار میں بے برکتی بھی ختم ہو سکتی ہے۔

روٹی کو دسترخوان پہ رکھ کر کھاؤ، ہاتھ میں مَت پکڑو۔ کیونکہ یہ کسی اور کا بھی نصیب یا حصہ ہو سکتی ہے۔ کھانے میں اعتدال سے کام لو۔ ہاتھ روک کر چند لقمے کسی بھوکے کو کھلا دو--- چند دانے کبوتروں، چڑیوں، چیونٹیوں، مچھلیوں کو بھی ڈال دو۔ ہر لقمہ پہ الحمدللہ کہو--- پھر دیکھو روزی رزق، خوش خوشحالی میں کیسی برکت پڑتی ہے۔

میرے بارے میں یار لوگ بے پَر کی اڑاتے رہتے ہیں کہ باباجی کے پاس ہمزاد ہیں، جنّ قابو کر رکھے ہیں۔ مصلے کے نیچے سے روپے نکلتے ہیں۔ ایک آدھ تو یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ مَیں کیمیاگر ہوں، سونا بنانا جانتا ہوں۔ کچھ بدخواہ مشہور کرتے ہیں کہ میں کوئی ناجائز دھندا کرتا ہوں۔ میں سب کی سُن سُن کر مسکرا دیتا ہوں۔ کیا جواب دوں، کچھ جواب دیتا بھی ہوں تو ان کی موٹی عقل میں نہیں آتا۔ میری کتابیں، تحریریں پڑھ کر اکثر قارئین مجھے کوئی پیر، اللہ والا بزرگ سمجھ کر مجھ سے رابطہ کرتے ہیں، خط لکھتے ہیں۔ مختلف مسائل اور پریشانیوں کے حوالوں سے میری راہنمائی چاہتے ہیں۔ میں انہیں کیا کہوں، کیا بتاؤں کہ

میں کیا ہوں---؟

میں کوئی پیر، بزرگ یا نیک آدمی نہیں ہوں، بالکل سیدھا سادا عام سا دنیادار انسان! نہ میرے پاس کوئی تعلیم یا ڈگری ہے، نہ کوئی قابلِ تحریر حسب نسب۔ میرے خاندان میں نہ تو کوئی قابلِ ذکر بڑا آدمی پیدا ہوا، نہ آگے کوئی نظر آتا ہے۔ ہاں، میرے شہر میں میرے مُرشد حکیم الامت، دانائے راز علامہ اقبالؒ کے علاوہ بھی بہت سے قابلِ ذکر انسان پیدا ہوئے۔ بس، اسی ایک شعر کا فیضان ہے ۔

مقامِ گفتگو کیا ہے، اگر میں کیمیاگر ہوں
یہی سوزِ نفس ہے، اور میری کیمیا کیا ہے

✿✿✿

میرے ایسے سٹھیائے گنٹھیائے، بے مصرف قریب القبر، دھرتی کا بوجھ، شوگر زدہ بڈھے--- اور نالائق، لاڈلی، بے روزگار اولاد اکثر گھر والوں کی "بیگار" ڈسپوزل پہ ہوتے ہیں۔ چھوٹے موٹے ادھر ادھر کے فالتو اوپر کے کام ان ہی سے لئے جاتے ہیں۔ گھر والوں کے اسی قسم کے ایک حکم کی تعمیل کے لئے میں پچھلے دنوں آٹا لینے بسم اللہ چوک کے ایک سٹور پہ پہنچا۔ جان پہچان والے دوکاندار نے علیک سلیک کے بعد گودام کے اندر ملازم کو آواز دی۔

"اوئے تھیلے خالوجی کے لئے "فین" آٹے کا تھیلا نکال کر لاؤ---"

پاکستانی گوشت پوست کے "تھیلے" نے امریکن گندم کے فائن آٹے کا تھیلا لا کر میرے سامنے دھر دیا، کہنے کی ضرورت نہیں کہ لڑکے کا نام طفیل ہی ہوگا۔ ماشاء اللہ، ہم لوگ کسی کا بھی اچھا بھلا نام بگاڑنے، بدلنے، دھرنے کے معاملے میں کافی حد تک خود کفیل ہیں۔ کفیل کو "فیلا" جمیل کو "جیلا" اور شوکت کو "شوکی" کہہ دینا ہمارا روزمرہ کا معمول ہی تو ہے۔ سوال اگر پیدا کرنا چاہیں تو یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اچھے خاصے خوبصورت ناموں کو مضحکہ خیز حد تک کیوں بگاڑتے ہیں؟ اور جواب اگر تلاش کرنا چاہیں تو شاید یہ ہو سکتا ہے کہ ہم جاہل، عجلت اور کہولت پسند ہیں، آدمیت کے احترام سے روگردانی برتتے ہیں، بے تکلفی اور احمقانہ قسم کے پیار و پچکار کا بھونڈے طریقے سے اظہار کرتے ہیں لیکن کچھ بھی ہو، ایسے نہیں ہونا چاہئے بلکہ بالکل ہی نہیں ہونا چاہئے۔ موضوع کی تشنہ لبی کو قدرے کم کرتے ہوئے کچھ اور مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔ قیوم "قوما" ہے تو مزمل "مجو" ہے۔ اسحاق

"ساقا" اور رفیق "فیما" ہے۔ غلام محمد کو ہم گما کہتے ہوئے ذرا سا حجاب بھی محسوس نہیں کرتے۔ گھر والے اگر یعقوب کو "قوبا" اور اقبال کو "بالا" کہنے پہ خوش اور مصر ہوں تو گلی' محلے اور تھانے کچہری والوں کی زبان کون روک سکتا ہے اور اسی طرح اگر بلقیس بے چاری محض بلقیس ہی رہتی' بلو نہ بنتی تو "کِنے کِنے جانا اے بلو دے گھر" والا بیہودہ گانا سننے کو نہ ملتا۔ گلی گلی لڑائیاں' مار کٹائیاں' سر پھٹول اور چند ایک قتل ہرگز نہ ہوتے۔ بدقسمتی سے ہمارا مزاج ہی ایسا بن گیا ہے کہ ہم وہ ہر کام اور حرکت و حماقت کر کے خوشی بلکہ فخر محسوس کرتے ہیں جس سے ہماری جہالت اور اوقات روز روشن کی مانند عیاں ہوتی ہو اور ہماری ذہنی' فکری جکڑن و جمود کی گرہیں بھی کھلتی ہوں--- نام ہی پہ کیا موقوف' ہم تو دین و دنیا کے ہر معاملے میں شارٹ کٹ اور ڈنڈی مارنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ مسئلہ کاروبار کا ہو یا تعلیم و ملازمت حاصل کرنے کا ہو۔ اسمبلی' سینما' ریل' جہاز کا ٹکٹ یا عدالت کچہری تھانہ' بنک یا کوئی سرکاری دفتر' ہمیں ہر جگہ کوئی نہ کوئی عقبی دروازہ یا کوئی اندر کا آدمی چاہئے ہوتا ہے۔ ہم دوسروں کا استحصال کر کے خوش ہوتے ہیں۔ قرینے' طریقے اور قاعدے قانون کی پاسداری ہماری شان اور اسٹیٹس کے خلاف ہے۔ سیدھا راستہ اختیار کرنا شاید ہماری سرشت ہی میں نہیں۔ کوئی اَدھ کھلی کھڑکی' کوئی آسان راہ' نیم وا روشن دان' کھدی اَدھ کھدی سُرنگ' چور راستہ یا پھر کوئی الہ دین کا چراغ' سلیمانی ٹوپی' طلسمی انگوٹھی' کوئی نجومی' مست ملنگ یا کوئی ڈباپیر جو چشم زدن میں ہماری کایا پلٹ کر دے۔ ٹھیکہ' ملازمت' ویزا' لاٹری' کمیٹی یا انعامی بونڈوں کے نمبروں کی ہی نشاندہی کر دے۔ میرٹ' معیار' محنت' مشقت اور مقدر پہ ہمارا اعتماد اور یقین ہی ختم ہو گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم پرَلے درجے کے ڈنڈی مار' سہل پسند' عیش کوش اور ہڈحرام ہو گئے ہیں۔ زبان و بیان کے معاملہ میں بھی ہم نے ایسا ہی ظالمانہ رویہ اپنایا ہوا ہے کہ زبان' ادب و ابلاغ وغیرہ ہم سے خود ہی منہ چھپائے پھرتے ہیں--- انڈیا کے چینل دیکھتے ہوئے ہم ان کے لب و لہجے کا تمسخر اڑاتے ہیں کہ نہ تو وہ اردو صحیح بولتے ہیں' نہ ہی انہیں پنجابی آتی ہے۔ چھاج کیا چھلنی کو طعنہ دے ہم تو خود ہی جنم جنم کے بگڑے ہوئے ہیں' روزمرہ کی گفتگو میں ہم اکثر الفاظ کے آدھے حروف بغیر ڈکار لئے کھا جاتے ہیں۔ کہیں "الف" ندارد ہے تو کہیں "ب" خالی ہے۔ ح' ہ' ق' ع' ز' ذ' ژ--- ایسے حروف' جن کی ادائیگی سے حلق پہ زور پڑے یا ان

کی نشست و برخاست کے معاملے میں ہلکی سی احتیاط کی ضرورت ہو' ہم انہیں سرے سے چبا جاتے ہیں یا انہیں اس حد تک بگاڑ دیتے ہیں کہ وہ حروف' حرفِ ندامت بن کر رہ جاتے ہیں۔

ایک روز نوید میاں کے ہاں دفتر میں بیٹھے اسی المیے پہ بات چیت چل رہی تھی' مَیں کہہ رہا تھا۔

"یار! نام ایسے رکھنے چاہئیں جنہیں بگاڑا نہ جا سکے۔"

وہ کمپیوٹر پر نظریں جمائے ہوئے ترت بولا۔ "باباجی! میری معلومات کے مطابق آج تک کوئی نام ایسا نہیں رکھا گیا جو بگاڑا نہ جا سکتا ہو۔ لوگ تو نعوذباللہ پاک اور مقدّس ناموں کو بھی اپنی جہالت اور غفلت کی وجہ سے بگاڑ دیتے ہیں۔ خاکم بدہن' محمد کو "ممدا" حسین کو "حسینا" حسن کو "حسنا" اور عبداللہ کو "دُولا" کہنا عام مثالیں ہیں۔ ہم تو مولوی کو بھی "مولبی" کہتے ہیں۔"

وہ اپنی دھن میں کہے جا رہا تھا۔ مَیں ایسے متبرک' پاکیزہ ناموں کا یہ حشر سن کر پریشان سا ہو گیا--- میرے سامنے اخبار دھرا تھا' ریما مسکرا رہی تھی۔ موضوع کا ٹریک بدلنے کی نیّت سے میں یونہی نوید سے پوچھ بیٹھا۔

"یار' یہ اپنی ریما--- میرا خیال ہے یہ نام بگاڑا نہیں جا سکتا۔"

وہ کمپیوٹر سے نظریں ہٹا کر ریما کی تصویر پہ جما کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "بزرگوارم! وہ خود اتنی بگڑی ہوئی ہے کہ اسے اپنے نام کو بگاڑنے کی چنداں ضرورت نہیں--- ویسے یار لوگ اسے "وہ" کہتے ہیں۔"

میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہنے لگا۔ "وہ کیا---؟"

وہ شرارتی انداز میں مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "اچھا' پہلے یہ فرمایئے کہ پنجابی میں غریب کسے کہتے ہیں؟"

اِس کے ایسے احمقانہ سے سوال پہ مَیں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

"میں تمہارے اس الَل ٹپ سوال کا جواب شاید یہی دے سکتا ہوں کہ غریب تو غریب ہی ہوتا ہے چاہے وہ پنجابی میں ہو یا اردو میں--- الٹا پڑھو یا سیدھا' بات غربت ہی کی رہے گی۔"

"بالکل درست--- آپ کو پنجابی ہونے کے ناتے یہ بھی پتا ہوگا کہ "غریب" ایک صابر شاکر سے جانور کی زوجہ محترمہ کو بھی کہتے ہیں۔"

مَیں داڑھی کھجلاتے ہوئے دَھاڑا۔ "ابے گدھے کی دُم! میں فلم ایکٹریس ریما کی بات کر رہا ہوں اور تم مجھے جانوروں کی اوقات اور ان کی بیویاں سنا رہے ہو۔"

وہ مجھے شانت کرنے کی کوشش میں کہنے لگا۔ "باباجی! ریما کو اُلٹا پڑھیں تو امیر بنتا ہے اور امیر کبھی کبھی بینک کرپٹ ہو کر غریب بھی ہو جاتا ہے اور غریب کا مطلب وہی پنجابی والا ہوتا ہے---"

مجھے اس کی لفظی الٹ پلٹ سے وہ مخبوط الحواس فلاسفر یاد آگیا جس کی بدحواسیوں' نکتہ آفرینیوں' ہمہ وقت مصروفیات اور غیرذمہ داریوں سے عزیز و اقارب کے علاوہ خاص طور پہ اس کی بیوی بھی بہت عاجز تھی۔ ایک بار جب وہ کئی دن اپنے مطالعہ کے کمرے میں بند رہنے کے بعد بھوکا پیاسا' نڈھال سا باہر نکلا تو بیوی سے دریافت کیا--- بھلی مانس' کیا پکایا ہے؟ زوروں سے بھوک لگی ہوئی ہے--- وہ جلی بھنی زندگی سے بیزار بیٹھی تھی' تنک کر جواب دیا کہ خاک پکائی ہے۔ بیٹھو' کھالو--- وہ خوش خوش ہاتھ منہ دھو' تیار ہو کر دسترخوان پہ آنکا' بیوی سے کہنے لگا۔

"اچھا کیا' تم نے آج گوشت پکالیا۔ میرا دل بھی کئی دنوں سے گوشت چکھنے کو چاہ رہا تھا"۔

بیوی یہ سُن کر بہت حیران ہوئی کہ اسے کیسے معلوم ہوا' مَیں نے آج گوشت پکایا ہے؟--- اس نے پوچھ ہی لیا۔

"تمہیں میرے گوشت پکانے کا کیونکر معلوم ہوا---؟"

وہ بڑی تسلی سے بولا۔ "تم نے جو "خاک پکائی ہے" کہا ہے نا! یہی تو گوشت ہے۔"

بیوی جھنجلا کر دہاڑی۔ "خاک میں گوشت کہاں سے نکل آیا' میرے فلاسفر سرتاج---؟"

وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "بھلی لوگ! خاک کو الٹا پڑھو تو کاخ بنتا ہے۔ کاخ کو فارسی سے باہر نکال کر عربی میں داخل کر دیں تو یہ محل بن جاتا ہے۔ محل کو کسی طرح الٹا کر پڑھیں تو اندر سے لحم نکل آتا ہے۔ لحم کو ایک بار پھر فارسی میں جھٹکا دیں تو گوشت باہر

نکل کر تمہاری ہنڈیا میں پک جاتا ہے--- جلدی کرو' سخت بھوک لگی ہے۔"

اللہ معافی دے' یہ پنجابی اور فلاسفر بڑی دُور کی کوڑی لاتے ہیں' کسی کو نہیں بخشتے--- ریما کے ذکر سے یاد آیا کہ پچھلے دنوں اس کا ایک بیان اخبار میں پڑھا تھا۔ فرماتی ہیں کہ ہوائی سفروں سے عاجز آ چکی ہوں' میری آدھی سے زیادہ عمر اسی ہوا پیمائی میں بسر ہو چکی ہے۔ اب تو ایئرپورٹ والے بھی کہنے لگے ہیں کہ ریماجی! آپ ایک چھوٹا سا ہوائی اڈا اپنی کوٹھی پہ ہی بنوالیں--- یہ خبر پڑھ کر میری تو ہنسی کھسک گئی--- ایئرپورٹ والے کیسے بھولے بادشاہ ہیں ورنہ وہ لفظ "اڈے" اور "کوٹھی یا کوٹھے" کا استعمال ایسے بھول پنے سے نہ کرتے اور ریمابی بی اگر اپنے پہلے "اڈے" پہ ہی رہتیں اور اسی "اڈے" کو ہوائی اڈے میں تبدیل کروالیتیں تو سینکڑوں ہزاروں مسافروں کے علاوہ مجھ ایسے ناتواں بڈھے جہاں گرد کو بھی سہولت رہتی۔ مَیں بھی زمین سے زیادہ ہواؤں کے دوش پہ دَھرا رہتا ہوں۔ چند گھر سامنے ہوائی اڈا ہوتا "ادھر نکلے' ادھر ڈوبے" کی آسانی رہتی۔ افسوس کہ ریمابی بی میری ہمسائیگی سے نکل کر ماڈل ٹاؤن' گلبرگ یا کسی اور "رنگ برنگے" ایریئے کی جانب مراجعت کر چکی ہے اور یہاں ویرانیوں کی جھاڑو پھیر گئی ہے۔ اس کی کوٹھی کے سامنے والی مسجد میں آتے جاتے کبھی کبھی ماں بیٹیوں کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی اور اب جب سے چڑیاں قمریاں اُڑ گئیں' کھیت کا کھیت ہی ویران پڑا ہے۔ مسجد میں وہ حاضری' نہ سامنے کی دوکانوں پہ وہ بیٹھکیں۔ ریما کی کوٹھی کا پتا پوچھنے والے پینڈو نوجوان بھی نظر نہیں آتے' نہ ہی اب پولیس کی گاڑیاں اور اخباروں والے دکھائی دیتے ہیں۔ سڑک پہ نہ وہ چہل پہل' بہانے بہانے سامنے سے گزرنے والے فارغ البال و عیال بوڑھے' گھروں سے بھاگے ہوئے ریما کے عاشق' ریڑھیوں' چھابڑیوں والے ۔ "جانے یہ کاروانِ شوق کہاں جاتا رہا"--- اب ریما چوک (سابقہ) میں جیسے خزاں جم کر رہ گئی ہے۔ ویرانیاں' اداسیاں چپک سی گئی ہیں ۔ "تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے"--- کاش! ریمابی بی یہاں سے مراجعت کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پیشتر کسی سیانے پروفیشنل سے مشورہ کر لیتی۔ تاہم ایئرپورٹ کے عملے نے جو مشورہ دیا تھا' وہ کچھ زیادہ غلط بھی نہیں تھا۔ ریما محض مذاق یا دل لگی جان کر ہلکے سے مسکرا دی ہوں گی لیکن اگر ذرا سی سنجیدگی سے غور کر لیتیں تو اس میں بڑے فائدے تھے۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوتا کہ انہیں خود اتنی دُور

ایئرپورٹ جانے سے نجات مل جاتی' یہاں قرب و جوار کے مسافروں کو بھی سہولت رہتی اور اس طرح اپنے موجودہ ننھے سے لاہور ایئرپورٹ پہ دباؤ کم ہو جاتا۔ اقبال تلوّن کی "پرائیویٹ ایئرلائنز" وغیرہ کی حوصلہ افزائی بھی برقرار رہتی۔ خاص طور پہ اس کے لئے تو جہازوں کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا' لاہور میں ان کی کمی نہیں۔ مقامی طور پہ ایک دو نہیں' ہزاروں جہاز ادھر ادھر بیکار "گراؤنڈ" ہوئے پڑے ہیں۔ لاہور ہوٹل' لکشمی چوک' چوبرجی' ریلوے اسٹیشن' شاہی قلعہ' شاہی محلّہ' شاہ جمال' میاں میر' میانی صاحب اور بھی کئی کچی پکی ایئرپٹیاں ہیں جہاں انہیں بیکار پڑے پڑے زنگ کھا رہا ہے۔ بس ذرا سی دیکھ بھال سے لاجواب پرواز کے قابل ہو سکتے ہیں۔ ان کے تیل ایندھن کے لئے بھی کسی غیر کا محتاج ہونا نہ پڑتا۔ افغانستان' پشاور سے کراچی گوادر تک دن رات ترسیل جاری رہتی ہے۔ مقامی طور پہ جہاں سے چاہو' جتنا چاہو' حاصل کر لو۔ لمبے چوڑے رن وے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ قدموں پہ ہی بیٹھے' کھڑے پرواز پکڑ لیتے ہیں۔ گڑگڑ نہ کوئی شور شرابا۔ ایندھن کے حصول میں اگر کبھی وقتی طور پہ تعطل پیدا ہو بھی جائے تو ان لاجواب باکمال جہازوں کی پرواز پہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ کھانسی کے شربت' اسپرٹ' پٹرول اور مٹی کے تیل سے بھی ہموار پرواز کے لئے توانائی حاصل کر لیتے ہیں۔ اب پاکستانی جہاز ساز سائنسدانوں نے لکڑی جوڑنے والے سفید گلو' صمد اور پنکچر لگانے والے لوشن سے بھی کامیاب پرواز کے تجربے کئے ہیں' بلکہ اس طریقہ پرواز کو بے حد سستا' محفوظ اور آسان قرار دیا ہے۔ سوئی گیس اور سلنڈروں والی گیس سے بھی استفادہ کرنے کے لئے تجربات جاری ہیں۔ گو ان تجربات سے ابھی تک کوئی امّید افزا کامیابی حاصل نہیں ہو سکی' تجربات کے دوران کئی قیمتی جہاز پرواز پکڑتے ہی انجن جام ہو کر کریش ہو چکے ہیں۔ بلیک باکس کی رپورٹ کے مطابق سینے میں پسٹن پھنس جانے سے یہ حادثات رونما ہوئے ہیں--- گوبر اور دیگر فضلات سے توانائی حاصل کرنے کے کامیاب تجربات بھی ہو چکے ہیں بلکہ کئی ایک ممالک بشمول پاکستان' اس توانائی سے خاطرخواہ مستفید بھی ہو رہے ہیں' بالکل انہی بنیادوں پہ جہازران کیمیا دان استعمال شدہ گندے شاپر بیگ' نائیلون پلاسٹک کی پھٹی پرانی جوتیوں' سلیپروں کو جلا کر ان کے دھویں سے توانائی کی بُو سونگھ رہے ہیں۔ لاہور کے کئے ایک پرانے جہازرانوں نے موٹرگاڑیوں' ویگنوں کے انجنوں کے پرانے "تیل بدلی" کے دُھوئیں

اور اسے پینے سے بھی پرواز کے لئے توانائی حاصل کرنے کا انکشاف کیا ہے۔ ان کے سپیئرپارٹس کے لئے بھی کسی غیر کا دست نگر نہیں ہونا پڑے گا جیسے ہم پہلے ہی ایف 16 کے پرزوں کے پھڈے میں پڑے ہوئے تھے۔ نہ سیکورٹی کا جھنجھٹ' نہ عملے کی کھٹ پٹ۔ نام بھی آسان فہم P.J.A یعنی "پاکستان جہاج ایئرلائن۔"

کبھی پی آئی اے کا نعرہ "باکمال لوگ' لاجواب پرواز" ہوا کرتا تھا۔ باکمال لوگ تو شاید اب بھی ہوں مگر لاجواب پرواز اب مشکوک لگتی ہے۔ اچھا ہوا کہ پی آئی اے نے یہ دعویٰ واپس لے لیا۔ پانچ' چھ گھنٹے کی تاخیر معمول بن چکی ہے۔ سامان کراچی' مسافر اسلام آباد۔ کنفرم او کے سیٹ بھی نہیں ملتی۔ چیک اِن کے بعد بھی مسافروں کو واپس کر دیا جاتا ہے۔ عملے کی بدتمیزی' بدکلامی اور پیشہ ورانہ ذمہ داریوں سے رُوگردانی' اخبارات کی سرخیاں بن گئیں۔ ایئرہوسٹس کو دیکھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے پی آئی اے نے بیٹیوں کو گھر بھیج کر ان کی ماؤں' خلاؤں اور ممانیوں کو ایئرہوسٹس لگا دیا ہے اور مردانہ عملہ' ادھیڑ عمرے مردم بیزار' چہروں پہ سرد مہری' آنکھوں سے خشونت' جیسے کے جی بی کے ایجنٹ بلوا کر جہاز پہ چڑھا دیئے گئے ہوں۔ البتہ یہ آپ کو جہاز چھوڑتے وقت' اللہ حافظ ضرور کہیں گے۔ اس سے کہیں برا حال پرائیویٹ ایئرلائنز کا ہے اور اگر یہی سب کچھ لمبے چوڑے کرائے اور حد سے بڑھے ہوئے مختلف ٹیکس' ایئرپورٹ چارجز دے کر ہی حاصل کرنا ہے تو یہ اپنے پاکستانی "جہاج" کیا برُے ہیں۔ تیس چالیس روپے کی پڑیا تھما کر جہاں جی چاہے' انکے ساتھ پرواز کر لیں--- پاکستان ایئرفورس نے اپنے چند ناکارہ جہاز' ایل ڈی اے کو بطور ہدیہ صدقہ یا خیرات دیئے ہوئے ہیں بالکل جیسے دوسرے ممالک' پاکستان کو اپنا رہند کھوند دے دیتے ہیں کہ چلو' اسی بہانے سپیئرپارٹ بکیں گے۔ دیکھا دیکھی پی آئی اے نے بھی اپنا ایک "ملبہ" چوبرجی میں پھینکا ہوا ہے۔ زمینی پاکستانی "جہاج" اپنے اس آسمانی جہاز کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے کھلے پروں کی طرح اپنے بازو پھیلا کر' پاس گراؤنڈ میں پرواز کرنے کی پریکٹس کرتے ہوئے اکثر دکھائی پڑتے ہیں۔

ایک دوپہر مَیں چوبرجی' خان بابا ریسٹورنٹ میں کھانا کھا کر باہر کھڑا خلال کر رہا تھا۔ سامنے پی آئی اے کے جہاز کے پاس کچھ لوگ کھڑے نظر آئے' پولیس کی دو گاڑیاں بھی موجود تھیں۔ مَیں بھی ٹانگیں کھولنے کی غرض سے ٹہلتا ہوا اِدھر آنکلا۔ دو دیہاتی بوڑھے'

تین عورتیں' دو ٹین کے صندوق' کپڑوں کا ایک بڑا گٹھر جس میں لحاف بھی نظر آ رہا تھا۔ ایک عدد دیسی حقہ جس کی چلم ہنوز گرم تھی' بوڑھے روتے ہوئے پولیس کو اپنی پریشانی بتا رہے تھے' بار بار ہاتھ میں پکڑی ہوئی پی آئی اے کی ٹکٹیں لہرا کر جہاز میں بیٹھنے کی ضد کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے عمرے کے ٹکٹ خریدے ہیں' ویزے لگانے والا بابو انہیں یہاں گیٹ پہ چھوڑ کر سگریٹ لینے گیا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ یہ جہاز ہے جو مکے شریف جائے گا' ابھی وقت نہیں ہوا لہٰذا ہم یہاں کھڑے گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ معلوم ہوا' کوئی نوسرباز ان سے لاکھ سوا لاکھ کا ہاتھ کر گیا ہے۔ ٹکٹیں واقعی خریدی گئی تھیں جو فیصل آباد کی تھیں۔

چند فائٹر جہاز جو لاہور میں مختلف جگہوں پر کھڑے اپنی بنانے والی کمپنیوں کی جان کو رو رہے ہیں اگر اللہ تعالیٰ انہیں کہیں زبان دے دے تو وہ بتائیں کہ ان کے ساتھ کیا کیا زیادتیاں ہو رہی ہیں۔ پچھلے دنوں اخبار میں بھی خبر چھپی تھی کہ زمینی "جہاجوں" نے ان سابقہ آسمانی جہازوں سے سلسلہ جُنبانی شروع کر رکھا ہے۔ ان کی قابلِ دست درازی اشیاء مثلاً لائٹس' ٹائر' گیئر اور ہر وہ پرزہ جو کُھل سکتا ہو' آہستہ آہستہ علیحدہ ہو کر بلال گنج پہنچ رہا ہے۔ اخبار والے بھی جَھلے ہیں۔ "جہاج" جہازوں کو نہ چھیڑیں گے تو کیا تمہاری پریس مشینوں کو گُدگُدی کریں گے؟ پاکستانی "تھوڑ دلوں" کا تو یہ عالم ہے کہ زنجیر تالے سے بندھا ہوا گٹر کا آہنی ڈھکنا اگر کوئی جہاج مرمت کی غرض سے لے گیا ہو تو یہ دوسرا اس کی جگہ پہ لا کر نہیں رکھتے۔ بچے' بڈھے کی ٹانگ تڑوالیں گے مگر گٹر ننگا ہی رہنے دیں گے۔ شہریوں سے تو سرکاری محکمے اور نیم سرکاری ادارے ہی بھلے جو ان کے ساتھ بھرپور تعاون کرتے ہیں۔ ریلوے لائن کی فش پلیٹیں' کانٹا بدلنے والے ڈھیلے لیور' پھاٹکوں کے راڈ اور باریں--- ٹیلیگراف اور واپڈا کی تاریں اور کھمبے' پارکوں کے جنگلے' گیٹ' سوئی گیس کے چالو پائپ' ٹیلیفون محکمے کی انڈر گراؤنڈ قبروں کے ڈھکن' تاروں کے بڑے بڑے رول' بجلی کے ٹرانسفارمر' میٹر بکسوں کے اوپر کے ڈھکن' باغیچوں باڑوں کے گرد خاردار تار' مسجد کے غسل خانوں کی ٹونٹیاں۔ میں نے تو ایک کباڑی کے پچھلے گودام میں ایک بڑا آہنی صندوق اسٹینڈ' زنجیر' تالے سمیت پڑا دیکھا جس پہ نیاز خواجہ غریب نواز لکھا ہوا تھا--- اور تو اور' گڑھی شاہو کا آہنی پل اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے بند نہیں ہوا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ

آہستہ آہستہ بذریعہ "جہاج" فونڈریوں اور کباڑیوں کے ہاں پہنچ رہا تھا اور ابھی کل ہی کی بات ہے کہ میانی صاحب کے قبرستان کے گرد مضبوط آہنی جنگلے لگوائے گئے تھے' اب جا کر دیکھیں۔ کوئی نسخہ پاکستانی "جہاجوں" کے ہاتھ میں ضرور ہے کہ وہ ویلڈنگ ٹارچ اور آری کے بغیر جس آہنی چیز پہ ہاتھ دھرتے ہیں "تیرے قدموں میں بکھر جانے کو جی چاہتا ہے" کہتی ہوئی قدموں سے لپٹ جاتی ہے۔ میں ایک ایسے لاک ماسٹر کو جانتا ہوں جو بغیر کسی تار چابی یا اوزار' محض ایک دو ہلکے سے جھٹکوں سے مشکل سے مشکل تالا کھول دیتا ہے' تعجب ہے--- میں نے صرف اسی غرض سے اس سے دوستی بڑھائی کہ وہ مجھے بھی یہ فن سکھا دے لیکن وہ ہتھے نہ چڑھا' ایک روز بولا۔

"باباجی! یہ بڑا مشکل فن ہے--- یہ خالص جندرا نفسیات ہے' جو آپ کے بس کی بات نہیں۔"

"بھائی! مجھے بھی نفسیات سے دلچسپی ہے' بلکہ میں تو خود بھی ایک معمولی سا نفسیات کا---"

وہ بیچ میں ہی میری بات' تالے کی طرح توڑتے ہوئے بولا۔ "باباجی! میں تالوں کی نفسیات کی بات کر رہا ہوں' انسانوں اور تالوں کی نفسیات میں لاکھوں لیوروں کا فرق ہوتا ہے---"

وہ بتانے لگا کہ اس کا مرحوم استاد تو صرف اک نظر دیکھتا اور تالا' ہاتھ جوڑ کر اپنے وجود کو کھول دیتا تھا' کئی تو سیدھے سیدھے پاؤں پڑ جاتے تھے۔ افسوس! کہ استاد نے مجھے یہ ہنر نہ سکھایا۔ وہ کہتے تھے کہ تیرا دماغ ہی ڈیڑھ لیور کا ہے' تو یہ ہنر نہیں سیکھ سکتا۔

"کمال ہے--- اس کا مطلب ہے کہ آپ کے استاد محترم بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں--- اسی وجہ سے وہ بیچارے اکثر ہر تیسرے چوتھے روز کسی نہ کسی تھانے پہنچ جاتے تھے--- آہ! ایک دن ان کی موت بھی اچانک ان تک پہنچ گئی---" وہ خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا۔ "گو انہیں فوت ہوئے پانچ چھ برس گزر گئے ہیں لیکن یقین نہیں آتا' یوں لگتا ہے کہ ابھی کہیں سے جھومتے ہوئے آ جائیں گے۔"

میں نے اداسی بھرے لہجے میں کہا۔ "سچ ہے کہ اللہ کے نیک بندوں کی جان بھی قفس

عنصری سے ایسے نکلتی ہے جیسے نئے تالے سے چمکتی ہوئی چابی--- کیا استاد محترم بیمار پڑے تھے یا یوں ہی بیٹھے بیٹھے---؟" مَیں نے مزید دلچسپی لیتے ہوئے دریافت کیا۔

وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بتانے لگا۔

"بابا جی ! جیسے سپیرا سانپ کے دانتوں سے اور بدمعاش' پولیس مقابلے یا دشمن کے ہاتھوں سے مارا جاتا ہے' بالکل اسی طرح بے چارے لاک ماسٹر بھی لاک اَپ کر کے مارے جاتے ہیں' واردات کوئی شیخوپوریا ڈال جاتا ہے اور پکڑا بے چارہ لاہوریا جاتا ہے' میرے استاد محترم کی موت بھی ایک معجزہ تھی بلکہ وہ "شہیدِ قُفلاں" تھے۔ وہ پاک و ہند کے قفل سازوں کا فخر تھے' بلکہ یوں جانئے کہ وہ تالاکُشائی اور جندرافہمی میں استاد سلامت علی خان جیسا مقام رکھتے تھے' خاں صاحب شام چوراسیئے تھے--- مگر ہمارے استاد بھی سیالکوٹی پچاسیئے تھے۔ آپ کے بزرگوں نے ہی سکھر کے مشہور پُل کو جندرا ڈالا تھا اور انگریز بدبختوں نے ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔"

مَیں یہ انکشاف سُن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ مزید دلچسپی لیتے ہوئے میں نے آگے کرُیدا۔

"بھئی' تم نے ابھی بتایا تھا کہ تمہارے استاد کوئی نشہ وشہ---؟"

وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہنے لگا۔ "توبہ توبہ کریں جی' بلکہ استغفار پڑھیں--- وہ تو ملنگ آدمی تھے' سچے ملنگ--- آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ملنگ درویش اپنی ملنگی درویشی کو لکُانے چُھپانے کے لئے کسی نہ کسی عِلّت کی آڑ ضرور لیتے ہیں۔ بس انہیں بھی اپنے بزرگوں کی طرح باجرا برابر افیون لینے کی چینک تھی ورنہ کوئی نشہ وشہ مطلب نہ ہوتا تھا' فرماتے کہ اسی چینا بیگم سے دماغ کے لیور لبُریکیٹ ہو جاتے ہیں' طبیعت میں شگفتگی اور مزاج میں ذرا شاہانہ سی بے نیازی آ جاتی ہے--- وہ اکثر ترنگ کے عالم میں فرمایا کرتے کہ تمام بادشاہ شہنشاہ اور برگزیدہ ہستیاں اسی سے التفات کرتی رہی ہیں' آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کا ذکر تو وہ بطور خاص کرتے تھے---"

"ان کا حلقۂ احباب بھی وسیع ہو گا؟" اس کی جاہلانہ باتوں سے بیزار ہوتے ہوئے موضوع بدلنے کی خاطر پوچھ بیٹھا۔

وہ چہک کر بولا۔ "کوئی ایسا ویسا--- ہر وقت دو چار عقیدت مند پاس بیٹھے پاؤں داب

رہتے۔ اپنی طبیعت کی سادگی' مخلوق کی عزت و خدمت اور ہنرمندی کی وجہ سے شہر بھر میں شہرت تھی۔ کبھی کوئی حاجت مند ان کے دروازے یا دوکان سے خالی نہیں لوٹا' اگر کچھ اور پیش کرنے کو نہ ہوتا تو بڑی ندامت سے پاؤں کے جوتے سے افیم کی پھکی نکال کر بڑھا دیا کرتے تھے---"

"پاؤں کے جوتے سے---" اچانک میرے منہ سے حیرانی سے نکل گیا۔

"ہاں--- وہ افیم کی گانٹھ جوتے میں رکھتے تھے' وجہ بتاتے ہوئے فرماتے کہ یہ کمائے اور استعمال کئے ہوئے چمڑے میں زندہ رہتی ہے۔ کتے' بلی' پولیس اور گھروالوں' بچوں بالوں سے بھی بچی رہتی ہے مگر افسوس کہ وہ خود لوگوں سے بچے نہیں رہتے تھے' دوکانداری کے اوقات کے علاوہ غرض مند انہیں گھر سے بھی باہر نکال لاتے تھے۔ سوتے ہوتے تو جگا دیئے جاتے' لیٹے ہوئے ہوتے تو بٹھا دیئے جاتے۔ اکثر ایسے ہوا کہ آدھی رات آگے' آدھی پیچھے کسی نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔ ہڑبڑا کر اٹھے' باہر دو معزز سے آدمی کھڑے ہیں' کہہ رہے ہیں کہ فلم دیکھ کر آ رہے ہیں اور چابی کہیں گر گئی ہے۔ مہربانی ہوگی' ذرا ساتھ چل کر ہماری تالاکشائی کر دیں۔ آدھی رات ہے' کہاں جائیں گے؟--- یہ بے چارے ان کی پریشانی کے پیش نظر ساتھ ہو لیتے' تالا کھول دیتے' دس بیس لے کر یہ سوئے جاگے گھر کی جانب نکل آتے اور وہ "ذوات شریف" گھر صاف کر کے کسی اور طرف چل دیتے۔ دوسرے دن پولیس ان کو تھانے لے آتی۔ دو چار روز یہ بھی اپنے کس بَل نکلوا کر نکل آتے۔ کیا وضع داری تھی اور مخلوق خدا کی خدمت کا جذبہ کہ ساری عمر اپنا یہ چلن نہ چھوڑا---"

مَیں نے اس کی بات پہ پھول چڑھاتے ہوئے بات بڑھائی۔ "سبحان اللہ! اللہ کے نیک بندوں میں یہی تو ایک وصف ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کر کے خوش ہوتے ہیں۔ حاجت مندوں کی حاجت روائی کر کے انہیں روحانی تسکین حاصل ہوتی ہے' انسانیت کی خدمت کو ہی وہ اصل عبادت سمجھتے ہیں--- ہاں تو' حضرت صاحب کی رحلت فرسائی کیسے ہوئی' آپ نے ابھی ابھی فرمایا تھا کہ وہ شہید ہوئے تھے---؟" میں نے اپنی بے پناہ دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"میں اسی طرف آ رہا تھا---" اس نے دزدیدہ نگاہوں سے آسمان کی جانب دیکھا جیسے

عالم برزخ میں اپنے استاد کی روح کو تلاش کر رہا ہو۔ پھر ایک یخ بستہ سی سانس کھینچ کر بتانا شروع کیا۔ "وہ جمعرات کا روز صبح صبح کا وقت، ہم شاگرد پیشہ دوکان کی صفائی سے فارغ ہو کر استاد کے بیٹھنے کی جگہ پہ جھاڑپونچھ کر رہے تھے کیا دیکھا کہ استاد خراماں خراماں تشریف لا رہے ہیں--- الٰہی خیر! اس وقت یہ نیا سورج کدھر سے نکل آیا، معمول کے مطابق انہیں ڈیڑھ گھنٹے بعد آنا چاہئے تھا؟--- مستانہ چال، نیا لباس، بھینی بھینی خوشبو، بال چپڑے ہوئے، سرمہ بھری مست آنکھیں، آنکھوں میں سرخ ڈورے۔ شاید گھر ہی سے خوراک لے کر چلے تھے--- علیک سلیک کے بعد اک شان بے نیازی سے ہم پہ اک نگاہ مستانہ ڈالی اور فرمایا، بچو! کیا ٹک ٹک نظریں باندھے دیکھ رہے ہو۔ نظر لگاؤ گے کیا؟ بس آج موڈ بن گیا تھا، ذرا جلدی چلے آئے۔ ہم ناشتہ بھی یہیں کریں گے--- اپنی جگہ پہ بیٹھتے ہی جوتے سے افیون نکال کر خوراک بنانے لگے۔ ہم شاگرد پیشہ حیران کہ یہ صبح صبح دوسری خوراک، وہ بھی خالی پیٹ؟--- میں نے چائے دانی سے کپ میں چائے انڈیل کر سامنے رکھی ہی تھی کہ موت کے فرشتے کی طرح ایک گاہک آگیا، کہنے لگا کہ دوکان کے تالوں کی چابیاں نوکر کے پاس رہ گئی ہیں۔ وہ کسی ایمرجنسی میں گاؤں چلا گیا ہے، جلدی میں چابیاں بھی ساتھ لے گیا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر ساتھ چلیں اور تالے کھول دیں۔ استاد نے معذرت کر دی کہ میں آج کام نہیں کروں گا۔ نوچندی جمعرات ہے، میں اپنے مرشد کے مزار پر حاضری کے لئے جا رہا ہوں۔ استاد نے بات ہی ایسی کر دی تھی کہ وہ بے چارہ مزید اصرار کئے بغیر چلا گیا۔ اب ہمیں بھی صحیح بات کا پتا چلا کہ استاد آج دولہا کیوں بنے ہوئے ہیں۔ استاد نے چائے نوش جان کرنے کے بعد سب کو حکم سنایا کہ آج سب چھٹی کریں بلکہ کل جمعہ شریف کی بھی چھٹی--- ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ وہی شخص، استاد کے ایک پرانے جاننے والے کے ساتھ پھر آگیا اور استاد سے اپنی مشکل بیان کی۔ استاد کے دوست نے بھی سفارش کرتے ہوئے کہا کہ یہ میرے رشتہ دار ہیں، منڈی میں ان کی آڑھت کی دوکان ہے، چابیاں غلطی سے نوکر لے گیا ہے اور تالے بھی بڑی عجیب وضع قطع کے ہیں--- ایک اور تالا شکن کو لے کر گئے ہیں، وہ تو کانوں کو ہاتھ لگا کر واپس آگیا ہے۔ بس آپ ہی ہیں جو یہ تالے کھول سکتے ہیں--- اس نے پاؤں دابتے ہوئے لجاجت سے کہا تو استاد جھوم کر اٹھے، مجھے ساتھ لیا اور منڈی میں اس کی دوکان پہ پہنچ گئے۔ مجھے

کیا پتا تھا کہ یہ ان کا آخری سفر ہے۔ وہ آنے والا گاہک نہیں بلکہ ملک الموت ہے۔ دو چار اوزار میرے ہاتھ میں تھے جن کی شاذ ہی کبھی استاد کو ضرورت پڑتی ہو۔ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ میرے استاد درویش تھے، صاحبِ نظر تھے۔ تالے جندرے کیا چیز ہیں، وہ تو بند نصیبے بھی کھول دیتے تھے--- دوکان پہ پہنچے۔ پرانے وضع کا بھاری چوبی دروازہ، تین عدد بھاری بھاری دیسی علی گڑھی آہنی تالے۔ ایک نیچے چوکھٹ پہ، دوجا دروازے کے درمیان اور تیسرا اوپر جو دوسروں کے مقابلے خاصا وزنی بھی تھا۔ مَیں نے زندگی میں ہر طرح کے تالے دیکھے، مرمت کئے، کھولے اور بند کئے مگر ایسی وضع قطع اور خوفناک جِناتی صورت والے وزنی تالے مَیں نے پہلی اور آخری بار دیکھے۔" وہ ذرا سا توقف کرتے ہوئے پھر کہنے لگا۔ "استاد چوکھٹ کے نیچے لڑکھڑاتے قدموں پہ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید خالی پیٹ افیون نے رنگ دکھایا ہوا تھا، گردن پہ سر بھی پنڈولم کی مانند حرکت کر رہا تھا، بس اِک مستانہ نگاہی سے اوپر والے تالے کو تاک لیا اور یہیں وہ مات کھا گئے۔ تالے کو دیکھ کر نیچے سے ہٹ جاتے تو وہ کچھ نہ ہوتا جو اس دن بیت گیا--- اُوپر دیکھا، کھڑے کھڑے ذرا جھکائی لے کر درمیانی تالے سے تعلق جوڑا اور جو مزید جھک کر پاؤں والے تالے سے سلسلہ جُنبانی شروع کیا ہی تھا کہ دَھڑم سے اوپر والا وزنی تالا استاد کی کھوپڑی پہ پکے آم کی مانند گرا۔ کھوپڑی کثرت استعمال پہلے ہی پلپلی ہو چکی تھی، پکے ہوئے خربوزے کی مانند پچک گئی۔ اس کے ساتھ ہی آگے پیچھے باقی دونوں تالے بھی استاد کے قدموں میں عقیدت سے ڈھیر ہو گئے۔ بعد سمجھ میں آیا کہ استاد مرحوم کو پہلے سے ہی اپنی شہادت کا اشارہ مل چکا تھا ورنہ یہ پیشگی زیب و زیبائش کا اہتمام کچھ یونہی نہ تھا---"

مَیں یہ دل گرفتہ سانحہ سن کر اپنا سر جھکا کر خاموش سا بیٹھ گیا--- الٰہی! کیسے کیسے تیرے پُراسرار بندے موجود ہیں کہ موت کے فرشتے کے پَروں کی سرسراہٹ تک محسوس کر لیتے ہیں--- کچھ اداس لمحے ہم دونوں کے درمیان خاموشی سے گزر گئے، شروع پھر میں ہی ہوا۔

"یار! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تمہارے استاد کسی کلام سے تالا شکنی فرماتے تھے یا پھر وہ فنی لحاظ سے اس معراج یا مقام پہ تھے کہ نگاہیں ہی ماسٹر چابی بن گئی تھیں؟"

"جی ہاں' وہ کلام پڑھ کر اپنی آنکھوں پہ پھونکتے تھے' پھر نگاہیں تالے پہ---"

مَیں نے اس کے احمقانہ سے جواب کو درمیان سے ہی کاٹتے ہوئے کہا۔ "بھائی! آنکھیں تو ہونٹوں کے بہت اوپر ناک کی جڑ کے پاس ہوتی ہیں۔ انسان اپنی پھونک اپنی آنکھوں تک پہنچانے پہ قادر نہیں' تم یہ آنکھوں پہ پھونکنے کی بات کیا کرتے ہو؟"

وہ میرے اس جاہلانہ سے استدلال پہ استہزائیہ سی ہنسی' ہنستے ہوئے بولا۔ "باباجی! آپ تو خود بھی پھونک پھونکیا کرتے ہیں' اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔ آپ نے انگلی سے دانت داڑھیں نکالنے والے تو دیکھے ہوں گے۔ وہ کوئی کلام اپنی شہادت کی انگلی پہ پھونکتے ہیں اور پھر وہ انگلی متاثر داڑھ یا دانت پہ رکھ دیتے ہیں' دانت بغیر کسی حیل و حجت مقناطیس کی مانند انگلی سے چمٹ کر باہر آ جاتا ہے۔ اسی طرح استاد بھی کلام پڑھ کر انگلی پہ دم کر کے آنکھوں سے مس کر لیا کرتے تھے---"

سبحان اللہ' مجھے فوراً" یقین آگیا کیونکہ مَیں نے اپنی پہلی صحت مند داڑھ محض تجربے کے طور پہ اوز اپنی ازلی حماقت کی بناء پہ نکلوائی تھی۔ مجھے خوب یاد ہے' بھائی پھیرو جاتے ہوئے بَس کے اندر وہ کلام کے ذریعے محض انگلی سے بلا تکلیف دانت نکالنے کا دعوٰی کر رہا تھا اور مَیں اس کی ایسی احمقانہ کچی باتوں پہ محض مسکرا رہا تھا' خوامخواہ پنگا لینے کی عادت سے مجبور ہو کر مَیں نے اس سے کہا۔

"بھائی' اللہ کی مخلوق سے یہ ڈرامے مت کرو۔ خدا کا خوف کرو' کلام سے اگر جمی جمائی مضبوطی سی داڑھ بغیر کسی تکلیف و تردّد کے باہر آ سکتی ہے تو کلام سے بنک کے سٹرانگ روم یا میری جیب سے پیسے باہر کیوں نہیں آ سکتے---؟"

وہ لپاڈیا کمال ڈھٹائی سے مسکرایا' بولا۔ "حاجی جی' یہ دونوں کام کلام اور اس کے بغیر بھی ہو سکتے ہیں۔ ذرا منہ کھولیں---"

مَیں نے لاپروائی سے بھاڑ سا منہ کھول کر اس کے آگے کر دیا کہ کیا کر لے گا' بڑا آیا کلام پڑھنے والا!--- اس بدلحاظ نے اپنی شہادت کی موئی گندی سی انگلی میری آخری چٹان کی مضبوط جمی ہوئی داڑھ پر رکھ دی۔ اسی اثناء میں شاید سڑک پہ کوئی جمپ آگیا تھا' بَس ہلکا سا اچھلی اور بس اسی بے درد لمحے اس کی انگلی بھی لہراتی ہوئی باہر نکل آئی۔ دو شاخہ دوہری پیلی سی مضبوطی داڑھ اس قصاب نے میری کپکپاتی ہوئی ہتھیلی پہ رکھ دی۔ حیران

اور غصّے سے میری تو آنکھیں اُبل آئیں' میٹر گھوم گیا۔ اچھی بھلی مضبوطی داڑھ میری حماقت اور اس دَیّوث کی خباثت کی نذر ہو گئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا' مزید تسلی کے لئے مَیں نے زبان کی نوک سے داڑھ والے مقام کو ٹٹولا۔ میرے خدا! وہاں تو اچھا خاصا گڑھا پڑا ہوا تھا جیسے چند لمحے پہلے یہاں بارودی سرنگ پھٹی ہو۔ اب چین کہاں کہ سکون سے بیٹھوں' انگلی سے دانت داڑھوں کی گنتی کی' ایک داڑھ بہرطور کم تھی--- وہ کمبخت گاڑی کے دوسرے مسافروں کی جانب متوجّہ تھا۔ کئی ایک مسافر جباڑے دبائے پڑے تھے' کئی ایک کو وہ اپنے منجن کی ترکیب استعمال سمجھا رہا تھا--- "ایک منٹ--- ابھی لیجئے--- آیا بزرگو!--- اچھا' بہن جی!--- دس روپے آپ کے تھے' ابھی پانچ واپس کرتا ہوں۔"--- ساری بس میں یہی کچھ سنائی پڑتا تھا۔ بس کیا تھی' اچھا خاصا دانت داڑھوں کا ہسپتال کھلا پڑا تھا۔ گاڑی بھگتا کر وہ دوبارہ میرے پاس آیا' اِدھر مَیں داڑھ ہتھیلی پہ سجائے حسرت بھری نظروں سے اس کا حشر دیکھ رہا تھا۔

"ذرا ادھر کھسکئے---" وہ زبردستی میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔ "حاجی صاحب! کوئی تکلیف وغیرہ تو نہیں ہوئی؟--- ویسے اچھا کیا جو یہ نامُراد داڑھ نکلوا دی۔ اسے کیڑا لگنے ہی والا تھا' خوامخواہ دوسری داڑھوں کو بھی خراب کرتی۔ آپ کو تو پتا ہے کہ ایک گندی مچھلی پورے جل کو گندا کرتی ہے---"

مَیں قہر بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اس کی خرافات سن رہا تھا' بائیں ہاتھ کی ہتھیلی سے جبڑے کا کلہ دبائے ہوئے تھا کہ ہلکا سا درد بھی محسوس ہو رہا تھا۔ میری خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے مجھے ایک گتے کی ڈبیا تھما دی' کہنے لگا۔

"--- ویسے تو ترکیب استعمال اور دوا منگوانے کا پتا اس پہ درج ہے' پھر بھی ابھی اسی وقت ڈبیا سے تھوڑا سا منجن انگلی کے ذریعے داڑھ والی جگہ پہ ملئے اور سر کھڑکی سے باہر نکال کر منہ ڈھیلا چھوڑ دیں' چند لمحوں میں سکون مل جائے گا۔ گھر جا کر رات سونے سے پہلے ایک مرتبہ پھر دوا ملئے گا۔ پانچ روپے عنایت کر دیجئے--- اور ہاں' یاد رکھئے کہ سر کھڑکی سے باہر ذرا احتیاط سے نکالئے گا کیونکہ دو مرتبہ ایسے ہو چکا ہے کہ سواری تو بھائی پھیرو پہنچ گئی لیکن سر راستے میں ہی کہیں رہ گیا---"

میرے سلوکے کی جیب اس کی جانب تھی۔ بڑی مشکل سے مَیں نے ہاتھ گھما کر اسے

پانچ روپے نکال کر دیئے۔ اگلے نہر والے سٹاپ پہ وہ منحوس اتر گیا' تھوڑی دیر بعد جب مَیں بھائی پھیرو اترا تو معلوم ہوا کہ داڑھ کے ساتھ میرے سلوکے کی جیب پہ بھی جھاڑو پھر چکی ہے۔ اس دن سے مَیں ایمان لے آیا کہ واقعی کلام اور کلام کے بغیر بھی منہ سے دانت داڑھ اور جیب سے پیسے ویسے ہی بغیر کسی درد اور تکلف و تکلیف کے نکل سکتے ہیں۔۔۔ بھائی پھیرو بس سٹینڈ پہ بے یارومددگار کھڑا میں اپنی کٹی ہوئی جیب اور بغیر درد' کلام سے اکھاڑی ہوئی داڑھ کا ماتم کرنے کا منظر عالم تصوّر میں دیکھنے کے بعد۔۔۔ سوچ رہا تھا کہ میرا قفل ساز دوست اور اس کا "شہید" استاد واقعی کلام سے جیب کا مال بھی اڑا سکتے ہیں جس کا واضح ثبوت میرے سلوکے کی جیب تھی جس کے بڑے سے شگاف کے آرپار میں اپنا ہاتھ ڈال کر اس عامل منجن فروش کے "کمال فن" کو داد تحسین پیش کر رہا تھا۔۔۔ جب ذرا ہوش ٹھکانے لگے تو یاد آیا کہ روپے پیسے گئے سو گئے' ساتھ وہ کچھ بھی گیا جسے کسی اور کے ہاتھ نہیں لگنا چاہئے اور جس کی وجہ سے مَیں بھائی پھیرو آیا تھا۔ یہ میری ایک پتلی سی ڈائری تھی جسے میں اپنی بُری عادت کی وجہ سے لپیٹ لپاٹ کر دس دس کے کرنسی نوٹوں کے ساتھ ہی جوڑ کر جیب میں ڈالے ہوئے تھا۔ اس ڈائری میں میری پچیس تیس برس کی محنت کا نچوڑ تھا۔ کیمیا اور حکمت کے اصول' اوزان' اجزا' خواص و مباحات' سمّیات و مجربات وغیرہ اسی نوع کی مختلف تراکیب و توازن کے مسائل اور نسخے درج تھے۔ اس ڈائری کو حاصل کرنا میرے لئے بہت ضروری تھا۔ اسی اڑچن میں پھنسا ہوا تھا کہ سامنے دوکان پہ مجھے بس کا کلینر دکھائی دیا' لپک کر اسے پکڑا۔

"بیٹا! وہ منجن بیچنے والا "شریف آدمی" مجھے کہاں مل سکتا ہے؟۔۔۔ بہت ضروری کام ہے۔۔۔"

"بزرگو! وہ تو کسی بس میں ہی دھندا کرتا ہوا ملے گا۔۔۔"

مَیں نے اسے منجن والا پیکٹ دکھایا۔ "بھائی! اس پہ تو یہیں کہیں بھائی پھیرو کا پتا لکھا ہوا ہے۔۔۔ میرا اس سے ملنا بڑا ضروری ہے' بہت ہی ضروری۔۔۔"

"خیر ہے نا' باباجی! کوئی داڑھ دانت کا مسئلہ یا کوئی اور چکر۔۔۔؟" وہ کچھ متردّد ہوا۔

"پتر! اس نے میری جیب کا صفایا کر دیا ہے۔۔۔ خیر' پیسوں کی تو کوئی بات نہیں مگر میری ذاتی ڈائری بھی ساتھ تھی۔ بس وہ مجھے واپس کر دے' پیسے بیشک رکھ لے۔ وہ ڈائری

نہ ملی تو میرے لئے خاصی پریشانی پیدا ہو جائے گی' مَیں بوڑھا آدمی کہاں دھکے کھاتا پھروں گا۔۔۔"

"میری آہ و زاری اور بھکی ہوئی حالت دیکھ کر شاید اسے حیا آ گئی' میرا ہاتھ پکڑ کر وہ مجھے ایک علیحدہ سی جگہ پہ ایک درخت کے نیچے لے آیا۔

"چاچا جی۔۔۔!"

مَیں نے اسے فوراً" ٹوکا۔ "پتر! کوئی ایک رشتہ چن لو۔۔۔ کبھی بزرگو' کبھی باباجی' کبھی چاچاجی۔۔۔"

"اچھا جی' آپ ہی بتائیں' میں آپ کو کیا کہوں۔۔۔؟" وہ گھبرا گیا۔

"تم مجھے سیدھے سیدھے باباجی کہہ لو' بس۔۔۔"

"اچھا' باباجی!۔۔۔ ہم چوبیس گھنٹے سڑک پہ رہتے ہیں' سینکڑوں ہزاروں اچھے بُرے روز اترتے چڑھتے ہیں۔ ہمیں صرف کرائے سے غرض ہوتی ہے۔ کون کیا ہے؟ ہم اس چکر میں نہیں پڑتے۔ آپ چونکہ بزرگ ہیں اس لئے۔۔۔"

"بزرگ نہیں' باباجی۔۔۔" مَیں نے اسے ہلکی سرزنش سے ٹوکا۔

"ہاں' باباجی!۔۔۔ مَیں کہہ رہا تھا کہ آپ چونکہ بے حد پریشان دکھائی دے رہی ہیں اس لئے میں آپ کو اس کا ٹھکانا سمجھا دیتا ہوں' وہ اس وقت وہیں ملے گا۔ پھر آپ جانیں' آپ کا کام۔۔۔ میرا نام مت لیجئے گا۔"

واقعی وہ وہاں موجود تھا۔ نہر کنارے کسی بزرگ کا تکیہ تھا۔ پرانے بوڑھ کے درخت کے نیچے سبزپوش سے ڈھکی ہوئی لمبی سی قبر' اس پہ پڑے ہوئے پرانے باسی موتیا گلاب کے پھولوں کے ہار' سرہانے کڑوے تیل کے بڑے بڑے مٹی کے پیالے۔ بوڑھے بوڑھ کی لٹکی ہوئی داڑھیوں سے رنگین رومال' دوپٹے اور پوٹلیاں بندھی ہوئی تھیں۔ بھنگ کا کونڈا' مٹی کے کھڑے' پیالے' لوٹے قبر کے اردگرد بکھرے پڑے تھے۔ بوڑھ کی جڑ کے پاس پرالی کے ڈھیر پر وہ منجن فروش الٹا پڑا دکھائی دیا' ایک مجہول سا لمبی لمبی لٹوں والا ننگ دھڑنگ ملنگ اس کی کمر پہ مکے سے مار رہا تھا یا شاید اسے دبا رہا ہو۔ میرے سر پہ پہنچنے کے باوجود نہ تو ملنگ نے میرا نوٹس لیا اور نہ ہی اس منجن فروش کو میری آمد کا کچھ علم ہوا۔ پھر اچانک جیسے میرے شانوں پہ ایک چیختی چلاتی قیامت سی ٹوٹ پڑی' مَیں حواس باختہ سا اپنی

عینک سنبھالتے ہوئے اپنے بوجھ پہ ہی دہرا سا ہو گیا۔ ابھی صحیح سے سمجھ نہ پایا تھا کہ یہ اچانک ٹوٹ کر گرنے والی کیا چیز ہے کہ وہ مصیبت میرے شانوں سے اُچھل کر ملنگ پہ جا پڑی۔ یہ ایک ننھی سی پالتو بندریا تھی--- کہتے ہیں کہ جوانی میں بندریا بھی سُندریا کہلاتی ہے۔ چیتی چمکتی پارا سی آنکھوں والی چلبلی سی گڑیا جیسی بندریا!--- ملنگ سے چھلانگتے ہوئے وہ منجن فروش کی پشت پہ بیٹھ کر غوں غوں کرنے لگی۔ اب وہ منجن فروش اٹھ کر بیٹھ گیا تھا' اک چور سی نظر مجھ فقیر پہ ڈال کر بندریا کو گدگدانے لگا۔ مَیں نے حسب عادت لمبی سی السلام علیکم اس کی طرف اچھالی۔

"وعلیکم السلام' حاجی صاحب!--- بہت ہی اچھا ہوا آپ خود ہی تشریف لے آئے' دو چار روز اور انتظار کرتا' پھر مَیں خود ہی آپ کے پاس پہنچ جاتا---" دواؤں والے سفری بیگ سے وہ میرے روپے نکال کر مجھے لوٹاتے ہوئے بولا۔ "یہ لیجئے' آپ کی امانت--- آیئے' ادھر بیٹھ جایئے۔ کھڑے کھڑے تھک جائیں گے---"

مَیں اس سے روپے لے کر وہیں پرالی پہ ہی بیٹھ گیا' اس شخص کے اس نہ سمجھ میں آنے والے برتاؤ پہ میں حیران بھی تھا اور پریشان بھی--- اگر اس نے روپے بغیر طلب کئے مجھے واپس ہی کر دینے تھے تو جیب کاٹنے کی کیا ضرورت تھی--- لیکن میری ڈائری کہاں ہے؟--- میں پریشان سا ہو گیا۔ مجھے اس طرح خاموش پاکر وہ خود ہی کہنے لگا۔

"آپ حیران یا پریشان نہ ہوں' آپ میرے لئے عزت کی جگہ ہیں--- آپ کو اپنے الفاظ یاد ہوں گے' آپ نے کہا تھا کہ اگر کلام سے داڑھ نکل سکتی ہے تو کلام سے جیب سے پیسے بھی نکل سکتے ہیں اور مَیں نے جواب دیا تھا کہ ہاں' یہ دونوں کام ہو سکتے ہیں کلام سے بھی اور بغیر کلام کے بھی---"

پھر وہ اپنے ملنگ کو کسی جناتی زبان میں کچھ کہنے لگا' شاید وہ اس چائے پانی کے لئے کہہ رہا تھا--- اب بولنے کی شاید میری باری تھی' مَیں نے لجاجت سے کہا۔

"بہت بہت شکریہ' آپ نے میرے روپے لوٹا دیئے۔ ان کے ساتھ میری پرائیوٹ ڈائری بھی تھی--- دراصل یہ میری پرائیوٹ ڈائری ہے' اس میں حکمت کے چند نسخے وغیرہ تحریر ہیں---" مَیں نے روپے اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آپ چاہیں تو یہ رکھ سکتے ہیں مگر میری ڈائری دے دیجئے' اس پہ میری ذاتی باتوں کے علاوہ میرے رشتہ

داروں' عزیزوں کے پتے وغیرہ بھی لکھے ہوئے ہیں---"

وہ بندریا کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانک کر مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ "مجھے پتا ہے کہ اس ڈائری پہ بہت کچھ لکھا ہوا ہے' بلکہ اور بھی بہت کچھ لکھا ہوا ہے---" اچانک وہ میرے قریب آیا' میرا پاؤں پکڑ کر التجا سی کرنے لگا۔ "آپ میرے بزرگ ہیں' میرا خیال ہے کہ مَیں نے آپ سے انجانے میں زیادتی کی ہے۔ پھر آپ پریشان کے عالم میں اتنی دور سے یہاں میرے ڈیرے تک آئے ہیں تو مجھے کچھ تو تلافی اور خدمت کا موقع ملنا چاہئے۔ مَیں التجا کرتا ہوں کہ میرے پاس کچھ دیر ٹھہریں' مجھے کچھ خدمت کا موقع دیں--- باقی رہی آپ کی ڈائری' تو یہ لیجئے---"

وہ مجھے ڈائری لوٹا کر دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنے کئے کی معافی مانگنے لگا۔ مَیں نے ڈائری لیتے ہوئے اس سے کہا۔

"بھائی! مَیں نے آپ کو صدق دل سے معاف کیا' اللہ آپ کا دونوں جہان بھلا کرے--- آپ بڑے بھلے مانس ہیں' اللہ کی مخلوق سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی ملال نہیں بلکہ مَیں آپ کا مشکور ہوں---" "اچھا' اللہ حافظ---!"

مَیں اٹھنے کے لئے پر تول ہی رہا تھا کہ اچانک ایک جلوئی سا چھناکا ہوا' وہی سندریا سی بندریا' بجلی کی سی چمک کے ساتھ کوندی اور میرے ہاتھ سے ڈائری اُچک کر اوپر برگد کے سندربن میں غائب ہو گئی۔ میری تو سٹی گم ہو گئی' کبھی اپنے خالی ہاتھوں کے طوطوں کو دیکھتا اور کبھی اوپر چھتنار برگد کو جس کے اندر بندریا تو بندریا' بن مانس بھی تلاش نہ ہو سکے۔ ملنگ نے یہ تماشا دیکھ کر ہونقوں کی طرح ہُوہُو کرنا شروع کر دیا اور منجن فروش نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"بزرگوار! مجھے تو آپ بہلا پھسلا کر شاید چلے ہی جاتے' میری سندری سے نبٹیں تو جانیں---"

قہر درویش برجان درویش' غصے کو صبر کے گھونٹوں سے ملا کر پی گیا--- کھانا اس نے کسی ٹرکوں والے ہوٹل سے منگوایا تھا۔ دیسی گھی میں بُھنا ہوا مرغ' تنوری روٹیاں اور کچھ پھل' بعد میں وہیں کُھلے کھلیان چائے کا اہتمام کیا گیا جس میں وہ ملنگ پیش پیش تھا۔ دنیا کی سنتوں اور دین کے فرضوں سے جب فارغ ہوئے تو منجن فروش جس کے بارے میں ابھی

تک میرا دل صاف نہیں تھا' اجلی صاف شفاف کھلی چاندنی میں میرے سامنے بیٹھ گیا--- چاندنی رات کا اپنا ایک فسوں ہوتا ہے' دُور کہیں کوئی دیوانہ حضرت سلطان باہوؒ کا کلام پڑھ رہا تھا--- ۔

"علموں باجھوں جے فقر کماوے' کافر مرے دیوانہ ہو"

دن بھر کا تھکا ہارا انگ انگ' آنکھیں دکھا رہا تھا۔ سرکار کے کلام کی تاثیر' لحن اور آہنگ' ماحول' ٹھنڈی ٹھنڈی پروائی' نہر کا کنارا۔ میرے تو بارہ بج گئے۔ جیسے کسی نے مجھے گوشت پوست سے کافور میں بدل دیا ہو۔ یونہی ذرا کی ذرا جھپکی آئی تو گھڑسوار ہولیا' سرپٹ سے دلکی میں آیا۔ شاید پاؤں رپٹا ہوگا' رکا تو آنکھ کھلی۔ وہ پولے پولے میرے پاؤں داب رہا تھا۔ چاند سامنے مسکرا رہا تھا' دودھیا دودھیا چاندنی میں اس کا چہرہ چاندی لگ رہا تھا' اس کی سندری اس کی بغل میں سرچھپائے شاید سو رہی تھی۔ میرے آنکھیں جھپکنے اور پہلو بدلنے سے اسے احساس ہوگیا تھا کہ مَیں نے کچھ دیر آرام کرلیا ہے۔ مَیں نے اس کے مصروف ہاتھوں کو تھام لیا۔

"بھائی' آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟--- مجھے دبوانے کی ضرورت نہیں---"

وہ میری بات سُنی' اَن سُنی کر کے کہنے لگا۔ "بزرگوار! مَیں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں---"

مَیں نے ناگواری سے کہا۔ پہلے یہ دابنا وابنا چھوڑو' اور یہ بزرگوار کہنا بند کرو پھر کوئی بات سنوں گا---"

"مَیں آپ کو کس نام سے پکاروں---؟" وہ بچوں کی سی معصومیت سے پوچھنے لگا۔

"بھائی' مجھے باباجی کہہ لو---" مَیں نے قطعیت سے کہا۔

"باباجی--- مگر آپ باباجی ہی کیوں کہلوانا پسند کرتے ہیں؟"

مَیں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے بتایا۔ "بس ایک دفعہ کسی نے ایسے بھول پنے اور معصومیت سے باباجی کہہ دیا تھا کہ مَن میں کھُب کر نقش سا ہوگیا--- بس اب میں باباجی ہی ہوں' اس کے علاوہ کوئی کچھ اور کہے تو مجھے زہر لگتا ہے---"

"اچھا' باباجی! اب میں کچھ کہہ سکتا ہوں---؟"

"ہاں' مگر جلدی جلدی--- مجھے صبح کی نماز کے فوراً بعد یہاں سے روانہ ہونا

ہے۔"

"باباجی! اگر وہ تو سندری پہ منحصر ہے---"

وہ سندری کو پیار سے سہلاتے ہوئے بولا--- مَیں نے سندریا' بندریا کو دیکھا۔ کیسے مزے سے اس کے سینے پہ سردھرے سو رہی تھی۔

"بھائی' ڈائری مجھے سندری سے مل چکی ہے اور مَیں اسے بڑی احتیاط سے محفوظ بھی کرچکا ہوں---"

وہ اداس سا ہو کر دُور مسکراتے ہوئے چاند کو حسرت بھری نظروں سے تکنے لگا' اک عجیب سا حزن اس کے چہرے پہ کِھل اٹھا تھا۔ وہ مجھے بے حد پیارا لگا' کافی دیر مَیں اس کے اداس چہرے پہ نظریں جمائے دیکھتا رہا۔ وہ بھی خاموشی کے پُراسرار سمندر میں کہیں اُتر گیا تھا اور مَیں بھی محویّت کا دِید تماشا بنا ہوا تھا۔ سمے اور وقت کی اِذن دھارا پھوٹی تو میرے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

"کہو--- سب کچھ' جو تم کہنا چاہتے ہو---"

"باباجی! مَیں ایک گنہگار بدکار انسان ہوں' مَیں نے اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں بہت برے برے کام کئے ہیں' اللہ کی مخلوق پہ بڑے ستم توڑے ہیں۔ دھوکہ دہی' فریب' مکاری' لوٹ مار' جعل سازی' سب کچھ کیا ہے حتیٰ کہ اغوا اور قتل تک کر چکا ہوں۔ کئی لڑکیوں عورتوں کو اپنے حرص و ہوس کے چنگل میں پھانس کر بے آبرو کرچکا ہوں' دو تین بار جیل یاترا بھی کر آیا ہوں۔ مَیں اب بھی کئی ایک کیسوں میں مختلف اضلاع کی پولیس کو مطلوب ہوں---"

وہ چاند پہ نظریں جمائے کہے جا رہا تھا اور مَیں--- میری یہ حالت کہ جیسے کوئی میرا قطرہ قطرہ لہو اور توانائی سرنج سے کھینچ رہا ہو۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے' ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے کی تریلیاں تیرنے لگیں--- "اے ربّ العزت! مَیں کہاں پھنس گیا۔ یہ تو کوئی ڈکیت ہے۔ نہر کنارے' اس اجاڑ بیابان میں اس اجڑے ہوئے مزار پہ نجانے کس نیت ارادے سے بیٹھا ہے۔ یہ ملنگ بھی مجھے کوئی جاسوس لگتا ہے اور یہ سندریا بندریا بھی شاید اس کی کوئی ساتھی واتھی ہو۔"--- وہ خدا جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا یا بک رہا تھا' مَیں تو اپنے خدشات کے پہاڑے پڑھ رہا تھا۔ ناگہاں بوڑھ کے جنگل سے کوئی چمگادڑ بھیانک سی چیخ و

چنگھاڑ کے ساتھ پھڑپھڑاتی ہوئی نکلی اور ہمارے سروں کے اُوپر سے لہراتی ہوئی نہر کی جانب چلی گئی۔

"باباجی! آپ کو نیند تو نہیں آ رہی---؟" اچانک اس نے پوچھا۔

"توبہ کریں--- مجھے تو اب معلوم ہوا کہ یہ سادھو سنت، فقیر درویش، ویرانوں بیلوں میں جنگلوں میں کیوں ڈیرے جماتے ہیں۔ یہاں نیند کا کیا کام--- یہاں ناگہانی، بے بسی کی موت آ سکتی ہے، کوئی کیدو آ سکتا ہے، ہیر یا سوہنی آ سکتی ہے، پولیس مقابلے کے لئے پولیس آ سکتی ہے مگر نیند نہیں آ سکتی---"

"باباجی! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے---؟" وہ میرے ماتھے پہ اپنے ہاتھ کی الٹی ہتھیلی رکھتے ہوئے بولا۔

مَیں نے بیزاری سے کہا۔ "یہی تو ٹھیک نہیں--- بھائی! صاف صاف کہو، تم نے مجھے یہاں کیوں روکا ہوا ہے؟ یہ سندریا بندریا بھی تمہاری سدھائی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تمہارے اشارے سے اس نے میری ڈائری چھینی تھی اور بوڑھ میں غائب ہو گئی تھی۔ یہ ملنگ، یہ ٹوٹی پھوٹی قبر، یہ بوڑھ کا درخت، مجھے یہ سب کچھ تمہاری ذات کے مختلف کردار یا حصے لگتے ہیں--- سچ کہو، تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

اس نے سر نیہوڑا کر جواب دیا۔ "آپ نے سب کچھ سچ کہا--- مَیں آپ سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے صدق دل سے معاف کر دیں اور پھر مجھے اپنی شاگردی میں لے لیں، مَیں آپ کے ہاتھ بیعت کرنا چاہتا ہوں۔"

اس نے میرے دونوں ہاتھ، ہاتھوں میں لے کر چُومنے شروع کر دیئے۔ مَیں نے بڑی مشکل سے ہاتھ چھڑا کر اس سے کہا۔

"بھائی! میرے بارے میں تم واقعی کسی خوش فہمی کا شکار ہو گئے ہو--- میری ظاہر بزرگی، داڑھی، لچھے دار باتوں اور لباس وغیرہ پہ مت جانا۔ میں کوئی پیر فقیر یا عامل کامل نہیں ہوں بلکہ ایک انتہائی گنہگار، جاہل، مطلق، گھٹیا اور گندا انسان ہوں---" مَیں نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر بڑی رسان سے کہا۔ "یقین کرو، مَیں تو تمہاری شاگردی اختیار کرنے کی سوچ رہا تھا کہ کسی طرح تو مجھے کلام کے ذریعے منہ سے دانت اور جیب سے درہم نکالنا سکھا دو۔ اب تو خیر، لد گئی، کہیں پچاس ساٹھ برس پہلے ٹکر گئے ہوتے تو

اس وقت میں کھٹارا بس سے نہیں، اپنی لینڈکروزر سے بھائی پھیرو کے لئے پھیرے لگاتا---"

وہ سر جھکا کر بجھے بجھے لہجے میں کہنے لگا۔ "آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں--- واقعی مَیں پہلے ایک بدنام زمانہ مشہور جیب کترا تھا، بچپن سے ہی اس کسب میں پڑ گیا تھا۔ اس فن کو انتہا کے درجے پہ پہنچایا۔ بڑا مال، کمال اور نام پیدا کیا۔ اس میدان میں بہت آگے نکل کر یہ حقیقت سامنے آئی کہ جیب کترا، جنم بھر حرف "ج" سے جان نہیں چھڑا سکتا۔ لاکھوں اڑائی، جیب خالی رہے گی اور دودھ کی بجائے جوتے جلیبیاں ہمیشہ کھائے گا۔ جلال پور جٹاں جائے نہ جائے، ہر جمعہ کے جمعہ جیل ضرور جائے گا سو سوچ سمجھ کر اس لعنتی کام پہ ہزار بار مزید لعنت بھیج کر کسی حلال کے کسب کے متعلق جستجو کی۔ ایک اور استاد ملا۔ اس نے میری انگلیاں، تیز طراری اور زبان کا لٹکا چٹکا دیکھ کر کلام کے ذریعے دانت داڑھیں اکھاڑنے کا ہنر سکھایا۔ بس وہ دن اور آج تک اسی فن سے روزی کما رہا ہوں۔ یقین کریں کہ کئی سالوں بعد آپ کے سلوکے پہ انگلیاں سیدھی کی تھیں، وہ بھی آپ کے یہ کہنے پہ کہ کلام سے پیسے نکل سکتے ہیں یا نہیں--- آپ کا سلوکا صاف کرتے وقت یہی نیت تھی کہ آپ کی رقم آپ تک واپس پہنچادوں گا---"

"آپ میری رقم واپس کیسے پہنچاتے جبکہ آپ مجھے جانتے تک نہیں---؟"

"باباجی! ہر اچھا جیب کٹوانے والا رقم کے ساتھ اپنی کوئی نہ کوئی شناخت اور اپنا پتا وغیرہ ضرور رکھتا ہے۔ میری خوش نصیبی کہ مجھے آپ کی جیب کاٹنے سے ایک ایسی دولت ہاتھ لگی جو میری بچپن سے جستجو تھی، طلب اور تلاش تھی مگر باوجود کوشش اور تلاش کے مجھے ایسا استاد اور عامل نہ ملا جو مجھے یہ فن سکھانے میں میری مدد کرتا---"

میرا ماتھا ٹھنکا، کچھ نہ سمجھتے ہوئے مَیں نے اس سے کہا۔ "بھائی! پہیلیاں نہ بجھواؤ، صاف صاف کہو کہ میری جیب کاٹنے سے تمہارے ہاتھ کون سی دولت لگی، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا--- اور ہاں، جو کچھ کہنا ہے وہ مختصر اور صاف صاف کہو۔ رات دوپہر بیت چکی ہے، میرے کچھ دین و دنیا کے تقاضے بھی ہیں---"

وہ کٹے پھٹے سرمئی بادلوں کی گود میں ہلکورے کھاتے ہوئے پیلے سے چاند کو یوں تک رہا تھا جیسے اس نے میرے وجود کی نفی کر دی ہو--- پھر ہلکے سے اس کے لب ہلے۔

"باباجی! میرے بھی تو کچھ دین و دنیا کے تقاضے ہیں۔۔۔ آپ مجھے تلاش کرتے ہوئے یہاں تک آئے۔۔۔ مَیں نے بہت عرصہ پہلے پاک پتن شریف میں ایک بزرگ سے کہا تھا کہ مَیں گمراہ ہوں' مجھے کسی رہبر کی تلاش ہے۔ انہوں نے کمال شفقت سے فرمایا کہ بیٹا' تمہارا رہبر تمہیں تلاش کرتا ہوا خود چل کر تمہارے پاس پہنچے گا۔۔۔"

میرا پارا پھر چڑھ گیا' کہا۔ "تو بھیا' مجھے یہ سب کچھ آپ کیوں سنا رہے ہیں۔ میرا ان باتوں سے کیا تعلق ہے۔۔۔؟"

کہتے ہیں کہ چاندنی رات میں جاگنے اور چاند کو بٹ بٹ تکنے والے یونہی واہی تباہی بکنے لگتے ہیں' اکثر ذہنی طور پر کھسک بھی جاتے ہیں اور بہکی بہکی ہانکنے لگتے ہیں۔ یہ منجن فروش' سابقہ جیب تراش بھی شاید ایسی ہی کسی ہیجانی کیفیت کا شکار تھا۔۔۔ وہ بدستور چاند کو تکتے ہوئے جیسے تنویمی حالت میں گویا ہوا۔

"آپ۔۔۔ آپ وہی ہیں جن کا مجھے انتظار تھا۔۔۔"

مَیں نے زچ ہو کر کہا۔ "چلئے' مَیں وہی ہوں جس کا آپ کو انتظار تھا۔۔۔ اب فرمایئے' میرے لئے کیا حکم ہے؟"

چاند چھوڑ کر اس نے میرے چرن پکڑ لئے' آہ و بکا کرنے لگا۔ "بس آپ اب مجھے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے گا۔ مَیں آپ کی سیوا کروں گا' آپ کے ادنیٰ سے اشارے پہ اپنی جان قربان کر دوں گا' بس میری راہ سیدھی کر دیں۔۔۔"

بڑی مشکل سے اس کی گرفت سے اپنے پاؤں چھڑاتے ہوئے مَیں نے "نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن" کے تحت کہا۔ "اس شرط پہ مَیں آپ کی بات قبول کروں گا کہ آپ بھی میرے استاد بنیں' کچھ مَیں آپ سے سیکھوں اور اگر مجھے بھی کچھ آتا ہے تو آپ بھی سیکھ لیں۔۔۔ اب پہلے آپ بتائیں کہ مجھ سے کیا سیکھنا چاہتے ہیں؟"

اس کی آنکھیں انگاروں کی مانند دہکنے لگیں' فرط ہیجان سے ہونٹ کانپنے لگے۔۔۔ کہنے لگا۔ "سرکار! ایک تو مجھے سونا پت کرنے کی ترکیب بتا دیں۔ وزن پکڑتا ہوں تو رنگ قائم نہیں رہتا' رنگ ٹھہرتا ہے تو وزن کھوکھل ہو جاتا ہے' ہر بار انیس بیس کا فرق اور ایک آنچ کی کسر رہ جاتی ہے۔"

یہ سن کر میرا اپنا رنگ اڑ گیا کہ ہم تو مرُشد تھے' یہ ولی نکلا۔ مَیں متوحش نظروں سے

اسے گھُور رہا تھا' جواب کوئی بَن نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے آگے بڑھا۔

"سرکار! میری دوسری درخواست ہے کہ مجھے بڑھاپے میں جوانی کا دم خم قائم رکھنے کا کوئی نسخہ عطا فرما دیں۔ کوئی ایسا کشتہ' تریاق یا بھسم جو مُردہ مرد کو بھی انیس برس کا جوان بنا کر دوبارہ زندہ کر دے' سو برس کا بوڑھا سولہ برس کا بَر تلاش کرتا پھرے۔۔۔"

اب تو میرے کانوں' نتھنوں سے دھُواں خارج ہونے لگا' کان کی لوئیں انگارہ سی دہکنے لگیں' بینائی کے وولٹیج جیسے یکدم بڑھ گئے' رگ و پے میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ مَیں اس حالت میں اسے محض خاموشی سے تکتا ہی رہ گیا۔

"میری سوہنی سرکار۔۔۔!" اب وہ میری پنڈلیاں پپولتے ہوئے خوشامدانہ انداز میں کہنے لگا۔ "کوئی ایسا اسم جو کبھی قضا نہ ہو۔۔۔"

معاً" کسی قریب کے گاؤں کی مسجد سے "اللہ اکبر' اللہ اکبر" کی صدا بلند ہوئی۔ مَیں نے "اللہ اکبر" کہتے ہوئے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔

"یہی وہ اسم اعظم ہے جو تم مجھ سے سیکھنا چاہتے ہو۔۔۔"

اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا' مَیں نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھتے ہوئی اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ اذان ختم ہوئی۔ پھر اس نے کچھ کہنا چاہا' مَیں نے پھر خاموش کرا دیا۔ نہر پہ آئے۔ نہائے' دھوئے۔ وہیں کنارے کے ساتھ ایک ہموار صاف سی جگہ پہ نماز پڑھی' اس نے پھر کچھ کہنا چاہا' پھر خاموش کروا دیا۔۔۔ دُعا میں کہا۔

"اے رَبّ العزت! تیرے ہی قبضہ قدرت میں سب کچھ ہے۔ بے شک تو ہی جسے توفیق دے تو وہ سیدھی راہ پکڑے اور پھر تیری ہی توفیق سے ثابت قدم رہے۔۔۔ یوم حساب کے مالک! ہم سب کو اپنے فضل کے حساب میں رکھیو۔ اس تیرے بندے کو میں نے تیرے امر سے تیرا اسم دیا ہے۔۔۔ علم الاسماء کے خالق! اسے اس اسم کی برکات اور ثمرات سے بہرہ مند فرما دے' آمین!"

نماز اور دُعا کے بعد' مَیں نے اس سے کہا۔

"اب بولو' کہو۔۔۔"

اب اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ مجھے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ مَیں خاموش ہو کر

وہیں اپنے شغل میں مگن ہو گیا اور وہ خاموشی سے اٹھ کر ایک پگڈنڈی پہ ہو لیا جو شاید ساتھ والے گاؤں کی جانب جاتی تھی۔ دل چاہا کہ اٹھوں' میں بھی چل دوں۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی تھی' پوَر پوَر دکھ رہی تھی' کمر الگ تختہ ہو رہی تھی۔ وہیں زمین کے ننگے فرش پہ ہی ڈھیر ہو گیا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی آنکھ کھلی گئی' بندریا سندریا میری ٹانگوں پہ اُچھل کُود کر رہی تھی' ننگ دھڑنگ ملنگ کاٹھ کندے اکٹھے کر رہا تھا۔ منجن فروش نے ناشتے پہ تازہ مکھن' لسی اور باجرے کی روٹی کا اہتمام کیا تھا۔ ناشتے کے دوران مَیں نے اسے بتایا کہ نگینہ انگوٹھی میں ہی جڑا ہوا محفوظ' معتبر اور موثر رہتا ہے۔ نگینہ اسم ہے' انگوٹھی تمہارا قلب ہے' رزق حلال اسے محفوظ رکھتا ہے۔ اللہ کا خوف اسے معتبر ٹھہراتا ہے اور خدمت خلق سے یہ موثر ہے۔ اب آؤ' تمہیں سونا بنانے کی ترکیب اور سدا جوان رہنے کا نسخہ بتاتے ہیں۔"

اس نے شہادت کی انگلی اپنے ہونٹوں پہ رکھ کر شاید مجھے خاموشی اختیار کرنے کی درخواست کی تھی۔

میرے اپنے بس میں ہوتا تو مَیں اس منجن فروش والے واقعے کے بعد کبھی بھائی پھیرو کا سفر اختیار نہ کرتا لیکن میرے تو نصیب ہی ایسے ہیں کہ مَیں کہیں جاؤں یا نہ جاؤں مگر کوئی نہ کوئی چھنکار' واقعہ' حادثہ' ہنگامہ' کہانی' طلاق نکاح یا کوئی نہ کوئی ہونی انَ ہونی میرے پلّے پڑنے کے لئے بالکل تیار ہوتی ہے۔ بالفرض اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہو تو پھر بھی میں ایسا کچھ نہ کچھ کرنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست بالجواز پیدا کر ہی لیتا ہوں۔ جیسے ہمارے ہاں آل اولاد میں کوئی نہ کوئی فرد ایسے چمکتے ہوئے نصیب لے کر پیدا ہوتا ہے کہ اپنے گھر کے علاوہ گلی' محلے' شہر بھر کی لعن طعن اور پھٹکار کا محوّر یہی "خوش بخت" ٹھہرتا ہے اور جس روز اسے اپنی لگی بندھی خوراک نہ ملے تو یہ اوازار' پریشان اور بیمار سا دکھائی پڑتا ہے۔ کئی دنوں سے میری بھی حالت بالکل ایسے ہی تھی۔ کوئی لڑائی نہ جھگڑا' نہ تھرتھلی نہ کوئی ہیجان' تردّد نہ کوئی پریشانی۔۔۔۔ بڑے بڑے سوکھے تھور ٹھنڈرے دن ہرک رہے تھے۔ الٰہی' خیر! اندر سے دل لرز رہا تھا کہ یہ سکوت کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ نہ ہو اور وہی ہوا کہ جس کا ڈر تھا۔ آدھی رات پیچھے نصف آ گئے' داڑھ میں جیسے کسی نے کیل ٹھونک دی ہو۔ ہڑبڑا کر

اٹھ بیٹھا' درد تھا کہ پورا جبڑا دکھن سے انگار بنا ہوا تھا' جائے واردات کو زبان کی نوک سے ٹٹولا تو معلوم ہوا کہ کلام سے نکلوائی ہوئی داڑھی کے ساتھ والی ہمسائی داڑھ میں درد کی کرب ناک لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ آدھی رات' کہاں کا ڈاکٹر یا دَوا دارو؟ کھٹ سے اپنے مُرشد علامہ اقبالؒ کی داڑھ' نمک اور اُدرک والا ٹوٹکا یاد آ گیا۔ فوراً اَدرک چھیلی' نمک پیسا اور داڑھ تلے دبا کر پڑ گیا پر توبہ کیجئے جو بال برابر بھی افاقہ محسوس ہوا ہو۔ درد اور ٹیسیں' الامان الحفیظ۔ جیسے کوئی الیکٹرک ڈرل پہ کنکریٹ میں سوراخ کرنے والا برما باندھ کر میرے جبڑے میں اندر باہر کر رہا ہو۔ لونگ کڑوے تیل میں جلا کر رکھے' پھر بھی بات نہ بنی۔ ہمدرد کا قلزم آزمایا' اسے بھی دو منٹ بعد تھوک دیا۔ اسپرین کی ٹکیہ رکھی' افاقہ کیا ہونا تھا الٹا گال سوج کر کُپا بن گیا' اسی ہائے ہائے میں صبح ہو گئی۔ پرانی روئی پہ نمک لگا کر ٹکور کی' اس سے یہ فرق پڑا کہ گال سرخ بوٹی کا مُچّا بن گیا۔ دن چڑھے جوں توں ایک ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ بات کرنے یا زبان ہلانے کا یارا نہ تھا' مفلر ہٹا کر گال دکھا کر اپنی حالت زار دکھائی۔۔۔ اس نیک بخت نے جیسے تیسے ٹیکہ لگایا' کچھ گولیاں اور کیپسول لکھ دیئے اور کہا کہ کل پھر آئیے گا۔۔۔ قِصّہ مختصر کہ دو تین روز بعد قدرے افاقہ ہوا تو میں نے عرض کی کہ اس ناہنجار داڑھ کو نکال دیجئے' یہ اب ناقابلِ برداشت ہو گئی ہے۔ انہوں نے باقاعدہ معائنہ کرتے ہوئے ساتھ والی یعنی کلام سے نکلنے والی داڑھ کے متعلق پوچھا۔ مجھ سے ساری تفصیل جاننے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ حضرت' آپ کے ساتھ یہی کچھ ہونا چاہئے تھا۔ یہ کلام سے داڑھ نکالنے والے فراڈ ہوتے ہیں۔ ایک مخصوص قسم کا کیمیکل وہ انگلی پہ لگا کر اندر داڑھ اور مسوڑھے پہ مل دیتے ہیں جس سے جگہ بے حِس ہو جاتی ہے اور سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ساتھ والی دوسری داڑھیں دانت بھی کچھ عرصہ بعد تکلیف دینا شروع کر جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دھیرے دھیرے منہ خالی ہو کر پھٹے ہوئے بٹوے کی طرح لٹک جاتا ہے۔ آپ یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ دیوار سے ایک ایک اینٹ کھینچ لو تو آس پاس کی اینٹیں بھی کِھسکنے میں آسانی پکڑ لیتی ہیں۔ بہرحال' آپ اس داڑھ کو نکلوا ہی دیں تو بہتر ہے۔ اس شریف آدمی نے سرنج بھر کر داڑھ کے آس پاس دو تین جگہوں پہ انجکشن ٹھونکے' ٹھنڈے پانی سے دو چار کلیاں کروائیں۔ ٹھیک پانچ منٹ بعد اس قصائی نما ڈاکٹر نے ایک ٹیڑھے منہ والا زنبور میرے منہ کے اندر داخل کیا۔ متاثر داڑھ پہ گرفت

کرنے کے بعد جو نکال کھینچنے کی کوشش کی تو میری چیخیں نکل گئیں۔۔۔ معلوم ہوا کہ مسوڑھوں کو سن کرنے والی دوا نے اثر نہیں کیا۔ دوبارہ انجکشن لگائے مگر داڑھ... کہ "جُنبد' نہ جُنبد گل محمد" بنی ہوئی تھی۔ میرے منہ میں انگارے سے بھر کر اس نے مشورہ دیا کہ یہ داڑھ آپ مت نکلوائیں' مزید کوشش سے آپ کی آنکھ متاثر ہو سکتی ہے۔ اس نے مزید گولیاں لکھ دیں۔ میری تو سٹی گم ہو گئی۔ داڑھ تو داڑھ' مجھے تو اب اپنی آنکھ کے لالے پڑ گئے تھے۔ مَیں داڑھ اور آنکھ کی سلامتی کے ساتھ وہاں سے اُٹھ آیا۔۔۔ اب نئی افتاد یہ آن پڑی کہ داڑھ' ڈاکٹر کی دھینگامشتی سے مزید خراب ہو چکی تھی۔ جب تک انجکشن اور دوا کا اثر تھا' قدرے سکون رہا۔ جونہی اثر ختم ہوا' جبڑا طبلے کی طرح بجنے لگا۔ اوپر آنکھ' ساتھ کان' سر' گردن جیسے کسی نے آگ میں ڈال رکھے ہوں۔ کھانا پینا بھی چھوٹ چکا تھا۔ کڑوی دوائیں اور کیپسول نگل نگل کر منہ ناسور بنا ہوا تھا۔ اسی دوران مجھے بھائی پھیرو سے خلیفہ بلاغ علی کا پیغام موصول ہوا کہ کل جمعرات کی صبح صبح آپ بھائی پھیرو پہنچ جائیں اور اپنا آرڈر جو تیار ہو چکا ہے' وصول کر لیں۔ جمعرات کو نہ پہنچنے کی صورت میں آپ کو اگلی جمعرات تک میرا انتظار کرنا پڑے گا کیونکہ مَیں جمعرات کی شام کو بہاولپور مال لینے کے لئے چلا جاؤں گا۔۔۔ مجھے داڑھ نے زندگی سے بیزار کیا ہوا تھا' مَیں اپنے آرڈر کو کیا اہمیت دیتا۔۔۔ معاً" مجھے جیسے جھٹکا سا لگا' یاد آیا کہ پچھلی بار بھائی پھیرو یاترا کی نشانی۔ اس منجن فروش کی دی ہوئی ڈبیا میرے پاس پڑی ہوئی تھی۔ فورا" اسے تلاش کیا' چٹکی سے متاثر جگہ کے آس پاس مٹی رنگت کے پوڈر کو مل دیا۔ ملنے کی دیر تھی' منہ لعاب سے بھر گیا۔۔۔ دس منٹ تک گاڑھا سا لعاب میرے منہ سے خارج ہوتا رہا۔ اگلے بیس منٹ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے داڑھ درد مجھے کبھی ہوا ہی نہیں تھا۔۔۔ اللہ کا شکر ادا کیا' دانت داڑھ کے درد میں افاقے اور زچہ کے چھلاپے کے بعد جو طمانیت اور سکون دونوں کو حاصل ہوتا ہے اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ مَیں نے کئی دنوں بعد سیر ہو کر کھانا کھایا' منجن والی ڈبیا کو تشکر بھری نظروں سے دیکھا' پہلی بار غور سے اسے پڑھا۔ منجن فروش کی داڑھی سمیت دھندلی سی تصویر کے ساتھ' نام پتا بھی تحریر تھا۔ "ہوالشافی۔ نقالوں' دھوکہ بازوں سے بچیں۔ کلام الٰہی سے دانت داڑھ نکلنے والے عامل۔ دَمہ' گنٹھیا' اٹھرا' مردانہ زنانہ امراض کا کلام الٰہی سے علاج' حکیم عامل سیّد شفاعت

علی شاہ قلندری المشہور شفوشاہ دنداں والا۔"

اس طرح مجھے بندریا سندریا والے منجن فروش کا نام معلوم ہوا اور یہ بھی کہ وہ سیّد اور قلندری بھی ہے۔ بہرحال' مَیں نے فورا" بھائی پھیرو جانے کی تیاری شروع کر دی کہ صبح صبح یہاں سے نکل لوں گا۔ خلیفہ بلاغ علی سے تو ملنا ہی تھا مگر اب شفوشاہ سے ملاقات بھی ضروری ہو گئی' مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ اس اللہ کے بندے کو مَیں جو کچھ اسم اعظم کے حوالے سے کہہ کر آیا تھا' اب اس کا کیا ردِ عمل ہوا ہے اور اب وہ کس حال میں ہے۔ یہ بات بھی مَیں قیافے سے جان چکا تھا کہ اس نے میری ڈائری ضرور پڑھی ہے' اس کے مندرجات وہ کسی حد تک جان یا سمجھ پایا ہے۔ یہ ایک الگ بات تھی مگر یہ اٹل حقیقت ہے کہ وہ کیمیاگری سے کسی نہ کسی طور دلچسپی ضرور رکھتا ہے' مخفی عُلوم اور حکمت سے بھی کچھ تعلق ظاہر ہے۔ دنیاوی نقطہ نظر سے ایسے پُراَسرار علوم اور فن' دولت و شہرت حاصل کرنے کے لئے سیکھے جاتے ہیں' کچھ لوگ شوق کی خاطر بھی سیکھتے ہیں مگر لالچی اور حرص و ہوا کے بندوں کے لئے تو یہ خاص طور پر بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ یہ راتوں رات امیر کبیر اور عزت و شہرت حاصل کرنے کے خواہش مند' ایسے پیروں فقیروں' سنیاسی اور جوگیوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں جو ان علوم کے بارے میں انہیں کوئی راہ راستہ دکھا سکیں۔ میری ڈائری پہ بھی ان علوم کے بارے میں بے شمار یادداشتیں' تجربے' نتائج' اجزاء' کیفیتیں' قرآنی آیات' اوَراد' نقش وغیرہ تحریر تھے۔ یہ سب کچھ میرا ذاتی شوق اور جنون تھا' کوئی دوسرا میری اس ڈائری سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا کیونکہ یہ سب کچھ میرے مخصوص انداز تحریر اور نہ سمجھ میں آنے والے خفیہ ناموں اور اشاروں کنایوں سے لکھا ہوا تھا۔ شفوشاہ قادری صرف یہ جان سکا کہ اس ڈائری کا مالک ان علوم کو جانتا ہے جبکہ ایسا قطعی نہیں تھا۔ بیس پچیس برس جو کچھ بھی میں نے دیکھا' حاصل کیا۔ میرے تجربے' مشاہدے' اندازے۔ خاص خاص باتیں' اچھے اچھے شعر' اقوال' ٹیلیفون نمبر اور اپنے پرایوں کے پتے' بے شمار ایسی چیزیں اس میں تحریر تھیں۔ یہ بھی درست کہ ان تینوں علوم کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا تھا' بچپن سے لے کر اب تک انہی علوم کی تلاش و جستجو میں رہا۔۔۔ یہ بھائی پھیرو والے خلیفہ بلاغ علی بھی کیمیاگری کے بہت پرانے کھلاڑی استاد تھے' اسی پچاسی کے پیٹے میں بیوی بچوں سے فارغ' دینی و دنیاوی دھندوں سے بے

نیاز' اپنی لگن میں مگن رہتے۔ وہ ایک زمیندار کے مربعے میں درختوں کے ایک ذخیرے میں الگ تھلگ پڑے رہتے تھے۔ ان کا مہربان زمیندار بھی سونا بنانے کا ٹھرکی تھا' باپ کے مرنے پہ پچیس مربعے وراثت میں پائے مگر اسی سونا بنانے کے چکر میں تقریباً" سارے مربعے بک گئے تھے' یہی ایک آدھ مربعہ جنگل ذخیرہ ہونے کی وجہ سے بچا رہا جہاں وہ اب اپنے استاد خلیفہ باغ علی کے ساتھ دن رات کشتے' قلعی' تانبا' پارا' شنگرف پخت کرتا رہتا۔۔۔ سچی بات یہ ہے کہ مَیں بھی وہاں اسی سلسلے میں حاضری دیا کرتا تھا اور پہروں بیٹھ کر خلیفہ صاحب کے تجربات اور باتیں سنا کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہمارا موضوع یہی کیمیاگری ہی ہوتا۔ بعد میں خاص خاص نکتے اپنی ڈائری پہ لکھ لیتا تھا۔ خلیفہ صاحب میرے استاد ہونے سے کہیں زیادہ میرے دوست بھی تھے' مجھ سے بے حد شفقت فرماتے۔ ایک بار انہوں نے فرمایا کہ کیمیاگری ایک گپت ساگر ہے۔ اس میں جو اُترا سو ڈوب گیا۔ جو لالچ لے کر اس شوق میں پڑا' وہ مارا گیا' وہ ساری عمر کچے پکے کے چکر میں ہی رہے گا۔ سیروں اصلی سونا' اس ٹھرک کے بھاڑ میں جھونک کر بھی ایک ماشہ خود ساختہ سونا نہیں بنا پاتا اور جو اسے امانت' دیانت اور بے غرضی سے حاصل کرتا ہے وہ چاہے تو سیروں منوں سونا بنا سکتا ہے'' اس کی نگاہ ہی کیمیا ہو جاتی ہے مگر اس کے باوجود وہ تنگ دست اور فاقہ مست ہی رہتا ہے اور ایسا ہی رہنا پسند کرتا ہے۔ کبھی بھی لالچ میں نہ پڑنا' عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی خواہش نہ کرنا' اللہ کی مخلوق کی خدمت کرنا' ان کے لئے آسانیاں پیدا کرنا۔۔۔ مَیں ان سے مفردات کے خواص جاننے کا خواہاں رہتا تھا اور اکثر جڑی بوٹیاں اور کچے پکے کشتے بھی لیتا تھا جنہیں مَیں اپنے تئیں مختلف تجربات اور مرکبات میں استعمال کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اکثر بھائی پھیرو اور لاہور کے مابین حالت سفر میں لٹکا رہتا۔ خلیفہ صاحب نے ابھی بھی مجھے اسی سلسلے میں یاد فرمایا تھا۔ بَس میں سوار ہوتے ہی میری نگاہیں' شفوشاہ منجن فروش کو تلاش کرنے لگیں مگر وہ اب کہاں نظر آتا' وہ تو شاید وہیں ڈیرے پہ اسم اعظم کے چکر میں پڑا ہوا تھا۔۔۔ تھوڑی دور آگے چونگی پہ بَس رکی تو ایک سُرمہ فروش بس میں داخل ہوا۔ اتفاق سے مَیں دروازے کے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میری موٹے شیشوں والی عینک اور دھندلی دھندلی آنکھیں دیکھ کر وہ میرے شانے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

''السلام علیکم۔۔۔ میرے بہن اور بھائیو! اللہ تعالٰی آپ کے سفر کو خیرخیریت سے

جاری و ساری رکھے' سلامتی سے منزل تک پہنچائے آمین' ثم آمین!۔۔۔ ہمارے ملک پاکستان کو سلامت تا قیامت رکھے' دشمن کا منہ کالا اور اس کی آنکھوں میں موتیا کالا۔۔۔ برادران اسلام! آپ نے ڈاکٹر حکیم علامہ مولانا محمد اقبال کی یہ مشہور نظم سنی ہوگی ؎

اکھیوں کے جھروکوں سے' تم کو دیکھا ہے سرَورے

بڑی دُور نظر آئے' بڑی دُور نظر آئے

یہ مشہور شعر علامہ صاحب نے اپنے پیارے بیٹے سرَور اقبال کو دیکھ کر ارشاد فرمایا تھا۔ علامہ اقبال آشوب چشم کے تکلیف دہ مرض میں مبتلا تھے' نظر کی دھندلاہٹ کا یہ عالم تھا کہ انہیں پاس کھڑا ہوا اپنا بیٹا بہت دُور نظر آتا تھا۔ انہی دنوں کسی خیرخواہ نے میرے دادا حکیم چشم الدین کے تیار کردہ سرمے کی تعریف اور سفارش کی۔ دو چار روز کے استعمال سے علامہ صاحب نے مرض دیرینہ سے خاطرخواہ افاقہ پایا۔۔۔ ماؤں بہنوں' بھائیو' بزرگو! مَیں اسی دادا کا پوتا ہوں۔ دادا مرحوم کی وصیّت کے مطابق مومن مومنات کی خدمت کی غرض سے عرصہ اٹھارہ برس سے اسی بس میں یہ سرمہ تحفے کے طور پر تقسیم کر رہا ہوں' صرف اشتہارات اور شیشی' سُرمچو' ڈبیا کے معمولی خرچ کے طور پہ صرف پانچ روپے' پانچ روپے' پانچ روپے۔۔۔"

وہ ایک شیشی میں لکڑی کا سُرمچو گھماتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔

''ذرا عینک اتارو' بزرگو! خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو۔ کالا مُوتیا' چٹا مُوتیا' پڑوال' دُھندلکا' ایک کے دو نظر آنا' پانی بہنا' آنکھ کا دُکھنا' ایک سو ایک مرض اور صرف ایک سرمہ' شاہین کی آنکھ مارکہ اقبال سرمہ' اقبال سرمہ۔۔۔ اچھا جی' ابھی دیتا ہوں۔۔۔ اچھا ماں جی! اچھا' حاجی صاحب۔۔۔!"

وہ میری جانب پلٹنے لگا تو مَیں طرح دے گیا۔

''بھائی! میری ایک آنکھ پتھر اور دوسری شیشے کی ہے لہٰذا مجھے شاہین مارکہ سُرمے کی ضرورت نہیں۔۔۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ مَیں نے اپنی عادت کے برعکس نہ کوئی پنگا لیا اور نہ کوئی تجربہ کیا تھا' اللہ نے سمجھ دے دی تھی کہ دانت تو بتیس ہوتے ہیں اور آنکھیں صرف دوؔ عدد۔۔۔ بَس بھگتا کر وہ اترنے لگا تو مَیں نے یونہی اس سے پوچھ لیا۔

"بھائی! کوئی دانتوں کے منجن والا بھی آئے گا' مجھے منجن چاہیے۔"

اس نے فوراً مجھے منجن کی ڈبیا تھماتے ہوئے کہا۔

"نکالئے پانچ روپے۔۔۔ ذرا جلدی کیجئے' مجھے یہاں اترنا ہے۔۔۔"

مَیں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ "بھائی! تم تو سرُمہ بیچتے تھے۔۔۔ یہ منجن۔۔۔؟"

"حاجی صاحب! لاہور سے "اپ" آتے ہوئے سرُمہ اور بھائی پھیرو سے "ڈاؤن" جاتے ہوئے منجن۔۔۔؟"

مَیں ڈبیا کو غور سے دیکھ رہا تھا' خود بخود میرے منہ سے نکل گیا۔

"بھائی! یہ تو شفوشاہ والا منجن ہے۔۔۔ وہ خود کہاں ہے؟"

"بابا جی! اسے کوئی بابا مل گیا ہے' یعنی مرُشد پاک۔۔۔ اب اس نے یہ سارے برُے دھندے چھوڑ دیئے ہیں' مَیں نے اس سے سارا تیار مال لے لیا ہے۔"

"بھائی! مَیں نے پوچھا ہے کہ وہ خود کہاں ہے؟"

"وہ جی' وہیں اپنے ڈیرے پہ "اللہ اکبر' اللہ اکبر" کی بانگیں دیتا رہتا ہے۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے وہ چلتی بس سے اتر چکا تھا۔

✿✿✿